رجسٹرڈ

دلی قلعہ معلی بازار

دینے کیلئے ۴ ٹکٹ آنے پر رسالہ روانہ ہوگا

جنوری سنہ ۱۹۱۱ء
جلد نمبر ۱



زبان

دہلی

زباں تا بود رواں چاہیے

ایڈیٹر ۔ نازک رقم اکبرآبادی

فہرست مضامین

زبان پریس دہلی میں چھپا

رائڈل صاحب کی بنائی ہوئی نہایت مجرب ادویہ

مرگال

آتشک کے امراض کی علامات جو جلد بدن پر تانبے کی رنگ کی پھنسیاں منہ پر بدنما داغ اور آلات تولید
ں کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ رائڈل صاحب کے مرگال کے داخلی استعمال سے اتنے ہی عرصہ میں
مضرت اور افشار راز جسمانی رہتی ہیں جتنے عرصے میں دیگر مرکبات سیماب کی مالش یا پچکاری سے خا
لج ڈاکٹروں کا مصدقہ ۔ ۴۰ گولیاں ۲ ؏

گونوسان

مشہور تکلیف دہ جانگداز مرض ریزش پر سوزش مثانے کا حکمی علاج مشہور اور خاص ڈاکٹران کا مصدقہ صندل
کے دیگر مرکبات کے خلاف معدہ گونوسان کو بلا اکراہ قبول کر لیتا ہے اسکے علاج میں کسی پچکاری کی ضرورت
نہیں پڑتی یہ انتہا درجہ کا جامع مرکب کثافتوں سے پاک ہے اور ایسا بینظیر کہ جسکی نقل اور ہمسری
ناممکن ہے اسکے کیپسول ریشم کی موافق ملائم ہوتے ہیں۔ گونوسان اصرار کے ساتھ خریدو۔
قیمت ۴۰ گولیوں کی شیشی کی دو روپے ۲ ؏

بوارنیوال

طاقت و بنانے اور دردا عصاب دور کرنے کی دوا ہسٹیریا کی مریض عورتوں کے واسطے
نہایت مفید۔ کم ہمتی۔ بدخوابی ضعف دل کو دماغ کو نافع۔ اگر کسی بدنصیب کو افیون
چانڈو یا شراب کی بری لت پڑ گئی ہو اور جسم میں ہر وقت سستی ہو اسکو لازم ہے کہ فوراً رائڈل صاحب کے بوارنیوال
کا استعمال کرنا شروع کرے یہ تمام نشی اشیاء کی عادت چھڑا دیتا ہے اور کوئی برا اثر نہیں پیدا کرتا

۴۰ گولیوں کی قیمت ۱ ؏

مندرجہ بالا ادویہ کے مفصل حالات میں ایک رسالہ بنام آب و آتش حال میں چھاپ کر مفت تقسیم کیا جاتا ہے بکتا ہے
ہر ایک کو درخواست کرنے پر مع محصول ڈاک ارسال کیا جائیگا۔ اور مذکورہ بالا ادویہ اپنے شہر کے انگریزی دوا فروشوں سے طلب کرو۔ اگر وہ نہ
[illegible]

زبان

ماضی و استقبال

جانے والے سال کے روز و شب صبح و شام جو جانے کے لئے آئے تھے
جن کا آنا جانے ہی کی خاص غرض سے تھا اور جو جا کر پھر نہیں آسکتے۔
آکر جا چکے ہیں۔

ثبات ایک بات ہے کہ منہ سے نکلی اور ہوا ہوئی۔ سانس کا اُتار چڑھاؤ
بحرِ زندگی کا مد و جزر ہے۔ اسکی ہموار رفتار گھڑی کا کھٹکا ہے کہ برابر چل رہا ہے
دقیقہ سنجوں کی نگاہیں اسی سے ہزارہا عبرت انگیز سامان پیدا کر لیتی ہیں۔ یہ چال
کوچ کا نقارہ ہے۔

عالمِ امکان کا قدیم دستور ہے کہ اپنے تغیرات سے ملاء ادنیٰ کے دماغ میں عجیب و غریب الٹ پھیر پیدا کرتا رہتا ہے۔ یہ قدرتی نیرنگی انسانی ادراک کیلئے ایک قسم کی اسکیل ہے۔ عام نگاہوں میں یہ تغیر پذیر یا متغیر آثار محض کرشمے یا شعبدے ہی نظر آتے ہیں مگر فلسفی نگاہ۔ علم الافلاک سے ماہر آنکھ زمانہ کے طویل امتداد میں ان رنگا رنگی شوخیوں کو ایک عظیم الشان طلسم جانتی ہے۔ اُن کی حکیمانہ بصیرت انہی نیرنگیوں کو ضوابط عام بنانے میں رہبر بن کر عالم کو تغیرات کے ہاتھوں میں دیدیتی ہے۔ مہندسانہ دماغوں نے انہی تغیرات کو سال۔ مہینوں۔ ہفتوں اور دنوں وغیرہ پر تقسیم کرکے عالم کے کاروبار میں انتظام کی روح پھونکدی ہے۔

مرقومہ بالا چند بے سروپا جملے سال گزشتہ کی مشایعت اور سالِ حال کے خیر مقدم میں نہیں لکھے ہیں بلکہ اس مختصر تمہید کے بعد ہم اپنے رسالہ زبان اور اپنا حساب دینے والے ہیں۔ ہمکو اس وقت یہ دکھانا مقصود ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء کے بارہ مہینے میں ہمارے رسالے نے اہلِ وطن کی کیا خدمت کی اور اگر آپ کے نزدیک بھی رسالہ زبان نے ترقی کی ہے تو وہ آپ کی قدردانی کا ضرور مستحق ہے اسکی ساتھ ہی ہمیں یہ بھی ظاہر کرنا ہے سنہ ۱۹۱۱ء کے واسطے ہم نے کیا کیا تیاریاں کی ہیں اور پبلک میں مذاق سلیم پیدا کرنے کے لئے ہماری کوششیں کس حدتک پہنچی ہیں۔ گزشتہ سال کی بے ترتیبی اشاعت اور مضامین کی عمومیت ضرور قابلِ اعتراض ہے لیکن دسمبر کے نمبر نے ہمارے خیال میں تمام باتوں کی ایک حدتک تلافی بھی کردی، اگرچہ ہم جائز طور پر پرچے کے متعلق کل بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کا الزام دوسروں کے سر لگا سکتے ہیں مگر چونکہ ناظرین کے نزدیک ریسپانسبل ہم ہی ہیں اسلئے ندامت کے ساتھ ہم ہی خواستگار معافی ہیں۔

رسالہ "زبان" کو ہر قوم اور ملت سے قطعی الگ کرکے ملکی۔ علمی اور غیر متعصب

بنانے کے واسطے ہمنے گزشتہ سال جس قدر کوشش کی ارباب فہم نے اسکی پوری قدردانی کی ہے۔ اور اسی روش کی پابندی کے سبب سے ہمنے مالی نقصان بھی اختیار کیا ہے۔ کیونکہ ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ روش جو ہم آج اختیار کر رہے ہیں لوگوں کی نگاہوں میں کچھ دلچسپ نہیں معلوم ہوگی۔ قومی جھگڑے۔ پارٹی فیلنگ کے اکھاڑے اور ساتھ ہی گل وبلبل کی مزید اچھیڑ چھاڑ کے بدلے۔ سائنس جیسا خشک اور پولیٹکل اکونومی جیسا دشوار گزار مضمون ہمارے رسالہ کا ماخذ ہوگا۔ مگر ساتھ ہی پارٹی پولیٹکس اور ملکی پولیٹکس کی طرف سے بیجا نکتہ چینیوں کو بھی روکے گا۔ اگر یہ تمام باتیں معہ ہندو اور اسلامی لٹریچر کے اس پرچے میں کامیابی کے ساتھ مقبول ہوئیں تو ہمارا خیال ہے کہ رسالہ "زبان" اُردو رسالوں میں کرنل بن کر نکلے گا۔ اور تعلیم یافتہ گروہ میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

گل وبلبل اور حسن وعشق کی دیکھی بھالی تصویروں یا سُنی سُنائی باتوں کو رنگ برنگ کے پہلوؤں سے دکھانا یا سُنانا ہمیں اسلئے مقصود نہیں ہے کہ ان فرسودہ معاملات میں ہمارا قلم کوئی صورت نہیں پیدا کرسکتا۔ اور ہماری زبان کوئی دلچسپ حکایت نہیں سُنا سکتی۔ ہاں اگر اس پامال میدان میں بھی کوئی بکار آمد جدوجہد ہوسکے گی یا کوئی دلکش اخلاق آموز انداز پیدا ہوسکے گا تو اُسکے بیان کرنے کے واسطے "زبان" تیار ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ "زبان" ایک ایسا علمی رسالہ بنجائے جس کی اُردو دنیا میں سخت ضرورت ہے۔ محض انشا پردازی کے جال میں پھنسے ہوے دل اور ادبیت کے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی طبیعتیں اگرچہ بادی النظر میں ہماری اس پالیسی کو حقارت انگیز نگاہ سے دیکھیں گی۔ لیکن اگر استقلال کے ساتھ "زبان" نے عمر پائی تو ہم دکھادینگے کہ کس قدر جلد ہوا ہمارے موافق چلنے لگتی ہے۔ یہ روشن زمانہ ہے معلوم

وفنون اپنے پروں سے خود بخود ترقی کی فضا میں بلند پروازیاں کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم بھی ابنائے وطن کے ہم زبان ہو کر کچھ کریں اور دکھائیں۔

لیکن اتنے مختلف مضامین کا انتظام کرنا ایک شخص کے امکان سے باہر ہے لہذا مفصلۂ ذیل اشخاص نے ان ان مضامین کے مرتب کرنیکا وعدہ کیا ہے جن کا ہم تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور نیز ہم اپنے ملک کے قابل قدر ناظموں ناثروں اور مضامین نگاروں سے ملتمس ہیں کہ اگر وہ اپنا تھوڑا سا قیمتی وقت صرف کر کے اخلاقی۔ تمدنی۔ علمی۔ تعلیمی۔ سائنسی وغیرہ با اثر اور ضروری مضامین پر طبع آزمائی فرمائیں تو صرف ہم ہی پر احسان ہوگا بلکہ تمام ملک کو مشکوری کا موقع ملیگا۔ آیندہ نسلیں آپ کی احسانمند ہونگی اور آپ ایک قسم کے مصلحان ملک کہے جا سکیں گے۔

۱۔ لالہ چندو لال صاحب چاول والے آنریری اڈیٹر۔ ہندو لٹریچر۔

۲۔ جناب محمود حسین صاحب رضوی آنریری اڈیٹر۔ اسلامی لٹریچر۔

۳۔ جناب ڈاکٹر بی۔ کے۔ متر صاحب مینجر۔ سائنس وطبی مضامین۔

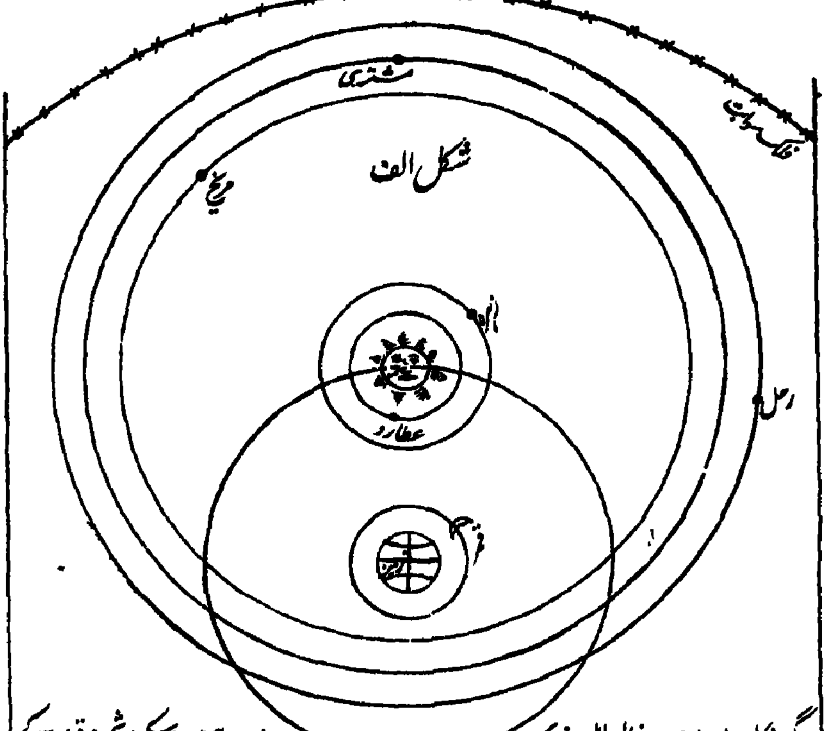
۴۔ جناب ماسٹر امیر چند صاحب۔ تعلیمی مضامین۔

۵۔ جناب پریانند صاحب سوشل مضامین۔

۶۔ جناب پادری اینڈروز صاحب۔ اشیائے منشی و اخبارات۔

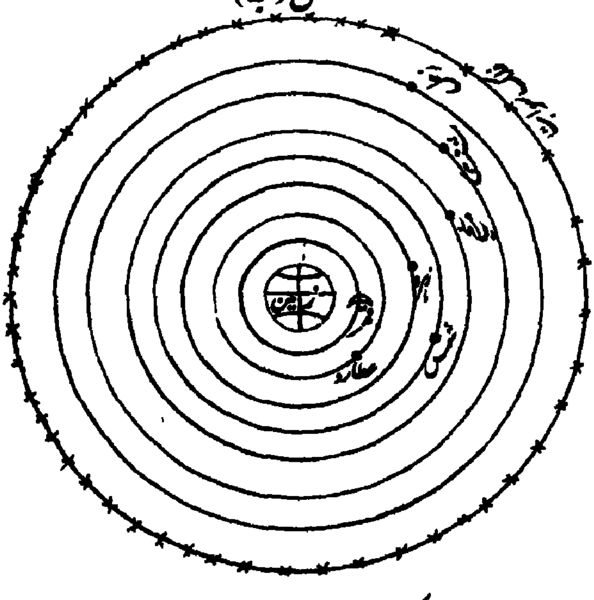
ہم سنہ ۱۹۱۰ء کے معاونین قلم کے شکرگزار ہیں۔ خاصکر اپنے دوست صادق مسٹر محمد اسلم صاحب سیفی (علیگ) کے کہ جنہوں نے اپنے والد جناب مولینا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے کلام سے اہل وطن کو فیضیاب ہونیکا موقع دیا۔

اڈیٹر



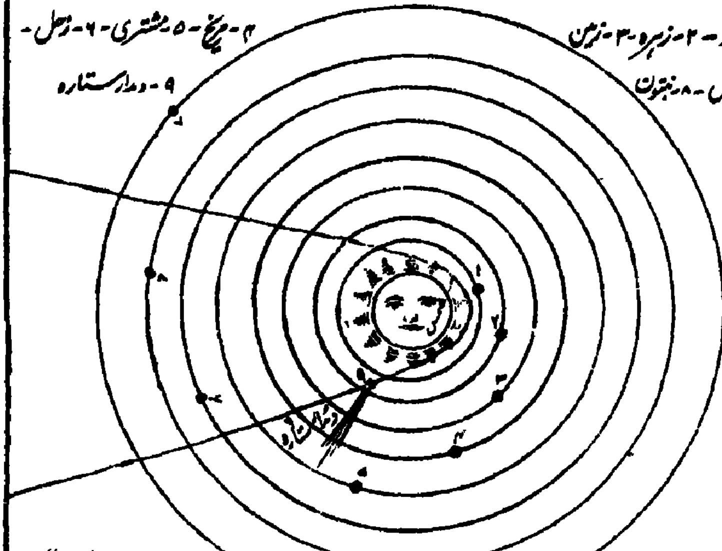
گرہوں کا دوران بموجب خیال اہل ہنود اس میں زمین بیچ میں اسکے بعد شمس و قمر زمین کے گرد دورہ کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں لیکن دیگر سیارگان مثلاً عطارد - زہرہ - مریخ - مشتری - اور زحل شمس کے گرد مطابق جدید خیال دورہ کررہے ہیں - متقدمین کو اُورانوس اور نپتون کی بابۃ واقفیت نہ تھی۔

شکل (ب)

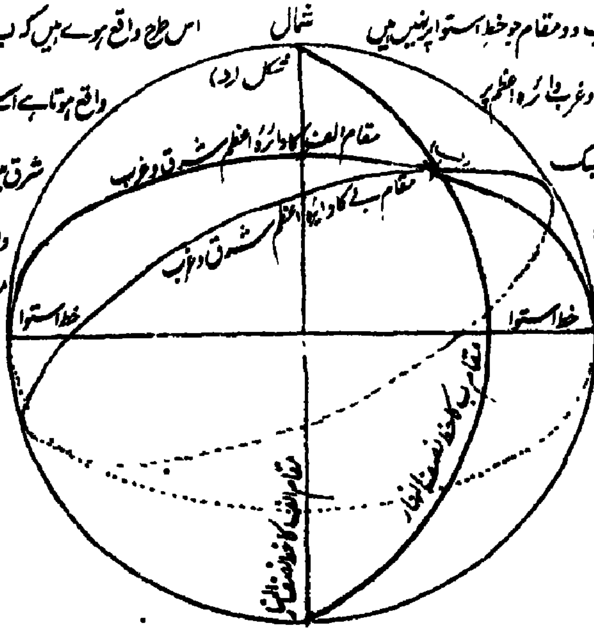


دوران سیارگان بموجب جماعت اسکندریہ جس میں زمین بیچ میں واقع ہے۔

شکل (ج)



دوران ستارگان بموجب جدید تحقیقات ہیئات سورج کے اردگرد
سیاروں کا دوران بشکل دائرہ دکھایا گیا ہے ۔ اور دمدار ستارہ کا رستہ بشکل بیضوی ہے جسکا دوسرا سرا تصویر میں نہیں آسکتا



الف اور ب دو مقام جو خطِ استوا پر نہیں ہیں اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ ب ۔ مقام الف
کے شرق وغرب دائرہ اعظم پر واقع ہوتا ہے اسلئے ب
الف کے ٹھیک شرق میں ہے لیکن
مقام ب کا شرق وغرب دائرہ اعظم مقام الف سے نہیں گزرتا

مغرب ۔ مشرق

جوتش یعنی ہیئات

علوم طبعی و فلسفہ کی طرح ہیئات بھی ہندوستان کا قدیم علم سمجھا جاتا ہے لیکن چونکہ اسی زمانہ میں دنیا کی دوسری شائستہ قوموں مثلاً بابلیوں چینیوں۔ مصریوں، اور بعد ازاں یونانیوں میں بھی اسکا چرچا پھیل گیا تھا۔ اسلئے محققین کی راے میں اختلاف ہے اور یہ نہیں پتہ چلتا کہ قدیم ہندوستان نے علم ہیئات کی تحقیق میں کس حد تک حصہ لیا۔ آجکل یہ مسئلہ زیر بحث ہے اور جس کے مباحثہ میں مختلف دلائل پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ایک زمانہ میں ہندوستان تمام علوم کا گھر تھا اور جس طرح دوسرے علوم یہاں سے نکلکر دوسرے ملکوں میں پہنچے اسی طرح یہ بھی غیر اقوام میں پہنچ گیا۔ غالباً اس راے پر ہمارے "محب وطن" جنکو دوسری قوموں کا لٹریچر دیکھنے کی فرصت نہیں ہے نہایت زور کے ساتھ تائید کریں گے۔

(۲) ہیئات معہ دیگر علوم و فنون ہندوستان میں یونانیوں سے بذریعہ فیثاغورث پہنچا۔ یورپ کے "محققین" جنکے دل میں یہ خیال جم گیا ہے کہ رنگدار اقوام میں نوعیت نہیں ہو سکتی اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے اور چونکہ وہ اپنے تمدن کو تمدن یونان کا نتیجہ دیکھتے ہیں اسلئے غیر اقوام کی خوبیوں کو بھی اسی ماخذ سے تلاش کرنے پر قدرتی طور سے مائل ہیں۔

(۳) یہ نویں صدی میں اہل عرب کے ذریعہ سے ہندوستان میں آیا اور برہمنوں

نے اُسکو صرف ہندو پوشاک پہنادی۔ اِس سے اُن "جدید محققین" کی جماعت
خوش ہوسکتی ہے۔ جو متقدمین کے تمدن پر اسلام کی اصلاحی قلم
کے اثر کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔

لیکن ہند۔ بابل۔ چین اور مصر کی قدیم کتابوں کو پڑھنے سے ظاہر ہوگا کہ ان
اقوام نے الگ الگ ستاروں اور سیاروں کے مشاہدے کئے ہیں۔ ان
تمام مذاہب کی پرانی تصانیف ظاہر کرتی ہیں کہ یہ مشاہدے حضرت عیسیٰ سے گیارہ
سو برس پہلے شروع ہوگئے تھے۔ اور چونکہ اس قدیم زمانہ میں بھی تجارتی و دیگر
اغراض کے لئے ان اقوام میں آمدورفت جاری تھی اسلئے یہ ممکن بلکہ اغلب ہے
کہ دوسری چیزوں کی طرح مال و متاع معلومات اور جنس خیالات کے تبادلے بھی
ہوتے رہتے ہونگے۔ ایک اور ثبوت ان اقوام کی جداگانہ کوششوں کا ہمارے
پاس یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے مذاق و ضرورت کے موافق ہیئات سے مختلف
عملی فائدے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ بابلی اور مصری جوتش کو زیادہ تر
تنجیم کی طرف لے گئے جس سے وہ اپنے خطرات سے بھرے ہوئے ملک میں
زمانہ آئندہ کی نامعلوم باتوں اور غیب کے حالات دریافت کرنے کی بابت معلومات
پھیلانا چاہتے تھے۔ یونانی اور دیگر بحری اقوام تجارتی اور سیاحی اغراض کی
ستاروں کے علم سے سمندری رستوں پر ہادی ہوئیں۔ لیکن ہند میں جہاں
لوگوں کی طبیعت کچھ مذہب کی طرف زیادہ مائل تھی وہ اسکے ذریعہ سے دھرم کرم
کے ٹھیک ٹھیک دن اور لگن یعنی طالع قائم کرنا اپنا مدعائے عظیم سمجھتے رہے

تاہم اُس قدیم زمانہ میں بھی جب گردش شمس و قمر کی وجہ سے موسمی تغیرات کا
اثر زراعت صحت اور انسانی بہبودی پر پڑا تو متقدمین کی توجہ تنجیم کی طرف رجوع ہوئی
جسکے کچھ کچھ آثار ہماری پرانی کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ پھلت جوتش یعنی تنجیم

کی بابت سر دست ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے لیکن اسقدر بتا دینا ضروری ہے کہ زمانۂ سلف میں بھی اسکے شوق سے علم ہیئات کی تحقیقات میں بڑی مدد کی ہوگی۔ ساتھ ہی ہمکو افسوس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اُن تمام اقوام میں جنکے ہاں گرنت جوتش یعنی ہیئات نے عجیب و غریب کرشمہ سازیاں دکھائیں بالآخر قومی زوال کے وقت لوگ پھلت جوتش یعنی تنجیم کے ذریعے شکم پُری پر آمادہ ہوگئے۔

ہندوؤں کی سب سے پرانی کتاب رگ وید میں ستاروں کے مشاہدے کی بابت نہایت کافی ثبوت پائے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں بعض بعض موسم خاص ستاروں کے نام سے منسوب کئے گئے ہیں۔ اگر اشون۔ مرگ وغیرہ اصطلاحوں کو ایک واحد پر برہم کے مختلف نام نہ تصور کرلیں (جیسے کہ آجکل بیچارے اگنی۔ اندر متر اور ورن وغیرہ سب ایک ہی بہروپئے کے مختلف سوانگ بنائے جاتے ہیں) تو وہ ضرور مختلف ستاروں کے نام ہونگے۔ آگے چل کر ہم یجر اور اتھرون وید میں بھی اسی قسم کے بہت سے حوالے پاتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آریہ رشیوں کا شوق ستاروں کے مشاہدے پر روز بروز بڑھتا گیا۔ لیکن ویدوں کے اندر تین سو ساٹھ دن یا بارہ قمری مہینے کا برس جس میں ہر پانچویں سال ایک ماہ کی ایزادی ہوجاتی تھی (لوند کا مہینا) اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس زمانہ قدیم میں بھی رشیوں کی معلومات متعلق گردش آفتاب تقریباً صحیح تھی۔

ویدوں کے زمانہ کے بعد ہند و تمدن نے مذہبی قیود کی پابندی میں ایک جنتری کی بڑی ضرورت دیکھی لہذا گرنت جوتش ویدانگ جوتش کہلانے لگا۔ اُنہوں نے آسمان کو اٹھائیس حصوں میں تقسیم کیا جن کے ذریعے وہ مختلف ظاہری گردش کرنے والی چیزوں کا مقام جنکو وہ سیارے یا گرہ کہتے تھے قائم کرسکتے تھے شروع شروع میں یہ سیارے سات مانے جاتے تھے بعدازاں ان کی تعداد نو قرار دی گئی غالباً

سب سے اول انکا ذکر تیتی تریہ ارنک میں ملتا ہے۔ قوانین منو اُن کی پرستش کی بابت بالکل خاموش ہیں جسکا حوالہ بجنا ولکیہ میں دیا گیا ہے) یہ بات قابل لحاظ ہے کہ قدیم ویدانگ جوتش میں گرہنوں کی بابت کافی واقفیت نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ اسی زمانہ کے بابلیوں نے اسپر مشاہدے کئے تھے۔ انہوں نے بجائے اٹھائیس کے بارہ برج قرار دیئے ہیں جنکو ہندو جوتش نے آخر میں اختیار کرلیا۔

علاوہ ازیں انہوں نے اپنے پرانے اٹھائیس منازل کو جو چھوٹے بڑے تھے درست کر کے ستائیس مساوی حصے بنا لئے جنکو نچھتر کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں اور کچھ زیادہ معلومات نہ ہوسکیں صرف پرانی علم پر بہت کچھ تشریح و نظرثانی کی گئی۔ البتہ گرگ آچاریہ نے اس بات پر مشاہدہ کیا کہ پرانے زمانہ کے لکھے ہوئے موسم ٹھیک انہی تواریخ پر واقع نہیں ہوتے جن پر پہلے ہوتے تھے۔ سبب یہ معلوم ہوا کہ نقطۂ اعتدال لیل و نہار ہر سال کچھ نہ کچھ تبدیل کرتا جاتا ہے۔ اگرچہ اہل ہند اسکی اصلیت کو نہیں پہنچ سکے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ایک نہایت قرین عقل تھیوری قائم کی کہ یہ نقطہ کبھی آگے بڑھتا اور کبھی پیچھے ہٹتا ہے جس سے عملی طور پر وہی نتیجہ نکلتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اہل ہند نے ایک زمانہ میں یونانی جوتش کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ان کی تحریرات سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ علم ہیئات ہندوستان میں فیثاغورث یا اسکندریہ کے ساتھیوں کے ذریعے آیا جیسا کہ بعض اہل یورپ کا خیال ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے اہل ہند کی آمدورفت تجارت و دیگر اغراض کے لئے غیر ممالک میں جاری تھی۔ اس زمانہ کے ہنود اس قدر تنگ دل و متعصب نہ تھے کہ غیر اقوام کی خوبیوں اور علوم و فنون کی قدر کرنے میں پس و پیش کرتے اسلئے انہوں نے یونانیوں کا جن کو وہ یون کہتے تھے علمی عزت کے ساتھ حوالہ دیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ اہل یونان نے بھی اپنی تحریرات میں برہمنوں کی بڑی قدر افزائی کی ہے۔ ہم

اُس زمانہ کی مشہور کتاب پنچ سدہانتیکا میں دو سدہانت ایسے بھی پاتے ہیں جو یونانیوں سے حاصل کئے گئے تھے۔ ان کا نام رومک و پولش سدہانت ہے پنچ سدہانتیکا کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس کا مصنف وراہمیر ان پانچوں کی اونچ نیچ سے پوری طور پر واقف تھا اور باوجود رومک و پولش سدہانتوں کی تعریف کے اسنے سوریہ سدہانت کو زیادہ مستند مانا ہے۔ یہ محقق چھٹی صدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ اسکی بے تعصبی سے ظاہر ہے کہ اسی نے سیاروں کے متعلق اپنی زبان کی تحریرات میں کہیں کہیں یونانی نام بھی درج کئے ہیں۔ بلکہ اسکی ایک مشہور تصنیف کا نام ہوراشاستر ہے جو محض ہورا ایک یونانی لفظ ہے۔ اسکے بعد ساتویں صدی میں برہم گپت مشہور ماہر ہیئات رہا برہم گپت کے بعد بہت سے نامی گرامی جوتشی ہند میں پیدا ہوتے رہے۔ جس میں سے آخری شخص بھاسکر اچاریہ بارہویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ آٹھویں نویں صدی میں اہل عرب نے ہندوؤں کی سنسکرت کتاب سدہانتوں کو بنام سند ہند ترجمہ کیا اور جوتش کا مطالع کیا۔ بارہویں صدی میں بھاسکر کے مرنے کے بعد اٹھارہویں صدی میں راجہ جے سنگھ ثانی کے زمانہ تک ہند میں کوئی ایسا محقق پیدا نہیں ہوا جو اس علم میں نئی بات کرتا۔ بلکہ اُس زمانہ میں ہندی جوتش کو اسلامی ہیئات سے وقتاً فوقتاً مدد ملی۔ چنانچہ کملاکر نے اپنی کتاب میں شہزادہ الغ بیگ کی معلومات کا ذکر کیا ہے ہندی شاہانِ اسلام نے چونکہ تنجیم کی سرپرستی میں کبھی زیادہ دلچسپی نہیں لی اسلئے ہیئات کو بارہویں صدی کے بعد سے ہی تنزل ہونا شروع ہوگیا۔ اٹھارہویں صدی میں جو راجہ جے سنگھ نے اپنے دارالملک جے پور نیز دلی۔ بنارس۔ متھرا اور اُجین میں بڑی بڑی رصد گاہیں تعمیر کرائیں تھیں (جو آجکل جنتر منتر کہلاتے ہیں اور جن میں سے بعض کھنڈرات حال میں مہاراجہ جے پور کی بدولت از سر نو مرمت کئے گئے ہیں) اسکی علو ہمتی اور اولوالعزمی کی شہادت دے رہی ہیں۔ لیکن اس کارِ اہم کی تکمیل میں جزرسی

پادریوں کا بڑا حصہ تھا جس کو مہاراجہ موصوف نے اپنی تصنیفات میں شکریہ کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ ان تمثیلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے جو کچھ غیر اقوام سے اخذ کیا اُسکا صاف طور سے اقبال کیا ہے۔ اِس قسم کا علمی سرقہ جیسا کہ اجکل فرنگستان میں ہو رہا ہے قدیم باشندگان ہند میں نہ تھا۔

پیشتر اسکے کہ ہم اس مضمون کو ختم کریں دو چار باتیں ہندو جوتش کی ناظرین کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اوّل۔ ہندوؤں نے تمام دیگر اقوام کی طرح سورج کو زمین کے گرد گردش کرتا ہوا مانا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُنھوں نے اپنے طریقہ حساب میں زہرہ اور عطارد وغیرہ سیاروں کو سورج کے گرد گردش کرنے والا ظاہر کیا ہے۔ جیسا کہ شکل الف میں دکھایا گیا ہے۔ اسکو شکل ب جماعت اسکندریہ اور شکل (ج) جدید ہیئات کے ساتھ مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوگا کہ ہندو اُن کی نسبت کسی قدر صحیح راستہ پر تھے۔

دوئم۔ اہل ہنود نے ماہ شمس و قمر کے تفرقہ کو مطابق کرنے کے لیے بجائے یونانیوں کی طرح اُنیس سال کے دوراں ماننے کے جس میں دو سو پینتیس ماہ قمری واقع ہوتے ہیں ادہی ماس (لوند کا مہینا) اور کشیہ ماس کا طریقہ تجویز کیا کہ جس سے کبھی ایک مہینا بڑھا دیا جاتا ہے یا گھٹا دیا جاتا ہے۔ گو اُن کو یونانی طریقہ معلوم تھا جس کا عمل رومک سدہانت میں دکھایا گیا ہے۔

سوئم۔ گو کہ زمانہ قدیم میں ہندوؤں کی لٹریچر سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ اُنھوں نے سورج گرہن کے متعلق کوئی خاص معلومات کی ہو لیکن بیچ کے زمانہ میں گرہن کی ٹھیک میعاد جاننے کا ایک نہایت آسان طریقہ ایجاد کیا جس کا عمل اسکندریہ جماعت میں مفقود تھا۔

چہارم۔ علم ہیئات کے متعلق چونکہ ہندسے اکثر کسور کی شکل میں واقع ہوتے تھے

ان کے ہٹانے کے لئے ہندوؤں نے ہندسوں کو بڑے بڑے اعداد اعظم میں ضرب دے کر اعداد صحیح بنا لئے۔ علاوہ ازیں انہوں نے زمانہ کو چار بڑے بڑے فرضی حصوں یعنی کلیگ۔ دواپر۔ تریتا اور ست یگ ہیں تقسیم کیا ہے۔ جن چاروں کے مجموعہ کو مہایگ کہتے ہیں۔ ان کی عمر مختلف مصنفوں نے اپنے حساب سے مختلف تعداد پر رکھی ہے۔ لیکن سبھوں نے اس بات کو مدنظر رکھا ہے کہ مہایگ کے آغاز میں حساب کی رو سے شمس و قمر و دیگر سیارگان سب ایک ہی برج میں واقع ہوں اور جن لوگوں کی تشفی مہایگ سے بھی نہیں ہوئی انہوں نے ہزار مہایگ کی برابر ایک کلپ مانا ہے اور وہ اپنا حساب ابتدائے کلپ سے ہی شروع کرتے تھے

پنجم۔ ہندو مصنفوں کی کتابوں کو بغور دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض بعض زمین کو نہ صرف مدور قیاس کرتے تھے بلکہ اسکی بابت صحیح واقفیت رکھتے تھے اور اُسکے لئے بہت معقول ثبوت بھی پیش کئے گئے ہیں۔ چنانچہ آریہ بھٹ نے کرۂ ارض کا اپنی دُھرے پر روزانہ گردش کے ذریعہ ستاروں کی ظاہری گردش کا بیان کیا ہے۔ سورج سدھانت کے ایک اشلوک میں یونی ورسل گریوی ٹیشن یعنی عالمگیر کشش کا بھی حوالہ ملتا ہے لیکن یہ بات ثابت نہیں ہوئی ہے کہ آیا مصنف کو اس بات کا علم محقق تھا یا محض شاعرانہ خیال تھا۔

ششم۔ البتہ ہندوؤں کے پاس آجکل کے زمانہ کی طرح تفتیش آلات مشاہدہ نہ تھے وہ خالی آنکھ کے مشاہدے اور ریاضی کے استدلال سے عجیب و غریب نتائج پر پہنچے۔

مثلاً۔ اگر مقام الف مقام ب کے ٹھیک شرق میں ہے تو یہ لازمی نہیں کہ مقام ب مقام الف کے ٹھیک غرب میں ہو۔ یہ بات آجتک کسی اور کو نہ سوجھی جو شکل (د) پر غور کرنے سے ظاہر ہوگی۔

ہفتم - ہندوؤں نے جوتش کی کتابوں کے لکھنے میں بھی وہی مختصر طریقہ اختیار کیا جو اور علوم کی بابت کیا گیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آسانی سے یاد رکھے جاسکیں - لہذا مختلف مضامین یا تو اشلوک یعنی اشعار میں لکھے جاتے تھے یا سُوتر یعنی مختصر الفاظ میں قصر کے طریقے پر بیان کئے جاتے تھے - لیکن چونکہ علم ہیئات کے بیان میں بہت سے اعداد آتے ہیں جنکو اشلوکوں میں لانا بہت مشکل ہے اسلئے اُنہوں نے اعداد کو الگ الگ ہندسوں سے ظاہر کیا - ہندسوں کی بابت بھی ایک اور سہولیت یہ پیدا کی کہ بجائے ان کو ایک - دو - تین - چار وغیرہ نام سے منسوب کرنے کے اُنہوں نے چند چیزوں کے نام سے مثلاً ہندسہ ۴ کو لفظ وید سے (چونکہ وید چار ہوتے ہیں) ظاہر کیا - اسی طرح سے کوئی اور لفظ جس کے معنے اگر وید ہو تو وہ بھی چار ظاہر کرے گا - لیکن اس طریقے کی تحریرات میں بعض دفعہ مطلب خبط رہتا ہے اور مدت تک بعض کتابیں بے معنی سمجھی گئیں - اس معاملہ میں ہمارا ملک ڈاکٹر تھیبو صاحب کا بہت مشکور ہے کہ جنہوں نے بعض اشعار کے معنے نکال کر سمجھنے کے قابل بنا دیا - انکے بعد ہمارے شہر کے جناب رائے چھوٹے لال صاحب ایگزیکٹو انجنیر نے بھی کتاب جوتش ویدانگ کی تشریح کی جو کہ یورپ اور ہندوستان میں نہایت عزت کے ساتھ دیکھی گئی -

بی - کے - مترا

قصیدہ سالِ نو

آتے ہی سالِ نو کے چلی وہ ہوائے عیش — چٹکی کوئی کلی بھی تو آئی صدائے عیش
اپنی یہی دعا ہے بس اب اے خدائے عیش — پھولے پھلے یہ موسمِ نشو و نمائے عیش
غنچے دلوں کے کھل گئے فرطِ نشاط سے — ہے کس بہار پر چمنِ دلکشائے عیش
ہے ہر دلِ شکستہ میں شکل انبساط کی — ٹوٹا سا آئینہ بھی ہے صورت نمائے عیش
گردش سے اپنی تھم کے یہ کہتا ہے آسماں — ہمنے بھی آج بیٹھکے کیا کیا اُٹھائے عیش
آمد سے سالِ نو کی زمانہ بدل گیا۔ — ہے آج مفلسوں کے بھی تن پر قبائے عیش
برقع اُلٹ دیا ہے عروسِ بہار نے — باغِ جہاں میں کیوں نہ ہر اک گُل منائے عیش
جوشِ طرب سے روح کو بالیدگی ہوئی — زوروں پہ ہے یہ قوتِ نشو و نمائے عیش
ہے سنہ یہ گیارہ اسمیں جو ظاہر ہیں دو الف — کرتے ہیں یہ اشارہ کہ ہاں آئے آئے عیش
ہو جائے ہمسے دور مرض یہ نفاق کا — ملکر ہوں دو جو ایک وہ نسخہ بتائے عیش
ہو اتفاق ہند میں قوموں میں اتحاد — دیر و حرم کا ایک ہی رستہ دکھائے عیش
شیر و شکر ہوں ملکے۔ رہیں چھپے سدا — وہ عید ہو گلے سے ہر اک کو لگائے عیش
کیا کیا گزشتہ سال نے محشر بپا کیے — وہ رنج و غم سبھوں کے دلوں سے مٹائے عیش
اڑنے نہ پائے طائرِ رنگِ حنا کی طرح — وہ رنگ آکے اب تو دلوں میں جمائے عیش
ہے گنبدِ فلک میں خوشی وہ بھری ہوئی — آوازِ بازگشت میں بھی ہے صدائے عیش
زاہد بھی اسکے واسطے اب لوٹ پوٹ ہیں — کب ایسی دلفریب تھی پہلے ادائے عیش

گلہائے انبساط کا یہ رنگ دیکھکر — دل چاہتا ہے اب کوئی مژدہ سنائے عیش
شکر خدا کہ دل میں یہ آیا ہی تھا خیال — ناگاہ میرے کان میں آئی صدائے عیش
وہ دیکھ اُسکی تخت نشینی کی دہوم ہے — جنت سے بڑھکے جسکی ہے دولت سرائے عیش
وہ کون یعنے شاہ و شہنشاہِ انڈیا — سایہ فگن ہے جسپہ سدا سے ہمائے عیش
یعنی وہ جارج پنجم و فرمانروائے دہر — ڈالی ہے جسنے ہند میں آکر بنائے عیش
اُسکے قدم کے فیض سے قسمت چمک اُٹھی — ہر دل کے آئینہ پہ ہوئی ہے جلائے عیش
سُنتے ہیں پھر دوبارہ وہ تشریف لائیگا — دیکھیں گے اُسکے عہد میں ہم انتہائے عیش
یارب پھر اُسکا شربتِ دیدار ہو نصیب — جلوہ کو اُسکے قند مکرر بنائے عیش
ہوجائیں مست دیکھکے پھر وہ نگاہِ مست — آنکھوں کو ساغرِ مے لندن پلائے عیش
اب گھر میں چلتی ہے کشتی فقیر کی — بحرِ سخا نے اُسکے کچھ ایسے بہائے عیش
مٹی کے مول بکتی ہے لو اب جہان میں — سستی ہے اُسکے عہد میں یہ کیمیائے عیش
خلعت عطا ہوئے وہ ستارے بھرے ہوئے — اوڑھے ہوئے ہے لیلیٰ شب بھی ردائے عیش
ہے زیبِ فرقِ پاک عجب تاجِ شاندار — جسمیں لگا ہوا ہے گُلِ خوشنمائے عیش
واصفؔ کی یہ دُعا ہے کہ جب تک زمانہ میں — یارب ہو حرفِ عین سے کے ما بعد یائے عیش
بن کر شبِ وصال کٹے اُسکی ہر گھڑی — آنے نہ پائے رنج تو جانے نہ پائے عیش
ہو اُسکے دوستوں کا سدا آکے دستگیر — اور دشمنوں کے ہاتھ سے دامن بچائے عیش

افزوں ہو عمر و دولت و اقبال و عز و جاہ
ہو عیش اُسکے واسطے وہ ہو برائے عیش

واصف اکبرآبادی

موجودہ طریقۂ تعلیم

جو مضمون نومبر سنہ ء کے پرچہ میں شایع ہو چکا ہے اُس میں سرسری طور پر تعلیم کی ضرورت اور موجودہ حالت کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ ہمارا منشا یہ ہے کہ بالعموم ہندوستان کے تعلیمی مسائل میں دلچسپی رکھنے والے اور اُن پر غور کرنے والے تمام اصحاب اور بالخصوص جو اشخاص اسوقت تعلیمی کام میں مصروف ہیں اُن کی توجہ کے لئے وہ نقائص اور فروگزاشتیں مُشرح اور مفصل بیان کی جائیں جو موجودہ طریقۂ تعلیم میں پائی جاتی ہیں اور جن کے جلد دور بلکہ معدوم کرنے کی طرف فوراً توجہ کرنی ضروری ہے۔ تاکہ تعلیم کی وسعت اور افزونی کے ساتھ ساتھ تعلیم کی نوعیت میں بھی بہتری و اصلاح ہو۔ اس میں مطلق شک نہیں کہ یہ اصلاح بھی اعلےٰ تعلیم کے زیادہ پھیلنے اور اعلےٰ درجہ کے مُدرسوں کی تعداد زیادہ ہونے پر منحصر ہے اور اس لئے رفتہ رفتہ ہی ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہمارے مُدرسوں میں زیادہ تر تعداد اُن مُدرسان کی ہے جنھوں نے پُرانے طرز کی تعلیم حاصل کی ہے اور جو جدید آراسے خیالات اصولوں اور طریقوں سے محض ناواقف ہیں۔ السنۂ مشرقی کے تقریباً تمام مدرس اُسی زمرے میں شامل ہیں۔ اور مدرسوں میں بھی اکثر اِن کی تعلیم کا طرز اسوقت بھی مکتب یا پاٹ شالاؤں کے طرز سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے۔ ابھی تک نارمل سکولوں یا ٹریننگ کالج کے پاس شدہ و ڈگری یافتہ مدرس بہت کم ہیں۔ بعض پُرانے مدرس ایک عرصہ سے صیغۂ تعلیم میں ملازم ہونے کے سبب سند یافتہ تو ضرور ہیں لیکن ان مدرسان کو بھی جدید ترین طریقوں اور اصولوں کی کی واقفیت نہیں ہوتی۔ جو سند یا ڈگری یافتہ ہیں وہ پُرانے طرز کے نقائص اور عیوب سے جبتر ہیں اور بہت لایق تو ضرور ہوتے ہیں لیکن مختلف اسباب سے تعلیم کے بعض ضروری

پہلوؤں پر وہ بھی کافی توجہ نہیں کر سکتے یا کرتے۔ پس موجودہ انتظام کے علاوہ یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ لیکچروں و ارزاں تعلیمی رسالوں اور ٹیچرز ایسوسی ایشن وغیرہ کے ذریعے جدید ترین طریقوں اور اصولوں کی واقفیت پھیلائی جائے اور نہ صرف مدرسان و معلمان بلکہ عوام میں بھی۔ عوام میں اس قسم کی واقفیت پھیلانے سے یہ مفید نتیجہ ہوگا کہ جو دقتیں اور مشکلیں اسوقت مدرسان کو اپنے شاگردوں کے والدین و سرپرستوں کی کمی ہمدردی یا اختلاف خیالات اور ناواقفیت سے پیش آتے ہیں وہ اگر بالکل مفقود نہیں تو کم ضرور ہو جائینگی۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرپرست اور والدین خود بھی گھروں پر اُن امور کا خیال کر سکیں گے اور اس طرح لائق مدرسوں کی اعلیٰ کوششوں کی تائید ہوگی اور اُن میں مدد ملے گی۔

راقم کو عرصہ ۱۰ سال سے دہلی کے دو ہائی سکولوں کے تعلیمی کام میں ہمہ تن مصروف ہونے کا موقعہ ملا ہے اور اسی لئے اس تجربے اور عام واقفیت کی بنیاد پر جو نقص موجودہ طریقہ تعلیم میں ہیں ان میں سے چند کی طرف ذیل میں ناظرین زبان کی توجہ منعطف کیجاتی ہے۔ اِن نقائص یا فروگزاشتوں کے بیان کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ موجودہ تعلیم بے سود یا بے نتیجہ ہے جیسا کہ بعض اصحاب کا خیال ہے بلکہ صرف یہ کہ جو کمی ہے وہ پوری ہو جو نقص ہیں وہ دور ہوں اور جن اصلاحوں کی اشد ضرورت ہے وہ جلد اور جوش سے عمل میں آئیں۔

(۱) اصول تعلیم سے جو اصحاب واقف ہیں اُن پر بخوبی روشن ہے کہ تعلیم کا ایک بڑا اہم مقصد و مدعا انسان کی زندگی کو کامیاب بنانا ہے۔ لفظ "کامیابی" دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ عام طور پر بعض اشخاص صرف دولتمند یا عالم ہونے کو مدعا و معراج زندگی قرار دیتے ہیں اور اسی کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ بعض اعلےٰ درجہ یا حیثیت حاصل کرنے سے نہایت خوش ہوتے ہیں۔ بعض جسمانی طاقت اور نشو و نما کو زندگی کا مدعا بنا کر اسی میں سرتاپا محو

ہو جاتے ہیں۔ بعض اور اصحاب حصول لذائذ نفسانی اور ادنیٰ خوشیوں و سیر تماشوں میں ہی اس طرح زندگیاں صرف کر دیتے ہیں گویا خالق ارض و سما نے انہیں یہ قالب انسانی اسی لئے عطا فرمایا تھا۔

الغرض ہر شخص اپنا اپنا خبط رکھتا ہے اور جدا جدا دھن میں لگا رہتا ہے۔ لیکن کیا کسی ایک ایسے مدعا کے حصول سے انسانی زندگی کامیاب کہلا سکتی ہے اور یہ اصول ختم تکمیل ہو سکتا ہے؟ کیا حیات انسانی کو اعلےٰ اور وسیلے و صحیح معنوں میں کامیاب کہہ سکنے کے لئے ایسا محدود دائرۂ خیال کافی و ٹھیک ہے؟ کیا صرف ایک سمت یا جز کی ترقی مکمل ترقی کہلا سکتی ہے؟ کیا صرف دولتمند یا عالم شخص یا ایک پہلوان درحقیقت مکمل انسان کہلا سکتا ہے

اصول تعلیم پر جن گہرے سوچنے والوں اور اعلےٰ مصنفوں نے جدید ترین تصانیف لکھی ہیں وہ سب اس نتیجہ پر متفق ہیں کہ مکمل انسان بنانے کے لئے اور مکمل انسان کے صحیح معنوں میں اعلےٰ ترین ترقی کرنے اور کامیاب ہونے کے لئے روح جسم اور دماغ تینوں کا نشو و نما از بس ضروری بلکہ لازمی شرط ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے اور یہ تسلیم کر کے اس اصول کے معیار سے موجودہ طریقۂ تعلیم کے نتائج کی جانچ پڑتال کیجائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آجکل تعلیم صرف اس کا نام رکھا گیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح امتحانات مقررہ پاس کر لئے جائیں اور تعلیم کا کام صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ حصول ملازمت و معاش کا وسیلہ ہو۔ مذہبی تعلیم۔ روحانی اصلاح اور اخلاقی ترقی کا چرچا خاص اسباب سے بعض ایام میں یا بعض دائروں اور طبقوں میں سننے میں تو ضرور آتا ہے لیکن مذہبی تعلیم یا دھرم شکشا، صرف اُن مدارس میں دیجاتی ہے جو کسی سماج وغیرہ کے متعلق ہیں یا مشنری مدارس اور کالجوں میں اور وہ بھی عموماً برائے نام اور بالکل غیر کافی اور بے قاعدہ اور خراب طریقہ پر۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جن پر ہم جداگانہ مذہبی تعلیم کے مضمون کے ذیل میں بحث کرینگے۔ رہی اخلاقی ترقی اور روحانی اصلاح۔ اس کا نہ کوئی خاص انتظام ہوتا ہے

نہ اس طرف خاص باقاعدہ توجہ ہوتی ہے نہ مسلسل و مستقل کوشش۔ اس کے کئی سبب ہوتے ہیں جن کا نہایت اختصار کے ساتھ اس جگہ ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) عموماً مدرسان خود اعلےٰ خیالات اور اصول والے نہیں ہوتے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ نوجوان طلبار پر بہ نسبت کتابی تعلیم یا زبانی تدریس کے زندہ نمونے کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مثلاً صرف ٹمپرنس کے اہم مسئلہ کے لحاظ سے دیکھا جاوے تو کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ خاص صیغۂ تعلیم کے اعلےٰ و ادنیٰ مدرسان کے لئے کوئی قید یا پابندی پرہیزگار ہونے کی نہیں کی جاتی۔ گو ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ مدرسان اوقات تعلیم میں تعلیم گاہ ہونگے اندر حالت نشہ میں طلبار کے روبرو ہوں لیکن طلبار پر صرف اس امر کا بھی کیسا مذموم اثر پڑنا لازمی ہے کہ اُنھیں اپنے مدرسان کا پرہیزگار نہ ہونا معلوم ہو۔

(۲) مدرسان کو خود طلبار کے اخلاق کی زیادہ پروا نہیں ہوتی گو اس بارے میں سب بے پروائی اور بے توجہی کو تسلیم کرنے کے لئے بہت کم تیار ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بہت سے ایسے مدارس موجود ہونے کے جن میں مذہبی تعلیم دیجاتی ہے بہت کم نوجوانوں کی زندگیاں فی الواقع دیارنک اور اعلےٰ درجہ کی نیک ہوتی ہیں۔

(۳) مدارس میں جو کچھ کوشش یا توجہ ہوتی بھی ہے اُسکی تائید گھروں میں والدین اور اور سرپرستوں کی طرف سے بالکل نہیں ہوتی بلکہ اکثر اُسکے مخالف اثر پڑتے ہیں جو مدرسوں اور معلموں کے عمدہ اثروں کے منافی ہوتے ہیں۔ ہم صرف دو مثالیں دیتے ہیں۔ بہت والدین اپنے لڑکوں کو جب رخصت دلانی چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ رخصت لینے کی صحیح وجہ مدرسوں کے نزدیک کافی نہیں ہوگی اور وہ رخصت نہ دیں گے تو بیماری وغیرہ کا خلاف واقعہ سبب لکھوا دیتے ہیں۔ گویا اُن کو خود دروغ گوئی سکھاتے ہیں۔ مدرسوں میں باقاعدہ حاضری پر بہت زور دیا جاتا ہے اور واجبی بھی ہے مگر بسا اوقات والدین یا سرپرست اس باقاعدگی کی ضرورت کو نہ سمجھکر بہت خفیف اور جزوی بلکہ غیر ضروری وجوہات سے اپنے لڑکوں

کو خود مدرسے جانے سے روکتے ہیں۔ بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ طلبا، جانا چاہتے ہیں اور والدین باصرار مانع ہوتے ہیں۔

(۴) اردگرد دنیا میں اخلاقی اور با اصول زندگی کے نمونے شاذونادر ہوتے ہیں اور اسکے برعکس بہت زیادہ اور جو تعلیم زمانۂ طالبعلمی میں حاصل کرتے ہیں اور جو اخلاقی سبق سیکھتے ہیں اُنپر عمل کرنے میں سخت دقتیں اور مشکلیں پیش آتی ہیں۔

(۵) زمانۂ طالب علمی میں بھی اسپر کافی زور نہیں دیا جاتا نہ نیک طلبار کو خاص جرأت دلائی جاتی ہے نہ کوئی خاص قدر و حوصلہ افزائی ہوتی ہے گو مستثنیات ضرور ہیں۔

(۶) مختلف اسباب سے جن میں خود مدرسان کی اخلاقی جرأت کی کمی۔ والدین یا سرپرستوں کی ناراضگی کا اندیشہ۔ ذمہ داری کا خیال اور ہر دلعزیزی و مدرسہ کی شہرت میں فرق آنے کا احتمال شامل ہیں خراب چال چلن والے لڑکوں کا اول تو مدرسان کو حال ہی نہیں معلوم ہوتا اور وہ اوقات مدرسہ کے علاوہ اپنے آپ کو انکا ذمہ دار ہی نہیں سمجھتے نہ والدین ہی اُن کو دخل اندازی کا مجاز سمجھتے ہیں اور اگر گاہے گاہے علم ہو بھی جاتا ہے تو اُن کا تدارک و انسداد نہیں ہوتا مثلاً امیدواران امتحان انٹرنس کے داخلۂ امتحان کے مطبوعہ فارم پر ہر ہیڈ ماسٹران کو دستخط کرنے ہوتے ہیں کہ طالب علم ہذا نیک چال چلن ہے یا اچھی خصلت رکھتا ہے۔ ہم جرأت کے ساتھ دریافت کرتے ہیں کہ کتنے ہیڈ ماسٹران فارموں پر کامل آزادی اور دیانتداری سے اور طلبار کے چال چلن کی بابت خاص طور پر تحقیق کرکے دستخط کرتے ہیں یا صریح چشم پوشی نہیں کرتے اور کتنی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی پرائیویٹ امیدوار یا طالبعلم کی فارم پر دستخط کرنے سے صرف اس بنا پر انکار کیا جاتا ہے کہ اُس کا چال چلن اچھا نہیں ہے یا اُس کی شہرت خراب ہے۔ اسی زمرہ میں جس بے پروائی اور جلدبازی سے سارٹیفکٹ دینے کا رواج ہے اور جس طرح سے اندھادھند تعریفوں کے طومار باندھے جاتے ہیں وہ بھی نہایت قابل اعتراض ہے۔ اور نیک و بد کا امتیاز نہ ہونے میں بڑی سدّ راہ ہے۔

اسی طرح مدرسوں میں نیک اور بد طلبا کا یکجا ہونا اور ایک دوسرے سے بلا روک ٹوک ملنا بھی موجودہ سسٹم (انتظام) کا ایک بڑا نقص اور شاید لاعلاج نقص ہے۔

اُس کل حالت کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اخلاقی لحاظ سے ہمارے نوجوانوں کی تربیت بہت ناکمل و ناقص رہتی ہے اور اُنکا کریکٹر (خصلت) نشوونما نہیں پاتا۔ بلکہ اکثر ناگفتہ بہ خرابیاں دیکھنے میں آتی ہیں کیریکٹر سے ہی عموماً بہت محدود مراد لیجاتی ہے اور صرف چند خاص عادات مثل ادب۔ اطاعت۔ خاموشی۔ پابندی وقت کا نام کریکٹر کہا جاتا ہے۔ ہم آیندہ اس سلسلہ کے کسی مضمون میں مفصل بیان کریں گے کہ آج کل ہمارے اعلے ڈگری یافتوں اور کالجوں کے تعلیم یافتوں کے کریکٹر میں کیا کمی اور نقص رہجاتے ہیں۔ (باقی آیندہ)

امیر چند

آزادی فروش

بُدھ رام نامی ایک مفلس نوجوان - کسی سوداگر کے پاس کلرکی پر نوکر تھا - صبح ہی اپنے ضروری کام سے فارغ ہو - دفتر چلا جاتا اور شام تک کاغذ کالے کیا کرتا - مگر بیچارے کلرکوں کی قسمت کچھ ایسی بدنصیب قسمت ہوتی ہے کہ خواہ کتنا ہی دل لگا کر اور ہوشیاری سے کام کریں - مالک اور افسروں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا - بدھ رام اپنی طرف سے کام میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑتا تو بھی اسکا مالک ہمیشہ ناخوش ہوتا رہتا (بدھ رام کا سر معمول سے ذرا بڑا تھا) اس لئے مالک ہمیشہ یہی طعنہ دیا کرتا تھا - تیرے اتنے بڑے دماغ میں معلوم ہوتا ہے کہ گوبر بھر رہا ہے - پہلے اپنے اس بیکار دماغ کا علاج کر پھر نوکری کر - اور ایکدن تو یہانتک بگڑے کہ بدھ رام کی تنخواہ کا حساب کر کے کہدیا - کل سے نہ آنا -

بُدھ رام بیچارہ عام کلرکوں کی طرح اتنا غریب تھا کہ بغیر نوکری کے ایک ہفتہ کا گذارا بھی مشکل تھا - رات تو جوں توں گزاری لیکن صبح اس خیال سے کہ شاید میرے دماغ میں دراصل کچھ خرابی ہو - چلو کسی ڈاکٹر سے ملیں - بات ٹھیک نکلے تو دوا دارو کی فکر کی جائے - یہ سوچ کر وہ ایک ڈاکٹر کے پاس گیا جن کا نام ڈاکٹر گھوش تھا اور جو دماغی حالات سمجھنے میں ایک مشہور آدمی خیال کئے جاتے تھے مگر تھے پرلے درجے کے خود غرض -

ڈاکٹر گھوش اپنے معمول کے موافق مطب میں بیٹھے تھے کہ بدھ رام داخل ہوا - مگر کمرا کھولتے وقت بدھ رام نے کواڑوں کو ایسی بے احتیاطی اور زور سے دھکا دیا کہ دروازے کے اوپر جو پرانے فیشن کا ایک گرز نمائش کے طور پر لٹک رہا تھا اس کے سر پر آ پڑا - لیکن نہ معلوم گرز ہی کسی خاص پہلو سے گرا - یا بدھ رام کا سر ہی اس بلا کا بنا ہوا تھا

کہ اتنا بھاری گرز اُس کے سر پر گرا مگر خون تک نہ نکلا۔ سر کی اس بے مثال مضبوطی کو دیکھکر ڈاکٹر صاحب کو بڑا تعجب ہوا اور سوچنے لگے۔ اگر یہ سر ہاتھ آجائے تو بڑا کام ہو۔

جب بُدھ رام کرسی پر بیٹھکر اپنا حال سُنا چکا تو ڈاکٹر صاحب نے اُسکے سر کو بڑے غور سے ملاحظہ فرمایا اور کہا۔ کیوں بھئی اپنا سر بیچتے ہو۔

بُدھ رام کو خیال بھی نہ تھا کہ اسکے سر کی کچھ قیمت ہو سکتی ہے اور یہ کام کی چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس سوال پر وہ بڑا حیران ہوا اور اُس نے تعجب سے دریافت کیا۔ کیا میرا سر اس قابل ہے کہ تم اسکے لئے روپیہ خرچ کرنے کو تیار ہو۔

ڈاکٹر۔ ہاں میں بالکل تیار ہوں۔

بُدھ رام۔ لیکن جناب جب میں ہی نہ رہا تو روپیہ میرے کس کام آئے گا۔

ڈاکٹر۔ تم روپیہ اپنے کام میں لاؤ۔ اور اپنا سر اپنے ہی پاس رہنے دو۔

بُدھ رام۔ کب تک۔

ڈاکٹر۔ جب تک تمہیں اسکی ضرورت ہو۔ تمہارے مرنے پر یہ سر مجھے مل جانا چاہئے اس وقت میں یہ دیکھونگا کہ اس سر کی غیر معمولی مضبوطی کی کیا وجہ ہے۔ میرے اس تجربے کی وجہ سے فن طبابت اور جراحی کو مدد ملے گی۔

بُدھ رام۔ لیکن اگر تم میرے سے پہلے ہی مرجاؤ۔ تو

ڈاکٹر۔ کچھ پرواہ نہیں۔ اگر میں پہلے مرگیا تو سر میری وصیت کے موافق میرے ایک دوست کو ملجائے گا۔

بُدھ رام۔ کیا دوگے۔

ڈاکٹر۔ پچاس اشرفی۔

بُدھ رام۔ نقدا نقد۔

ڈاکٹر۔ نقد تو میں نہیں دے سکتا۔ پانچ اشرفی فی ہفتے دیتا رہونگا اور ایک مہینے کی

اشرفیاں پیشگی دیدونگا۔تمہارا علاج بھی مفت کردیا کرونگا۔

بدھ رام۔اچھا تو اشرفیاں لائیے۔

ڈاکٹر صاحب نے اُسی وقت مہینے بھر کی بیس اشرفیاں بدھ رام کے حوالہ کردیں اور اگریمنٹ دستخط کرکے رکھ لیا۔

تھوڑے دن بعد کا ذکر ہے کہ بدھ رام ایکدن کہیں جارہا تھا اور ایک ایسے مکان کے نیچے سے گزر رہا تھا جس کی مرمت ہو رہی تھی۔کاریگر پاڑ پر بیٹھے کام کررہے تھے کہ سامنے سے ڈاکٹر صاحب آگئے اور غصے سے بدھ رام کا ہاتھ پکڑکر کہا تم میرے سر کی طرف سے بڑے بے پرواہ معلوم ہوتے ہو۔تمہیں دوسرے کی چیز کا درد نہیں۔ابھی کوئی پتھر اُوپر سے آپڑتا اور سر کا نقصان ہوجاتا تو میں تمہارا کیا کرلیتا۔

بدھ رام کو غصہ تو بہت آیا لیکن مجبور چپ ہو رہا۔

ایکدفعہ بدھ رام معہ اپنے چند دوستوں کے کشتی میں بیٹھکر دریائی سیر کے ارادے سے دریا کے کنارہ گیا۔جب وہ کشتی میں بیٹھنے لگا تو کسی نے پیچھے سے اسکا ہاتھ پکڑکر روک لیا دیکھا تو ڈاکٹر گھوش چپ۔

بدھ رام کے دوستوں نے حیران ہوکر ڈاکٹر سے دریافت کیا۔کیوں جناب آپنے بدھ رام کو کیوں روک رکھا ہے۔بیٹھنے کیوں نہیں دیتے۔

ڈاکٹر نے کہا۔جناب میں ہرگز انہیں پانی کی سیر کو نہ جانے دونگا۔(بدھ رام کے سر کی طرف اشارہ کرکے) یہ میری ملکیت ہے۔میں نے ان پر اعتماد کرکے اپنا مال ان کے پاس چھوڑ رکھا تھا۔بغیر کسی کرایہ کے اپنی چیز مفت استعمال کرنے کے لئے دے رکھی تھی۔مگر پرائی چیز کا کسی کو درد نہیں ہوا۔اب آپ ہی بتلائیے اگر کشتی الٹ جائے اور بدھ رام کہیں سمندر میں ڈوب جائے تو میری ساری اُمید اور کری کرائی سب خاک میں مل جائے اسکا کیا بگڑے۔یہ کہکر اُسنے بدھ رام کو زبردستی گھسیٹ لیا۔

بُدھ رام بیچارے سے سوائے چُپ رہنے کے کچھ بن نہ آیا۔ لیکن اُس گھڑی کو یاد کرکے پچھتا رہا تھا جب اُس نے تھوڑی سی لالچ میں آکر اپنی آزادی ڈاکٹر کے ہاتھ بیچ ڈالی تھی۔ خدا کسی کو کسی کا تابع نہ کرے۔ آزادی کی روکھی سوکھی بھی غلامی کی تربتر سے اچھی ہے

بُدھ رام بیچارہ بہتیرا دیکھ بھال کے نکلتا لیکن پھر بھی ڈاکٹر کہیں مل ہی جاتا۔ ایک روز اُسے ایک شخص سے ملنے جانا تھا۔ دن میں تو ڈاکٹر کے خوف سے نکلا نہیں۔ دن چھپے گھر سے باہر نکلا۔ اول تو شام کا اندھیرا۔ اُس پر کُہر برس رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے ملنے کا خیال بھی نہ تھا۔ مگر معلوم ڈاکٹر نجوم پڑھے تھے یا اُن کی روح ہر وقت بدھ رام کے ہی گرد چکر لگایا کرتی تھی۔ بُدھ رام ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب مل گئے۔ بُدھ رام کو دیکھتے ہی ڈاکٹر کے غصے کا پارہ ایکدم چڑھ گیا۔ غصے سے چلا کر کہا بُدھ رام لاؤ میرا سر دیدو۔ کیونکہ اب تم پر بھروسہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں ذرا بھی خیال نہ آیا کہ اس کُہر میں نکلنے سے زکام ہوگا۔ اندھیرے میں کہیں ٹکر لگ کے گر پڑے تو سر خراب ہو جائے گا۔ کسی غریب کا نقصان ہوگا۔ تم بڑے بیدرد ہو۔ جاؤ ابھی گھر واپس جاؤ۔ ورنہ سر ابھی وقت دیدو۔ بُدھ رام ناچار گھر واپس پھر آیا۔

اب بُدھ رام یا تو بالکل گھر سے نہ نکلتا۔ یا بڑی ہوشیاری سے پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا۔ اپنے سایہ سے بھی ڈرتا ہوا۔ بازار کے بیچوں بیچ ہو کر چلتا پھر بھی یہی ڈر رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو ڈاکٹر صاحب آجائیں اور خفا ہوں کہ سڑک کے بیچ میں کیوں چلتا ہے۔ کسی گاڑی سے کچلا گیا تو میں کیا کرونگا۔

غرض ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں بُدھ رام کی جان بڑی مشکل میں تھی۔ تھوڑی سی لالچ نے بُدھ رام کا جینا دوبھر کر دیا۔ بہتیری عقل لڑائی کہ کسی طرح اس مصیبت سے چھٹکارا ہو مگر کوئی تدبیر پوری نہ اُترتی تھی۔ ڈر کے مارے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کو کہاں چین آتا تھا۔ ایک روز آپ نے اپنا آدمی بھیجکر بُدھ رام کو اپنے گھر بلوایا۔ ناچار بُدھ رام ساتھ ہولیا جس وقت بُدھ رام ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچا اور مطب کے کمرے میں کرسی پر بیٹھ چکا تو ڈاکٹر صاحب نے

دو شخصوں کی طرف اشارہ کر کے بدھ رام سے کہا۔

بدھ رام یہ دونوں جنٹلمین یورپ کے مشہور ڈاکٹر مسٹر جمیس اور مسٹر فرنیک ہیں ان کو میں نے تمہارے سر کی بابت لکھا تھا اور اب یہ دونوں خود تمہارے سر کو دیکھنے آئے ہیں۔ یہ کہکر ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی سے اٹھے اور بغیر کچھ کہے سنے یا معافی مانگے بدھ رام کی ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھدی اور پھر میز پر سے ایک مضبوط سی چینی کی رکابی اٹھا کر اس زور سے بدھ رام کے سر پر ماری کہ رکابی کے ٹکڑے ہو گئے۔

بدھ رام کا سر گو لاکھ مضبوط تھا۔ مگر تھا تو گوشت اور ہڈی کا ہی۔ رکابی کی چوٹ سے اسکا سر جھنا گیا اور اسنے غصے ہو کر ڈاکٹر سے کہا۔

آپ بالکل بے رحم ہیں۔ آپ کو کسی کی تکلیف کی ذرا پروا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہنسکر کہا۔ میں نے یہ بات صرف اس لئے کی ہے کہ اپنے فاضل دوستوں کو یہ دکھاؤں کہ میں نے اتنی بڑی رقم دیکر خراب سودا نہیں کیا ہے اور اس سر کی بدولت علم طب کو آیندہ کیسا فائدہ پہنچے گا۔ یہ کہکر اسنے ایک الماری کھولی جس میں مختلف انسانی کھوپڑیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ الماری کے ایک خانے میں ایک خالی جگہہ تھی اس کی طرف اشارہ کر کے ڈاکٹر نے دوسرے دوسروں سے مخاطب ہو کر کہا۔ یہ جگہہ میں نے خاصکر اس سر کے لئے رکھچھوڑی ہے۔ ایک چھری اٹھا کر۔ یہ چھری اس سر کے کاٹنے کا کام دے گی۔ اور میں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ سر کہاں سے اور کیونکر کاٹا جاوے گا۔ یہ کہکر ڈاکٹر صاحب چھری لیکر بدھ رام کی طرف بڑھے۔ چھری ہاتھ میں لئے ڈاکٹر کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھکر اول تو بدھ رام دو قدم پیچھے کو ہٹا لیکن پھر ایکدم آگے بڑھکر چھری ڈاکٹر کے ہاتھ سے چھین لی۔ چھری زمین پر پھینک۔ ڈاکٹر صاحب کو کمر پکڑ کر اٹھا لیا اور اس زور سے زمین پر دے مارا کہ ڈاکٹر صاحب کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ پھر جھٹ کواڑ کھول بدھ رام بازار میں ہو رہا۔

ڈاکٹر صاحب کو جب ذرا ہوش آیا تو وہ ایک وکیل کے پاس گئے اور اگریمنٹ دکھا کر بدھ رام پر اُس کا سر لانے کا دعویٰ کرنے کو کہا۔ مگر وکیل نے کہا کہ اگریمنٹ کی شرطوں کے موافق بدھ رام کا سر تمہارا ہے مگر اُس کے مرنے پر۔ اُسکی زندگی میں تم سر پانے کا دعوے نہیں کر سکتے بلکہ وہ تم پر رکابی مارنے اور اُسپر چھُری اُٹھانے کا دعویٰ کر سکتا ہے بہتر ہے اس وقت اِس خیال سے باز آؤ ایسا نہ ہو کہ خود تم پھنس جاؤ۔ ناچار ڈاکٹر صاحب مایوس ہو کر اپنے گھر چلے آئے۔

چندو لال مچاول والہ

لطیفہ

ایک چور جو نہایت چالاک اور اپنے کام میں طاق تھا برابر چوری میں کامیاب ہوتا رہا۔ آخر کب تک ایک دن پکڑا گیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ ہمیشہ سے یہی کام کرتا ہے۔ پولیس نے چالان کر دیا۔ حاکم وقت کے سامنے چند بار اُسے جانا پڑا۔ آخر کار فیصلہ کا دن آہی گیا ملزم نے اپنی پیروی کے لئے ایک ہوشیار بیرسٹر کو بھی کر لیا تھا۔

حاکم وقت نے اُسے حکم سنایا کہ تم کو ۴ سال کی سخت سزا دیجاتی ہے۔

بیرسٹر نے بطور جرح بیان کیا کہ ملزم کا تمام جسم چور نہیں ہے صرف اِسکا ہاتھ مجرم ہے۔

حاکم نے جواب دیا۔ بیشک اگر یہ اپنا ہاتھ نہیں بھیج سکتا ہے تو خود چلا جائے۔

ملزم اس بات پر بہت خوش ہوا۔ اور اپنا ہاتھ جو نقلی لگا رکھا تھا کھول کر عدالت کے سامنے پیش کر دیا اور خود روانہ باشد۔

میں خوش رہنا چاہتا ہوں

مجھے دولت جمع کرنی چاہئے۔ دنیا کے سب کام دولت سے وابستہ ہیں۔ روپیہ دنیا کی تمام چیزوں کے تبادلے کے واسطے کافی ہے۔ ساری دُنیا روپیہ کی محتاج ہے جسکے پاس یہ ہے گویا ہر قسم کی خوشیوں کے کل اسباب مہیا ہیں۔ ہاں میں ایسا ہی کرونگا۔ روپیہ جمع کرونگا۔ دولت کے خیال کو مقدم رکھونگا اور پھر میں خوش رہ سکتا ہوں۔

لیکن اے دولت ڈرتا ہوں کہ قارون کی قسمت میری تقدیر نہو جائے۔ سلطان محمود کی طرح ترسے لئے دمِ واپسین اپنے جمع کردہ دفائن اور معروقہ خزائن کو دیکھکر حسرت سے ہاتھ نہ ملنے پڑیں۔ نہیں مجھکو میں پسند نہیں کرتا۔ ہاں مجھے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔ میں اپنے اقبال سے کام لونگا۔ دُنیا کا فاتح بن کر اپنے نام کا ڈنکہ بجالاؤنگا۔ اپنا سکہ چلاؤنگا۔ بے سود دولت کے جمع کرنے میں تضیع اوقات نہیں کرونگا۔ جہاں سلطنت ہے دولت خود چلی آتی ہے۔ دنیا میری شمشیر کے جوہر دیکھے گی۔ آفتاب کی آنکھیں میرے خنجر کی چمک سے چوندھیا جائے گی۔ میری دہشت اور میرا رعب شیروں کا زہرہ آب کردیگا۔ میری عظمت وجلال سے سمندر اور پہاڑ نذریں دینگے اور یہ حالت غالباً مجکو خوشی رکھ سکتی ہے۔

مگر اے ظلم پسند سلطنت مجھے تجھ پر کیا اعتبار؟ میں نہیں چاہتا کہ تیرے خیال میں پڑکر ہزاروں بندگان خدا کے خون میں اپنا ہاتھ رنگوں۔ مجھے ضحاک کی شاہی سے نفرت ہے میں چنگیز وہلاکو کی زندگی ناپسند کرتا ہوں۔ تیمور کے واقعات میرے پیش نظر ہیں جس نے برف کے نیچے دب کر جان دی۔ نپولین بوناپارٹ کی طرح قید میں سسک سسک کر جان دینی مجھے منظور نہیں۔ شاہجہان بنکر بیٹے کے ہاتھوں قید ہونا میں گوارا نہیں کرسکتا۔ اور قطب الدین

جیسا کہ خلجی ہوکر اپنے پروردہ سے اپنا گلا کٹوانا میری قسمت کے خلاف ہے۔

ہاں میں کوئی اعلےٰ عہدہ حاصل کرونگا جس میں اقتدار تو سلطنت کے برابر ہی ہوتے ہیں لیکن اس قدر ذمہ داریاں اور مقاصد نہیں ہوتے۔ میں اپنا کام ایمانداری کے ساتھ کرونگا۔ بادشاہ کی خیرخواہی میں جان دینا فخر سمجھونگا۔ رعایت اور غصہ میرے پاس نہ آئیگا۔ غفلت اور ناتجربہ کاری بھی مجھے چھو بھی نہ جائے گی۔ اور ایسی صورت میں مجھے خوشی نصیب ہوسکتی ہے

نہیں میں ایسا نہ کرونگا۔ میں ابوالفضل کی مصیبت کو خود اپنے سر نہ لونگا۔ اکبر کا دبیر بنکر اُسکے بیٹے کے ہاتھ سے اپنا خون کراؤنگا۔ بزرجمہر کی قسمت کا شریک نہ ہونگا جس نے نوشیرواں کے دربار میں مدارالمہامی کے نیم تخت پر جلوس کرنے کے بعد پھانسی پر لٹکنا پسند کیا۔ شیر افگن خاں کی طرح نامرد جہاں دینا مجھے ہرگز گوارا نہ ہوگا۔ اور یحییٰ برمکی کی مانند جان دینی بے سبب مجھے منظور نہیں ہوسکتی۔

لیکن اگر میں اپنی تمام عمر ناچ رنگ میں پوری کردوں۔ دنیا کی بیہودہ چپقلش سے اپنی طبیعت کو پریشان نہونے دوں اور ناگوار صدائیں میرے کانوں سے دور رہیں تو البتہ مجھے خوش رہنے کی اُمید ہوسکتی ہے۔

نہیں! اس قسم کی زندگی بھی مجھے نہ اختیار کرنی چاہیئے۔ کیونکہ تانا شاہ محمد شاہ اور واجد علیشاہ کا سا انجام اپنے واسطے خود تلاش کرنا اعلےٰ درجہ کی حماقت ہے۔

ہاں! سیاستِ مدن سے کنارہ کشی۔ اہل دنیا سے علیحدگی۔ تعلقات دنیا کو استعفا جنگلوں کی سیر۔ پہاڑوں میں بسیرا۔ بناس پتی اور خودرو میووں پر گزراوقات بیشک مجکو خوش رکھنے کے لئے کافی ہوگی۔

مگر نہیں! میں گوتما (بانی بودھ مذہب) کی طرح بیابانی زندگی کو چھوڑ کر پھر تعلقات کے گورکھ دھندے میں پھنسنا سخت ندامت سمجھوں گا۔ کنفیوشش (ریشیا کے ملک چین) کی مانند سرکاری عہدہ چھوڑ کر پھر اسکے واسطے کوشش کرنے کو خجالت خیال کرونگا۔ جن کا میں

متحمل نہیں ہو سکتا۔

ہاں علم و حکمت کی تحصیل ۔ ہندسہ و فلسفہ کا درس ۔ قوم کے بچوں کو مہذب بنانا، اپنے ملک کا بہی خواہ بنکر عمدہ عمدہ اصلاحیں کرنا ضرور میری خوشی کا سبب ہو سکتا ہے ۔

نہیں میں ایسا بھی نہیں کرونگا ۔ افلاطوں کی حیرت کو اپنے ساتھ نہ لیجاؤنگا ۔ فیثاغورث کی طرح محصور ہو کر اپنے ساتھ شاگردوں کو جلانا پسند نہ کرونگا ۔ سقراط کی طرح زہر کا پیالہ مجھے سیراب نہ کرے گا ۔

ہاں میں فصاحت و بلاغت میں کمال حاصل کرونگا ۔ میری باتیں دلوں کو خوش کرینگی میری فصاحت ایک عالم کو محو کر دے گی ۔ میری بلاغت مخالفوں تک سے میرا کلمہ پڑھوا دے گی ۔ لوگوں کے دل میری زبان کے ہاتھوں میں ہونگے ۔ میں جب چاہوں گا اور جدہر چاہونگا اپنی جادو اثر آواز اور مدلل تقریر سے ہزاروں کے دلونکو پھیر دونگا ۔ میری باتیں دشمنوں تک کو دوست بنالیں گی اور پھر مجھے اُمید ہو سکتی ہے کہ میں خوش رہ سکونگا ۔

نہیں مجھے فردوسی بنکر ہاتھی کے پانوں کے نیچے کچلے جانے کا حکم سُننا پسند نہیں ۔ سسرو کا درجہ پاکر اپنی جان بچانے کے لئے مجھے سمندروں کو طے کرتے پھرنا گوارا نہیں ۔ قرۃ العین کی طرح آوارہ پھرتے پھرتے اپنے حُسن کی قربانی کرنا میرے لئے شرمناک ہے

ہاں میں شہ زوری اور شجاعت پیدا کرونگا میرے مقابلہ میں بڑے بڑے شیر دل جی چرائیں گے ۔ میرے گرز سے بڑے بڑے آہنی بازو دم توڑینگے ۔ میرا جلال سب پر چھا جائیگا اور پھر میں خوش رہ سکتا ہوں ۔

نہیں میرے خیالات پراگندہ ہیں ۔ میں اسفندیار کی طرح اپنی آنکھیں نہ پھوڑواؤنگا ۔ رستم بنکر ہفت چاہ میں زندگی سے ہاتھ نہ دہوؤنگا ۔ ارجن کیطرح اپنے خاندان کے لئے ہی تیر و ترکش ہی نہ اُٹھاؤنگا ۔ اور پھر پورشیر دل کی سی صولت و جبروت پیدا کرکے دشمن کی قید اور تاوان کا تحمل نہ کر سکونگا ۔

ہاں میں حسینوں کے جمگھٹ میں رہا کرونگا۔ نازنینوں کے حلقہ میں اپنی عمر کو پورا کرونگا کسی کا جمال میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائے گا۔ کسی کا تبسم میرے غنچہ دل کو کھلاتا رہے گا میں اُس سراپا سرور کی درگاہ میں تمام دنیا کی راحتوں کو پاؤنگا۔ اُسی کے عارض پرنور کو مہرو مہ سمجھکر گردشِ لیل ونہار سے بے پروا ہو جاؤنگا۔ اور پھر بیشک مجھے دوامی خوشی حاصل ہوسکتی ہے۔

لیکن نہیں میں اس مصیبت زدہ فرقہ کی طرف ذرا بھی میلان نہ کرونگا۔ مجھے اس منحوس گروہ کی جانب مطلق التفات نہ کرنا چاہئے۔ اے سانپ سے ڈسوا کر جان دینے والی کلیوپیٹرا میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ اے پیٹ میں خنجر بھونک لینے والی شیریں میں تیری خوابگاہ کی طرف قدم رکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اے راکھ کا ڈھیر ہونے والی پدماوتی میں مارواڑ کا رخ نہ کرونگا۔ اور اے عالم آشوب ایران دخت میں تیرے فریب آمیز پیام کو قبول نہ کرونگا۔

ہاں میں کنج عزلت اختیار کرونگا۔ گوشہ عافیت مجھے صرصر حوادث سے بچائیگا۔ میں زبان کو خاموشی کا سبق یاد کراؤنگا۔ میں دشت پیمائی کو چادر کے اندر پاؤں پسارنا سکھاؤں گا۔ نظر فریب منظر کبھی مجھ کو نہ دیکھینگے شکیب دریا تماشے کبھی میرے استغنا کو کم نہ کر سکیں گے۔ اور اس درجہ پر پہنچکر فی الحقیقت میں خوش رہ سکتا ہوں۔

نہیں میں لہراسپ کی بددماغی کو جو کنج عزلت کا نتیجہ تھا اپنی ذات سے منسوب نہ ہونے دونگا اورنگ زیب کی بدگمانی کو جو ابتدائی عمر کی گوشہ نشینی کا ثمرہ تھا اپنی روح کا سوہان نہ بناؤنگا لیکن افسوس۔ اگر میں ان تمام راہوں سے جنپر ہر طبقہ کے لاکھوں آدمی چل رہے ہیں ہٹ جاؤنگا۔ اگر میں ان تمام طریقوں کو رنج واندوہ کے اسباب سمجھکر چھوڑ دونگا تو میری آرزو کیونکر پوری ہوگی۔

اے دنیا تو مجھے خوش نہیں کرسکتی۔ اے موجودات و مخلوقات عالم تم سب میرے

خوش کرنے کے لئے تا کافی ہو۔ میں خیالی خوشی کو نہیں ڈھونڈتا۔ میں اور عارضی مسرت کو نہیں چاہتا۔ بلکہ خوشی باامید بھی مجھے خوش نہیں کر سکتی۔ افسردہ دل اور پژمردہ دماغ کے ارادے کی خوشی خوشی ہرگز نہیں بن سکتی۔ اسلئے اعتباری خوشی نا قابل اعتبار اور یقینی خوشی یقیناً بے سرو کار ہے۔

اے دنیا اگر تیرے پاس دلکو سکون دینے والی خوشی ہے تو میں اسکا خریدار ہوں اور اگر تیرے پاس نہیں ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ یقیناً نہیں ہے تو میرے دل کو نہیں لے سکتی۔ اگرچہ تیری خوشنما صورت اور فوق البھڑک رنگت میرے حواس پر پورا تصرف کرلے اور میرے ناچیز قویٰ کو بھی مسخر بنالے تاہم وہ دل جو بھی خوشی کا طالب ہے غیر فانی اور ابدی خوشی جویا ہے کبھی تیرا نہیں ہو سکتا۔

اے ہماری روحوں کے خالق اور ہمارے دلوں کے مالک ہماری سن فضل و کرم کے دوشالوں سے ہمکو ڈھانک۔ رحمت کے پردے میں ہمکو چھپا دے۔ اور بتا کہ سچی خوشی کیا ہے۔

آواز آئی کہ "الا ان فی ذکر اللہ تطمئن القلوب"

"اللہ بس باقی ہوس"

"آنریری اڈیٹر"

کشف و کرامات

بمبئی سے ایک رسالہ تھیاسوفسٹ میں شایع ہوا کرتا تھا جسکا مقصد تھا کہ اُن علوم مخفیہ کو جنھوں نے زمانہ قدیم میں مشرقی ملکوں میں بہت ترقی اور عظمت حاصل کی تھی مگر اب مغربی علوم کی روشنی کے سامنے اُنکا چراغ گُل ہو گیا ہے۔ از سر نو رونق دیکر زندہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی ذیل میں اپالونیوس ساکن ٹائنا کی بابت اس میں ایک مضمون نکلا تھا جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مدعیانِ معجزہ و کرامات صرف اُنہی مذاہب میں نہیں گزرے ہیں جنکو الہامی کہتے ہیں بلکہ دُنیا کے اور مذاہب میں بھی جو بُت پرستی سے کم و بیش علاقہ رکھتے ہیں ایسے صاحبِ کرامات آدمی اکثر گزرتے رہے ہیں۔

چارلس بی ویٹ نے آغاز مذہب عیسوی کی ایک تاریخ لکھی ہے جسپر امریکہ کے ایک بینر آف لائٹ نے ریویو لکھا تھا۔ اِس ریویو میں دوسری صدی عیسوی کے مشہور صاحب کرامات اپالونیس کے حالات پر بھی جس کا ثانی رومی سلطنت میں کوئی پیدا نہیں ہوا بحث کی گئی ہے۔

وہ زمانہ جس سے یہ تاریخ بالخصوص علاقہ رکھتی ہے چھ حصوں پر منقسم ہے۔ اِس کا دوسرا حصہ یعنی سنہ ۸۰ء سے لیکر سنہ ۱۶۰ء تک ایج آف مریکلز یعنی زمانہ معجزات پر مستمل ہے۔ جس کا احوال قلمبند کرنا اُن لوگوں کے واسطے جو اسپرچوئلزم یعنی روحانیت کے قائل ہیں خالی از دلچسپی نہ ہوگا اِسکے ذریعہ سے وہ لوگ اُس زمانہ کے وجود ہائے غیر ضروری اسراروں کو اُن واقعات سے مطابق کر سکیں گے۔ جو آغاز شیوع مذہب عیسوی میں گزرے ہیں۔ اپالونیس ٹائینس اپنے زمانہ کے عجیب و غریب اشخاص میں سے گزرا ہے اور بارہ رومی بادشاہوں کے عہد حکومت

اُس نے دیکھا تھا۔ اُسکی ولادت سے کے قبل ایک مصری دیوتا جس کا نام پرڈیوس تھا اُس کی ماں کو دکھائی دیا اور یہ خبر دی کہ تیرے ہاں جو لڑکا پیدا ہونے والا ہے اس میں حلول کرونگا۔ چنانچہ اُن روایتوں کے مطابق جو اُس عورت کو عالم خواب میں ہوئی تھیں وہ ایک باغ میں پھول جمع کرنے کے واسطے گئی۔ جس وقت وہ پھول توڑ رہی تھی راج ہنسوں کا ایک جھلڑ آیا اور اسکے چاروں طرف چکر لگانے لگا۔ کبھی اپنے بازوں سے مختلف سازوں کی آواز پیدا کرتے تھے اور کبھی نہایت خوش الحانی سے گاتے تھے۔ اِسی کیفیت میں آپالونیس پیدا ہوا۔

ابتدائے عمر میں اپالونیس اپنی دماغی قوت اور جسمانی خوبصورتی کے واسطے مشہور تھا۔ افلاطون کرائی سیس اور ارسطو کے پیروں کے ساتھ رہنے اور اُن کو اپنے ساتھ رکھنے سے بچتا تھا۔ اس نے ترک حیوانات کیا تھا۔ صرف پھلوں اور زمینی پیداوار پر زندگی بسر کرتا تھا۔ حکیم فیثاغورث کا مطیع اور مداح تھا۔ اور اُسی کی تقلید میں پانچ سال کامل سکوت میں رہا۔ جہاں کہیں وہ جاتا تھا مذہبی عبادت کی اصلاح کرتا تھا۔ اور عجیب و غریب کرامتیں اُس سے سرزد ہوتی تھیں۔ دعوتوں میں مہمانوں کے واسطے وہ فوراً میوہ وغیرہ منگا لیا کرتا تھا۔ کبھی بتوں میں جان ڈالدیتا تھا اور کبھی اسکے اشاروں پر پیتل کی مورتیں چلنے پھرنے اور خدمتگاروں کی طرح کام کرنے لگتی تھیں۔ اِسی قوت کے عمل میں لانے سے مادہ کے حجاب کو کبھی اُلٹا دیتا تھا۔ سونے چاندی کے برتن مع کھانے کے غایب ہوجاتے تھے۔ اور خدمتگار بھی ایک لمحہ میں نظر سے غائب ہوجاتے تھے۔ اس پر ایک مرتبہ شہر روم میں بادشاہ کی بدخواہی کا الزام لگایا گیا۔ اظہار کے وقت جب ملزم نے سامنے آکر اُس کاغذ کو کھولا جس میں جرم اور سزا کی کیفیت درج تھی تو اُس لکھے ہوئے کاغذ کو سادہ دیکھکر لوگوں نے تعجب کیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اپالونیس کو ایک جنازہ ملا۔ اُس نے لوگوں سے کہا کہ اس جنازہ کو نیچے رکھدو میں تمہارے اُن آنسوؤں کو جو اُس میت کے لئے بہا رہے ہو ابھی خشک کئے دیتا

ہوں۔ یہ کہکر اُس نے میت پر ہاتھ رکھکر کچھ الفاظ منہ سے کہے اور چادر الٹ دی۔ مردہ زندہ ہوگیا۔ جب یہ شہر سمرنا میں تھا تو لوگوں نے شہر افنیس میں بلایا اس شہر میں وبا بہت زور شور سے پھیلی ہوئی تھی چنانچہ اسکے پہنچتے ہی وبا جاتی رہی۔

جب اسکی عمر تقریباً سو برس کی ہوئی تو لوگوں نے اسپر جادوگری کا الزام لگایا اور بادشاہ روم کے سامنے لے گئے۔ بادشاہ نے قیدخانے میں بھیجدیا۔ قیدخانہ میں اس سے لوگوں نے پوچھا کہ تجھکو رہائی کب ہوگی تو اُس نے جواب دیا کہ اگر حاکم کے حکم پر رہائی موقوف ہے تو کل ہوگی اور اگر میرے اوپر منحصر ہے تو اسی وقت ہو سکتی ہے یہ کہکر اس نے اپنے پاؤں کو بیڑیوں سے نکال لیا اور کہا کہ دیکھو آزادی مجھکو حاصل ہے اور پھر اس نے پاؤں بیڑیوں میں ڈال لئے۔

عدالت میں اس سے سوال کیا گیا کہ لوگ تجھکو دیوتا کیوں کہتے ہیں۔

اُس نے جواب دیا کہ ہر نیک آدمی اس لقب کا مستحق ہے۔ پھر اُس سے پوچھا کہ تو نے ونفیس کی وبا کا حال پہلے سے کس طرح بتا دیا۔

اُس نے کہا کہ میں بمقابلہ اور لوگوں کے زیادہ ہلکی اور قلیل غذا کھاتا ہوں۔

ان سوالات اور مختلف سوالات کے جوابوں سے جو اس سے پوچھے گئے تھے بادشاہ پر اسقدر اثر ہوا کہ اُسکو جرم سے بری کر دیا مگر یہ کہا کہ میں تجھسے تخلیہ میں گفتگو کرنے کے لئے چند روز اور روکونگا۔

اپالونیس نے جواب دیا کہ آپ میرے جسم کو روک سکتے ہیں میری روح کو نہیں روک سکتے بلکہ میرے جسم پر بھی آپ کا قابو نہیں چل سکتا۔ یہ کہکر وہ عدالت سے غائب ہوگیا۔ اور اُسی روز پیوٹیولی میں جو روم سے تین منزل ہے اپنے دوستوں کو ملا۔

اپالونیس کی تحریرات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ذی علم شخص تھا۔ انسانی طبیعت سے خوب واقف اور اُسکا دماغ اعلےٰ درجہ کے خیالات اور عمدہ ترین اصول حکمت سے مزین تھا۔

ایک خط میں جو ولیریس کو اُس نے بھیجا تھا وہ لکھتا ہے کہ کسی شے کو فنا نہیں ہوتی ہے ہاں اُسکی ظاہری حالت و کیفیت میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔ اور کسی وجود کا ظہور نہیں ہوتا ہے۔ صرف کیفیت ظاہر بدل جاتی ہے۔ جو چیز کہ جوہر سے مادہ میں آتی ہے وہ اُس کا ظہور خیال کیا جاتا ہے اور جو شے مادہ سے جوہر میں جاتی ہے اُسکو فنا کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ نفس الامر میں نہ کوئی چیز پیدا ہوتی ہے اور نہ معدوم ہوتی ہے بلکہ ہست اور نیست فقط ظاہر و غائب کے شعبے ہیں۔ مادہ کی کثافت محسوس ہوتی ہے اور جوہر کی لطافت آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوجاتی ہے۔ ورنہ شے ایک ہی ہے۔

سب سے بڑی قدر دانی اپالونیس کی بادشاہ ٹائٹس نے کی تھی یعنی اس بادشاہ کے تخت نشینی ہونے بعد اپالونیس نے اسے ایک خط لکھا جس میں بطور نصیحت یہ لکھا تھا کہ نظم و نسق سلطنت میں عدل و انصاف اور میانہ روی کا سب سے زیادہ خیال رکھیے۔ ٹائٹس نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں اپنی اور اپنے وسیع ملک کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور ان باتوں کا جو آپ نے تحریر کی ہیں خیال رکھونگا۔ میں نے بیت المقدس کو فتح کیا ہے مگر آپ نے مجھکو مسخر کرلیا۔

وہ عجائبات جو اپالونیس سے ظہور میں آئے تھے جنکو لوگ اعجاز خیال کرتے ہیں اور جن کی علت اس زمانہ کے علم اسپرچولزم سے بخوبی ظاہر ہے دوسری صدی عیسوی میں اور اسکے بعد بھی سیکڑوں برس تک سب لوگ کیا عیسائی اور کیا اور مذاہب والے اُنپر اعتقاد رکھتے چلے آئے ہیں۔

سایمن میگس ایک اور عجیب و غریب صاحب کرامات شخص دوسری صدی میں گزرا ہے، عیسائیوں کو بھی مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اسکی کرامتیں ظاہر ہوئی ہیں۔ اعمال حواریین باب ۸ و ۹ و ۱۰ میں اسکا تذکرہ ہے۔

اُسکی شہرت عالمگیر تھی اور ہر قوم میں اُسکے پیرو گزرے ہیں اور شہر روم میں اُسکی

یادگار میں اُسکا بُت بھی نصب کیا گیا ہے۔ پیٹر حواری سے یہ امر ثابت کرنے کی غرض سے کہ کسی شخص کو زیادہ قدرت حاصل ہے اکثر اسکے مناظرے ہوئے ہیں۔ اعمال پیٹر و پال میں لکھا ہے کہ سائمن کے کہنے سے ایک پیتل کا سانپ حرکت کرنے لگا تھا۔ پتھر کی مورتیں ہنسنے لگیں اور خود اس نے ہوا میں بلند ہونا شروع کیا۔ اسکے جواب میں بیان کیا گیا ہے کہ پیٹر نے نابینا کو بینا کر دیا۔ بیمار کو ایک لفظ سے اچھا کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

جب سائمن کو لوگ نیرو شاہ روم کے پاس لائے تو اس نے اپنی شکل بدل لی۔ آن واحد میں وہ ایک بچہ بن گیا بعد بوڑھے آدمی کی صورت میں آگیا۔

ان دونوں صاحب کرامات شخصوں کے علاوہ اور بھی بہت لوگوں کے حالات دیکھنے میں آئے ہیں جس سے قطعًا یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قوتِ اعجاز نما کسی خاص شخص تک محدود نہ تھی بلکہ طاقت آجکل کی طرح اُس زمانہ میں بھی اکثر لوگوں میں پائی جاتی۔ اُن واقعات کی نسبت پہلی دو صدیوں کے مصنفوں کے اقوال نقل کرنے سے اس زمانہ میں عجائبات میں بھی نہایت سریع الاعتقاد آدمیوں کے اعتقاد متزلزل ہوجائینگے۔ ممکن ہے کہ ان بیانوں میں اکثر مبالغہ ہو۔ مگر یہ فرض کر لینا خلاف قیاس ہے کہ یہ سب باتیں محض ڈھکوسلا ہیں۔ اور انمیں آدھا بھی سچ نہیں ہے۔ اور اُن مکاشفات کی نسبت جو بعد شیوع جدید اسپرچولزم لوگوں کو ہوئے ہیں اس بات کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔

(ترجمہ) سید سرفراز حسین خاں

خیال

حکمائے یونان نے فلسفۂ طبیعیات میں لکھا ہے کہ منجملہ حواس خمسہ باطنہ کے ایک قوت کا نام "خیال" بھی ہے جو مقدم دماغ کے جوف کے آخری حصہ میں ہوتی ہے، - یہ قوت ان صورتوں کے لئے خازن ہے جن کا حس مشترک کے ذریعے سے ادراک ہوتا ہے اور اُن صورتوں کے لئے حافظ ہے جو اُسمیں منطبع ہوتی ہیں -

اسکے ثبوت میں حکما یہ دلیل لاتے ہیں کہ عام طور پر قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد ہماری نظروں سے غائب ہوجاتی ہے پھر جب کبھی وہ سامنے آتی ہے تب ہم پہچان لیتے ہیں کہ اسکو پہلے کبھی دیکھا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوت ہمارے جسم میں ایسی ہے جو ذرا سے غور و تامل کے بعد ذہن سے غائب ہوجانے والی چیز کو دوبارہ حافظے کے سامنے لاکر حاضر کر دیتی ہے - اسی کو "خیال" کہتے ہیں -

اگر بالفرض یہ کوئی قوت نہ ہوتی تو جو چیز ہمارے معائنے سے کبھی گزر چکی ہے وہ دوبارہ نظر کے سامنے لائی جائے تو اُسکو ہم نہ پہچان سکتے - حالانکہ مشاہدات اور تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم بلا تامل پہلے کی دیکھی ہوئی چیز کو پہچان لیتے ہیں -

حکما نے اسکو حس مشترک سے مغائر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اول کا دعویٰ ہے کہ خیال صرف حافظہ کا نام ہے اور اپنے اس دعوے پر کئی دلائل قائم کئے ہیں مگر اُس کے ساتھ ہی اُن حکما کے ایک ایک استدلال کی کئی کئی پیرایہ سے تردید بھی کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ "خیال" "حس مشترک" ہی سے ہوا کرتا ہے - اور کوئی علیحدہ قوت نہیں ہے -

حکما کی پہلی دلیل یہ ہے کہ جو جو صورتیں محسوس ہوتی رہتی ہیں اُن کے احساس کے وقت

ہمارے پاس دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ جو "قبول" اور "تحفظ" کے نام سے موسوم ہیں جو چیز محسوس ہوئی ہے اُسکے احساس کے وقت کوئی طاقت ہمارے دماغ میں تھی جس نے اسے محسوس ہونے والی چیز کو قبول کر لیا۔ گویا ایک ظرف تھا جس میں یہ شئے محسوسہ سما گئی، اور دوسری ایسی طاقت ودیعت کی گئی ہے جسنے قبول کی ہوئی چیز کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ پس معلوم ہوا کہ "قابلیت قبول" اور "طاقت تحفظ" دو مغائر قوتیں ہیں۔ اور مسئلہ مسلم ہے کہ دو جدا جدا چیزوں کے لئے دو الگ الگ مبدا بھی ہونا چاہئیں۔ پس محسوسات کا قبول کرنے والا "حس مشترک" اور اُن کی حفاظت کرنے والا "خیال" ہے۔

لہذا "خیال" "حس مشترک" سے ایک علیحدہ قوت ہوئی۔

اس دلیل کی کئی طریقوں سے جوابات دے گئے ہیں۔ اوّل جواب یہ کہ یہ دلیل اس امر پر مبنی ہے کہ "ایک قوت سے ایک ہی اثر صادر ہو سکتا ہے"! حالانکہ بعض قوتوں سے آثار کثیرہ بھی صادر ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حفظ کا قبول سے پہلے ہونا لازم ہے۔ کیونکہ پہلے قبول پھر حفظ مرتب ہوتا ہے۔ اور اگر "قبول" اور "حفظ" دو علیحدہ قوتیں ہیں تو ایک ہی وقت دونوں کا مرتب ہونا جائز تھا۔ حالانکہ یہ بالکل خلاف واقع ہے۔ یہ بھی مان لیا گیا ہے کہ ایک طاقت میں دو متضاد آثار بھی مختلف اوقات میں صادر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی دو اثر ایک قوت میں جمع ہو گئے ہیں۔ یہ اثر متضاد بھی نہیں ہیں اور یہ وہی قوت ہے جس کا نام "خیال" رکھا گیا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ حس مشترک مختلف ادراکات کا مبدا ہے جس سے طرح طرح کے احساس ہوا کرتے ہیں۔ پس اس جگہ ایک قوت "حس مشترک" سے بہت سے اثرات کا صدور ثابت ہے اور تمہاری (حکماء کی) دلیل کا مبنیٰ یہ ہے کہ "ایک قوت سے ایک ہی اثر صادر ہوتا ہے"!

جب مذکورہ بالا جواب سے ایک ہی قوت سے بہت سے اثرات کا صدور ثابت ہوا تو صرف حس مشترک یا خیال اسے ہی قبول اور حفظ کیوں صادر نہیں ہو سکتے۔ تاکہ ایک ہی قوت سے قبول اور حفظ صادر ہوتے رہیں۔ اور اس امر کی ضرورت نہ رہے کہ دو مبدا متغائر مانیں جائیں۔ جبکہ ایک ہی مبدا سے ہمارا کام نکل سکتا ہو۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ نفس صور عقلیہ کو قبول کرتا ہے۔ اور بدن میں تصرف کرتا ہے یہاں بھی ایک ہی شئے سے دو مختلف اثروں کا صادر ہونا پایا جاتا ہے۔

بہر صورت یہ قول کہ "القوۃ الواحدۃ لاتصدر عنہا الا اثر واحد" کسی نوع اعتراضات سے نہیں بچ سکتا۔ اور نہ اس دعوے پر کوئی قطعی برہان قائم ہو سکتی ہے۔ یہ وجوہ مفتر ہیں کہ قبول اور حفظ کے لئے دو جدا جدا قوتوں کا بہم پہنچانا غیر ضروری امر کی بے جا کوشش کرنا ہے۔

محمد حسین محوی

فانی ہے ہر ایک چیز بجز ذاتِ خدا — چتر فلک و فرش زمیں ہونگے فنا
اسلاف کو جب اسنے نہ چھوڑا محوی — دنیا سے وفا کریگی کیا ہے وفا

مٹنے کو ہے ہر چیز بجز ربِ متین — بیکار ہیں نخوت و غرور و تمکین
اللہ سے لو لگاؤ کہنا مانو! — حب دنیا بھی کام آئی ہے کہیں

محوی ۔ لکھنوی

مراسلات و مکالمات

طلباء اور پالٹیکس

جناب منیجر صاحب۔

تسلیم۔ آپ کا دسمبر کا پرچہ کسی قدر دیر میں دستیاب ہوا۔ جو تصاویر کی کمی پچھلے نمبروں میں ہوئی تھی اُسکے پورا کر دینے سے نہایت خوشی ہوئی۔ ہندو مائی تھولوجی کی جو جدید تشریح لالہ چند ولال چاولہ کی قلم سے ہوئی ہے وہ تمام ہندوستانیوں کے لئے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ قابلِ دید ہے۔ آپنے اس پرچہ کی تعصّبانہ صلح کُل پالیسی کو اس زمانہ کی تنگ خیالی میں بھی آخیر تک خوب نبھایا ہے۔ دُھوپ چھاؤں کے عنوان سے جو مستقل واقعات اور اُن کی تشریح اخبار نویس نے پیش کی وہ نہایت ہی بھلی معلوم ہوئی۔ اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ آپ اسکو ماہ بماہ جاری رکھیں گے۔

لیکن باوجود ان خوبیوں کے مجھے بہ حیثیت ایک آپکے دوست و خیر خواہ رسالہ اور خادم ملک یہ کہنا پڑے گا کہ جو آپ کا نیا اعلان پروگرام زبان پر قاعدہ نمبر تین میں درج ہے کہ یہ کرنٹ پالٹیکس کے جھگڑوں وغیرہ وغیرہ باتوں سے مبرّا ہوگا۔ اگر اس کی خاص طرح سے تشریح نہ کیجاے تو باعث ترقی معکوس ہوگا۔ مجھے جہانتک معلوم ہوا ہے آپ اپنے رسالہ کو طلباء و نوعمر اشخاص کے مُفید مطلب بنانا چاہتے ہیں۔ اِسلئے اسکو عشقیہ مضامین و قابلِ اعتراض پولیٹکل جھگڑوں سے پاک رکھنا آپ کا فرض ہے اور بیشک ہر زمانہ میں ملکی و قومی بہبودی طلباء کے خیالات کی درستی پر مبنی ہے۔ ہم اس بات کو بالکل تسلیم کرتے ہیں

کہ جو ناگفتہ بہ بدمزگیاں ہمارے ملکی پالیٹکس میں پیدا ہوئی ہیں اُن میں طُلبا نے اپنی حدود سے بڑھکر حصہ لیا اور نیز اخبارات و رسائل نے اُن کو اس بیجا حرکت میں تحریک و ترغیب دی۔ لیکن کیا آپ صدق دل سے کہہ سکتے ہیں کہ پالیٹکس بذات خود گناہ ہے۔ جو اس سے بالکل اجتناب کیا جائے۔

بالفرض اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اس زمانہ کے زیادہ تر پالیٹکس والوں کا رویہ خراب تھا لیکن اس میں پالیٹکس کا کیا قصور۔ یہ ٹھیک ویسا ہی معاملہ ہے جیسا کہ سائنس و مذہب کے عنوان سے میں نے لکھا ہے کہ دُنیا کے لاکھوں خدا پرستوں میں سے اگر کسی زمانہ میں چند پاگلوں نے مذہب کے نام سے خلق خدا کو پامال کیا تو کیا ہم سب کے سب مذہب سے دست بردار ہو جائیں۔ کیا آپ طلبار کی مذہبی و اخلاقی تعلیم کو بھی اس بنا پر روکیں گے۔ ہرگز نہیں۔ پھر طلبار کی پولیٹکل تعلیم کی بیخ کنی ایک آپ کی طرح ایک آزاد رسالہ کے منیجر سے امید نہیں کیجاتی اور نہ پولیٹکس کو اس طرح "ہوّا" بنانا کسی کے لئے زیبا ہے۔

میرے خیال میں ہند کی پولیٹکس میں طلبار سے جو قابل افسوس واقعات پیش آئے وہ طلبار کی پولیٹکس سے ناواقفیت کا نتیجہ تھے۔ اگر طلبار کو کتب درسیہ کے ساتھ پولیٹکل سائنس کی صحیح تعلیم ملتی تو غالبًا یہ باتیں نہ ہونے پاتیں۔ آپ نوعمر اشخاص کی نشائی کو لوجی "یعنی خیال زندگی" سے خوب واقف ہیں نوعمر اشخاص کے لئے پرستش اور تحقیر کے درمیان ایک اوسط حالت اختیار کرنا مشکل ہے جو دونوں کی دونوں خطرناک ہیں۔ علی دہریوں کے چہرۂ دل کو ٹٹولنے سے معلوم ہوگا کہ اُن کی یہ قابل افسوس دماغی حالت کا باعث اوصاف خدا کی غلط فہمیوں سے ہوا ہے۔

مثلاً کسی قمار باز باراں کو آج مینہ کے برسنے سے نقصان ہے وہ خدا سے دعا مانگتا ہے کہ رام جی آج نہ برسیو۔ لیکن قدرتی قوانین سے شاید مینہ برستا ہے اور اس سے قمار باز کا اعتقاد رام یعنے خدا پر نہیں رہتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ قمار باز کو رام کے اوصاف کا پتہ نہیں

اسی طرح ناجائز پولٹیکل حرکت والے کو رعایا اور گورنمنٹ کے باہم تعلقات کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ اسلئے اگر نوعمر اشخاص کو اس عادل گورنمنٹ کی پالیسی ٹھیک ٹھیک سمجھائی جائے تو بہت سے گمراہ ہونے سے بچ سکیں۔ ایک موٹی سی بات اسکے متعلق یہ ہے کہ ہمارے ہموطن بہت سی چیزوں کو گورنمنٹ سمجھتے ہیں جو گورنمنٹ کے محض آلا ہیں۔ اُن کے نزدیک ریلوے گورنمنٹ ہے۔ پوسٹ آفس گورنمنٹ ہے میونسپلٹی گورنمنٹ ہے غرضیکہ جو چیز جس سے گورنمنٹ کا کچھ بھی تعلق ہے وہ گورنمنٹ کہلاتی ہے۔ ان میں سے کہیں کسی نے کوئی بدانتظامی دیکھی معاً گورنمنٹ کو قصور وار ٹھیرا لیا۔ علاوہ ازیں اصول گورنمنٹ کو کارکنان گورنمنٹ سے مطابق کرنا ایک دوسری غلط فہمی ہے۔ جو رسائل نوعمروں کے دل سے بہ آسانی ہٹا سکتے ہیں۔

سوئم۔ جو قومی مایوسی اس وقت اس رحیم گورنمنٹ کے اصلی منشا کی ناواقفیت سے پیدا ہو رہی ہے۔ اس کے اظہار سے یہ تاریکی کسی حد تک رفع کیجا سکتی ہے۔

الغرض پالٹیکس کی بابت محض خاموشی اس رسالہ کے حق میں جو کہ زیادہ تر طلبار کے لئے لکھا جا رہا ہے نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں نوجوانوں کے دل میں اوّل پولٹیکل سائنس رعایا و گورنمنٹ کے باہم تعلقات کا صحیح خیال پیدا کرانا چاہئے۔ ہمیں اس اجتماعی زندگی میں فرو بشر کے فرائض سے ہر ایک کو آگاہ کرنا چاہئے۔ ہمیں روز بروز نوجوانوں کو اپنے عادل بادشاہ کے دیئے ہوئے حقوق پر یاد دہانی کرتے رہنا چاہئے۔ اور اسکو ہر قدم پر انکے مستحق ہونے کے لئے ہمت و اُمید دلانی چاہئے۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ ان کے تحصیل کرنے میں ناکامیاب رہیں جو کہ ہمارے بادشاہ مرحوم اور اُن کی جنت نشین والدہ نے ہمیں عطا کیا تھا تو ہمیں اسکے لئے گورنمنٹ عالیہ سے اُنکی درخواست کرنے میں بھی جرأت دلانی چاہئے۔

"پریانند" ودیارتھی

سائنس و مذہب

سائنس و مذہب کے عنوان سے ایک مضمون دسمبر سنہ ۱۱ء کے رسالہ زبان میں پریمانند ودہیارتھی جی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکے متعلق میں کچھ کہوں۔ ودہیارتھی جی نے مذہب کی وکالت سے اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے کہ وہ اس پیشہ کی ہر ایک گھات سے خوب ماہر ہیں۔ اُنہوں نے اپنے موکل کو بچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ وہ اول اول مدعیوں کے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے خود بھی ایک حد تک مذمت کرتے ہوئے بدلائل دکھاتے ہیں کہ سائنس میں بھی خیال و فرضی باتیں موجود ہیں اور آخر میں مذہب نے جو دنیا کو نقصانات پہنچائے ہیں انکو لامذہبی کا نتیجہ کہکر اپنے نزدیک بالکل بازی جیت گئے ہیں۔

ہمیں شک نہیں کہ سائنس کے استقرار میں قیاس و خیال کی ضرورت ہوتی ہے مگر اُسکو دیگر خیالی باتوں کے برابر بنا دینا صحیح منطق نہیں ہے۔ اِس بنا پر تمام بھوت و جنات کے قصے بھی سائنس کے ہمپلہ ہو جاتے ہیں۔ دویم۔ وہ مذاہب اور علم اخلاق ایک معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر سو آدمیوں سے بلا استثنیٰ یہ پوچھا جائے کہ تمہارا مذہب کیا ہے تو اُن میں سے نوّے ۹۰ اشخاص سعدیؒ کے ہمزبان ہوکر ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

کو اپنے مذہب کا کلمہ نہیں قرار دیں گے۔ جس طرح کہ ودہیارتھی جی ظاہر کر رہے ہیں۔ عام آدمیوں کے لئے مذہب چند قیود اور اعتقاد کے مجموعے کا نام ہے کہ جس سے وہ اپنے وجود کو کسی خاص روحانی ہستی سے منسوب کرتے ہیں اور اُسی کے احکام پر اپنے کو کاربند سمجھتے ہیں جنکو ان احکام میں کچھ کلام ہو وہ بجائے اعضا یکدیگر ہونے کے

کافر یا ملیچھ سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان لفظوں کے ساتھ جو توہین و حقارت شامل ہے وہ ہر ایک مذہب کے ماننے والے کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے۔ آجکل مذہب والے دنیا کو اس بھلاوے میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مختلف مذاہب میں دراصل کوئی خصومت یا مخالفت نہیں ہے۔ ہر ایک مذہب کے اغراض و مقاصد ایک ہی ہیں بلکہ وہ صرف مختلف رستے ایک ہی منزل مقصود پر پہونچنے کے ہیں۔ اسلیے ان میں کوئی تنازع نہیں ہو سکتا۔ لیکن عملی طور پر ہم اُسکو بالکل مختلف پاتے ہیں۔ چنانچہ کسی کے خیال میں کسی خاص جانور کا مارنا مردم کشی کے برابر ہے حالانکہ دوسرا اُسی جانور کو اپنے خداے پاک کے نام پر نہایت پسندیدہ قربانی سمجھتا ہے کوئی نجات کا ذریعہ اپنے اعمال کو سمجھتا ہے۔ کوئی اپنے نبی کی وساطت و سفارش پر نجات کا دار و مدار جانتا ہے۔ کسی کے نزدیک نجات کا مُدعا حصُول جنّت ہے جو دنیاوی زندگی کی طرح عیش و عشرت سے پر ہوگی۔ کسی کے نزدیک جنت کوئی چیز ہی نہیں بلکہ عیش و عشرت رنج و غم سے بریت کا نام نجات ہے جو اس دُنیا میں یا اسکے بعد حاصل ہو سکتی ہے۔ بعضوں کے نزدیک موت روح کو فنا نہیں کرتی ہے اور بعضوں کے نزدیک وہ نیست ہو جاتی ہے لیکن اُسکا اثر باقی رہتا ہے جو اپنے میلان کے بموجب کسی موزوں حیثیت میں دوبارہ دنیا کی ہوا کھانے آتی ہے حتیٰ کہ ایک موقع ایسا آپہنچتا ہے کہ اسکے کرم و کھیل نبک کے حساب کی طرح مساوات کے درجہ میں پہنچ کر بند کھاتہ تصور کیا جاتا ہے شاید اسی کا نام نروان ہے (جسکے اصلی معنی (نجات ابدی) پالی کتابوں سے نکالنا باقی ہے) کوئی اپنے خدا میں مادّہ کی شرکت مانتا ہے اور کوئی نہیں مانتا۔ کوئی خدا کو مخلوق سے الگ مانتا ہے کوئی مخلوق کو خدا کا حصّہ سمجھتا ہے۔ کوئی خدا کو دنیا کا پیدا کنندہ سمجھتا ہے کوئی صرف منتظم ہی مانتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسطرح سے جس سے پوچھو وہ کچھ نئی بات بتائیگا۔ غرضیکہ اس قسم کی تفرقہ پردازیاں اور تفرقات

اسقدر زیادہ ہیں کہ اگر ان سب کو چھان بین کر کے کوئی خالص علم مذہب نکالا جائے تو اُسکی کوئی ایسی ہستی نہیں ہوگی جو سائنس سے کچھ ٹکر کھا سکے۔ البتہ مذاہب مختلف کے ظلم سے تنگ ہو کر چند سائنس والے اپنے حدود علم سے الگ یہ کہہ بیٹھے تھے کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے۔ جس کے جواب میں شنکر آچارج اور بشپ بارکلے کی طرح بگڑے دلوں نے منطق سے ثابت کر دیا کہ مادی دنیا میں کوئی چیز نہیں لیکن ان فیصلوں کو تسلیم کرنے کے لئے تمام دنیا تیار نہیں۔ مادی دُنیا کی حقیقت کو ہر ایک شخص جانتا ہے۔ لیکن خدا کے وجود کی بابت صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُسکا علم انسانی فہم سے باہر ہے۔ لہذا اسکی بابت خاموشی بہتر ہے۔

ہم ودہیارتھی جی سے یہاں ضرور اتفاق کرتے ہیں کہ خالص علم مذہب کو علم طبعی سے کوئی عداوت یا رقابت نہیں ہے لیکن خالص علم مذہب ہمیں کہاں ملتا ہے ہم ہر جگہ یہی پاتے ہیں کہ اُس خالق کے (جسکو سائنس والے مادی قوت کہتے ہیں) عابد حدود عقل سے بڑھکر اسکی بابت واقفیت کا دعویٰ کرتے ہیں اکثر اُسکو شخصیت کا جامہ پہناتے ہیں اور شخصیت کے ساتھ اسکے جذبات اور کریکٹر بھی بناتے ہیں جو ظاہر ہے کہ ان خیالی خداؤں سے بڑھکر نہیں ہو سکتا۔ کہیں خدا ماں کی طرح رحمدل۔ باپ کی طرح منصف۔ خاوند کی طرح پیارا۔ مالک کی طرح رازق و پروردگار۔ دوست کی طرح معاون پایا جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں جانور کی طرح خونخوار ظالم اور وحشیوں کی طرح غیور و پر انتقام بھی ثابت ہوا ہے۔ اور جب کسی کا خدا اُسکو منکر ہونے کے گناہ پر اپنے بھائی کے مارنے کا حکم دے سکتا ہے دوسرے کے مال و متاع کو اپنے تصرف میں لانے کی اجازت دیتا ہے۔ اسکے ننگ و ناموس سے جانور سے بھی بدتر سلوک کرنے کے اختیارات دیتا ہے تو ہم اس خدا کی بابت کیا سمجھیں یہی کہا جائے گا کہ یہ خدا کسی شخص کے بگڑے ہوئے دماغ کا ماحصل ہے۔ اسلئے

خیال خدا سے جو اخلاقی نتائج نکالے جاتے ہیں اُن کی کسوٹی انسانی عقل ہی رہی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی اخلاقی زندگی کو مستحکم کرنے کے لئے بجائے اسکے کہ کسی دوسری ہستی کا نزول ہو جسے ہادی دین ضروری سمجھتے ہیں اگر ہم انسان کی فطرت میں محبت و ہمدردی کو قدرتی مان لیں جیسے کہ ہربرٹ سپنسر نے مانا ہے تو ہمارے خدا کے کریکٹر سازی کا بوجھ بالکل جاتا رہے گا۔ اور اس کے ساتھ۔ مذہبی جھگڑے بھی ایک حد تک دفع ہو جاویں گے اور اسی طرح اگر ہم مرکز مذہب کو مہذب دُنیا سے ہٹا دینے میں کامیاب ہوں تو پھر ہمیں مذہب اور سائنس کی دوستی پیدا کرنے اور ایک کو دوسرے کی امداد پر تیار کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

راقم

ن۔ ر۔

اجل کریگی نہ ہنگام نزع پاس ترا
بقا نہیں ہے تجھے، ہے غلط قیاس ترا
پہن کے جامۂ ہستی نہ دل میں تو اترا
کہ مستعار ہے یہ عارضی لباس ترا

فروغِ شمع وہ یاروں کی انجمن میں نہیں
وہ سرفروشیٔ اہلِ وفا وطن میں نہیں
اُڑا کے بادِ خزاں لےگئی کہاں ہیہات
کہ گُل تو کیا کوئی کانٹا بھی اب چمن میں نہیں

وہ ہمنشین اب لگے سے انجمن میں نہیں
وہ کیفِ نشۂ وحدت سے کہن میں نہیں
اب ایک ایک کو ہر کھا ئے جاتا ملے شاکر
وطن وہی ہے، پہ ایکا وہ اب وطن میں نہیں

(شاکر میرٹھی [?])

مولانا حالی کا تازہ کلام

اسلامی نماز کی بابتہ ایک مسیحی کے خیالات

مولوی چراغ علی مرحوم نے انگریزی میں ایک کتاب جہاد کی نسبت بہت محنت اور تلاش سے لکھی ہے جس کا ترجمہ جناب مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی مترجم "فلسفہ تعلیم" فرما رہے ہیں۔ اُردو میں اُسکا نام تحقیق الجہاد رکھا گیا ہے اُسمیں ایک نظم نماز کی بابتہ کسی انگریز کی لکھی ہوئی ہے۔ مترجم کی درخواست پر مولانا حالی مدظلہ العالی نے اُسکو نظم کر دیا ہے جو ہدیہ ناظرین ہے۔ محمد یحییٰ تنہا

سب سے زیادہ عزت ہے اُن نمازیوں کی　　مسجد ہے جنکی ہر دم موجود اُن کے اندر
جو جگمٹوں کے غُل میں، جو شور میں بگل کے　　جو چلتی گاڑیوں میں اور بہتی کشتیوں پر
گو پاس ہوں وطن کے یا دور ہوں وطن سے　　گو گرد و پیش اُن کے ہوں اجنبی سراسر
ہو وضع غیر جنکی، جن کی زباں الگ ہو　　کوئی ادا نہ جن کی ملتی ہو اِن سے تل بھر
القصہ یہ نمازی جس حال میں ہوں چپ چاپ　　سجادہ بے تکلف اپنا دہیں بچھا کر
ہوتے ہیں دل سے مصروف اسطرح بندگی میں　　گویا کہ ہیں وہ اس دم ملتجے سے اپنے گھر
کان اور آنکھ ہوتے، سُنتے نہ دیکھتے ہیں　　گویا کہ کور ہیں وہ سب کی طرف سے اور کر
ارکان دست و پا سے کرتے ادا ہیں لیکن　　روحیں حضور حق میں حاضر ہیں اُنکی یکسر

کرتے ہیں نقل و حرکت وہ اِس طمانیت سے
گویا کہ قرب حق کی چھائی ہے ہیبت اُن پر

انسان

(ناتمام)

(باجازت خاص از کلیات اسمٰعیل)

میں بھی کیا خوب ہوں مجھپر نہ کھلا راز اپنا　　نہ تو انجام ہے معلوم نہ آغاز اپنا
شاید اس بزم میں ہے مرتبہ ممتاز اپنا　　لیکن اوروں سے نرالا ہے کچھ انداز اپنا

ہوں تو بے قدر پہ مجموعۂ کل عالم ہوں
میں ہی مسجودِ ملائک ہوں اگر آدم ہوں

ابر و باد و مہ و خورشید مرے کام میں ہیں　　مرغ و ماہی و دد و دام مرے دام میں ہیں
آب و آتش مری خدمت کے سرانجام میں ہیں　　کل جمادی و نباتی مرے خدّام میں ہیں

مجھ میں قدرت نے عجب فضل و شرف رکھا ہے
میں نے فردوس کے میووں کا مزا چکھا ہے

انساں کی ناتمام تصویر اس بات کی محتاج ہے کہ مولانا ہی کا جادو نگار قلم اسمیں رنگ بھرے۔ اڈیٹر

خدا میرا نگہبان ہے

اے خداوندِ دو عالم! تو نگہباں ہے مرا　　دستِ قدرت میں ترے سررشتۂ جاں ہے مرا
جادۂ صدق و صفا میں تو ہے میرا رہنما　　تو ہی رہبر آہ! اے خضرِ بیاباں ہے مرا
موت کے سایہ کی ہیں یہ وادیاں جو پرخطر　　پھر رہا ہوں ان میں۔ کیا پھر نے سے نقصاں ہے مرا
ساتھ تو ہر وقت ہے میرے یہی مجھکو یقیں　　تو ہر اک آفت میں حامی ہے یہ ایماں ہے مرا
تو ہی یا رب میرے دستِ ناتواں کا ہے عصا　　گوئے ہمت تو ہی ہے اور تو ہی چوگاں ہے مرا

خوانِ نعمت غیب سے مجھکو عطا کرتا ہے تو / رزق پہنچاؤں بہم ورنہ کب امکاں ہے مرا
میکدے میں دہر کے ہوں آہ! وہ مستِ الست / تیرے سرجوشِ کرم سے جام جوشاں ہے مرا
تو ہی درماں ہے دلِ رنجور کا رب کریم! / کون یاں ورنہ شریکِ دردِ پنہاں ہے مرا
ڈھانک لے پردہ مرا اے میرے ستارِ عیوب / یعنی آلودہ بہت دامانِ عصیاں ہے مرا
وہ عناصر کا ہیولیٰ ہوں کہ ہوں نقشِ فنا / ہوں وہ مجموعہ کہ شیرازہ پریشاں ہے مرا
شیوۂ ملت میں میرے کفرِ نعمت ہے گناہ
شاکرِ رحمت ہوں شاکر شکر ایماں ہے مرا

شاکر (امیٹھی)

کلام برتر

میرے دوست محمود حسین صاحب رضوی دہلوی کی وساطت سے جناب مولینا برتر غازیپوری صاحب کا کلام دستیاب ہوا ہے جسکو ہم ساتھ شکریہ کے درجِ زبان کرتے ہیں اور مولینا برتر صاحب سے ملتجی ہیں کہ وہ نیچرل مضامین سے ہمیشہ اس پرچے کو مزین فرماتے رہا کریں گے۔ (ایڈیٹر)

ستمگر کون کہتا ہے نہیں خنجر کا دم اچھا / بہت اچھا ہے لیکن ہے دمِ بسمل سے کم اچھا
زیادہ مانگنا اچھا کسی سے ہے نہ کم اچھا / سوالِ اہلِ حاجت سے یہ اندازِ کرم اچھا
مصیبت اشک کی اچھی ہے فرقت کا ستم اچھا / ہمیں کیا! ہے نصیبِ دشمناں انکا کرم اچھا
خیالِ دیر اچھا ہے نہ سودائے حرم اچھا / خدائی ہے جو رہ جائے تو سب کا ہے بھرم اچھا
لگائے پر ہوائے کوچہ چاکِ گریباں نے / دلِ وحشی کو حیلہ مل گیا یہ کم سے کم اچھا
قیامت نے کہا اٹھکر تو فتنے بیٹھ کر بولے / تری رفتار اچھی ہے ترا نقشِ قدم اچھا
صدا دیتی ہے یہ رگ رگ شہیدانِ محبت کی / تری سفاکیاں اچھی ترے خنجر کا دم اچھا

کوئی پوچھے تو دل ہی وضعدارانِ محبت کے
نشاطِ چند روزہ سے ہمیشہ کا ہے غم اچھا

شباب اک چیز تھا جو لے گیا سب حسن ساتھ اپنے
شکن ابرو میں اب اچھی نہ اب زلفوں میں خم اچھا

اثر پیدا کرے گا زہر آبِ زندگانی کا
کسی دن دیکھ لو تم دیکھیے ان کی تو نسخۂ سم اچھا

زمانے میں ہے فرمایاں نگاہِ انتخاب اپنی
تمھیں کردو برا ثابت تمھیں کہتے ہیں ہم اچھا

بنایا قبلۂ مقصود اپنا کوے جاناں کو
محبت نے چکایا قصۂ دیر و حرم اچھا

یہ آخر ہمسری کب تک عدو کو ماریے گولی
خدا کیواسطے مجھ پر تو ہو کوئی ستم اچھا

غلط دعوے ہماری سجدہ ریزی کے ہیں سب لیکن
دکھادیں آپ ہی اپنا کوئی نقشِ قدم اچھا

بقدرِ حوصلہ ہوتی ہے جو شے اچھی ہوتی ہے
ترا لطف و غضب ظالم بہت اچھا نہ کم اچھا

گریباں گیر ہو دستِ جنوں صبحِ قیامت کا
الٰہی کچھ تو ہو آخر مآلِ شام و غم اچھا

مقدر کی برائی کا گلہ کیا مختصر یہ ہے
کیا احسان مجھ پر تم نے اے لوح و قلم اچھا

خدا رکھے اسے یہ تو چراغِ بزمِ رنداں ہے
ہزاروں بادہ خواروں میں ہے اک واعظ کا دم اچھا

ترے افتادۂ راہِ طلب اٹھکر کہاں جائیں
انھیں اب مل گیا ہے سایۂ نقشِ قدم اچھا

نہوتی خانۂ زنجیر میں وابستگی تنہا
پھنسا ہے ساتھ اپنے جوشِ وحشت کا قدم اچھا

خوشی جینے کی کسکو خوشی منظور ہے تری
اگر مرنا ہی اچھا ہے تو مر جاتے ہیں ہم اچھا

بہارِ خارزارِ حسرت و ارماں بری کیا ہے
کہ ہے الجھا ہوا دامن آہِ برق دم اچھا

مزاجِ دردمندانِ وفا بھی لاؤبالی ہے
کرم ان کو برا معلوم ہوتا ہے ستم اچھا

جو خط میں حرفِ مطلب تھے انھیں پہ خاک ڈالی ہے
غبار آیا کسی کے دل میں ہنگامِ رقم اچھا

خدا بھی اب اگر پوچھے تو اچھا ہے کہیں برتر
کسی بے مہر کو جب کہہ چکے ہیں منہ سے ہم اچھا

دیگر

بنایا مدعی کو تو نے ہمرازِ ستم اچھا
نہیں ہے یہ ستم او فتنہ پردازِ ستم اچھا

ستم پرور ہے تو۔ تیرا ہر انداز ستم اچھا
تری تمکین جو اچھی ترا نازِ ستم اچھا

پر افشانی ترے تیرِ نظر کی کھلتی جاتی ہر
مرا رنگِ پریدہ بھی ہے غمازِ ستم اچھا

تری پہلو تہی سے مٹ گیا لطفِ خلش آخر
ہوا زخمِ جگر اوناوکِ اندازِ ستم اچھا

تمہیں ہوتی ہے خفت یا ستمکش ہا رہے ہیں
کسی نے دیکھ لو تم دیکھے اوازِ ستم اچھا

شبابِ جور بیداد راس پیرانہ سالی پر
بنایا آسماں کو تمنے ممتازِ ستم اچھا

نظر آنے لگی صورت انہیں اپنی جفاؤں کی
تحیر بھی مرا ہے آئینہ سازِ ستم اچھا

یہ مانا اب ستم ایجاد تم جیسا نہیں لیکن
دکھا دو کوئی مجھسا بھی تو بازِ ستم اچھا

تماشا دیکھنا منظور گر ہے رقصِ بسمل کا
مرے جاں چھیڑ کر دیکھو کوئی سازِ ستم اچھا

پرانی ہو گئی تقلید گر دہ لطف کیا اسمیں
کوئی پیدا کرو اب اور اندازِ ستم اچھا

ہماری سر فروشی کی بھی اچھی قدر دانی کی
کیا اغیار کو تمنے سرافرازِ ستم اچھا

ہنسی زخمِ جگر کی بلبلو تمکے ہوش اڑاتی ہر
نہیں ہے اسقدر بھی شورِ پروازِ ستم اچھا

کسی سفاک پر مرتے ہی مرنا ہو گیا مشکل
وفا نے کر دیا مجبور اعجازِ ستم اچھا

حنا پر پہلے جو پستے تھے وہ اب ہاتھ ملتے ہیں
نہ انجامِ ستم اچھا نہ آغازِ ستم اچھا

تری آنکھوں سے ہمنے عمر بھر آنکھیں لڑائی ہیں
نہیں اب کوئی برتر سے نظر بازِ ستم اچھا

کلام ذکی

مایوس میں ہوں ذوقِ تمنا کہاں نصیب
اے چشمِ راز خوابِ زلیخا کہاں نصیب

وحشت میں اشکِ غم کیطرح ہم پڑے رہیں
زنداں میں ہائے دامنِ صحرا کہاں نصیب

چھوڑے گا صبح تک مجھے کیوں اضطرابِ شوق
فردا کا وعدہ کرتے ہیں فردا کہاں نصیب

منہ پھیر لیں بلا سے وہ حیرت میں دیکھکر
میں ہوں دوچار آئینہ آسا کہاں نصیب

پاتے ہیں نام او جگہ بزم عدو میں
ہر بوالہوس کو شوق ہے اللہ کہاں نصیب

پھولوں میں رنگ و بو تیرا کی ادا سہی
وہ شوخی بتاں خود آرا کہاں نصیب

نقش قدم وہ ہنس کے دکھا دیتے ہیں مجھے
کہتا ہوں رو کے جب دل شیدا کہاں نصیب

وہ بام پر ہیں کوچہ میں محو نظارہ خلق
آؤ نہ دیکھ لیں یہ تماشا کہاں نصیب

کمبخت بیخودی سے گیا ہائے مشغلہ
کیجے خیال صورت زیبا کہاں نصیب

پیری میں گریہ آنکھوں کا کچھ شیوہ ہو گیا
وہ جلوہ ہائے شاہد رعنا کہاں نصیب

مدت سے میں مریض غم ہجر ہوں ذکی
وہ آئے دیکھنے کو یہ میرا کہاں نصیب

حیرت میں بھی باقی ہے مجھے جوش محبت
آنکھیں دم دیدار ہیں سے نوش محبت

پھر جاتی ہیں محفل میں اگر اور کو دیکھوں
اُس شوخ کی آنکھیں ہیں خطا پوش محبت

اقرار کیا تھا کہ تغافل نہ کریں گے
کچھ یاد ہے او وعدہ فراموش محبت

عاشق کو یہ راحت کبھی پہلے نہ ملی تھی
مرقد کو بجا کہتے ہیں آغوش محبت

ہنسنے ہی سے تم گل چمن حسن کے ٹھیرے
میں چپ ہوں تو ہوں بلبل خاموش محبت

جو بات نہ تھی کہنے کی منصور نے کہدی
یوں خانہ برانداز ہوا جوش محبت

سُننے کو ترے تیرے پیغام زبانی
میرا دل صد رخنہ بنا گوش محبت

آئینۂ حیرت میں ہے مصروف تماشا
محروم نہیں جلوے سے مدہوش محبت

نظارہ کا ہے لطف وہ آئے سر بالیں
ہے تلخی مردن ثمر نوش محبت

یہ سر سے چلائے تو چلوں تا دم آخر
منقاد محبت ہوں رضا کوش محبت

بڑھتا ہی گیا اُسکے تعلق کے برابر
ہے رشک عدو ہمسر و ہمدوش محبت

جو چاہو ذکی کو کہو القاب بہت ہیں
دیوانہ و سرگشتہ و بیہوش محبت

کلام شیفتہ

خواہاں ہوں بوئے باغ تنزہ شمیم کا | یارب ادھر بھی بھیج کبھی جھونکا نسیم کا
تیرے گدا کو سلطنت جم سے کیا کہ ذوق | ہے کاسہ شکستہ میں جام دو نیم کا
نیرنگ جلوہ بار دھ ہوش سوز ہے | کیا امتیاز رنگ سے کیجئے شمیم کا
تیری نسیم لطف سے گل کو شگفتگی | وابستہ تیرے حکم پہ چلنا نسیم کا
واجب کی عقل آئے گی ممکن کی عقل میں | کتنا دماغ ہے خلل آگیں حکیم کا
وقت سے پہلے عجز سلامت کی راہ ہے | کیسا سپاس دار ہوں عقل سلیم کا
میری فنا ہے مشعلہ محفل بقا | پروانہ ہوں میں پرتو شمع قدیم کا
گر تیری شوق میں ہیں یہی بیقراریاں | لے لونگا بوسہ پایۂ عرش عظیم کا
طاعت اگر نہیں تو نہو یاس کس لیے | وابستہ سبب ہے کرم کب کریم کا
جس وقت تیرے لطف کے دریا کو جوش آئے | فوارۂ جناں ہو زبانہ جحیم کا

اے شیفتہ عذاب جہنم سے کیا مجھے
میں امتی ہوں نار و جناں کی قسیم کا

جب رقیبوں کا ستم یاد آیا | کچھ تمہارا بھی کرم یاد آیا
کب ہمیں حاجت پرہیز پڑی | غم نکھایا تھا کہ سم یاد آیا
وہ لکھا خط کہ خط پیشانی | مجھکو ہنگام رقم یاد آیا
شعلۂ زخم سے لے صید افگن | داغ آہوئے حرم یاد آیا
ٹھیرے کیا دل کہ تری شوخی سے | اضطراب سپے ہم یاد آیا
خوبی بخت کہ پیمان عدو | اسکو ہنگام قسم یاد آیا

وہ مرا دل ہے کہ خود بینوں کو　　دیکھکر آئینہ کم یاد آیا
ایسے خود رفتہ ہوا ہے شیفتہ کیوں
کہیں اُس شوخ کا رم یاد آیا

کلام شبلی

مست و پر عربدہ تنگش بکشم در آغوشش　　تشنۂ وصل و تمائے بہ محابا باشم
بادہ ہر چند تہ خرقہ تواں نیز کشید　　نرگسِ مست کسے خواست کہ رسوا باشم

گردم از مدحتِ شیرازہ صفاہاں زدہ ام　　سرم بادم کہ نواہائے پریشاں زدہ ام
ساغر زندگیم (حیف) کہ جز درد نداشت　　جرعہ ہمیں جرعۂ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام
اندکے نیز، بہ کام دلِ خود بیں باشم　　روزگارے چو دم از دانش و عرفاں زدہ ام
چند در پردہ تواں کرد سخن، فاش بگوی　　سنگ بر شیشۂ تقوی زدہ ام ہاں زدہ ام
ان نگارِ عجمی چہرہ بد انساں فروخت　　کاتش آوردم و در خرمنِ ایماں زدہ ام
ہاں وہاں دست بدارید ز من اے احباب　　کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پیماں زدہ ام
کس چہ داند کہ بہ خلوت گہ آں ماہِ تمام　　زدہ ام ساغر و بر یادِ حریفاں زدہ ام
بے تواں بُرد کہ ایں زمزمہ بے چیزے نیست
شبلی ایں تازہ نواہا نہ چو مستاں زدہ ام

دھوپ چھاؤں

کانگرس | جیسا کہ ہمارے ناظرین کو معلوم ہے۔ کانگرس کا پچیسواں سالانہ جلسہ اس سال الہ آباد میں ہوا تھا۔ ڈیلی گیٹس اور حاضرین کی تعداد بھی کافی تھی۔ سر ولیم ویڈبرن پریسیڈنٹ جلسہ کی تقریر کو بھی اکثر لوگوں نے پسند کیا۔ مگر کانگرس کے مشہور لیڈرز یعنی مسٹر گوکھلے اور بابو سرندرو ناتھ بنرجی وغیرہ میں سے نہ تو کسی نے کوئی روزلیوشن پیش کیا اور نہ کسی کی تائید کی۔

مسلمان اسپیکروں میں سے ایک صاحب نے مسلم لیگ کا ذکر کرتے ہوئے چند لفظ خلاف تہذیب استعمال کئے تھے جن پر پریسیڈنٹ نے اسپیکر صاحب کو روک دیا۔ اور بابو سرندرناتھ بنرجی نے فرمایا کہ گو ہمارے اصولوں میں اختلاف ہے تو بھی ہمیں اپنے اصول اور تہذیب کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

کانگرس ڈیپوٹیشن سے ملاقات کرکے لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر والیسرائے ہند نے ایک اچھی مثال قائم کی۔ کانگرس کے دعووں پر خیال رکھنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ خدا کرے آپ کا وعدہ عملی صورت اختیار کرے تاکہ پبلک کا اعتبار قایم ہو۔

مسلم لیگ | مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ اس سال ناگپور میں ہوا تھا۔ لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ پریسیڈنٹل اسپیچ اس شان کی نہ تھی جیسی کہ پہلے ہو چکی ہیں۔ مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ کی اسپیچ میں ذرا مدبری اور دوراندیشی سے کام لینا چاہیے تھا اور کسی خاص خیال کے لوگوں کا ان لفظوں میں ذکر نہ کرنا چاہیے تھا جس طرح کہ پریسیڈنٹ صاحب نے فرمایا۔

محمدن یونیورسٹی | ہمیں یہ سنکر از حد خوشی ہوئی کہ ہندوستان کے مسلمان ایک یونیورسٹی قائم کر رہے ہیں۔ خدا اُن کو اُنکی آرزوؤں میں کامیاب کرے۔ اس انسٹوٹیوشن سے قوم میں یگانگت بڑھے۔ تعلیم کو ترقی ہو کیونکہ کیا ہندو۔ کیا مسلمان قوم کو تعلیم کی از حد ضرورت ہے۔

نمائش الہ آباد | نمائش کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ دسمبر آخر اور شروع جنوری میں نمائش کی وجہ سے الہ آباد میں اچھی رونق رہی۔ لیکن نمائش کو بجائے نمائش تماشہ کا خطاب ملا۔ اور خالص ہندوستانی نمائش بھی نہ رہی۔ کیونکہ روپیہ زیادہ تر تفریح کے کاموں اور ولایتی ڈھنگ کی چیزوں دکھانے میں صرف کیا گیا۔ ایک بڑی فحش غلطی تو کارکنانِ نمائش کی یہ ہے کہ انہوں نے کالج کے ایک پروفیسر کو بھیج کر کلکتے سے گوہر جان نامی ایک طوائف کو بلوایا اور اس پر یہ ستم کیا کہ طوائفوں کا ناچ اور ناز وغیرہ دکھانے کے لئے طالب علموں کو خاص رعایت اور کم قیمت پر ٹکٹ دیئے۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ آمدنی کی لالچ سے طوائفوں کا ایک خاص سکشن بنا کے طالب علموں اور پبلک کی زیادہ دل لگی کا سامان پیدا نہ کیا۔ ورنہ اگر آمدنی میں کچھ کمی رہ گئی ہے تو وہ بھی پوری ہو جاتی۔ ہم کارکنانِ کو تو کیا کہیں۔ لیکن افسوس بے شمار کانفرسوں اور اپنے ملکی لیڈروں پر ہے جن سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ کسی کانفرنس میں ایک تو رزولیوشن اس خلاف تہذیب فعل سے ناراضی ظاہر کرنے کے لئے پاس کر دیتے۔ اور تو اور سوشل کانفرنس سے بھی اتنی جرأت نہ ہوئی۔ ان کے سامنے پنجاب کی مثال موجود تھی۔ جہاں پچھلے سال اسی قسم کی کارروائی کا خیال نوٹس لینے پر فوراً روک دیا گیا۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایسی باتوں کا خیال رکھا جائیگا اور ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ کے ممبر ایسے بعید از اخلاق کاموں سے پرہیز کریں گے جن کی وجہ سے طالبعلموں کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے۔

ٹمپرنس کانفرنس | اس انجمن کا منشا تمام نشے والی چیزوں کی ترقی کو روکنا ہے کیونکہ شراب وغیرہ نشیلی چیزوں کی ہندوستان میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اس سال کی کارروائیوں میں ہم نے اس جملہ کو بڑی خوشی سے پڑھا ہے کہ گورنمنٹ بمبئی نے اپنے تمام صوبے میں ہولی اور محرم کے دنوں میں شراب بیچنے اور شراب کی دوکانیں کھلی رکھنے کی ممانعت کر دی ہے۔ عید۔ بقرعید۔ ہولی۔ دیوالی پر شراب زیادہ پی جاتی ہے۔ اگر گورنمنٹ ان موقعوں پر شراب بیچنے کی ممانعت کر دے تو ہندوستانیوں پر بڑا احسان ہو۔ مانا کہ گورنمنٹ کسی سے نہیں کہتی کہ تم شراب ضرور پیو۔ لوگ خود اپنی بیوقوفی سے اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارتے ہیں۔ لیکن اپنی رعایا کو ایک بُرے رستے سے بچا

گورنمنٹ کا فرض ہے۔ ہم ہر ایک صوبے کی گورنمنٹ اور والیسرائے کی کونسل کے ممبروں سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے صوبوں کی گورنمنٹ کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کریں اور بمبئی گورنمنٹ کی طرح کم از کم تہواروں پر شراب بیچنے کی ممانعت کرادیں۔

ہندو مسلمانوں کا ایکا | ہندو مسلمانوں میں ایکا کرانے کے لئے اس سال ایک جلسہ ہوا اور اس معاملہ پر غور کرنے کے لئے چند چیدہ ہندو مسلمانوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی جو ان تجویزوں پر غور کرے گی جس سے آپس میں میل ہوجائے۔ ہم صرف ایک یا دو بات اس معاملہ پر پیش کرتے ہیں۔

اول۔ اُن اخبارات کا بندوبست کیا جائے جو محض اپنی شہرت اور ٹکے کمانے کے خیال سے قوموں کو لڑوارہے ہیں۔ بھولی بھالی پبلک ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر ان کو اپنا خیرخواہ اور قومی لیڈر سمجھ کر۔ ایک دوسرے سے خواہ مخواہ لڑ پڑتی ہے۔ سب سے پہلا کام ان کی لگائی ہوئی آگ پر پانی ڈالنا ہونا چاہیے۔

دوسرے گاؤکشی کا مسئلہ ہے بجائے ضروری کے ایک معمولی سی حیثیت دی گئی ہے۔ گاؤکشی کے رُکنے سے یہ ہی نہیں کہ جُہلا کے فساد رکیں گے بلکہ گائے کا سوال ملک کا ایک تمدنی مسئلہ ہے اور گائے کی حفاظت کرنے سے دونوں قوموں کا فائدہ ہے۔ خدا کرے وہ دن جلد آئے کہ آپس کی کدورت رفع ہوکر۔ دونوں قومیں ملکر ترقی ملک کے لئے کوشش کریں۔

موحدوں کی کانفرنس | یہ کانفرنس اُن لوگوں کی ہے جس کے پیرو ہر ایک مذہب کے بزرگوں کی عزت کرتے ہیں۔ سوائے ایک خدا کے کسی کو نہیں مانتے۔ لیکن عجیب بات اس کانفرنس کی یہ سننے میں آئی ہے کہ کانفرنس کے کارکنوں نے ایک ایسے رزولیوشن کو جو کانفرنس میں پیش ہوکر پاس بھی ہوگیا۔ کارروائی کی رپورٹ میں شامل نہیں کیا اور نہ اخباروں میں چھپا۔

ہمارے خیال میں تو ایسے باخلاق سکرٹری یا کارکنان کانفرنس کو آئندہ پبلک پلیٹ فورم پر نہ آنا چاہیے کیونکہ ان سے ایک اخلاقی جرم سرزد ہوا ہے۔

لیڈیز کانفرنس | یہ عورتوں کی کانفرنس ہے۔ اس سال اس نے ہندوستان۔ ملک کی

معزز خاتونوں نے جمع ہوکر ہندوستان کی عورات کی ترقی کے وسائل پر گفتگو کی ۔ خدا ہماری معزز بہنوں کو ان کے ارادے میں کامیاب کرے ہماری معزز خاتونوں کو اس قابل بنائے کہ وہ ہمارے ارادوں میں ہماری مدد کرسکیں ۔

ہندو مسلمانوں کی سچی صلاح | ماہ جنوری کے واقعوں میں سنہری حرفوں میں لکھے جانے اور دونوں قوموں کے عمل کرنے کے لائق یہ واقعہ ہے کہ لکھنؤ کے سکھ صاحبان نے اپنے مسلمان بھائیوں کے خیال سے اپنے گرو کا جنم اتسو یعنی سالگرہ چند روز کے لئے ملتوی کردیا ۔ ایک خاص مسجد کے پاس باجا بھی بند کردیا ۔ اس احسانمندی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے چند معزز مسلمانوں نے گردوارے میں جاکر سکھوں کا شکریہ ادا کیا ۔ جلوس کے دن سیکڑوں مسلمانوں نے جمع ہوکر سکھوں کی ہمدردی پر اظہار خوشنودی ظاہر کیا ۔ اگر سکھوں نے ہندو مسلمانوں میں سلوک کرانے کی ایک عمدہ مثال قائم کی ہے تو مسلمانوں نے اسکا شکریہ ادا کرکے اپنی شرافت کا ثبوت دیا ہے ۔ اگر ہندو مسلمان اسی طرح ایک دوسرے کے فیلنگ ۔ جذبات اور خیال کا خیال کرلیا کریں تو روز کی تو تو میں میں جاتی رہے ۔ آپس کی سر پھٹول ہونے کے نظارے دیکھنے میں نہ آئیں ۔ عدالتی کارروائیوں میں قوم کا روپیہ ضائع نہ ہو ۔ اگر ہندو محرم کے دنوں میں اپنی خوشی کی تقریبیں نہ کیا کریں اور مسلمان گاؤکشی سے پرہیز کرلیں تو آج فساد کی جڑ جڑ سے کٹ جاتی ہے ۔ ہندو مسلمانو! خدا کے لئے ۔ ایشور کے لئے لکھنؤ والوں کے اس پیش قدمی سے سبق لو اور تم بھی اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو ۔

جملہ معترضہ | ہم اپنے ناظرین کی دلچسپی اور ایک ضروری بات پر روشنی ڈالنے کے لئے ۔ دلی کے رہنے والے دو اشخاص کی گفتگو سے چند لفظ نقل کرتے ہیں ۔ جن میں ایک صاحب تو کسی انجمن کے کارکن ہیں اور دوسرے ایک معمولی طالب علم ۔

طالب علم ۔ کیوں جناب آپ اس سال الہ آباد تشریف لے گئے تھے ۔

کارکن ۔ ہاں گیا تھا ۔

طالب علم - سنتے ہیں اس سال الہ آباد میں بہت سے جلسے اور کانفرنسیں ہوئیں۔

کارکن - ہاں الہ آباد میں اس موقع پر کانگریس - سوشل کانفرنس - پٹرنس کانفرنس - انڈسٹریل کانفرنس - شدھی سبھا - عورتوں کی کانفرنس - ویش سبھا - کھتری سبھا - برہمن سبھا - ناگری پرچارنی سبھا - آریہ سبھا - راجپوت سبھا وغیرہ بہت سے جلسے ہوئے۔ وجہ یہ ہے کہ کانگریس کی وجہ سے ایسے موقعوں پر ملک کے ہر حصے سے چیدہ چیدہ اور لایق لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ان تمام سبھاؤں کا ایک جگہ جلسہ ہونے سے وہ ہر ایک میں شریک ہو سکتے ہیں۔

طالب علم - کیوں جناب چونکہ اس سال دلی میں دربار ہونے والا ہے - دربار کی وجہ سے دلی میں بہت سے لوگ جمع ہونگے اگر اس سال یہ تمام جلسے دلی میں ہوں - لوگ اچھے اچھے لیکچر سنیں تو پبلک پر اچھا اثر پڑے۔

کارکن - یہ ٹھیک ہے لیکن دربار کی وجہ سے دلی میں مکانوں کا کرایہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ توبہ ہی بھلی جہاں ایسے جلسے ہوتے ہیں - مہمانوں کے ٹھیرانے کے لئے مکان اکثر مفت مل جاتے ہیں۔ جلسوں کے لئے ہال بھی خالی ہوتے ہیں - کام کرنے کے لئے مددگار بھی اور خدمت پیشہ بھی آسانی سے اور سستے داموں پر مہیا ہو جاتے ہیں - دربار کے موقعہ پر دلی میں نہ تو مکان ملینگے نہ منڈوے بنانے کو میدان - نہ کام کرنے کو مددگار - خدمتی اور مزدور اول تو ملنے مشکل ہونگے۔ دوئم اگر ملے بھی تو چوگنے داموں پر - اس لئے اور جگہ ایک آنہ خرچ ہوتا ہے تو اس سال دلی میں کسی کانفرنس کو مدعو کرنے سے پانچ روپیہ خرچ ہونگے اور اس پر بھی مہمانوں کی خاطر تواضع نہ ہو سکیگی کیونکہ نہ لیکچر کو جگہ ملے گی نہ مہمانوں کو ٹھیرانے کے لئے مکان نہ آنریری واکر نہ خدمتی - اگر کسی نے کسی کو مدعو بھی کیا تو شاید کام پورا اترے کیونکہ ایسے موقع پر اپنے ذاتی مہمانوں سے فرصت ہی نہ ہوگی۔

اخبار نویس

نوٹس

برہمن | ہندوؤں کو چار ذاتوں پر تقسیم کرکے۔ براہمنوں کو سب سے اعلےٰ درجہ دینے کی عقلمندی کا راز اُسوقت سمجھ میں آتا ہے جب براہمنوں کے فرض پر نگاہ ڈالی جاتی ہے۔

جیسا کہ آجکل خیال ہے۔ براہمن۔ خالی سپرچوئل یعنی روحانی گروہی نہ تھے۔ بلکہ ہر پیشہ ور کی رہبری کرنا اور ہر ایک ہنر کی تعلیم دینا اُنکا فرض سمجھا جاتا تھا۔ تجاروں کو تجارتی اور تمدنی ترقی کی راہ بتانا۔ حکمرانوں کو ملکی انتظام کے اصول سکھانا اور چھتری بچوں کو جنگی تعلیم دینا براہمنوں کے سپرد تھا۔

کہیں تو ایک برہمن جنگل میں جھونپڑی بنائے۔ کسی پہاڑ کی کندرا میں آسن جمائے علمی تحقیقات یا کسی مسئلہ کو حل کرنے میں مصروف ہے۔ کہیں معتقدوں کے حلقے میں بیٹھا ہوا روحانیت کے اصول بیاں کر رہا ہے۔ کہیں راجا کا وزیر بن کر راجہ اور رعیت کے فرض بتا رہا ہے۔ اور کہیں خود تیر کمان لئے راج پتروں کو ہتیاروں کا استعمال کرنا اور جیسا کہ آپ رسالہ کے شروع کی تصویر میں ملاخط فرماتے ہیں۔ تیر کمان چلانا سکھا رہا ہے۔

آجکل کے اُستادوں کی طرح تنخواہ لے کر تعلیم دینے اور فیس لے کر علاج کرنے یا کسی خواہش سے پبلک کی خدمت کرنے والا براہمن نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ ہندو لا کے اصول سے برہمن وہ ہے جو بھیک مانگ کر یا جنگل کے پھل پھول کھا کر گزارہ کرے۔ اور بلا کسی عوض یا خواہش کے پبلک خدمت کرنا۔ بھولے ہوؤں کو رستہ بتانا اور دنیا والوں کی بہتری کے لئے جینا اپنا فرض سمجھے۔ خواہشوں کو روک کر پہلے خود علم حاصل کرے۔ ہر فن اور ہر ایک ہنر کو پایۂ تکمیل

تک پہنچائے اور پھر اپنی زندگی اپنا علم و ہنر اور وقت دوسروں کے لئے وقف کردے۔

یہی وجہ تھی کہ ان اصولوں پر عمل کرنے والوں اور ایسے کامل اور پاک زندگیوں یعنی براہمنوں کی ہر جگہ عزت ہوتی تھی۔ ایسے لوگ دنیا میں باعث برکت خیال کئے جاتے تھے۔ اور قوم اُن کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔

خدا کرے کہ ہندوستان کا نصیب جاگے اور یہاں ایسے انسان پیدا ہونے لگیں جنکی زندگی کا مشن۔ بے غرضانہ پبلک خدمت کرنا ہو۔

شبیہ خان بہادر شمس العلما منشی ذکاء اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ دہلوی۔ نہایت افسوس ہے کہ منشی صاحب مرحوم کی سوانحعمری جس کے مرتب کرنے کا وعدہ ماہ دسمبر سنہ ۱۰ء کے واسطے ان کے ایک عزیز نے کیا تھا اسوقت تک ہمارے پاس نہیں آئی لہذا شبیہ منشی صاحب مرحوم بغیر سوانح عمری شایع کی جاتی ہے۔

ناظرین زبان کی واقفیت کے واسطے رسالہ زبان نمبر ۵ سنہ ۱۰ء میں مختصر حالات منشی صاحب مرحوم کے شایع کرچکے ہیں۔

پلیگ۔ موسمی بخار کی طرح پلیگ بھی اب ہر سال ان اطراف میں جاڑوں کے اختتام پر دورہ لگانے لگا ہے جسکی وجہ ایک جرم ہے جو زیادہ تر بذریعہ چوہے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا ہے۔ کیونکہ جس محلہ میں پلیگ ہوتا ہے وہاں سے چوہے نکل کر دوسرے محلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ چوہے سے انسان میں پلیگ کا زیادہ تر جرم پسّو کے ذریعے پہونچتے ہیں۔ اس شہر میں پلیگ کی رفتار پر مشاہدے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص خاص محلوں میں پلیگ کے اجرام دبا کے دفعہ ہونے کے بعد بھی بے ضرر شکل میں موجود رہتے ہیں۔ کیونکہ ہر سال انہی محلوں سے پلیگ شروع ہوتا ہے۔ جہاں پہلے ہوچکا تھا اور پھر چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔

رسالہ زبا

بہتر ہے کہ ان محلوں کے مکانات کے فرش اور بدرو درست کردی جاویں جو کہ اتنا بڑا کام ہے کہ کسی فرد بشر کے اختیار میں نہیں اور نہ میونسپلٹی کو سروست اتنی فرصت ہے کہ اس طرف متوجہ ہو۔ پلیگ کے پھیلنے پر سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان محلوں کو چھوڑ کر کسی اور کھلی جگہ میں جا کر کچھ عرصہ کے لئے قیام کریں۔ شہر کے اندر ایک محلہ سے دوسرے میں جانے سے وہاں بھی پلیگ پھیل جاتا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کے لئے شہر کے باہر رہنا بھی بہت ہی مشکل ہے۔

علاوہ کھانے۔ پینے۔ رہنے سہنے اور کام کاج کے ایک سب سے بڑا ڈر چور اور قزاقوں کا رہتا ہے۔ چونکہ اپنے آپ حفاظت کرنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں اسلئے بہت سے اشخاص قزاقوں سے پلیگ کو بہتر سمجھتے ہیں۔ نہیں تو شہر ابتک باہر دور تک ایک نیا شہر آباد ہو جاتا اسمیں بھی شہر والوں کو گورنمنٹ کی مدد کی ضرورت ہے۔ گو کہ اس شہر میں چوہے کچھ کچھ پکڑوائے گئے۔ لیکن اکثر اشخاص نے اپنے مکان کے چوہے پکڑ کر دوسرونکے مکان میں چھوڑ دیئے۔ لہذا ایسے لوگوں کی زیادہ ضرورت ہے جو ہر روز لوگوں کے گھروں میں چوہے دانوں سے چوہے نکال کر لے آئیں اور وہ باقاعدہ ضائع کر دیئے جائیں۔ اگر میونسپلٹی فی چوہا کچھ انعام مقرر کرے۔ تو غالباً یہ کام زیادہ سرگرمی سے ہو۔ آخر ہی فرد بشر کی حفاظت اس کے لئے ہوکن صاحب کے ٹیکہ کو بہت بے ضرر و قابل اطمینان سمجھتے ہیں۔ اسکی بابت جو اعتراضات مشہور کئے گئے ہیں وہ ہم دو دفعہ کے ٹیکہ لگوانے کے ذاتی تجربے اور بہت سے قابل اطمینان اشخاص کے بیان کو غلط سمجھتے ہیں۔

ہم ناظرین رسالہ زبان کو یہی صلاح دینگے کہ خدانخواستہ اگر اُنکے ہاں یہ وبا ے طاعون پہلے تو وہ ضرور ٹیکہ لگوائیں۔ جس سے صرف دو دن تک خفیف حرارت سی محسوس ہوسکتی ہے اور کسی قدر قبض رہتا ہے لیکن تقریباً چھ ماہ کے لئے اس موذی مرض سے بچاؤ ہوسکتا ہے۔

THE ZABAN -DELHI



SHAMS-UL-ULAMA MOLVI ZAKA-ULLA

نباتی غذا۔ مس نکلسن سکرٹری انجمن حامیان نباتی غذا لندن نے ۱۹۰۸ء میں بیس ہزار بچوں پر متواتر چھ ماہ تک یہ تجربہ کیا کہ نصف تعداد کو نباتی غذا دی گئی۔ باقیوں کو معمولی غذا (جس میں گوشت شامل ہوتا ہے) دی۔ اس میعاد کے اختتام پر فریقین کا امتحان جسمانی ڈاکٹروں کے ذریعے کرایا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نباتی غذا پر پرورش شدہ بچے دوسرے فریق سے صحت میں بہتر وزن میں بھاری۔ عضلاتی طاقت میں زیادہ اور جلدی حالت میں بہتر پائے گئے۔ اسی زمانہ میں امریکہ کی ییل یونیورسٹی کے ڈاکٹر فشر اور برسلز یونیورسٹی کی معلمہ ڈاکٹر مسمات ٹوٹی کو نے الگ الگ سلسلہ تجربات سے یہ ثابت کیا کہ نباتی غذا کھانیوالوں کے عضلات بمقابلہ گوشت کھانے والے اشخاص کے دیر میں تھکتے ہیں۔ فرانس کی طبی اکاڈمی نے ڈاکٹر ٹوٹی کو ان تحقیقات کے صلہ میں ایک بیش بہا انعام عطا کیا جو نہ صرف انہیں کے لئے باعث فخر ہے بلکہ حامیان نباتی غذا کے لئے ایک مستند طبی انجمن کی تائیدی شہادت ہے۔

شراب۔ اکثر اشخاص شراب خوش مستی کے لئے پیتے ہیں لیکن اسمیں بہت سے ایسے ہیں کہ جنکو دوسروں کے بتانے یا اپنی دل کی تسلی کے لئے ایک "وجہ معقول" کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ شراب گرم ہے لہذا سردی کے دنوں میں اسکا استعمال مفید ہے۔ غالباً یہ غلط فہمی اطبا کے ادویہ کا مزاج قایم کرنے سے ہوئی ہے۔ شراب کو گرم اس لئے بتایا جاتا ہے کہ اسکو پینے سے دہن و معدہ کے اندر جو ایک قسم کی خراش پیدا ہوتی ہے اُسکا اثر طبیعت پر بانند ایک قسم کی سوزش کے محسوس ہوتا ہے جیسے کہ مرچ یا دیگر تیز چیزوں کے کھانے سے ہوتا ہے لہذا عوام الناس مرچ وغیرہ گرم مصالحے اور شراب کو گرم سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کوئی ہرج نہیں۔ لیکن اس استدلال سے جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ نہ صرف بالکل لغو بلکہ خطرناک بھی ہے۔ چونکہ شراب علاوہ دہن و معدہ میں سوزش پیدا کرنے کے عارضی طور پر قلب کی تحریک سے دوران خون کو بھی تیز کرتی ہے اس لئے اسکے استعمال سے سطح جسم پر ایک قسم کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ پس اس خیالی حرارت کے دھوکے

میں نہ صرف عوام الناس بلکہ طبی اشخاص بھی مدت تک اس غلطی پر رہے کہ شراب گرم ہے۔ محرک قلب ہے۔ کھانے کو ہضم کرتی ہے۔ جسم کو قوت بخشتی ہے دماغ کو روشن کرتی ہے وغیرہ وغیرہ پھر تو میخواروں کی بن آئی۔ موسم سرما میں تو اکسیر ہی بن گئی اور گرمیوں میں بغیر اسکی مدد کے نیند کہاں اور برسات کی تو کیا ہی بات ہے کہ ایسے بہار کے موسم میں کوئی ذریعہ تفریح نہو۔ الغرض شراب اُنگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑتی ہے۔

کہاں موسم سرما کے لئے واقعات کے برعکس ایک جھوٹی دلیل سے اسکو جائز سمجھا گیا اور کہاں ہر موسم کے لئے یہ ضروری نعمت بن گئی۔ بیاہ شادی میں اسکا دور چلنے لگا۔ ایک طرف تو ناخواندہ جہلا نے اسکو اپنا ذریعہ تفریح قائم کیا۔ دوسری طرف پڑھے لکھے بابو لوگوں نے تمام قدیم احکام مذاہب اور ہدایت اخلاق کو بالائے طاق رکھکر اسکو جدید تمدن فرنگ کا سرتاج سمجھکر اپنی تہذیب کی دیوی قرار دیا۔ اور ان میں جو ذرا متمول سمجھے جاتے ہیں مثلاً ڈاکٹر و حکیم اور وکیل وغیرہ اُنکی نشستگاہوں میں کنٹر دیوی کی پرستش بجائے لکشمی جی کے ہوئی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جس کے گھر میں کنٹر نہیں اُسکی کوئی آمدنی نہیں اور اسکی کوئی لیاقت نہیں۔ لہذا کنٹر دیوی اور اُسکے لوازمات جنکا بیان کرنا نامناسب سمجھتا ہوں ہمارے ہاں کی فیشنیبل سوسائٹی کا عزت کا میزان ہے۔

اب واقعات کو دیکھئے جدید تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ شراب بجائے محرک قلب ہونے کے ساکت قلب ہے۔ بجائے گرم ہونے کے سرد ہے کیونکہ یہ چند کیمیائی تبادلات کو جو جسم انسان میں حرارت قائم رکھتے ہیں کسی حد تک ساکت کرتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ جلدی دوران خون کو بڑھا کر سطح جلد سے جسمانی حرارت کو جلد خارج کرتی ہے اسلئے موسم سرما میں اسکا استعمال خاص طرح مضر ہے۔ کیونکہ مے نوشی ایک تو طبیعت پر خیالی حرارت محسوس ہوتی ہے دوسرے میخوار اسے جھوٹے اطمینان سے اپنے جسم کو کپڑوں سے کافی محفوظ نہیں رکھتا۔ لہذا اسکا استعمال بہ نسبت گرمی کے سردی میں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔

معدہ۔ جسم اور دماغ پر اسکا جو کچھ اثر ہوتا ہے اُسکا کسی اور موقع پر بیان کیا جائیگا۔

آب پاشی ۔ صیغۂ آبپاشی میں سائنس کی مدد سے نہر کی کھودائی ۔ چوڑائی ۔ گہرائی ۔ سطح پانی کی بلندی ۔ تراش چہال ونصبی قلابہ جات کی ساخت ہوتی ہے ۔ الا اس ترکیب سے عمل ہوتا ہے کہ ہر قطرہ پانی کا جو نہر میں رواں ہو محفوظ رہے لیکن افسوس ہے کہ جب پانی بغرض آبپاشی حوالہ کاشتکاران کیا جاتا ہے بالکل سائنس کے خلاف کارروائی ہوتی ہے ۔ کھیتوں میں کیاری نہیں بنائی جاتی بلا اندازہ اناپ شناپ پانی دیا جاتا ہے جس سے بسا اوقات پیداوار میں کمی ہوتی ہے حتیٰ کہ تلف ہو جانے کی نوبت کہیں کہیں آجاتی ہے ۔ اور گولوں کی صفائی نہ ہونے سے بکثرت پانی ضائع جاتا ہے ۔ بتجربہ کیا گیا ہے کہ ایک چھ انچہ کے قلابے سے جس کا ڈسچارج (اخراج) فی سیکنڈ ایک مکعب فٹ ہو ایک دن رات میں ۰۰۰۰۰ فٹ مکعب پانی خارج ہوگا ۔ جناب برسفورڈ صاحب بہادر نے فرمایا ہے کہ اس مقدار پانی سے ۹ ۔ ایکڑ کی آبپاشی ہونی چاہیے کہ جن میں تری ۱۲ ۔ انچہ سطح زمین سے نیچے تک پہونچے گی جو ۴ ۔ انچہ پانی سطح کھیت پر پہنچانے سے میسر ہو سکتا ہے مگر موجودہ مروجہ عمل سے بمشکل ۳ ۔ ایکڑ کا اوسط پڑتا ہے بلکہ بعض دفعہ اس سے بھی کم ۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر پانی بطریق سائنس مستعمل ہو تو آبپاشی بہت زیادہ ہو سکتی ہے ۔ ایک کاشتکار کو ہم نے چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا کر صرف ۴ ۔ انچہ اونچا پانی سطح کھیت میں پھیلاتے ہوئے آبپاشی کرنے کی ہدایت کی جس سے واقعی اُس کاشتکار کو فائدہ پہنچا یعنے بمقابلہ اوقات گزشتہ کے اس پیرہ میں اُسکی آبپاشی قریب دوچند کے ہوئی اور پیداوار میں بھی فرق ہوا یعنی زیادہ ہوئی ۔ حالانکہ اُس نے پابندی پوری نہ کی تھی ۔

آیندہ ہم بتلائیں گے کہ پانی کا استعمال بطریق سائنس کس طرح پر ملک امریکہ میں ہو رہا ہے ۔ اس وقت کاشتکاروں سے یہی استدعا ہے کہ اپنے کھیت میں چھوٹی چھوٹی کیاریاں کر جو ایک بسوہ پختہ کی ایک کیاری کے برابر ہوں چار انچہ اونچا پانی سطح کھیت میں پھیلا کر آبپاشی کریں ۔

کلیات اسمٰعیل - جنوری ۱۹۱۱ء میں اورنیٹل پبلشنگ کمپنی نے میرٹھ سے شایع کیا ہے قیمت مجلد فی نسخہ کی چار ہے - ریویو کسی آیندہ نمبر میں کیا جائیگا - مگر اتنا لکھنا خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ ابتک جس قدر ریویو کلیات اسمٰعیل کے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ پرانی روش کی تقریظیں ہیں اور زمانہ حال کا مذاق چاہتا ہے کہ تنقید کامل ہو - اس صنف میں لٹریری میگزینیں ملک ایک نہایت اہم خدمت کرسکتے ہیں - اور اپنے ناظرین کو خوگیر کی بھرتی کے خریدنے سے باز رکھ سکتے ہیں - مگر افسوس ہے کہ اس طرف باوجود خداداد قابلیتوں کے بھی اڈیٹران رسائل واخبارات مائل نہیں ہوتے -

---

عظیم الشان مشاعرہ - انجمن اتحاد سخن دہلی کا ایک عظیم الشان مشاعرہ بتاریخ ۲۵ فروری ۱۹۱۱ء بروز ہفتہ بوقت شب بر مکان جناب کنور بدری کشن صاحب واقع نئی سڑک دہلی طرح ذیل پر منعقد ہوگا - اُن صاحبان سے التماس ہے کہ جو بیرونجات سے اس مشاعرہ میں شرکت کریں وہ اپنی آمد کی اطلاع کم از کم ۴ یوم قبل سکرٹری انجمن ہٰذا کو دیدیں تاکہ وقت مقررہ پر ٹھیرانے میں دقت نہو -

طرح - کیوں تمنے بٹھا رکھا ہے پردہ میں حیا کو - حیا قافیہ

پیش طرح - اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ - زغن قافیہ

"مگس"

حمایت بیوگان

بموجب فرمایش سکرٹری صاحب بدہوا سہایک سبھا ہندوستان - آیندہ سے اس رسالہ میں - بیوگان کی حالت زار پر پبلک کی توجہ دلانے کے لئے مسئلہ بیوگان پر بھی بحث ہوا کرے گی - اسلئے ایسے بزرگوں سے جنہیں اس کام سے ہمدردی ہے التجا کی جاتی ہے کہ اس مضمون پر آرٹیکل لکھکر یا خبریں بھیجکر ہماری مدد کیا کریں -

اڈیٹر

ہمیں جہانتک معلوم ہے کہ اس زمانہ میں ایک طرف تو وہ جماعت جو خاص خاص حالتوں میں عقد ثانی بیوگان کے حامی تھی تعداد میں روز بروز ترقی کر رہی ہے اور دوسری طرف وہ جو اسکے برخلاف تھی اب اپنے عقیدے کی حمایت میں وہ جوش و سرگرمی ظاہر نہیں کرتی جو کہ چند سال پیشتر ظہور میں آتا تھا - لہذا اس سے ظاہر ہے کہ کم از کم تھیوری یعنی خیال میں اہل ہنود نے بیوگان کے عقد ثانی کی ضرورت کو کسی حد تک محسوس کر لیا ہے لیکن عملی طور پر اس معاملہ میں اس قدر کم کامیابی ہوئی ہے کہ حامیان عقد ثانی بعض مرتبہ مایوس ہوجاتے ہیں - مگر اس ظاہری شکست میں دوسرے فریق کو بھی خوشی کا موقع نہیں ہے - معائب بیوگان سے وہ بھی اسقدر آزردہ ہیں جیسے کہ فریق اول - صرف فرق اتنا ہی ہے کہ ایک فریق اسکے دفعیہ کے لئے منجملہ دیگر تدابیر عقد ثانی بھی تجویز کرتے ہیں - وہ دوسرے کسی وجہ سے اسکو برا سمجھتے ہیں - میں اس مضمون میں بیوگان کی بہبودی کے متعلق صرف ایک بات پر توجہ دلاؤنگا جو کہ عقد ثانی سے تعلق نہیں رکھتی لہذا امیدوار ہوں کہ معترضین اس سمع خراشی کے لئے مجھے معاف کرینگے -

اس وقت یہ بحث نہیں ہے کہ بیوگان کا عقد ثانی کس حد تک جائز یا ناجائز ہے لیکن

طرفین کو یہ ماننا پڑیگا کہ بہت سی عورتیں خواہ عمداً خواہ جبراً بیوہ رہنے کے لئے مجبور ہونگی جن اقوام میں یہ رسم مذہبًا درست - رسوماً جائز ہے انمیں بھی بہت سی بیوہ ایسی باقی رہجاتی ہیں کہ جن کا عقد ثانی مناسب معلوم ہوتا ہے - لیکن ہندوستان میں کہ جہاں علاوہ اُن اسباب کے جو اور ممالک میں موجود ہیں دستور بھی ایک بڑا زبردست حصہ لئے ہوئے ہے جس کے سامنے ہندو مسلمان سب دست بستہ سر جھکائے کھڑے ہیں یہ سب کے لئے فرض ہے کہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ ہم اُن بیشمار بیوگان سے کیا سلوک کریں - بحیثیت ایک ہندو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے ساتھ ہمارا برتاؤ ہندو دہرم کے طرز وطریقے کے برخلاف ہے - اگر میں ہندو دہرم کو ٹھیک سمجھ سکا ہوں تو میں کہونگا کہ ہمارے دہرم میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں ہر فرد بشر کو اسکی تعلیم و تربیت اسکی حیثیت و میلان طبیعت کے موافق اپنا عقیدہ قایم کرنے کا موقع دیا ہے - مثلاً جو احکام برہمن کے لئے فرض سمجھے جاتے ہیں شودر کے لئے وہ نہیں ہیں - پھر جو بیوہ برہمچرج کے لئے لازمی ہیں سنیاسی کے لئے نہیں ہیں - اسی طرح ایک شخص خدا کو مادرانہ حیثیت میں دیکھتا ہے تو دوسرا پدرانہ حیثیت میں ایک تیسرا خدا میں شخصیت مانتا ہی نہیں لیکن سب کے سب ہندو ہیں کسی کو کسی سے تنازع نہیں - مگر باوجود مذہبی معاملہ میں اس آزادگی و وسعت کے بیوگان کے لئے ایک عالمگیر سخت قاعدہ تجویز کرنا ہندو دہرم کی منشا کے برخلاف معلوم ہوتا ہے - چنانچہ کہیں کہیں ہم اسکے برخلاف روایات و تحریرات بھی پاتے ہیں - مثلاً رامائن میں تارا و مندودری کا عقد ثانی (جو ہندو لٹریچر کی سات آیڈیل عورتوں میں سے ہیں) خود رامچندر جی کی تجویز و حکم سے تکمیل ہوا - مہابھارت میں بھی ہم دمینتی کے عقد ثانی کا تذکرہ پاتے ہیں جس میں اتفاق سے وہ شادی اسکے بچھڑے ہوئے خاوند نل سے دوبارہ ہوگئی - ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ہندوؤں میں عقد ثانی بیوگان اعلےٰ سے اعلےٰ خاندانوں میں بھی جائز سمجھا جاتا تھا - لیکن افسوس آجکل دستور اسقدر غالب آرہا ہے کہ یہ روایات اور خاص دہرم شاستر کے بعض احکام و نیز عقلی دلائل سب کے سب بے سود ہیں جسکی وجہ ہم کسی اور موقع پر بیان کرینگے - فی الحال ہمارے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ ہم

علاوہ عقد ثانی کے کوئی اور بھی معقول طریقہ بیوگان کی بہبودی کے لئے نکال سکتے ہیں یا نہیں۔

میرے خیال میں بیوگان کی بہبودی کے لئے سب سے مقدم چیز اُن کے واسطے معقول کام دہندہ مہیا کرنا ہے جس سے وہ نہ صرف مشغول رہیں بلکہ اگر ضرورت ہو (جو کہ اکثر ہوا کرتی ہے) اپنی معاش عزت کے ساتھ پیدا کر سکیں۔ گو کہ قدیم زمانہ سے ہند میں یہ دستور چلا آتا ہے کہ شُرفا کی مستورات روٹی کے لئے کوئی کام نہیں کرتیں۔ کیونکہ اُن کی پرورش بچپن میں باپ پر۔ بعد عقد خاوند پر اور بعد وفات خاوند بیٹے پر فرض تھی۔ لیکن ایسی بہت سی تمثیلیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ جہاں بیچاری عورتیں بیوہ ہونے کے بعد بجائے اپنے لڑکوں یا ماں باپ کے گھر سے مدد پانے کے انہیں کی خدمت کے لئے مجبور ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں کسی علم و ہنر کا جاننا اُن کے حق میں ہر صورت سے مفید ہوگا۔ پھر بھی سالہا سال کے دستور اور نیز جسمانی تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر ہم عورتوں کے لئے چند ایسے کام تجویز کرتے ہیں جو نہ صرف اُن کے لئے بہت ہی موزوں ہیں بلکہ ملک کے لئے بھی نہایت مفید ہونگے وہ یہ ہیں۔

اول پیشۂ تعلیم۔ آجکل لڑکیوں کی تعلیم کی بابت ایک بڑی قباحت یہ بھی ہے کہ ہمیں معقول اُستانیاں نہیں ملتی ہیں۔ یہ سب پر عیاں ہے کہ اُستانی کے لئے علاوہ علمی لیاقت اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ مثلاً محبت۔ ہمدردی۔ اخلاق و عصمت وغیرہ وغیرہ جو صفات شریف قوموں کی بیوگان میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ اِسلئے لڑکیوں کی تعلیم کے زمانہ میں ہر ایک شخص اس بات کا لحاظ رکھ سکتا ہے کہ یہ تعلیم کم از کم اسقدر ہونی چاہئے کہ اگر ضرورت ہو تو یہ اوروں کو پڑھا سکیں فرنگستان میں تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں عورتیں بہتر طریقہ سے دے سکتی ہیں۔ علاوہ اسکے اس افلاس زدہ ملک میں جہاں ہر ایک سوال کے ساتھ کم خرچی کا بھی پہلو دکھایا جاتا ہے چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم عورتوں کے سپرد کرنا آئندہ نسلوں میں ضروری ہو جائے گا۔

دوئم تیمارداری۔ یہ بحیثیت ایک پیشہ عورتوں کے لئے نہایت ہی موزوں ہے چنانچہ

یورپ میں یہ کام بالخصوص عورتوں کے سپرد ہے - تیمارداری حقیقت میں ایک علم اور فن ہے جسکی باقاعدہ تعلیم ہر ایک عورت کو ملنی چاہیے خواہ اسکو یہ پیشہ بطور معاش اختیار کرنا پڑے یا نہیں - ہمنے بارہا مریضونکو تیمارداروں کی غلطیوں سے ضایع ہوتے دیکھا ہے - اسکا چرچا جس قدر پھیلے بہتر ہے - خواہ مرد سیکھیں یا عورتیں - اس قسم کی تعلیم کے لئے ہمارے ملک میں ابتک کوئی خاص انتظام نہیں ہے -

سوئم دائی گیری - یہ کام ہندوستان میں بالخصوص نیچ قوم کی عورتوں کے سپرد کیا گیا ہے حالانکہ یورپ میں یہ قاعدہ برعکس ہے - یہ لازمی نہیں کہ ہر ایک کام میں ہم یورپ کی تقلید کریں فن دائی گیری میں عورتیں کمال پیدا کر سکتی ہیں جس کے لئے میڈیکل کالجوں کی تعلیم کی ضرورت ہے - لیکن اسکے متعلق بہت سے کام ایسے بھی ہیں جو تھوڑی سی جستجو سے گھرونپر حاصل ہو سکتے ہیں - ہمارے ملک کی دائیاں اسقدر نا قابل اطمینان ہیں کہ جبتک یہ کام شرفا - دیانتدار - اور باعلم اشخاص کے ہاتھ میں نہ جائیگا تب تک ملک کی بہتری نہیں ہو سکتی - بہت سی جانیں روز بروز دائیوں کی غفلت اور طمع کے سبب سے ضایع ہوتی ہیں - بیوگان کے لئے اس کام کا جاننا نہ صرف صیغہ معاش بلکہ ایک کار خیر کا ذریعہ ہو سکتا ہے -

ب - م - ڈ

قیمت سالانہ ۱ر　　　　حجم ۲۰ صفحے

رسالۂ زبان دہلی

فانوس میں یہ شمع ہے نور انجمن میں ہے

معزز اخبارات و رسائل کی رائے ہے کہ "زبان" ہر لحاظ سے قابل قدر پرچہ ہے۔

اگرہ اخبار۔ صاف ستھرا نو کسطرح بیانِ دہلی بہ نور کے سانچے میں ڈھالی ہے زبانِ دہلی رسالہ زبان کا منشا رخاص یہی ہے کہ ہندوستان والونکو دہلی کی زبان سکھائی جائے تاکہ وہ اسکے باریک تر پہلوؤں پر کافی غور کر کے اپنی زبان کی اصلاح کریں۔

سرمۂ روزگار اگرہ۔ ماشاءاللہ رسالہ زبان ہر طرح قابلِ قدر پرچہ ہے بعض بعض مشاہیر اہل قلم کے مضامین نظم و نثر اسمیں جو شایع ہوتے ہیں وہ اگر مبالغہ نہ سمجھا جاوے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان اُردو کے سرمایۂ ناز ہیں۔

رہنمائے تعلیم لاہور۔ "زبان" کیا حسن ظاہری کیا حسن معنوی ہر لحاظ سے دلکش اور نہایت پسندیدہ ہے۔۔۔ مضامین اسقدر اعلیٰ اور دلچسپ ہوتے ہیں کہ جبتک کل نظم و نثر کے مضامین ختم نہ ہولیں رسالہ ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔۔۔ الغرض رسالہ ہر ایک لحاظ سے نہایت اعلیٰ درجہ کا بلکہ قریباً ہندوستان کے کل ماہوار رسالوں سے بڑھا چڑھا ہے۔

نظام المشائخ دہلی۔ زبان دہلی کا شہرۂ آفاق ماہواری رسالہ ہے۔۔۔ مضامین نہایت ضروری اور کارآمد باتوں پر لکھے جاتے ہیں۔۔۔۔ دہلی کا تعلق غالب مرحوم کے بعد اب پھر اس رسالہ نے قایم کیا ہے۔

کمال دہلی۔۔۔ مضامین نظم و نثر قابل قدر ہوتے ہیں۔ کاغذ بہت عمدہ و نفیس لکھائی عمدہ ایڈیٹر صاحب خود نازک قلم ہیں جنکا ایک ایک دائرہ خورشید جہانتاب سے ہمسری کر رہا ہے جناب حاجی گکڑ بی کے ترا صاحب منیجر رسالہ ہذا کے مضامین ڈاکٹری کے متعلق نہایت اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ قسم اول ۱ر ہے اور قسم دوم ۱۲ر اس خوبی کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے منیجر رسالہ زبان دہلی سے طلب کیجیے۔

عصمت

ایک زمانہ معترف ہے کہ اس وقت خواتین کے واسطے دلّی کا رسالہ عصمت نعمت ہے۔ اخبار مشرق کی رائے ہے کہ خاتونان ہند کے پڑھنے کیلئے اُردو میں بینظیر پرچہ ہے۔ صنفِ نازک کے دست میں جگہ پانیکے لئے جتنی نزاکتیں اور نازآفرین کرشمے ممکن ہیں اسمیں پیدا کئے جاتے ہیں۔ یہ گلدستہ ہماری مخدرات کے پڑھنے کے لئے خاص سفارش چاہتا ہے جتنی عورتیں اسمیں لکھتی ہیں اُنکی قابلیت کی داد اگر دیجائے تو مضمون بڑھجائے گا۔ ہمارے دوست مولوی عبد الراشد الخیری اڈیٹری میں نکل رہا ہے جو دہلی کے ایک اہل زبان بزرگ ہیں۔

عصمت اس غرض سے جاری کیا گیا ہے کہ کنواری لڑکیونکو سلیقہ شعار ہونا فرمانبردار بیٹیاں۔ بیویونکو اطاعت گذار بیویں۔ اور منتظم گھر والیاں بنائے۔ مذہب۔ اخلاق۔ عادت۔ اطوار کے متعلق بیش بہا نصیحتیں تعلقات پر معقول اور مفصل بحث دلچسپ نتیجہ خیز کہانیاں کھانے پکانے کے نسخے۔ خانہ داری کی تدبیریں۔ سینے پرونے۔ کاڑھنے کی ہدایتیں اور نقشے۔ علمی معلومات۔ کام کی باتیں۔

غرض اس ۴۴ صفحہ کے رسالہ میں ہر مہینے نئے نئے مضامین اور مفید تدبیریں بتائی جاتی ہیں۔ سنہری بیل اعلیٰ درجہ کا کاغذ لکھائی چھپائی دیکھنے کے قابل قسم اول معہ تصویر ۳؎ ۔ قسم دوم بلا تصویر ۲؎ نمونہ کا پرچہ ۴ ر ۱۲ ر

منیجر عصمت دہلی سے طلب کریجئے

فروری و مارچ سنہ ۱۱ء

نمبر ۲ و ۳ جلد ۲



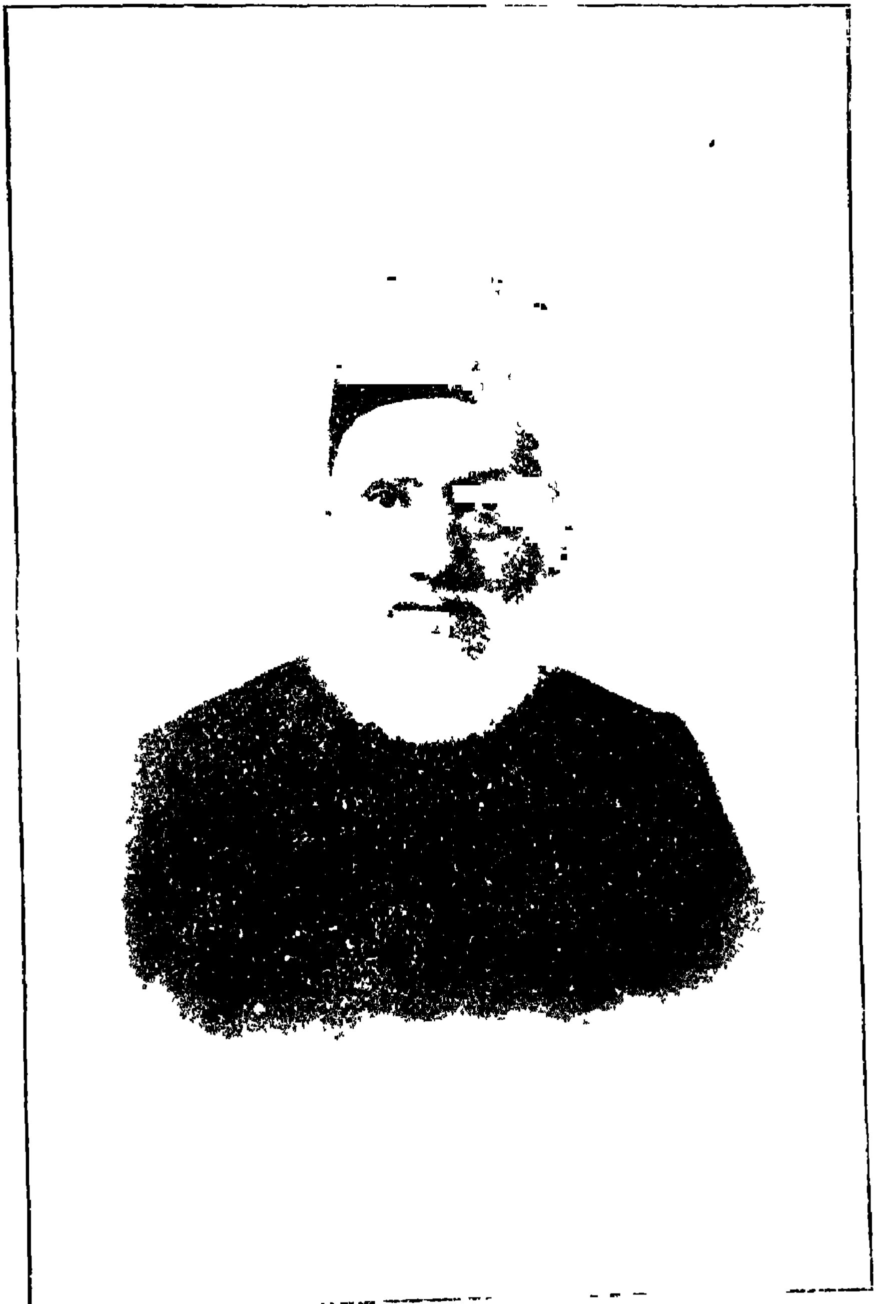
زبان

دہلی

ایڈیٹر نادک رقم اکبرآبادی

فہرست مضامین

THE ZABAN. DELHI.



۷۸۶

زبان

اخلاقی تعلیم

تھوڑے دن سے جو شورش ہندوستان میں مچی ہوئی ہے اُس سے جہاں بعض نقصانات ہوئے وہاں اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ گورنمنٹ اور نیز ہندوستان کے لایق لوگوں کو کچھ توجہ مسئلہ تعلیم کی جانب پھر پیدا ہوگئی ہے۔ اور اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ ہمارے طالب علموں کی موجودہ حالتِ تعلیم قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ خصوصاً اس بات کا اعتراف ہوتا جاتا ہے کہ ہمارے اسکول اور کالجوں میں درستی اخلاق کے سامان نہیں ہیں اور اسی وجہ سے نئی تعلیم سے جو تغیر خیالات ہو رہا ہے وہ بجائے مفید ہونیکے مضر ہے

اور اسکی درستی نہو گی جب وقت تک کہ کسی قسم کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم لڑکوں کو ندیجائے گی اور اسی بنا پر یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ اعلےٰ درجہ کی تعلیم انگریزی عوام کے واسطے چنداں ضروری نہیں ہے۔ مجھے اس خیال سے تھوڑا سا اتفاق ہے اور بہت کچھ اختلاف۔ میرے نزدیک یہ بالکل بے بنیاد خیال ہے کہ اعلےٰ درجہ کی انگریزی تعلیم سے ہندوستانیوں کے اخلاق پر عمدہ اثر نہیں پڑا یا جو نقص کہ پیدا ہو گئے ہیں وہ محض اس وجہ سے ہیں کہ گورنمنٹ نے اس وقت تک مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے ذریعے اپنے اسکول اور کالجوں میں مہیا نہیں کئے۔ نئی تعلیم کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ خیالات اور طریق عمل میں تغیر ہوا اور ہر تغیر کے ساتھ نفع و نقصان وابستہ ہیں۔ غور طلب یہ امر ہے کہ آیا نفع زیادہ ہے یا نقصان زیادہ ہیں۔ اس پر اختلاف راے ضرور ہے گو میرے نزدیک کثرت راے مدبران ہند کی یہی ہے کہ فائدہ زیادہ ہوا ہے اور نقصان کم۔ لیکن اس مسئلہ پر اس وقت بحث کرنے کا اس مختصر مضمون میں کوئی موقع نہیں ہے لیکن چونکہ میں اس امر کو اول ہی تسلیم کر چکا ہوں کہ ایک حد تک یہ اعتراض صحیح ہے کہ ہمارے لڑکوں کی اخلاقی تربیت کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے اور اسکول اور کالجوں میں اسکی درستی کا سامان بہت کم ہے لہذا دو چار باتیں اسی کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں مذہب کا اثر سوسائٹی پر ہمیشہ اس قدر رہا ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کس طرح کوئی طریقۂ تعلیم درستی اخلاق کے لئے کافی ذریعہ ہو سکتا ہے جب وقت تک کہ اس میں مذہب بھی شامل نہو۔ لیکن یہ امر بھی ظاہر ہے کہ جب مختلف مذہب ہندوستان میں ہیں تو انگریزی گورنمنٹ کے واسطے اپنے اسکول اور کالجوں میں کسی قسم کی مذہبی تعلیم جاری کرنا اگر ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے لیکن علاوہ اس وقت کے اور دقتیں ہیں کہ جنکا موجودہ حالتِ ہندوستان میں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور جب تک وہ دقتیں رہیں گی اوسوقت تک انگریزی

تعلیم پر نکتہ چینیوں کے اعتراضات قائم رہیں گے۔ جو صورت اُن دقتوں کی ہے وہ مختصراً بیان کی جاتی ہے۔

تین قسم کی تعلیم کا اثر انسان پر ہوتا ہے اول وہ تعلیم جو اپنے والدین سے اُسکو گھر میں ملتی ہے دوسری وہ کہ جو اُس سوسائٹی سے ملتی ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے اور جو آٹھ پہر اس کے گرد و پیش ہے۔ تیسری وہ کہ جو اسکول اور کالجوں سے اُسکو حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ تینوں تعلیمیں ایک طرح کی ہوتی ہیں تو اسکا نتیجہ اُمید کے موافق ہوتا ہے۔ جہاں ان میں سے کسی قسم کا اختلاف ہوتا ہے وہاں اُسکے نتیجہ میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً انگلستان کو لیجئے۔ انگریز کا لڑکا جو باتیں گھر میں دیکھتا ہے اور سیکھتا ہے وہی باتیں اُسکو اسی سوسائٹی میں نظر آتی ہیں اور وہی اُس کو اسکول میں سکھائی جاتی ہیں۔ جن بری باتوں سے وہ اسکول میں متنبہ کیا جاتا ہے اور جو اچھی باتیں اسکو وہاں سکھائی جاتی ہیں ویسا ہی سبق اُسکو اپنے گھر میں بھی ملتا ہے اور سوسائٹی میں بھی وہ اُنھیں باتوں کو معیار نیک و بد دیکھتا ہے جب کہ خیالات والدین اور اسکول ماسٹروں کے ایک ہونگے تب دونوں میں اتفاق لازم ہوگا اور اس اتفاق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گھر کی تربیت کی تائید اسکول اور اسکول کی تعلیم کی تائید گھر کریگا۔ اور چونکہ جو تعلیم بچے یا نوجوان پا رہے ہیں وہی تعلیم سوسائٹی نے بھی پائی ہے اس لحاظ سے سوسائٹی کا اثر بھی جو لڑکے پر پڑے گا وہ گھر اور اسکول کی تعلیم کے موافق ہوگا۔ انگلستان میں یہی حالت ہے اور درحقیقت یہی بڑی اخلاقی تعلیم ہے کہ جو ہر انگریز کے بچے کو ملتی ہے۔ یہ خوب واضح رہے کہ محض کتاب پڑھنے سے درستی اخلاق نہیں ہوتی ہے۔ نہ لکچروں سے نہ اس قسم کی بیہودہ سختیوں سے کہ جنکا آجکل ہمارے سررشتۂ تعلیم میں فیشن ہے۔ بلکہ بڑا اثر بچے پر تعلیم نظری کا ہوتا ہے اور جبکہ محض یہی نہیں کہ اسکول میں انھی عمدہ باتوں کی جانب ترغیب دیجاتی ہے کہ جنکی جانب والدین

بھی ترغیب دیتے ہیں بلکہ جس محبت اور ہمدردی سے بچے سے ماں باپ پیش آتے ہیں اسی محبت اور ہمدردی کا برتاؤ ماسٹروں کا بھی اس سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان کی حالت ملاحظہ فرمائیے۔ گھر کی صورت یہ کہ ماں جاہل مطلق باپ نیم تعلیم یافتہ سوسائٹی کی حالت یہ کہ جس میں کل عورتیں جاہل مردوں میں کم از کم آدھے ویسے ہی جاہل۔ بہت سے پرانے فیشن کی تعلیم پائے ہوئے اور بہت تھوڑے انگریزی تعلیم یافتہ اسکول کی یہ حالت کہ نیچے کے درجوں کے ماسٹروں میں نہ علم نہ اخلاق۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اگر پڑھانے کی قابلیت رکھتے بھی ہیں تو فن تربیت و تعلیم سے ناواقف اور سب باتوں پر یہ خیال غالب کہ نتیجہ امتحان ایسا ہو کہ جسکو ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پسند کریں اس سے کچھ غرض نہیں کہ لڑکے کو پڑھنا لکھنا کچھ آیا کہ نہیں آیا۔ کالج میں کثرت سے پروفیسر انگریز جن کی قابلیت میں شک نہیں ہو سکتا اور جو کسی قدر فنِ معلمی سے بھی واقف ہیں مگر ہندوستان کے لوگوں اور اُن کے خیالات اور طریق سے بالکل ناواقف دماغ میں وہی حکومت کی بُو جو کلکٹر صاحب کے دماغ میں ہے۔ کلاس کی کتابیں پڑھانا تو ضرور فرض سمجھتے ہیں لیکن لڑکوں سے محبت و ہمدردی سے پیش آنا اور آیندہ بہبود میں ساعی ہونا اُن کا کوئی فرض نہیں ہے۔ کالج میں تو لڑکا انگریزی خیالات حاصل کرتا ہے۔ مل اور برک کی کتابیں پڑھتا ہے۔ پولٹیکل آزادی۔ آزادی نسواں معقولات کو منقولات پر فائق سمجھنا یہ سبق تو کالج میں پڑھتا ہے۔ گھر میں عورتوں کی ذلیل حالت بھائیوں کو بہنوں پر ترجیح۔ پنڈت کا قول محکِ حق و باطل۔ نئی تہذیب اور نئے خیالات کی آٹھ پہر مذمت کا سامنا رہتا ہے۔ جس گھر کے بزرگ درحقیقت تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں وہاں پولٹیکل آزادی اور حقوق انسانی کے اذکار سنتا ہے کالج میں بھی کتابوں میں وہی باتیں پڑھتا ہے مگر پروفیسر صاحب کا برتاؤ اسکے دل پر ہر دم اور ہر گھڑی یہ نقش کرتا ہے کہ ہندوستانیوں کے واسطے آزادی مضر ہے

ان کو اپنے تئیں اہل یورپ کے برابر نہیں سمجھنا چاہیے اور یہ سخت گستاخی ہے کہ اُس سے پروفیسر اسی محبت اور دوستی کے طریق سے ملیں جس طرح اُس کے والدین یا اس کی سوسائٹی کے بزرگ ملتے ہیں اس دو چار برس میں جو ابتری تعلقات پروفیسر اور طلبا میں واقع ہوئی ہے اُس کی نسبت اس رسالہ میں کچھ لکھا بھی نہیں جا سکتا ہے اور لکھنے سے سوائے اسکے کہ آتش غیظ وغضب بعض عقلمندوں کے دلوں میں اور مشتعل ہو اور کچھ حاصل بھی نہیں ہے ؎

گلوئے نالہ کو کرتا ہوں وقفِ تیغ خاموشی
مبادا بارِ خاطر ہو کسی طبع گرامی کا

لیکن جو بات ہمارے غور کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ گو کالج اور سکول ہمارے اختیار میں نہیں ہیں اور گو جو ہماری تعلیم کے اس وقت ذمہ دار ہیں وہ اس بات کو ابھی نہیں سمجھتے ہیں کہ سکول اور کالج کبھی ذریعہ درستی اخلاق جیسا چاہیے ویسا نہیں ہو سکتے ہیں جس وقت تک کہ اول پروفیسران کالج اپنے طالب علموں سے سچی محبت سے پیش نہ آئیں گے اور دوم جس وقت تک کہ ان پروفیسروں اور اُن طلبا میں ہمدردی اور اتفاق راے نہو گا مگر اس قدر ضرور ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اپنے گھر میں وہ سامان پیدا کر لیں کہ جو نئی تعلیم کے خلاف نہوں بلکہ موافق ہوں مثلاً بچے کی ابتدائی تعلیم جس کا اثر درحقیقت تمام عمر کم و بیش رہتا ہے وہ تعلیم ہے جو اُسکو اپنی ماں سے ملتی ہے۔ اگر ماں جاہل ہے تو جو موجودہ حالت ہندوستان کی ہے اس میں عام طور سے یہ بات ناممکن ہے کہ باپ اپنے بچے کو تعلیم دے سکے۔ تعلیم کے معنے محض لکھنا پڑھنا ہی نہیں ہے بلکہ ہر فعل ماں باپ کا اچھا یا برا جو بچہ دیکھتا ہے وہ تعلیم کا اثر رکھتا ہے۔ چونکہ ظاہر ہے کہ بچپنے میں بچوں کی پرداخت ماؤں ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لحاظ سے جو ماں کے خیالات اور عادات کا اثر بچے پر پڑتا ہے

اُسکو کسی سکول اور کالج کی تعلیم مٹا نہیں سکتی ہے ؎

بچوں کو ماں کی گود بھی مکتب سے کم نہیں

اس مدرسہ میں حاجتِ لوح و قلم نہیں

لہذا یہ ضرور ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو تو ایسی تعلیم دیں کہ جو بچوں کو تربیت دے سکیں اور گو سکول کو بالفعل اصلی درستی اخلاق سے کوئی بحث نہ ہو لیکن اپنے گھر میں تو بچہ اچھی باتیں سُنے اور دیکھے۔ جو اہلِ ہند اپنے نوجوانوں میں نقص اخلاق دیکھتے ہیں اور اُسکی اصلاح دل سے چاہتے ہیں تو وہ سکول اور کالجوں سے بالفعل زیادہ اُمید نہ رکھیں مگر اپنے گھروں کو درست کریں۔ یعنی اپنی عورتوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ اچھی طرح سے بچوں کی ابتدائی تعلیم اور نیز اخلاق و عادات کی محافظ نگراں ہو سکیں۔

بشن نراین۔ در

مطالعۂ قدرت حیات

ماسٹر صاحب - اچھا بچو آج میرے ساتھ باغ چلو اور میں وہاں تمہیں کچھ سبق دونگا۔

بچے - سب کے سب کونسی کتاب لے چلیں -

ماسٹر صاحب - کتاب کی کوئی ضرورت نہیں صرف کاغذ اور پنسل لے چلو۔ باغ بذاتِ خود ایک کتاب ہے بقول سعدیؔ ؎

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

لہذا اُسی کے صفحے لوٹ پوٹ کر ہم کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں - (یہ کہہ کر معہ لڑکوں کے باغ کو روانہ ہو گئے)

ماسٹر صاحب - اچھا رام تم ان درختوں کو کیا سمجھتے ہو جو کہیں پھل اور پھول سے لدے ہوئے اور کہیں سوکھ کر مر گئے ہیں -

رام - جناب یہ بھی خدا کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں جیسے انسان - حیوان - ندی اور پہاڑ وغیرہ وغیرہ -

ماسٹر صاحب - (شام کی طرف اشارہ کرکے) ان میں اوروں سے کوئی خصوصیت بھی ہے یا نہیں -

شام - نہیں جناب یہ انسان اور حیوان کی طرح جاندار ہیں - لہذا ندی اور پہاڑ سے بالکل مختلف ہیں - لیکن انسان اور حیوان سب اپنی مرضی سے چلتے پھرتے ہیں -

درخت صرف ایک ہی جگہ پر قایم رہتے ہیں۔
ماسٹر صاحب۔ (محمود کی طرف اشارہ کرکے) بعض بعض درخت بالکل زمین پر قائم نہیں ہیں۔ چلو سامنے کے تالاب میں سنگھاڑے کی بیل مرغابیوں کی طرح پانی پر تیر رہی ہے اور ایک جگہہ سے دوسری جگہ جا سکتی ہے۔ پھر کیا سنگھاڑے کی بیل اور مرغابی ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں۔
محمود۔ نہیں جناب جانوروں میں ایک قسم کی روح ہوتی ہے جس سے وہ دکھ سکھ محسوس کرسکتے ہیں۔ اپنی تکالیف کو کسی طرز سے ظاہر کرسکتے ہیں اپنی خوشی چل سکتے ہیں۔ سنگھاڑے کی بیل محض ہوا کے جھوکوں سے پانی کی لہروں پر جنبش کر رہی ہے۔ اسکو در اصل چلنا نہیں کہتے ہیں۔ یوں تو بڑ کا پتہ بھی حرکت کر رہا ہے۔
ماسٹر صاحب۔ ہاں بات تو کچھ صحیح ہے لیکن سعید تم بھی کچھ کہو۔
سعید۔ نہیں جناب جانوروں میں روح ہرگز نہیں۔ روح تو صرف انسان ہی میں ہوتی ہے۔
ماسٹر صاحب۔ خیر ہمیں اس سے بحث نہیں کہ روح کس میں ہوتی ہے کس میں نہیں۔ ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ اول دو قسم کی چیزیں جو ہمنے دیکھی ہیں ان میں سے ایک بیجان جیسے ندی۔ پہاڑ۔ دوسری جاندار مثلاً انسان۔ مرغابی اور سنگھاڑے کی بیل۔ اب ہمیں پہلے یہ دیکھنا ہے کہ جاندار و بے جان میں کیا فرق ہے اور دوسرے جاندار چیزوں میں جو بظاہر دو بڑی قسمیں دکھائی دیتی یعنی ایک طرف تو انسان و حیوان اور دوسری طرف درخت و پودے ان میں کیا امتیاز کیا جا سکتا ہے۔
راحم۔ جناب انسان اور حیوان میں تو یہ فرق ہے کہ انسان بول سکتا ہے۔ حیوانوں کو تکلیف و خوشی محسوس کرنے کی قابلیت ہے لیکن درخت اور پودوں کو یہ بات میسر نہیں اور پہاڑ۔ ندی وغیرہ سب بے جان چیزیں۔ حرکت و خیال وغیرہ کچھ

بھی نہیں۔ ان کی حالت یکساں رہتی ہے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔
سعید۔ نہیں جناب انسان اشرف المخلوقات ہے اسمیں علاوہ زبان کے اخلاق و خدا تعالےٰ کی بندگی کا خیال موجود ہے۔ وہ اپنے تمام کام عقل کے ساتھ کرتا ہے۔ حیوان محض بھوک پیاس وغیرہ قدرتی تقاضوں سے اپنے جسمانی فعل بجالاتے ہیں ان میں سوچنے اور سمجھنے کا مادہ بالکل نہیں ہے۔ درختوں میں نہ ذاتی حس ہے نہ حرکت لیکن اسمیں حیوانوں کی طرح مرنا جینا موجود ہے۔ اس لئے ان میں بھی جان ہے۔ جمادات میں یہ باتیں کچھ بھی نہیں۔
ماسٹر صاحب۔ ہاں کچھ صحیح ہے لیکن تم نے جو کچھ کہا اس کا ثبوت نہیں پہنچایا۔ قدرت کے مطالعہ میں مشاہدہ مقدم ہے۔ تم بہت سی باتیں اپنے خیال سے یا سُنی سُنائی کہتے ہو (شام اور محمود کی طرف مخاطب ہو کر) کیا تم ان کے بیان کی تائید و تردید میں کچھ کہہ سکتے ہو۔
شام۔ جمادات میں اندرونی و بیرونی تغیرات و نیز حرکات کے ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ ہم جغرافیہ طبعی میں پڑھ چکے ہیں کہ گلیسیر اور معمولی ندیاں بھی اپنی رگڑ سے پہاڑ اور مٹی کو ریزہ ریزہ کر کے سطح زمین میں بیشمار تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں۔ دیگر زمین کی اندرونی حدت سے اسکی سطح کہیں اونچی اور کہیں نیچی ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اونچے اونچے پہاڑ کسی زمانہ میں سطح سمندر کے نیچے تھے زمین پانی اور ہوا وغیرہ کیمیائی اشیا ہیں اور ہم مدرسہ میں تجربوں سے دیکھ چکے ہیں کہ ان چیزوں میں کیا کیا کیمیائی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً معمولی بتی یا آگ کے جلنے سے جلنے والی شئے کا کاربن ہوا کے آکسیجن سے ملکر کاربونک ایسڈ گیس بناتا ہے۔ مجھے یہ بھی پڑھا ہے کہ انسانی جسم میں بھی اسی قسم کی کیمیائی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کہ جن پر زندگی کا دارومدار ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جسمانی فعل بالکل انجن کی حرکت

کی طرح ہے کہ اگر اسمیں حدت پیدا کرنے والی غذا نہ پہنچائی جائے تو وہ بھی کچھ مدت میں بے آنچ و پانی کے انجن کی طرح ساکت ہو جائے گا۔ لیکن باوجود ان مطابقت کے جو جاندار و بے جان چیزوں میں موجود ہے میرے خیال میں جاندار چیزوں میں چند خاصیتیں ایسی ہیں کہ جن کا مجموعی نام حیاتی کہا جا سکتا ہے جو معمولی کیمیائی وطبعی واقعات سے کسی قدر مختلف ہیں۔ مثلاً نشوونما کہ جس سے جاندار چیزیں بیرونی اشیا کو اپنا جزو بدن بنا سکتی ہیں۔ اور دوم اپنے بیرونی تعلقات کو کسی حد تک جانچ اور سمجھ سکتے ہیں مثلاً اگر انجن کو بغیر ڈرائیور کے چھوڑ دیا جائے تو وہ ٹوٹے پل پر سے چلا جائیگا۔ لیکن اسی طرح ایک حیاتی انجن مثلاً ہاتھی جب کسی خطرناک جگہ پر پہنچے تو خوب سوچ سمجھکر آگے بڑھیگا۔ لہذا یہ سمجھ اور جان کی حفاظت کا فکر تمام جاندار چیزوں میں ایک عجیب خاصیت ہے جو بیجان چیزوں میں نہیں ہے۔

محمود۔ علاوہ ان دونوں تفرقوں جیسے نشوونما اور بیرونی چیزوں کی آگاہی کے ایک اور بھی بہت بڑا فرق ہے۔ مثلاً جاندار چیزیں خاص خاص وقتوں میں بچے دیا کرتی ہیں جو بیجان چیزوں میں بالکل نہیں ہوتا۔ اسی کا نام تولید ہے۔

ماسٹر صاحب۔ تمہارے عالمانہ جواب سے میں خوش ہوا۔ لیکن یہ بھی زیادہ تر کہیں کہیں سے پڑھا ہوا ہے۔ اپنے مشاہدے سے کہو۔

رام۔ کیوں جناب کیا انجن کے اندر بھاپ کبھی کبھی اس قدر جمع نہیں ہو جاتی ہے کہ آنچ کے ہٹا لینے پر بھی وہ اپنی اندرونی طاقت سے کچھ دیر تک حرکت کر سکے پھر اس میں اور جانداروں کی نشوونما میں کیا فرق ہوا اور پھر مشینوں میں جو بہت سے اوٹومیٹک کام کرنے کے بندوبست رہتے ہیں مثلاً آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے مہینے میں جب ہم آپ کے ساتھ مل دیکھنے گئے تھے تو آگ سے بچنے کے لئے کیا کیا ترکیبیں تھیں۔ ایک طرف تو الارم گھنٹہ تھا جو کہتے ہیں کہ آگ لگتے ہی خود بخود بجیگا۔ اور پھر

کروں کے اندر پانی کے فوارے جو آگ لگتے ہی اپنے آپ چھٹنے لگیں گے وغیرہ
اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جاندار چیزوں کی آگاہی بیرونی تعلقات اور خیال حفاظت اس سے بالکل مختلف ہے اور اگر کوئی انجن ایسا ہو جس سے کہ انجن تیار ہوتے ہوں تو کیا وہ ایک معنوں میں تولید نہیں ہے۔

سعید ہرگز نہیں۔ یہ مشابہت محض ظاہری ہے ورنہ دراصل جاندار اور بے جان چیزوں کے ان تمام فعل میں ایک قسم کا اختلاف ہے۔ انجن کے اندر بھاپ کے جمع ہونے سے وہ اس کا جزو بدن نہیں ہوتی اور نہ اُس سے اُسکی نشو و نما ہوتی ہے۔ بعض بعض بیجان چیزیں بھی بظاہر گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں مثلاً دریا کے کنارے ریت کی تہوں سے اونچے ہو جاتے ہیں اور کبھی پانی کے زور سے بہہ جاتے ہیں لیکن وہ زندہ چیزوں کی نشو و نما سے بالکل مختلف چیز ہے۔

محمود۔ بالکل مختلف تو نہیں ہے کیونکہ جاندار و بیجان دونوں انہی کیمیائی و طبعی قانون کے پابند ہیں صرف فرق یہ ہے کہ جانوروں کی ساخت نہایت پیچیدہ ہے لہذا ان کے فعل بھی نہایت پیچیدہ ہیں اس لئے جن چیزوں میں ہم یہ تین بڑی بڑی حیاتی خاصیتیں مثلاً نشو و نما۔ تولید اور بیرونی چیزوں کی آگاہی تو ہم اسکو جاندار کہتے ہیں۔ اور باقیونکو بیجان سمجھتے ہیں۔

رام۔ اگر اس طرح جاندار و بیجان میں کوئی اصلی فرق نہیں رہا جیسے کہ محمود کہتے ہیں کہ صرف ایک ساخت کی پیچیدگی کا فرق ہے تو پھر یہ نتیجہ نکلا کہ بہت پیچیدہ ساخت کی بیجان چیزیں جاندار ہو جاتی ہیں۔

سعید۔ اور یہ تو بتائیں کہ جان کیونکر پیدا ہوئی۔

محمود۔ یہ تو تم نے جغرافیہ طبعی میں پڑھا ہی ہے کہ کسی زمانہ میں سطح زمین اسقدر گرم تھی کہ مٹی اور پتھر سب کے سب پگھلی ہوئی حالت میں تھے۔ (غالباً سورج کے اندر سے الگ

کیا ہوا ایک جسم تھا) تو ظاہر ہے کہ اس حالت میں اسکے اندر نباتات وحیوانات کا کچھ پتہ بھی نہ تھا البتہ ان کے کیمیائی عناصر زمین میں موجود تھے اور چونکہ اب ہم نباتات و حیوانات کو سطح زمین پر دیکھتے ہیں لہذا یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جاذاتی کیمیائی تغیرات سے پیدا ہو گئے ہیں۔

شام۔ جناب یہ صرف ایک پرانا خیال ہے جو کہ جدید تجربوں سے ثابت نہیں ہو سکا کہ بیجان اشیاء سے جان پیدا کیجا سکتی۔ لہذا ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ حیاتی ذرے کسی اور آباد سیارے سے روشنی کے دباؤ سے سطح زمین پر پہنچ گئے اور یہاں نشوونما پاکر مختلف نباتات اور حیوانات کی شکل اختیار کر لی چنانچہ اب بھی اسی قسم کے حیاتی اجسام موجود ہیں کہ جن کو یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ نباتات یا حیوانات میں سے ہیں، اور بہت سے اجرام مرض اسی قسم کے خوردبینی اجسام ہیں۔

سعید۔ کیا خوب اور وہ اس آباد سیارے میں کہاں سے آئے۔

محمود۔ بہت ٹھیک سوال ہے۔ وہ آباد سیارہ بھی کسی زمانہ میں پگھلے ہوئے پتھر کی طرح گرم تھا۔ لہذا چاہئے اس دنیا میں جاندار چیزیں پیدا ہوئیں یا کسی اور آباد سیارے سے یہاں لائی گئیں وہ ضرور کسی نہ کسی زمانہ میں بیجان چیزوں سے پیدا ہوئی ہونگی۔

دیگر یہ کہ دوسرے سیارے سے ہماری دنیا میں حیاتی ذروں کے آنے کے برخلاف ایک بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ جب یہ ذرے آسمان کی نیلی روشنی کے اندر سے لکھو کہا میل کا سفر کرتے ہوئے اُٹھیں گے تو وہ دنیا میں پہنچتے وقت تک کچھ سردی اور کچھ سورج کی کرنوں سے ضایع ہو چکیں گے۔ اسی بنا پر اجرام کے دفعیے کے لئے سورج کی روشنی پہنچانے کی تاکید کیجاتی ہے۔

سعید۔ جناب میں تو ایک بات جانتا ہوں۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

ماسٹر صاحب۔ میں تمہارے اس فلسفیانہ مباحثے سے بہت خوش ہوا لیکن

ہم اس باغ میں جاندار چیزوں کی خاصکر درختوں کے مشاہدے کے لئے آئے ہیں تم ان پر خوب غور کرکے خود سمجھ کے یہ بتاؤ کہ درختوں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے۔

البتہ حیات کی اصلیت کی بابت ہمیں کافی واقفیت نہیں ہے۔ لیکن مشاہدے سے ہم قوانین قدرت کو ضرور سمجھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں جیسے بیجان مادہ کی چند طبعی و کیمیائی خاصیتیں ہوتی ہیں ویسے ہی زندہ مادہ کی بھی ہوا کرتی ہیں مثلاً پانی کی چند عجیب وغریب خاصیتیں ہیں یعنی ایک خاص حرارت پر جمکر برف بنجانا۔ خاص حدود کے اندر بشکل سیال رہنا اور آگے جاکر بھاپ بنجانا۔ خاص حرارت پر بوجھ میں بھاری ہوجانا۔ جمنے کی حالت میں عجیب و غریب قلمونکی شکل اختیار کرلینا۔ مختلف اشیا کو تحلیل کرلینا وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان کو پانی کے مادی خواص کہیں تو پانی سے بدرجہا زیادہ پیچیدہ مرکب حیاتی مادہ کی وہ خاصیتیں یعنی نشوونما۔ تولید اور بیرونی تعلقات کی آگاہی کو اسکی مادی خاصیت تصور کرنے میں کیا دقت ہے۔

اب رہی ابتدائے حیات اسکی بابت ہماری واقفیت اور بھی کم ہے کہ کن حالتوںمیں بیجان چیزوں میں جان ظہور میں آئی لیکن چونکہ کسی سلسلہ تجربوں سے ہم لیبوریٹری کے اندر بیجان چیزوں سے جان پیدا نہیں کرسکتے اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ قدرت اپنی لاانتہا وسائل سے بھی یہ نہیں کرسکی یہ کسیقدر خلاف عقل معلوم ہوتا ہے لہذا اس معاملہ پر ہم زیادہ بحث نہیں کرینگے صرف دو ایک مثالیں دیکر ختم کرتے ہیں۔ مثلاً نہایت چھوٹے درجہ کی جاندار چیزوںمیں جو حرکت وغیرہ حیاتی خاصیتیں ظہور میں آتی ہیں جدید تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ وہ زیادہ تر کیمیائی وطبعی قوتونکے نتیجے ہیں۔ لہذا حیاتی قوتوں کو کیمیائی و طبعی قوتوں سے بالکل مختلف سمجھنا غلطی ہے۔

ڈاکٹر بی۔ کے۔ متر

اُردو رسائل کے مضامین

اپنے کرمفرما مسٹر اختر کا مضمون شایع کرتے ہوئے ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے دوسرے ہمعصر ہی اس مضمون کو غور سے پڑھیں گے اور کوشش کریں گے کہ حتی المقدور یہ صریح نقائص دور ہو جائیں۔ اڈیٹر

اُردو رسائل کی کثرت اور مختلف اقسام کے لٹریچر کی ضرورت نے اخبار نویس اور کارکنان پریس کے علاوہ ایک اور گروہ کی بنیاد جمائی جس کا کام مضامین اور غزلیں لکھنا۔ شعر و سخن کو ترتیب دینا اور دیگر زبانوں کے علم ادب کو اپنی زبان کا جامہ پہنانا قرار پایا۔ اور اس گروہ کے اراکین رسائل کے قلمی معاون کہلائے جانے قرار پائے۔

ہندوستان میں کوئی میگزین مقبول عام نہیں ہو سکتا جب تک اُس میں انواع و اقسام کے لٹریچر کا ایک بیش قیمت ذخیرہ موجود نہ ہو۔ اس کی وجہ عموماً ہندوستان کا افلاس اور یہاں کے باشندوں کی بدمذاقی ہے۔ یورپ میں مختلف مذاق کے مختلف رسالے نکلتے ہیں بعض پولٹیکل پرچہ ہیں۔ بعض کا کام قصہ کہانیاں شایع کرنا ہے، کچھ تجارت کے حامی ہیں اور چند علمی مباحث شایع کرتے ہیں۔ ان میگزینوں کی قیمتیں بھی جداگانہ ہیں، نامہ نگار بھی مختلف لوگ ہیں اور ہر ایک کی تعداد اشاعت بھی شاید ہندوستان کے تمام رسالوں کی تعداد سے کچھ کم ہی شاید ہو۔

ایک ہی اوڈیٹر یا مضمون نگار کے قلم سے مختلف طرز اور جداگانہ مذاق کے مضمون نہیں نکل سکتے۔ کوئی صرف تاریخی مضامین لکھ سکتا ہے کوئی ادبی اور

سیاسی زمین میں قلم دوڑا سکتا ہے۔ کسی کو نظم کا شوق ہے اور کسی کی خواہش صرف مختلف قصے اور ناول ہی لکھنا ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض ناثر ناظم ہوتے ہیں اور بعض ناظم ناثر۔ لیکن ایک ہی دماغ سے ادبی۔ سیاسی۔ تاریخی اور مذاقیہ لٹریچر کا نکلنا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ مشہور رسائل سے لیکر ادنیٰ رسالوں تک بغیر دوسرے مصنفوں کی امداد کے کوئی رسالہ تنہا اڈیٹر مکمل نہیں کر سکتا۔ فی زمانہ رسائل کے قلمی معاونین چار طرح کے ہیں۔

اول۔ وہ لوگ جو اپنی محنت کا معاوضہ نقد روپیہ چاہتے ہیں۔

دوسرے۔ وہ جن کو کارکنانِ رسالے سے بلحاظ ملاقات یا قرابت داری کوئی خاص خیال ہو۔

تیسرے۔ وہ معاون جو مضمون نگاری کے سلسلے سے رسالہ بھی دیکھتے ہوں اور انکے مضامین بھی شایع ہو جاتے ہوں۔

چوتھے۔ ایسے اصحاب جنہیں صرف اخباری دنیا میں مشہور ہونیکا شوق مضمون لکھنے پر آمادہ کرتا ہو۔

ہندوستانی رسائل کے اڈیٹر اول الذکر اصحاب سے تو سروکار ہی نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ نہ تو وہ کسی عمدہ مضمون یا نظم کا معاوضہ دینے کے عادی ہیں نہ انہیں مفلسی اور سرمایہ کی کمی اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ معاوضہ طلب مضمون نگار پیدا کریں۔ دوسری قسم کے لوگوں کی ایک معقول تعداد موجود ہے لیکن بغیر کسی خاص سبب کے متعدد مرتبہ دو دو تین تین گھنٹے محنت کر کے مضمون لکھنا آسان نہیں۔ البتہ ایسے اصحاب جن کی تعریف میں ہندوستان کا ظریف الطبع شاعر سید اکبر حسین اکبر مندرجہ ذیل شعر لکھتا ہے کثرت سے موجود ہیں ؎

دیکھو جسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا   بہرِ خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے

رسائل کی کثرت، مضامین کی کمی، وقت کی پابندی اور خریداروں کی بیتابی اڈیٹر کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ایسے ہی اصحاب کو رسالہ کی صفِ اول میں جگہ دیتے ہوئے غیر مفید مضامین سے اپنے پرچے کو پبلک کی بدمذاقی کا شکار بنائے۔ امریکہ کے ایک مشہور اخبار نویس کا قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ وہ "تاخیر اشاعت، چھپائی کی بدانتظامی، اور خریداروں کی کمی ان سب کی تلافی ہوسکتی ہے لیکن جو غیر مفید مضمون ایک دفعہ چھپ جاتا ہے وہ کبھی نہیں مٹتا" یہی اخبار نویس لکھتا ہے کہ اگر دس فضول اور غیر مفید مضمونوں کے بدلے میں پچیس سطروں کا ایک کار آمد مضمون مل جائے تو ہزار درجہ بہتر ہے۔

اُن پرچوں کے علاوہ جو کسی خاص فرقہ یا مقصد کے لیے جاری ہوں قلمی رسائل کے لیے مفصلۂ ذیل مضامین کا ذخیرہ لازمی ہے۔

اول۔ ادبی۔ تاریخی۔ تمدنی۔ ملکی۔ اخلاقی وغیرہ مختلف سبجکٹ (مضمون) پر تین سے زیادہ مضمون۔

دوم۔ ایک یا ایک سے زیادہ مذاق یا ترجمہ۔

سوم۔ تین یا چار مختلف مضامین پر نظمیں اور بشرطِ گنجایش تین چار غزلیں۔

اسمیں حسبِ ضرورت ترمیم ہوسکتی ہے، لیکن مقاصد کے برخلاف کام کرنا اور اپنے مقصد کو مدِنظر نہ رکھنا بھی پستی کی بہترین دلیل ہے۔ میں نے بہت سے ایسے رسالے دیکھے ہیں جن کا مقصد تو تاریخی۔ اخلاقی مضامین شایع کرنا ہوتا ہے لیکن مہینوں اُسپر عمل نہیں کرتے اور ادہر اُدہر کی فضولیات چھاپ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں اُردو رسائل کی تعداد دن بدن بڑہتی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہر پرچہ کی اشاعت میں ایک غیر معمولی رُکاوٹ پیدا ہوجاتی ہوگی۔ لیکن مُلک قدردانوں سے خالی نہیں ہم اپنے آپ کو قابلِ قدر بنائیں دیکھیں دوسرے ہماری قدر کیسے نہیں کرتے۔ فقط۔

مظہر حسین۔ اختر

رزم زبان

آجکل جابجا یہ چرچا ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں ایک خاص زبان ہو جانی چاہئے اگر ایسا ہو سکے تو وہ کونسی ہو۔ ہندی والے کہتے ہیں کہ وہ ہندی ہونی چاہئے کیونکہ وہ ہند کی زبان ہے۔ اسکے حروف ایسے ہیں کہ پڑھنے میں غلطی و دقت واقع نہیں ہوتی۔ اسمیں جدید خیالات بخوبی ادا کئے جا سکتے ہیں کیونکہ اسکو ایک طرف تو سنسکرت اور دوسری طرف فارسی سے تعلق ہے اور اس گری ہوئی حالت میں بھی اسکے سمجھنے والے اور زبانوں سے زیادہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اُردو والے کہتے ہیں کہ اسکو ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب سمجھتے ہیں۔ یہ آسانی اور جلدی سے لکھی جاتی ہے اگر نقطہ زیر۔ زبر۔ پیش وغیرہ لگائے جائیں تو پڑھنے میں کوئی دقت نہیں۔ اس میں بھی غیر زبانوں سے اخذ کرنیکا مادہ اتنا ہی ہے کیونکہ اسکے لئے بجائے سنسکرت کے عربی موجود ہے۔ اسکی لٹریچر بھی اسوقت ہندی سے زیادہ ہے۔ اسکے علاوہ یہ فی زمانہ اُس جماعت کی مادری زبان ہے جو بلحاظ پولٹیکس ضروری سمجھی جاتی ہے۔

بنگلہ والے کہتے ہیں کہ اسکے بھی سمجھنے والونکی تعداد اُردو یا ہندی والوں سے بہت کم نہیں ہے۔ لٹریچر میں یہ دونوں ملکر بھی اسکے پاسنگ نہیں ہوتیں۔ جدید سائنس و فلسفے کے ادق مضامین و اصطلاحیں اس میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ باحتیاط جلدی لکھے جانے کے یہ اُردو سے کم نہیں۔ اسکے حروف (دیوناگری) یعنی ہندی سے خوبصورت اور لکھنے میں آسان ہیں یہانتک کہ ایک معمولی خواندہ شخص تین چار دن

کی کوشش سے بنگلہ کے سب حروف اور اسکے مرکبات پہچان کر سب کتابیں پڑھ سکتا ہے۔ اور آخرش کسی ایک پولیٹیکل پارٹی کی ہندوستان میں ایک خاص زبان قرار دینا صرف واقعات کے برخلاف ہے بلکہ اسکی کوشش موجب قومی مصائب ہوگی۔

اسی طرح مرہٹی و گجراتی زبان بھی ہندوستان کی زبان بننے کے لئے اپنے دعوے پیش کرسکتی ہیں۔ لیکن جہانتک ہم قیاس کرسکتے ہیں زبان ہندوستان کی آخری لڑائی ہندی اُردو کے درمیان ہونے والی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ جنگ میں بہت سے چھوٹے مقامات کی چھوٹی موٹی بولیاں جس میں ابتک کوئی لٹریچر پیدا نہیں ہوئی ہے پامال ہوکر نیست و نابود ہوجائینگی۔ لیکن زبان ہندوستان کے رقیب اس جنگ و جدل میں بنگلہ۔ گجراتی۔ مرہٹی اور بعض دکھنی زبانوں کو ہرگز اپنے مطابقت میں نہیں لاسکیں گے بلکہ اسکے فتاح کو بعد فتحیابی کے بھی مدت تک ان ہم شیرہ زبانوں کی امداد سے ایک قومی لٹریچر بنانے کی ضرورت رہے گی۔

اس لڑائی کے رنگ ڈھنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ سردست اس بات فیصلہ کرنا کہ کون آخر میں فتحیاب ہوگا بہت ہی مشکل ہے۔ ہندی بظاہر کمزور معلوم ہوتی ہے سکے اور نوٹوں کے معاملہ میں اسکی ناکامیابی سے جو کہ عنقریب ہوچکی ہے بعض شخص دل ہی دل میں خوش ہورہے ہیں علاوہ اسکے ملک کے مختلف اضلاع میں کہ جہاں اُردو عموماً نہیں بولی جاتی ہے وہاں بھی سررشتہ تعلیم میں معدودے چند اشخاص کے لئے اُردو پڑھانے کی تجویز کچھ نہ کچھ اُردو کو تقویت دے گی۔ چونکہ حال تک صرف سو دو سو روپیہ کی پونجی سے بھی معقول اُردو پریس قایم ہوسکتے تھے اس لئے اس میں بیشمار اخبارات و رسائل پیدا ہوگئے جو کچھ مدت تک ہندی کو سر نہ اٹھانے دیں گے لیکن ہندی کی تعدادی اور اندرونی طاقت اُردو کی ان تمام بیرونی امداد کے مقابلہ میں

زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ہندی بہ آسانی لکھی جاسکتی ہے جتنی کہ دہلی۔ آگرہ۔ لکھنو وغیرہ جو مخزن اُردو زبان کہلاتے ہیں وہاں بھی اکثر اہل ہنود اپنی خط وکتابت ناگری خط میں کیا کرتے ہیں۔ نیز مسلمان صاحبان بھی اپنے تجارتی بہی کھاتے ایک قسم کے "شکستہ ہندی" میں رکھتے ہیں۔ دیگر اور کئی اضلاع کے لوگ جو ہندی نہیں بولتے ہیں وہ بوجہ سنسکرت کے باہم تعلقات کے ہندی کو اُردو کی نسبت بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً بنگالی۔ گرمکھی۔ گجراتی۔ مرہٹی وغیرہ انمیں سے بعضوں کے حروف ہندی کی طرح دیوناگری ہیں۔ اور اگر یہ سب کے سب اسبات پر اتفاق کرسکیں گے جیسی کہ تجویز ہے کہ باوجود مختلف زبانوں کے سب دیوناگری خط کو اختیار کرلیں تو ہندی کی طاقت بہت بڑھ جائے گی۔ اُردو والونکی جو دلیل ہے کہ یہ عام فہم ہے ہندی والونکے حق میں زیادہ عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ دراصل بولنے چالنے کی زبان اُردو اور ہندی میں بہت فرق نہیں ہے۔ جہاں لوگ اُردو سمجھ سکتے ہیں وہاں ہندی بھی سمجھ سکتے بلکہ فصیح اُردو میں جو بیشمار عربی وفارسی الفاظ کی آمیزش ہے وہ سمجھنے کے لحاظ میں کتابی ہندی سے جس میں اسی قدر سنسکرت الفاظ شامل ہوتے ہیں زیادہ وقت طلب ہے۔ سنسکرت بہت سی ہندوستانی زبانوں کی بنیاد ہے اس لئے سنسکرت لغت کے سمجھنے والے بمقابلہ عربی وفارسی لغت کے ہندی میں زیادہ ہیں لہذا محض عام فہمی کی بنا پر اُردو ہندی سے ہرگز سبقت نہیں لیجا سکتی۔ اب رہی لٹریچر البتہ اُردو میں تیار شدہ لٹریچر تو بہت ہے لیکن وہ زیادہ تر ایک خاص رنگ کی لٹریچر اسلئے قوم کی دماغی غذا کے لئے کسی قدر بیکار ہے اور ناکافی۔ جدید لٹریچر کی کمی اُردو اُردو ہندی میں مساوی پائی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس لڑائی کا فیصلہ بہت سا اسباب پر مبنی ہوگا کہ ان میں سے کوئی جدید لٹریچر بہ افراط پیدا کرسکے۔

میں اس لڑائی میں کسی خاص فریق کا طرفدار نہیں ہوں گو کہ میری ہمدردی اسوقت

اُردو کے ساتھ ہے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود ان بیرونی امداد کے جو اُردو کو اتفاق سے حاصل ہو رہی ہے۔ اُردو والے اس لڑائی کیلئے کوئی خاص تیاری نہیں کر رہے ہیں اور غالباً یہی اطمینان اور اپنی قوتوں پر بھروسہ اسکے زوال کا باعث ہوگا۔ اُردو زبان کی ترقی کی بابت یہ بات قابل غور ہے کہ جس دلیل کی بنا پر اُردو والے اپنی زبان کو ہندوستان کی زبان بتاتے ہیں کہ یہ ہند کے ہر حصہ میں سمجھی جاتی ہے۔ اُردو لٹریچر کچھ اسکی بیخ کنی پر آمادہ ہے میں ناظرین کو اس بات سے پہلے ہی آگاہ کر چکا ہوں کہ فارسی عربی لغات ہندوستان میں ہندی کی بہ نسبت کم فہم ہیں۔ لہذا اگر اُردو کی ترقی چاہیں تو مولوی الطاف حسین صاحب حالی کی روش پر اس میں زیادہ ہندی الفاظ شامل کریں۔ اسکو حتی الامکان فارسیت و عربیت سے بری کریں۔ لیکن فی زمانہ مضمون کا میلان اسکے برعکس پایا جاتا ہے۔ اسی طرح جدید ہندی والے بھی ایک غلطی کر رہے ہیں کہ وہ بے سوچے سمجھے بڑے بڑے سنسکرت لغات ہندی کے اندر لیتے چلے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ مصنوعی ہندی بھی بغیر کاشی کے پنڈتوں کی مدد کے سمجھنی دشوار ہوگی میرے خیال میں طرفین کی کوششیں اس بات پر ہونی چاہئیں کہ وہ ہندوستان کی ایک زبان پیدا کریں۔ اور اسکی کامیابی بہت سی سہل اور عام فہم طریقہ تحریر پر مبنی ہے۔

کسی زمانہ میں انگریزی میں بھی لفاظی تحریر کا حسن سمجھا جاتا تھا لیکن ارتقاع زباندانی نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ زبان وہ ہے کہ جس کو سننے والا سمجھ سکے۔ اسلئے آج زبان انگریزی میں گہرے سے گہرے خیالات علاوہ (اصطلاحات) عام فہم الفاظ میں ظاہر کئے جاتے ہیں اور جب انگریزی زبان لاطینی۔ یونانی و فرانسیسی رنگ آمیزی سے بری ہو کر ایک عالمگیر زبان (کم از کم تجارتی دنیا میں) ہو گئی ہے تو کیا ہم اُردو اور ہندی ملا کر جو ایک ماں کی اولاد ہیں ایک عالمگیر ہندوستانی زبان پیدا نہیں کر سکتے کہ جو ادق کوش و قاموسی الفاظوں سے مبرا ہو۔

ب۔ م۔ ق۔

تندرستی ہزار نعمت ہے

خداوند کریم نے انسان کے عیش و آرام کے لئے دنیا میں بہت سی چیزیں پیدا کی ہیں۔ جنکی تعریف ہم سے کسی طرح ممکن نہیں۔ خدائے تعالیٰ نے انسان کو جس قدر اعضائے جسمانی عطا کئے ہیں اُن کی توصیف ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ ہمارے معبود حقیقی نے ہم کو ہوش عقل اور حواس وغیرہ وغیرہ بہت سی چیزیں مرحمت فرمائی ہیں جس کا شکریہ ادا کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

ہر چیز ایک کام کے لئے مثلاً کان سننے ناک سونگھنے زبان بولنے ہاتھ کام کرنے پیر چلنے سر سجدہ کرنے اور عقل فکر کرنے کے لئے ہے۔ عقل ایک کسوٹی ہے جو اچھے بُرے کی تمیز کرتی ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہر ایسا کام جو بذریعہ عقل مناسب دریافت ہو کریں۔ اگر ہم اپنی عقل سے کام نہیں جو کچھ دل میں آئے بے سوچے سمجھے کر گزریں تو ہماری نادانی اور بیوقوفی پر دال ہے۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جو کام بغیر جانے بوجھے کیا جاتا ہے عموماً اُس کا نتیجہ سوائے اسکے کہ بیٹھے ہوئے ہاتھ ملتے رہیں اور کیا ہو سکتا ہے ؎

آگے کے دن پاچھے گئے ہر سے کیو نہ ہیت
اب پچھتائے کا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم جو کام کریں پہلے ہی اُس کے نشیب و فراز سے واقف نہ ہو لیں کسی کام کے کرنے کے پیشتر ہی تھوڑی دیر کی تکلیف "دیر آید درست آید" کو مد نظر رکھتے ہوئے گوارا کر کے اُس کے اچھے یا بُرے نتیجے پر غور کرنے کے بعد عمل کرنا شان

فتحمندی ہے۔
جہانتک دیکھا جاتا ہے عموماً یہی ہوتا ہے کہ اکثر حضرات بغیر کام کا آغاز و انجام سوچے ہوئے کر گزرتے ہیں اور بعد کو پچھتاتے ہیں کہ افسوس ہمنے ایسا کیوں کیا؟ اگر پہلے ہی سوچ لئے ہوتے تو آج یہ روز بدنصیب نہ ہوتا ایسے وقت میں ہم کو یہی کہنا ہوگا

"مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خود باید زد"

مگر غور کرنے سے ہمکو عقل یہ سمجھاتی ہے کہ وہ تمام کام جو ہم کرتے ہیں سب میں کامیاب نہیں ہوسکتے اس کی وجہ ہماری کمزوری اور ہمارے خیالات غیر صحیح کا قصور ہے۔
اب ہم خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان جب تک مختلف ٹھوکریں نہیں کھا لیتا ہے ہرگز ہرگز راہ راست پر نہیں آتا۔ اور دنیا کے رنگا رنگ واقعات سے خبردار نہیں ہوتا۔ ناتجربہ کاری آدمی کے واسطے بہت بری بلا ہے۔ فارسی کی ایک مثل مشہور ہے۔

پیش طبیب مرو پیش تجربہ کار برو

اس کے علاوہ تندرستی انسان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جسپر دنیا و دین کے تمام کام محول ہیں۔ لہذا ہم تندرستی کو مخاطب کر کے دو دو باتیں کرنا چاہتے ہیں کہ اے تندرستی میں نے تمام دنیا کی خاک چھانی مگر میری نظروں میں تجھ سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں۔ انسان خواہ کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو اگر وہ اس نعمت سے محروم ہے تو اس کی دولت ہیچ ہے اسکی زندگی بیکار ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی تمام عیش و آرام کی چیزیں اس کے لئے زہر ہلاہل سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ بالفرض اگر کوئی شخص اپنی تندرستی کے لئے قاروں کا خزانہ صرف کرنے کو مستعد ہو جائے پھر بھی ہمارے خیال میں بالکل کم ہے اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو کوئی دنیا میں ایسی کوئی شے نظر نہ آئے گی جس کو ہم تندرستی پر ترجیح دے سکیں۔

ایک ایسا شخص جو نہایت غریب ہے، اور ٹکڑے کو محتاج ہے مگر تندرستی کی دولت سے مالامال ہے۔ اُن حضرات سے جو اپنی زندگی مخلوق میں بیماری کی حالت میں بسر کرتے ہیں بدرجہا بہتر ہے۔ پیارے ناظرین ہماری ہی بے احتیاطی ہم کو اِس دولت سے محروم رکھتی ہے چھوٹی چھوٹی باتوں کو ہم پروا نہیں کرتے جو دل میں آتا ہے کر گزرتے ہیں جو حفظ صحت کے اصول کے بالکل خلاف ہے۔ ہماری ہی بے اعتدالی ہم کو دُنیا کی تمام بیماری اور دکھوں کا شکار بناتی ہے۔

وہی شخص اپنے سرمایۂ زندگی کی بخوبی حفاظت کر سکتا ہے جو اصول حفظ صحت کا پابند ہے۔ وہ شخص جو اصول صحت کی قدر نہیں کرتا ہے وہ اپنے رشتۂ حیات کو آپ ہی قطع کرتا ہے یا یوں کہیے کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنے پیر پر کلہاڑی مارتا ہے۔

پہلا اصول تندرستی کا وقت پر غذا کھانا اور جسم اور لباس کی صفائی ہے جو شخص پاک و صاف رہتا ہے وہ بہت کم بیمار ہوتا ہے جس کو اس کا خیال نہیں ہوتا وہ بیشک اکثر امراض میں مبتلا ہوتا ہے اور دائم المرض کہا جاتا ہے۔ طاقتِ جسمانی کو دن بدن زوال ہوتا ہے ناتوانی بڑھتی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اُس سے بھی زیادہ مصارف ہوتے ہیں جو حالتِ صحت میں ہوتے۔ پھر بھی لاحاصل۔ ہر چیز کی روک ابتدا ہی میں بسہولیت ممکن ہے۔ بقول سعدیؒ ؎

سرِ چشمہ باید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نشاید گزشتن بہ پیل

آخر کار ایک روز دُنیا کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ دل کی حسرتیں دل ہی میں رہجاویں گی کفِ افسوس ملنا ہوگا کہ آہ ہمنے اپنی تمام عمر گزار دی نہ تو کچھ عیش ہی کیا نہ آخرت کی کچھ فکر۔ مگر افسوس کے سوا اُس وقت کچھ کرتے نہ بنے گی۔

تندرستی کا دوسرا اصول کم سے کم دوسرے تیسرے دن حمام کرنا اور نہانا ہے۔

جبکہ چرند اور پرند اپنا تمام جسم پانی سے صاف کرتے رہتے ہیں تو انسان کو بدرجہ اولیٰ اس اصول پر عمل کرنا چاہئے۔ اس کا تصفیہ ہم آپ ہی کی لطافت طبع اور صفائی مزاج پر چھوڑتے ہیں۔

نہانے سے جسم کا جما ہوا میل دور ہو جاتا ہے بدن صاف رہتا ہے طبیعت کو فرحت حاصل ہوتی ہے جس سے بیماریاں دور رہتی ہیں۔

نہانے کے لئے سب سے زیادہ صبح کا وقت موزوں ہے اس وقت نہانے سے بدن کی سستی جاتی رہتی ہے اور جسم میں ایک تازگی پیدا ہو جاتی ہے انسان تمام دن اپنے فرائض کو مستعدی سے انجام دیتا ہے۔ خون کو گردش ہوتی ہے اور جسم میں خوشگوار حرارت محسوس ہوتی ہے۔ کم سے کم ہفتہ میں دو بار عمدہ صابون سے اگر بدن صاف کیا جائے جسم پر ہمیشہ صاف اور ستھرا لباس رہے تو شاید ہم کبھی بیمار نہ ہوں۔

اب ہم ناظرین کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں کہ کم سن بچوں کو فضول اور لغویات کھیل سے باز رہنے اور بدن و لباس کے صاف رکھنے کی بچپن ہی سے تعلیم دیجائے اور عادت ڈالی جائے تو نہایت مناسب ہے۔ اس واسطے کہ عالم طفلی میں جو عادت پڑ جاتی ہے وہ کبھی نہیں چھوٹتی "ترک العادۃ عداوۃ" عرب کا ایک مشہور مقولہ ہے۔

گوبند پرشاد

معذرت - ہم اپنے معزز خریداران سے معافی کے خواستگار ہیں کہ انکو اس غیر معمولی تاخیر پر از حد انتظار کرنا پڑا ہوگا۔ مگر خادم کی ناسازی طبیعت نے اسقدر طول کھینچا کہ بسبب چند معزز ڈاکٹرز اور حکماء کے بلیغ کوشش کے ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ دوسرے پلیگ کی وجہ سے جو بے چینی ہوئی ہے اُسکا ذکر کرنا عبث ہے۔ اسواسطے ہر دو نمبر (یعنی فروری و مارچ) یکجا شائع کئے جاتے ہیں اور تصویر کی جو کمی رہگئی ہے اُسکو آئندہ پورا کر دیا جاوے گا۔

اڈیٹر

میری نوٹ بک

نمبر ۲

کرم فلاسفی یا لا اوف کرما پر ایک چھوٹی سی بدھسٹ کہانی

عرصہ ہوا جب کہ بدھ مذہب پھیلا ہی پھیلا تہا۔ ہندوستان بڑی خوش حالی اور فارغ البالی کی حالت میں تہا۔ آریہ ورت کے رہنے والے اعلےٰ درجے کے مہذب اور نیک نیت لوگ تھے۔ ہر کمال کے انسان اور ہر جوہر کے قدرشناس نظر آتے تھے۔ منڈیاں۔ ہر قسم کی صنعت و دستکاری اور تجارتی مال سے بھری رہتی تھیں۔ لین دین کرنے والوں کی بھیڑ سے بازاروں میں چلنا مشکل ہوتا تہا۔ ہرطرف علم کا چرچا تہا۔ دریائی گنگا میدانوں کو سیراب کرتی ہوئی گلی کوچوں سے ہو کر گھر گھر جل تھل کر رہی تہی۔ یہ اُس سنہری زمانے کا ذکر ہے کہ۔

پنڈو نامی ایک امیر جوہری۔ اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ بعنرسی کو جو اسوقت بنارس کہلاتا ہے جاتا تہا جسے امیری کے علاوہ اپنے علم کا بھی بڑا غرور تہا۔ راستے میں اُسے ایک شرمن جو اُسوقت کے بدھ سادہوں کا خطاب تہا ملا۔ جوہری نے اِس پاک صورت کو دیکھ کر خیال کیا یہ کوئی لائق اور اہل دل شخص معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی بنارس جا رہا ہو تو گاڑی میں بٹھالو۔ کیونکہ لائقوں کی صحبت سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوتا ہے۔ یہ سوچکر اُسنے سادہو سے دریافت کیا۔ مہاراج آپ کہاں جا رہے ہیں۔ اور یہ معلوم ہونے پر کہ اِنکا نام نارد ہے اور یہ بھی بنارس ہی جا رہے ہیں جوہری نے گاڑی ٹھیراکر سادہو سے بیٹھ جانے کے لئے عرض کیا۔ اسپر سادہو نے کہا۔ میں آپکی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ میں دور سے آرہا ہوں اور اب چلتے چلتے تھک بھی گیا ہوں لیکن میرے پاس ایسی تو کوئی چیز ہے ہنیں جسے نقدی کی صورت میں بطور عنایت پیش کروں۔ ہان شاید کچھ روحانی خدمت بن آئے یا اُس خزانے کا پتہ دیکھوں جو تم نے جہاتا بدھ کے

قدم بقدم چلکر حاصل کیا ہے۔ یہ کہکر سادھو گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور گاڑی روانہ ہوئی۔ چلتے چلتے کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ بعد ایک ایسی جگہ آئی جہاں راستہ رکا ہوا تھا۔ کیونکہ ایکطرف تو بارش کے زور سے سڑک جگہ جگہ سے بُری طرح کٹ رہی تھی اور دوسری طرف کسی زمیندار کا چاول سے لدا ہوا چھکڑا اڑ رہا تھا۔ دھرے کی کیل کہیں گر جانے سے پہیہ نکل گیا تھا۔ وہ چھکڑے کا مالک دیول باندہ جوڑ میں لگ رہا تھا۔ کیونکہ اسے بھی بنارس پہنچکر اپنے چاول بیچنے کی جلدی تھی اور یہ فکر تھا۔ کہ کسی طرح کل صبح پو پھٹنے تک بنارس پہنچ جاؤں۔ اگر ذرا بھی دیر ہو گئی تو شاید منڈی کا وقت نکلجائے یا خریداروں کو ایسے عمدہ باسمتی چاولوں کی ضرورت نہ رہے۔

جب پنڈت نے یہ دیکھا کہ گاڑی رُک گئی۔ اور بغیر چھکڑا ہٹے یہاں سے نکلنا مشکل ہے تو اس نے سائیس کو حکم دیا۔ مہادت چھکڑا ایک طرف دھکیل کر گاڑی نکال لے چلو۔ یہ لفظ سُنکر کسان کے ہوش جاتے رہے۔ اور اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ جناب چھکڑا عین سڑک کے کنارے کھڑا ہے۔ اگر ذرا بھی ادھر سرکا تو میرا بڑا نقصان ہوگا۔ ذرا صبر کیجئے مگر پنڈت کب ماننے والے تھے۔ حکم کی تعمیل نہ ہونے پر دوبارہ سائیس کو حکم دیا۔ مہادت کیا بہرہ ہے کیوں نہیں چھکڑے کو ایک طرف کر دیتا۔

مہادت ایسے ہی وقت کے لئے حرام کے لقمے کھا کھا کر بھینسے کی طرح پھول رہا تھا۔ اور دوسروں کے دل دکھانے میں اُسے مزا آتا تھا۔ شہ ملنے کی دیر تھی۔ فوراً گاڑی سے کود پڑا۔ اور پیشتر اسکے کہ بیچارہ سادھو کچھ دخل دے چھکڑا سڑک سے نیچے ڈھکیل دیا۔ اور پھر جھٹ کوچ بکس پر بیٹھ راس سنبھال لی۔ گاڑی آگے بڑھنے ہی کو تھی کہ سادھو نیچے اتر پڑا۔ اور پنڈت سے کہا جبوقت آپنے مہربانی فرماکر مجھے گاڑی میں بٹھایا تھا۔ اسوقت میں تھکا ہوا تھا۔ لیکن گھنٹہ بھر آرام ملنے سے میری تکان دُور ہو گئی۔ علاوہ ازیں یہ کسان مجھے آپکا ایک قریبی رشتہ دار معلوم ہوتا ہے۔ اور میں آپکی مہربانی کا اس سے زیادہ صلہ نہیں دے سکتا کہ میں

کی اِس مصیبت میں مدد کرون اسلئے اَب میں اجازت چاہتا ہون اور آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوتا ہون۔

پنڈ دے نے تعجب سے سادہو کیطرف دیکھکر کہا۔ یہ ناچیز کسان اور میرا رشتہ دار۔ ناممکن۔ اِس پر سادہو نے ایک یقینی لہجہ مین جواب دیا۔ ہان بلکہ تمہارا اور اوسکا ایسا قریبی رشتہ ہے جیسے ایک ہی باپ کی اولاد یا ایک ہی جسم کے اعضاء۔ تم کو یہ نہیں معلوم کہ مختلف انسانون کے ساتھہ تمہارے کیسے کیسے ضروری اور بے شمار واسطے ہیں۔ نہ تم کو اُس رشتہ کا علم ہے جس نے انسانی زندگیونکو ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اور مالا کے دانونکی طرح ایک ہی تاگے مین پرو رکھا ہے۔ ہمارے رنج و راحت ہمارے دکھہ ہمارے سکھہ مشترکہ ہیں۔ ہماری ہستی کا دار و مدار ایک دوسرے کے سہارے ہے۔ اِسوقت تم اِس کسان کو دُکھہ دیکر خوش ہو لو۔ لیکن وقت آئیگا جب تمکو معلوم ہوگا کہ اِس غریب کو دکھہ پہنچا کر تم نے اپنے حق میں کانٹے بوئے تھے۔ آپ اپنے پاؤنمیں کلہاڑی ماری تھی۔ لیکن میں کوشش کرونگا۔ اور جہانتک ہوسکیگا تم کو اِس تکلیف سے بچاؤنگا۔

سادہو نے یہ لفظ بڑی سنجیدگی اور محبت آمیز لہجے میں کہے مگر چودہری اپنی رائے کے خلاف سننے کا عادی نہ تہا۔ ہمیشہ۔ ہان حضور۔ بجا ارشاد ہوا۔ سچ ہے غریب پرور۔ ایسا ہی ہے ان داتا۔ سنا کرتا تہا۔ اور پھر بقول گوسائین تلسی داس۔ دوہا۔

جاکو پربھو دارن دکھہ دیہین واکی مت پہلے ہر لیہین

یعنی جب کسی پر کوئی بڑی مصیبت آنیوالی ہوتی ہے تو اوسکی عقل پر پردہ پڑجاتا ہے نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی۔ میٹھی کڑوی۔ کڑوی میٹھی۔ سیدہی الٹی۔ الٹی سیدھی بھلی بری۔ بری بھلی۔ سچی جھوٹی اور جھوٹی سچی معلوم ہوتی ہے۔ دوست دشمن۔ دشمن دوست اپنے غیر غیر اپنے نظر آتے ہیں۔ سادہو کی نیک نصیحت۔ سچی اور فائدہ کی بات پنڈدہ نے طعنہ کرکے مانی اور لٹسنے منہ بناکر کہا۔ بس جی بس چپ کرد زیادہ فلاسفی نہ چھانٹو۔

میں اپنی آپ نبیڑ لونگا۔ مہادت چل گاڑی ہانک مہادت نے فوراً ہنٹر پھٹکارا اور گھوڑا ہوا ہوگیا۔

گاڑی روانہ ہوجانے کے بعد سادہو فوراً کسان کیطرف بڑھا۔ اور جھٹ چھکڑے کو درست کرنے اور ادہر اُدہر گرے ہوئے چاولونکو لدوانے لگا۔ اِس تائید غیبی سے موثر ہوکر کسان نے سوچا۔ یہ سادہو کوئی دیوتا ہے جو انسانی لباس میں میری مدد کرنے آیا ہے۔ جب سب کام ہوچکا تو اُس نے سادہو سے دریافت کیا۔ مہاراج میری اِس تکلیف۔ اِس ناگہانی آفت کی کیا وجہ ہے۔ جس شخص کا مینے کبھی کچھ نہیں بگاڑا۔ اُس نے مجھپر یہ ظلم کیون کیا۔ میرے ساتھہ یہ ناانصافی کیون ہوئی۔ سادہو نے کہا۔ مہاتن تم تو کیا۔ ایک ننھے سے کیڑے یا حقیر تنکے۔ پانی کے چھوٹے سے چھوٹے قطرے اور ریت کے باریک سے باریک ذرّے کے ساتھہ بھی ناانصافی نہیں ہوتی۔ تم وہی کاٹتے ہو جو تم نے بویا ہے۔ وہی پاتے ہو جو تم نے جمع کیا ہے۔ تم سے ویسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ جس کے تم لائق ہو۔ تمہاری قسمت تمہارے ہی فعلونکا نتیجہ اور تمہارے ہی کرمونکا پھل ہے۔ اپنی پستی۔ اپنے زوال۔ اپنی تکلیف کا الزام کسی دوسرے کو نہ دو۔ اسکا سبب سوائے اپنی ہی لاعلمی اپنی ہی کاہلی کے کسی دوسرے کو نہ سمجھو۔ کیونکہ تمہاری یہ زندگی۔ تمہاری یہ ہستی۔ اور تمہاری یہ موجودہ حالت تمہارے ہی گزشتہ افعال اور تمہارے ہی کرے ہوئے کرم ہیں۔ کسان نے دریافت کیا۔ کسی کے کرم سے کیا مراد ہے۔ سادہو نے جواب دیا کسی کے کرم سے مراد وہ خیال۔ اور وہ فعل ہیں جو یہ کرتا رہا ہے۔ قسمت اُن اچھے اور بُرے فعلونکو کہتے ہیں۔ جو کسی نے اپنی موجودہ یا کسی پہلی ہستی اور زندگی میں کئے تھے۔ تمہاری یہ زندگی اُن بہت سی حرکتون اور خیالونکا ایک مسلسل سلسلہ ہے جسکا ظہور تم سے ہوتا رہا ہے جو متواتر ایک زندگی سے دوسری زندگی میں آتی رہی۔ یا ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کا وجود اِن مسلسل کارگزاریونکا

ایک ایسا مجموعہ ہے جسمیں کہ موجودہ خیال۔ فعل اور تجربے نے کچھ کمی بیشی کرکے ایک شے یا ایک صورت بنادی ہے۔ اسلئے ہم وہی ہیں جو ہم نے آپ کو بنایا ہے۔ اور اسی طرح آیندہ بھی ہم وہی ہونگے یا بنیں گے جو ہم بنائیں گے۔ یا جیسا بنیں گے۔ اور جیسا بنانے کی ہم کوشش کررہے ہیں یا کرینگے۔ اگر تم اچھا بننا چاہتے ہو تو اچھے بننے کے فعل کرو اگر آزاد ...... فقرہ ابھی ختم ہونے پایا تھا۔ کہ اچانک گھوڑا کود کے ایک طرف کو ہوگیا اور کسان چلایا۔ سانپ سانپ۔ لیکن جب سادھو نے اس چیز کو جس سے چمکا تھا۔ نزدیک جاکر ذرا غور سے دیکھا تو اشرفیوں کی تھیلی تھی۔ سادھو نے سوچا اس راستے سے پنڈدہی گزرا ہے۔ ہو نہو یہ اسی کی ہے۔ چنانچہ اس نے تھیلی کسانکو دیکر کہا۔ اسے اپنے پاس رکھ لو۔ اور جسوقت بنارس پہنچو تو سرا میں جاکر پنڈد کو تلاش کرنا اور تھیلی اسے دیدینا۔ اور کہنا میں تمہارا قصور معاف کرتا ہوں اور میری طرف سے کہنا۔ کہ نارد نے کہا ہے میں تمہاری مہربانی کا شکرگزار ہوں اور دل سے تمہاری بہبودی کا خواستگار ہوں۔

اب پنڈد کی سنیئے جسوقت وہ بنارس پہنچکر اپنے اس دوست کے پاس پہنچا جسکی معرفت یہ بنارس میں لین دین کیا کرتا تھا۔ وہ بھی ایک حیثیت دار آدمی تھا۔ اور دونوں کا آپس میں گہرا تعلق اور ایک قسم کا دوستانہ تعلق تھا۔ تو اسے ایک عجیب فکر میں پایا یہ شخص شاہی رسوئی کے لئے رسد دیا کرتا تھا جسمیں چاول بھی شامل تھے۔ آج ذرا دیر سے منڈی میں پہنچا عمدہ چاول سب بک چکا تھا۔ ایک دانہ بھی ہاتھ نہ لگا اور اسوقت اسے یہ خیال تھا کہ اگر شام تک شاہی رسوئی کے لائق چاول نہ ملا تو شاید رسوئی خانہ کا داروغہ خفا ہو جائے۔ یا اس کام پہ کسی اور کو مقرر کردے۔ یہ دھندا ہاتھ سے نکل گیا۔ تو بات میں بھی فرق آئیگا۔ اور کاروبار کو بھی نقصان پہنچیگا چپ چاپ بیٹھا بہتیری عقل دوڑا رہا تھا۔ مگر گرہ کچھ ایسی گول پڑی تھی کہ کسیطرح کھلتی ہی نہ تھی۔ پنڈد نے معمولی صاحب سلامت کے بعد جب لین دین کا ذکر چھیڑا۔

تو اُسنے بیچ میں بلت کاٹکر کہا جناب مجھے افسوس ہے کہ میں اسوقت نہ تو آپکی کچھ خاطر تواضع کر سکتا ہون اور نہ مجھے بیوپار کرنے کا ہوش ہے۔ ناچار پنڈو سرایں واپس آیا اور روپیہ حفاظت سے رکھدینے کے خیال سے اشرفیوں کی تھیلی گاڑی میں تلاش کرنے لگا۔ مگر وہان کیا رکھا تھا۔ تھیلی تو راستہ میں گر چکی تھی۔ اور اسوقت کسان کے پاس تھی۔ تھیلی وہان ہو تو ملے۔ اِدھر دیکھ۔ اُدھر تلاش کر۔ یہ تکیہ اٹھا وہ گدّی جھاڑ۔ مگر سب بے فائدہ۔ اَب تو ان کے پاؤن تلے کی مٹی نکل گئی۔ دو آدمی۔ خود یا مہادت کوچوان۔ ہاتھ سے کسی کو دی نہیں۔ اپنا مال آپ کیا چراتا۔ ہو نہو مہادت کی بے ایمانی ہے۔ فوراً مہادت کو آواز دی اور لال پیلا ہو کر کہا۔ بچہ جی خیر چاہتے ہو تو تھیلی حوالے کرو۔ ورنہ عمر بھر جیلخانہ میں پڑے سڑ وگے۔ بے قصور مہادت لگا قسمیں کھانے اور لیجانیوالے کو گالیان سُنانے۔ مگر پنڈو بغیر تھیلی ملے کیونکر پتیاتے۔ اور کس طرح مہادت کی ایمانداری کا یقین لائے جب اُس نے دیکھا کہ مہادت برابر انکار کئے جاتا ہے اور یہی کہے جاتا ہے کہ بیشک مین ایک خراب اور برے چلن کا آدمی ہون۔ لیکن مجھے تمہاری تھیلی کا علم نہیں۔ مین ہمیشہ کا جھوٹا سہی۔ لیکن اس معاملہ میں بالکل سچ کہہ رہا ہون۔ کم از کم میری اس بات کا یقین کرو۔ اگر میں نے کبھی سچ بولا ہے۔ تو اس موقعہ پر۔ اسنے اِس خیال سے کہ شاید تھپڑ لاز کے ڈر سے بتادے۔ سرکاری پیادہ کو بلانے چلا۔

پنڈو کے پیچھے مڑنے پر وہ جہان کھڑا تھا وہیں کھڑا رہگیا۔ اور سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے یہ میرے اُس گناہ کی سزا ہے۔ جو میں نے اپنے آقا کے کہنے سے ایک غریب اور بے گناہ کسان کو ستالکر کیا ہے۔ اِس خیال کے آتے ہی کسان کی تصویر اُس کی آنکھون کے سامنے پھر گئی اور یہ معلوم ہوا کہ کسان اسکے سامنے ہی کھڑا اور اسی کی طرف رحم کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ مہادت اُس خیالی تصویر کی طرف بڑھا اور ہاتھ جوڑکر کہنے لگا۔ اے نیک انسان میرا قصور معاف کر۔ مین اپنے کئے پر شرمندہ ہون

تجھسے دست بستہ معافی مانگتا ہون۔ ادہر مہادت اِس خیالی تصویر سے باتیں کر رہا تہا۔ اور ادہر پنڈد مرے مرے قدمون سڑک کے دروازے کی طرف جا رہا تہا۔ کہ کسان سرا میں داخل ہوا۔ اور سب کے سامنے اشرفیونکی تہیلی جوہری کے ہاتہہ میں دیدی۔ چھناچھن کی آواز سے جوہری کی بھی باچھیں کہل گئیں اور مہادت کی بھی وہ خیالی تصویر خیالی سے اصلی ہوگئی۔ فرق تہا تو یہ کسان کا چہرا تو ایک ایسے تبسم سے شگفتہ ہو رہا تہا جس سے رحم اور محبت ٹپکتی تہی۔ پنڈد کا چہرا جو پہلے غصے سے تمتما رہا تہا۔ وہ اب ایسی مسکراہٹ مین بدل گیا تہا۔ جس سے باوجود مسکراہٹ کے اب بھی اُسکی اندرونی غرور اور اوس کی سیاہ دلی ٹپک رہی تہی۔ پنڈد کسانکو ساتہہ لئے ہوئے آئے۔ اور سارا ماجرا اُس کے سامنے بیان کیا۔ بنارس والے کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ کسان بڑہیا چاول بیچنے لایا ہے تو فوراً ڈیوڑھی چوگنی قیمت دیکر سب مال خرید لیا اور پنڈد کو بھی مال دلوانے کا اقرار کر لیا۔

لین دین سے فارغ ہوکر۔ پنڈد بہار میں جاکر سدرمن کے قدمونمیں گر پڑا اور اُپدیش سننے کی التجا کی۔ نیکی کا راستہ دریافت کیا۔ سادہو نے کہا۔ مجھے کہنے میں تو عذر نہیں لیکن کیا کرون تمہارا دل اِس نعمت کے لائق نہیں معلوم ہوتا۔ یہ مضمون تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے اُس راستے پر چلنا اور بتلائے ہوئے پر عمل کرنا تم سے نہیں ہونا۔ اور جب بات پر یقین نہ آیا۔ کہے پر نہ چلے تو نہ کہنے کا فائدہ نہ سننے کا۔ لیکن پھر بھی مجھے انکار نہیں ہے۔ سنو تمام نصیحتونکا نچوڑ۔ اور سارے اپدیشونکا سار یہ ہے۔ کہ جو کچھہ تم نے کیا وہی پایا۔ جیسے بنے ویسے ہی ہو۔ جو بننا چاہتے ہو وہی بنو۔ اور ویسا بننے کے لئے جن فعلون کی ضرورت ہے۔ ویسے ہی فعل کرو۔ محبت درکار ہے تو محبت کرو۔ عزت کی خواہش ہے تو عزت کرو۔ کیونکہ دنیا ایک ایسی جگہ ہے۔ جہان جو بوتا ہے۔ وہی کاٹتا ہے۔ جیسا کرتا ہے۔ ویسا ہی پاتا ہے۔ پنڈد نے کہا مہاراج اگر تکلیف نہ ہو تو اِس مضمونکو ذرا اور کہولکر فرمائیے۔ سادہو نے کہا۔ میں اِس اندہیرے راستے مین رہبری کے لئے تمہین ایک

شمع دئے دیتا ہون۔ اور اس گورکہہ دہندے کا گر بتا دیتا ہون۔ اگر اسوقت تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو مجھپر بھروسہ کرکے۔ میرے کہنے پر بواش اور یقین لاکے میری خاطر۔ میری بات مان لینا۔ اور اُسپر عمل کرنا۔ کیونکہ بغیر عمل کیئے۔ کچھ حصول نہیں ہوتا۔ غور کرو۔ اور جو میں کہتا ہون۔ اُسے پوری توجہ سے سنو۔

وہ خودی جسکا تم نے سہارا لے رکھا ہے۔ اور جس سے نہیں کوئی نگاہ مین نہیں جچتا۔ وہ دہوکا ہی دہوکا ہے۔ نری پول ہی پول۔ جو شخص خودی پر بھروسہ کرکے۔ خودی کے کہنے پر عمل کرتا اور خودی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔ اس اندہے رہبر کا ہاتھ پکڑتا اور اس دہوکے باز صلاحکار کی سنتا ہے۔ وہ گناہونکی دلدل مین پھنس جاتا۔ اور مصیبتون کے بھنور مین پھنسکر جان دیدیتا ہے۔ خیال خودی ایک ایسا طلسم۔ جادو کا پردہ۔ مایا کی نگری اور دہوکے کا نقاب ہے۔ جس سے آنکھیں بالکل بند ہو جاتی ہیں۔ اور عقل پہ پردہ سا پڑجاتا ہے۔ دوست دشمن مین تمیز نہیں رہتی۔ کردنی ناکردنی کا خیال نہیں رہتا۔ یہ اِس نادانی ہی کی وجہ ہے کہ ہم نے اپنا۔ غیر۔ میرا۔ تیرا۔ قائم کر رکھا ہے۔ یہی خودی۔ وہ جہالت۔ لاعلمی۔ یا اگیان ہے یا تم گناہونکی سرتاج اور تمام دکہون کی جڑ ہے۔ اسی وجہ سے اِنسان۔ بڑھاپے اور موت کا شکار ہوتا ہے۔ اِس وہمی پردے کو چاک کر ڈالو۔ اور تمام جاندارونمیں اپنی سی جان سمجھکر کسی کو تکلیف نہ دو۔ بس اِن لفظونکو تعویذ بنالو۔ لوحِ دل پر لکھہ لو۔ اور ہر وقت اِس موٹو کو سامنے رکھو۔

جو دوسرونکا برا مناتا ہے وہ اپنے ہی راستے میں کانٹے بوتا ہے۔

جو دوسرونکی خدمت کرتا ہے۔ کہہ اپنے ہی بھلے کی کرتا ہے۔

جو خودی کا خیال دور کرکے جہالت کا پردہ چاک کر ڈالتے ہین۔

انہیں نیکی کا راستہ نظر آنے لگتا ہے۔ اور وہ خوشی کے محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔

جب تک جہالت کا عمل دخل ہے۔ لاعلمی کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ اگیان کا اندھکار ہے۔ نیکی کا راستہ اونچا۔ نیچا۔ ٹیڑھا۔ ترچھا۔ اور دشوار گزار معلوم ہوتا ہے طبیعت ڈانواڈول اور ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے۔ اگیانی نہ تو روح کی مختلف حالتیں مانتا ہے۔ نہ روحوں کے سلسلوں اور رشتوں کو سمجھتا ہے۔ اور نہ وہ ایک ہی ظہور کے مختلف ظہوروں کو ایک سمجھکر سب کے ساتھ نیکی سے پیش آتا ہے۔ جاؤ ذرا اسپر غور کرو۔ اور اسپر عمل کر کے دیکھو تمہاری عقل سلیم تمہاری رہبر ہو۔ اور تم نیکی کے راستہ پر چلنا سیکھو۔ معجزہ لفظوں میں نہیں ہوتا۔ ایک ہی بات جب ایسے بے اصول کے منہ سے نکلتی ہے۔ جسکا اندر باہر کچھ اور ہوتا ہے۔ تو اکثر بالا ہی بالا گزر جاتی ہے۔ لیکن وہی لفظ جب ایک نیک اور محبت بھرے دل سے نکلتے ہیں تو جادو کا کام دیتے ہیں۔ پنڈت پہلے ایک مغرور اور سخت دل آدمی تھا۔ اب کچھ تو نارد کی سادہ مزاجی اور مفید زندگی نے اُسے موم کیا۔ اور کچھ سادھو کی سچی اور نیک نصیحت اثر کر گئی۔ ہاتھ جوڑ کر سادھو سے عرض کیا۔ مہاراج آپکے یہ لفظ ایسے معنی خیز اور صداقت سے بھرے ہوئے ہیں کہ مجھے کبھی نہ بھولیں گے۔ مجھ سے صرف یہ ایک چھوٹا سا کام ہو گیا تھا۔ کہ میں نے ایک غریب سادھو پر رحم کر کے تھوڑی دیر کے لئے گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔ آپکی نصیحت کے موافق آج سے میں اپنا وقت۔ اپنا روپیہ اپنی زندگی مفید کاموں میں صرف کرونگا چنانچہ اپنے وطن پہنچتے ہی سادھوؤں کے ٹھیرنے کے لئے ایک عظیم الشان دھرم شالہ بنوائی۔ جہاں غریب۔ اپاہجوں اور ہر ایک طرح کے حاجتمندوں کی خدمت ہوتی تھی علم کی روشنی گمکردہ راہ اور بھولے بھٹکوں تک پہنچانے کے لئے ایک بڑا کتبخانہ بھی کھولدیا تھا۔ اس تمام کارخانہ کا انتظام بھی معقول کیا اور ایسے دیانتدار اور لائق آدمی رکھے جو سوائے اپنی مقررہ تنخواہ کے کسی سے پیسے کا واسطہ نہ رکھتے تھے۔ اور اس کام کو اپنا فرض سمجھکے کرتے تھے۔ لیکن جسوقت جوہری کا سانحہ حادثہ ہوا سادھو کچھ فیض نہ پاسکا کیونکہ جوہری کی احسان فراموشی سے اسکا دل بیزار ہو گیا اور اسی سبب نوکری چھوڑ کر گائکوں کے ٹولے میں شریک ہو گیا۔ انکی سرگزشت کسی آئندہ نمبر میں پیش کی جائیگی۔

چندو لال صاحب دل دالم۔

آب حیات

جو لوگ عقل سے بے بہرہ ہیں۔ اور جنکو سوچنے اور سمجھنے کی عادت نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ فقط کھانا۔ پینا اور سونا زندگی کیواسطے ضروری ہے اور انہیں تینوں اصول پر رشتہ حیات کی درازی منحصر ہے۔ ایسے لوگوں اور نباتات میں کچھ فرق نہیں ہے اور انکی حالت بالکل مشابہ ہے۔ پودوں سے جو نشو و نما پا کر درخت ہو جاتے ہیں۔ غور سے معلوم ہو جائیگا کہ اس دنیا میں انسان کے ذمے بڑے اہم کام لگا دئے ہیں۔ جنکا کرنا دلیپذیر اور عین فرض ہے۔ انسانکو حیوانات پر صرف اسلئے شرف بخشا گیا ہے۔ کہ وہ سوچے اور سوچکر کام کرے۔ مگر ان بڑے کاموں کا انجام بلا کوشش بلیغ اور محنت شاقہ ناممکن ہے اور کوشش اور محنت بلا حفظ صحت اور ترقی طاقت دماغ و قوت روح نہیں ہو سکتی تاکہ یہ طاقت اور قوت ذہن کی تیزی اور عقل کی جودت اور ادراک سے بلکر ایک ساتھ کام دیویں نہ کہ آدمی زندگی کا آلہ بیکار بنکر بیٹھ رہے۔ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے۔ اور آپا بیج بنجائے پس چونکہ انسان ہمیشہ کچھ کرنے کی غرض سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور جیتا ہے تو اوسکو جاننا چاہیئے کہ کیونکر جینا زیبا ہے۔

اس مضمون کی تحریر سے خلاصہ مافی الباب یہ ہے کہ جینے کے بارہ میں کچھ اصول بیان کئے جائیں۔ تاکہ اُنکے مطابق عمل کرنے سے جینے کا حظ اور فائدہ حاصل ہو۔ یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں کہ جو لوگ اعتدال کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہی زیادہ جیتے ہیں۔ اور

جو بے اعتدالی سے رہتے ہیں وہ جلد مر جاتے ہین۔

اِس بات کے ثبوت کے لئے ہمکو اِسوقت ایک شخص کازمار و نام شہر اطالیہ کے باشندہ کا حال یاد آیا ہے۔ کہ یہ شخص چالیس برس کی عمر تک نہایت بے اعتدالی سے رہا اور اس عرصہ مین کوئی ایسا امر کرنے بدون نچھوڑا۔ جو مضر صحت و زندگی نہ تہا۔ اور اب اِسکو خیال گذرا کہ تمام دنیا کے عیب و ثواب کئے سب کا مزا لیا۔ مگر کسی مین کوئی بہی فائدہ نہ پایا۔ بلکہ بالعکس اسکے جو جسمانی اور روحانی طاقتین تہیں وہ سب طاق ہوگئیں۔ اور حواس خمسہ کے بہی چھکے چھوٹ گئے۔ غرض اس ششِ و پنج میں وہ پنج عیب شرعی چاروں شانے چت پڑا رہتا۔ اور سوچا کرتا۔ کہ اگرچہ ان بے اعتدالیون سے دل و جسم کی یہ حالت پہونچگئی ہے۔ کہ آج مرے کل دوسرا دن مگر تاہم کوئی ایسا سبب ہوتا جس سے زیادہ جیتا۔ اے کاش کچھ دن تو اور بقاء حیات رہتا۔

اِس حال میں کامیاب ہونے کی غرض سے اُسنے چند قواعد اپنی پابندی کے لئے مقرر کئے اور اوہنیں قواعد کیوجہ سے ہم تک اُسکا نام پہنچا ہے۔ گو قواعد مذکور کی پابندی سے مطلب اہم حاصل نہون تاہم اتنا ضرور ہے۔ کہ اُن کے مطابق عملدرآمد کرنے سے حفظ صحت اور طاقت جسمانی مین فتور نہ آویگا۔ اِس لئے ہم کارنارو کے اقوال اِس مضمون کے تمہیدی فقرات میں شمار کرینگے۔ یعنی

۱۔ زیادہ کھاجانا یا دیر تک فاقہ رہنا نہ چاہیے۔ اور کوئی فعل ایسا سرزد نہو جو خلاف طبیعت ہو۔

۲۔ زیادہ کھانے اور پینے والے بیمار رہتے ہیں۔

۳۔ حلق تک بھر کے کھانیوالونکا علاج فاقہ ہے۔

۴۔ بوڑھونکو فاقہ کرنا آسان ہے۔ اور پیر بہی بوڑھون کے برابر فاقہ سے رہ سکتا ہے لیکن نوجوان اور بچے بالکل فاقہ کی برداشت نہین کرسکتے۔

۵۔ نوجوان کے مزاج مین قدرتی حدت زیادہ ہوتی ہے۔ اسلئے نوجون کی پرورش کرد

تاکہ اُن کے اجسام ضعیف نہو جاوین۔

۶۔ انسانکو دن بھر میں دو دفعہ سے زیادہ کھانا نچاہئیے بشرطیکہ رسم و رواج کیخلاف نہو۔ اور تقاضا سن اور موسم اور مقام بود و باش کی آب و ہوا بھی مانع نہو۔

۷۔ جس جسم سے مادہ کا اخراج نہیں ہوتا۔ اور کثیف رکھا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ مضرت سے خالی نہ رہے گا۔

قواعد مذکورہ بالا کے مطابق عمل کرنے سے اسی **کارنارو** کی عمر جسنے کھانے پینے مین حصر اُسکے چربونکو بھی مات کیا تھا۔ اتنی بڑی ہوئی کہ لوگونکو کمال استعجاب ہو قبل مقرر کرنے قواعد انتظام جسم کے جسکو لوگ اون بلا سوچے سمجھے کے خراب کرڈالتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ناظرین کو جسم کی ترکیب و حرکات سے کیقدر آگاہ کردیاجاوے اور یہ بھی بتادیا جاوے کہ جسم کو دل سے کیا تعجب انگیز تعلق ہے۔ انسان کے جسم مین جتنے بڑے کام کے اعضا ہیں اور جنکو شاید اعضاء رئیسہ کہنا بیجا نہوگا۔ ہر چھوٹے بڑے اعضا و اعصاب و رگ و پے سے خواہ وہ اعضا رئیسہ سے کتنی ہی دور کیون نہون تعلق بسیط ہے۔ اور جسم کا ایسا کوئی بھی حصہ نہیں جسکو تکلیف یا درد پہنچانے سے تمام جسم مین اُس تکلیف کا اثر پیدا نہو۔ چنانچہ شیخ شیرازی کا مقولہ ہے؎

چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار

پس بہرحال لازم آتا ہے۔ کہ پہلے تجویز و انتظام ایسی پیچیدہ کل کے جدا جدا حصون اور اونکی حرکات سے ہم لوگ آگاہ ہوجائیں۔ ہمنے جو جسم کو کل کہا ہے تو اس سے یہ بات سمجھ لینا نہ چاہیئے کہ ہم نے یہ لفظ تشبیہاً استعمال کیا ہے۔ کیونکہ درحقیقت انسان کا جسم بڑی کامل اور پوری کل ہے۔ اور دنیا بھر کی کلین اُسی کل کا نمونہ ہین۔ دیکھو اسکی ترکیب کسقدر رگون سے مثل ایک نہایت عمدہ صنعت کے بنا ہوا ہے۔ جو تعلق مین قلعون اور چوکیون مثل ایک نہایت عمدہ فیض تیار کی مندرق کے بنی ہوئی ہین ہڈیان

اُسی طور پر ایک دوسرے سے وصل کیگئی ہے۔ جیسے کسی بڑے صناع نجار کا کام ہوتا ہے محرابیں اور ستون۔ اور حقیقتے ایسے ہیں کہ عمدہ سے عمدہ عمارت کی محرابوں وغیرہ سے فائق و برتر ہیں۔ کلاک گھنٹہ کی کمانیوں اور چرخیوں اور پھرکیوں سے جسم کی کل زیادہ تر تعجب خیز ہے۔ غرضکہ نہایت نادر آپ سے آپ کام دینے والی کل جس سے جب چاہو کل جسم کو جہان چاہو لیجاؤ۔ جسم ہے۔ ہاتھ اور انگلیاں آلات ہیں جن سے ہر قسم کا آلہ کاریگروں کا بنایا جاتا ہے۔ اور ہر ایک جزو دستکاری کے سامان کا سوئے سے لے جنگی جہاز تک انہی ہاتھوں سے بنایا جاتا ہے پس ہر طور پہ یہ جسم ایک مرکب اور نہایت پائیداری سے بنائی ہوئی کل ہے کہ جسکے ہر پرزے سے جب تک تمام و کمال علم ہو تب تک انجام ہونا۔ اوس بڑے کام کا جسکے واسطے کل بنائی گئی ہے۔ غیر ممکن ہے۔

علم عمل حیات وحرکات مخلوق ذی روح کے پڑہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے آیہ خدمت کے نوعمر نوخیز نوجوان نوآموز نوآمدہ عزیز بھائی اور دوست یگانے اور صغیر سن ہنیں۔ جو بہ میشہ کی دیلے مان بنگئی ہیں۔ بے شائبہ ریب جزیرہ واقعہ جنوبی انگلستان کے اس لا علم شہزادہ سے منسوب ہو سکتی ہیں۔ جسکو سوچنے اور سمجھنے کی مطلق عادت نہ تہی۔ اور جو اتنا عقل کا صریح عدو تہا۔ کہ فقط کہانے پینے اور سونے ہی کو بقاء حیات کے اسباب جانتا تہا۔ ایک روز اسکو ایک فلسفی نے آلہ متحرک بالذات حوالہ کیا۔ اور کہدیا کہ اسکو بحفاظت تمام رکھنا۔ چھونا چھیڑنا نہیں مگر یہ شہزادہ کیکی سنتا تہا۔ اسنے نہ مانا۔ اور آلہ مذکور کی اُدھیڑبن کی فکر میں ہوا۔ اور اوسکی کلوں اور پرزوں اور چرخیوں اور کمانیوں کو چھیڑ چھیڑ کر بیکار کر دیا۔ جب کی واقف کار نے شہزادہ کو اُس آلہ کے پرزے جدا جدا کرکے دکہائے اور اسکی کیفیت بیان کی۔ اور کشادو بست کا طریقہ سمجہایا۔ اور سکہایا۔ تو شہزادہ نے آہ سرد بھری

اور فرمایا۔ کہ اگر مجھکو اِس آلہ کی اندرونی کیفیت ساخت کی معلوم ہوتی تو بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے رکہتا۔ اِسی طرح سے کہتے ہین۔ بہت لوگ جو اپنے جسم کی ترکیب اور ساخت سے ناواقف ہین۔ اور اندرونی ترکیب جسم سے نابلد رہکر اندرونی حصونکو خراب کر ڈالتے ہین۔ اد پھر جب عرصہ کے بعد انکو بتایا جاتا ہے کہ انہون نے اِسطور پر کل بگاڑ ڈالی تو ایسا بتانا اُسوقت سودمند نہین ہوتا۔ اِسواسطے اگر اُسوقت پیش قدمی کیجادے۔ اد جسم کی ترکیب مین تھوڑا سا لکہا جاوے۔ تو خالی از منفعت حب وطنی نہوگا۔ گو یہ مضمون بظاہر اکثر صاحبونکو خشک اور بدمذاق معلوم ہو مگر ہمکو آگاہ کردینے سے کام ہے۔ اسلیئے ہم اِس ترکیب کی تحریر مین اَب زیادہ دیر نہ کرینگے۔ فقط باقی آیندہ

ہری شنکر شیوپوری

اصلاح و ترقی اردو

مولوی حامد حسن صاحب قادری بچھرایونی

مشاہدے سے یہ بات ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز عالم وجود مین آتی ہے۔ تو شروع ہی سے مکمل حالت میں نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ ابتدائی حالت سے نشو و نما پاکر رفتہ رفتہ درجہ کمال کو پہنچتی ہے۔ نباتات۔ حیوانات۔ انسانات۔ اور انسان کے تمام ایجادات و اکتشافات غرض دنیا کی تمام چیزیں اِس قدرتی اصول کی مثال مین پیش کیجاسکتی ہے۔ یہی حال کسی زبان کا ہے۔ کہ جب وہ پیدا ہوتی ہے۔ تو ستھرے اور عمدہ لباس سے آراستہ نہیں ہوتی۔ یعنی اوسکے الفاظ محاورے انداز بیان محدود اور غیر فصیح ہوتے ہین۔ گویا وہ ایک بچہ ہے۔ جسکے کپڑے بچپن کے کھیل کود کے سبب میلے رہتے ہین۔ جون جون وہ بڑھتا جاتاہے۔ اور شعور سیکھتا جاتاہے۔ اوسکے کپڑے صاف رہنے لگتے ہین۔ پس اردو زبان بھی اِس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔

اول اول اردو میں بہت سے ایسے الفاظ تھے۔ جنکے تلفظ طبیعت پر گران تھے۔ اور اوسکو تمام خیالات اور مصطلحات کے ادا کرنے کی قدرت حاصل نہ تھی بلکہ یہ بات تو آجتک بھی پورے طور پر حاصل نہین ہوئی جب اردو کی طرف عام دلچسپی بڑہتی گئی۔ تو علماء و شعراء نے اوسکو صاف اور پاکیزہ بنانے کی کوششیں کین۔ بہت سے قابل ترک الفاظ ترک کر دئے۔ بعض الفاظ کی جگہ دوسرے رکھے۔ بعض کو مختصر کردیا مگر یہ کام بھی ایک وقت مین اور ایک جماعت سے نہ ہو سکا۔ بلکہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنکو اسکی اصلاح کیطرف توجہ ہوئی اور رفتہ رفتہ زبان کو سدھارتے رہے۔

اردو کی اصلاح اور ترقی کے بہت سے ذریعے ہین - بڑا طریقہ تو یہی ہے - کہ مختلف فنون و علوم کی مستند کتابین مختلف زبانون سے اُردو مین ترجمہ کیجائین - سائنس اور دیگر علوم کی مصطلحات کا اردو مین عمدہ ترجمہ کیا جائے - جسکی کمی کی وجہ سے اردو بہت کچھ غیر مکمل ہے - انجمن ترقی اردو کی کوششین اس بارہ مین بہت زیادہ قابل شکریہ ہین - سنا ہے کہ مولوی عزیز مرزا صاحب بی - اے نے انجمن کی طرف سے اصطلاحات علوم کی لغت تیار کرانیکا - اشتہار شایع کیا ہے - جس سے بڑی کمی کے پوری ہونے کی امید کیجا سکتی ہے - دکیل ٹریڈنگ کمپنی بھی عمدہ ترجمے شایع کر رہی ہے - معلوم ہوا ہے - کہ ریاست جے پور مین بھی کوئی انجمن قائم ہوئی ہے - جو انگریزی سے عمدہ کتابین کے ترجمے اردو مین شایع کر رہی ہے - عرصہ سے لکھنؤ مین ایک انجمن اصلاح اردو کا کام کر رہی ہے - مگر اوسکی کارروائیان شاید پبلک مین پیش نہین کیجاتین ورنہ ملک مین اوسکا بہت کچھ چرچا سنا جاتا - معلوم نہین اوسکا منشا کے نظر کیا ہے - اور کس قسم کی اصلاح زبان مین کرنی چاہتی ہے - اور کر رہی ہے -

دوسرا اور اصلی ذریعہ اصلاح کا یہ ہے کہ نفس زبان کو درست کیا جائے - مثلاً

۱ - جن الفاظ عربی یا فارسی وغیرہ کے غلط معنے مشہور ہوگئے ہین اونکو ٹھیک کیا جائے -

۲ - جن اُردو الفاظ کو دیگر زبانون کے لفظون سے غلط طور پر مرکب کر دیا گیا ہے - اونکو صحیح کیا جائے -

۳ - اُردو جملون مین فارسی عربی الفاظ کی ترکیب غلط نہو -

مثال کے طور پر یون سمجھئے کہ لفظ مشکور عام طور پر ممنون کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے - حالانکہ اوسکے یہ معنی نہین ہین - ممنون کے معنی ہین وہ شخص جسپر احسان کیا گیا ہو - اور مشکور وہ شخص ہے جسکا شکریہ ادا کیا جائے - لہذا مشکور کی جگہ شکر گزار یا ممنون کہنا چاہیئے -

بعض اردو الفاظ ایسے لفظون کے ساتھہ مرکب کرکے بولے جاتے ہین جیسے سمجھدار بمعنی عاقل و دانشمند۔ یہ ترکیب غلط ہے کیونکہ سمجھ اردو ہے۔ اور دار فارسی جیسے پردار۔ زردار وغیرہ الفاظ ہین۔ سمجھدار کی جگہ سمجھہ وال (مخفف والا) کہنا درست ہے

ایک اور غلطی عموماً ہر جگہ اور خصوصاً پنجابی اخبارات وغیرہ مین پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ایک اردو اور ایک عربی یا فارسی لفظ یا دو اردو الفاظ یا جملون کے درمیان مین حرف عطف واؤ لایا جاتا ہے۔ جو فارسی اور عربی کے واسطے مخصوص ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ

پتھر و لعل برابر نہین یا
ٹوپی و اچکن پہنو یا
ہم الہ آباد گئے و چلے آئے

ایسے موقع پر واؤ کی جگہ اور بولنا چاہیئے۔ ایسی اور بہت باتین ہین جو غور کرنے سے سمجھہ مین آسکتی ہین۔

آجکل انگریزی خوان حضرات نے یہ بات فیشن مین داخل کر لی ہے کہ ہر گفتگو اور تحریر مین انگریزی الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہین۔ یہ بالکل غلط طریقہ ہے بعض انگریزی الفاظ تو اردو مین ایسے مستعمل ہین کہ اونکی نسبت یہ گمان بھی نہین ہوتا کہ یہ کسی دوسری زبان کے الفاظ ہین جیسے بوتل۔ گلاس۔ چین وغیرہ۔ خیران کے بولے بغیر تو چارہ ہی نہیں اور یہ جزو زبان ہوچکے ہین۔ مگر نامانوس اور غیر مستعمل الفاظ بولنے اور غیر انگریزی دان مخاطب کو پریشان کرنا کوئی خوبی نہیں بلکہ ترقی کے واسطے مضر ہے۔ بعض نظمون اور مضمونون مین تو اس کثرت سے رزگنیشن۔ کنسٹریشن۔ پریزیڈنسی ایشن۔ جیوری ہوپس۔ ایجنٹ وغیرہ لفظ لکھے جاتے ہین کہ بیچارہ انگریزی سے ناواقف تو سمجھی ہی کرتا رہجاتا ہے۔ اور مزا یہ ہے کہ ایسے الفاظ پر نہ اعراب لگائے جاتے ہین

کہ پڑھنے مین آسانی ہو - اور نہ اُنکے معنی لکھے جاتے ہین کہ سمجھنے میں وقت نہ ہو۔
اسمین شک نہیں کہ جون جون تعلیم انگریزی پھیلتی جایگی انگریزی الفاظ جزد زبان ہوتے جائیں گے اور ناواقف بھی اون سے مانوس ہونے لگین گے گر ایسے الفاظ کا استعمال اوسی وقت مناسب بھی ہوگا۔

غرض میرا مطلب یہ ہے کہ ترقی خواہ و مصلح زبان گروہ کو اول خود ان اصلاحون پر عمل کرنا چاہیئے اور اپنی تقریر و تحریر مین ایسے الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اسی طرح کام ہوا کرتا ہے اور ہو سکے گا۔

آجکل اردو کے اکثر رسالے نکلتے ہین۔ جنکا مقصد ترقی و اصلاح اُردو ہے۔ اونکے ایڈیٹر صاحبان سے خصوصاً یہ درخواست ہے کہ وہ ایسے الفاظ کے استعمال سے خود بھی پرہیز کرین اور اپنے نامہ نگارونکو متوجہ کرتے رہین۔ نیز حتی الامکان ایسے مضامین جنمین اس قطع کی غلطیان ہون۔ بالکل نہ چھاپیں اور چھاپیں تو اصلاح فرما کر۔

(حامد حسن قادری بچھرایونی)

واثق باللہ

اوّل

ہم نے خلفائی بنی عباسیہ کے تاریخی حالات لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اوسکی پہلی قسط معتصم باللہ کے نام سے ہدیۂ ناظرین کرچکے ہین امید ہے کہ وہ مضمون ہمارے احباب کے پسند خاطر ہوا ہوگا۔ لیکن ہمیں کیونکر اسکا علم ہوسکتا ہے۔ صرف اپنے گمان پر رائے قائم کرکے یہ دوسری قسط بھیجتے ہین۔ آج کی قسط میں معتصم باللہ کے خلف الرشید واثق باللہ کے سوانح معرض بیان مین لائے جاتے ہین۔ "السعی منی والاتمام من اللہ"

اِس خلیفہ کا لقب واثق باللہ اور ہارون نام، ابوجعفر کنیت ہے۔ اور بقول بعض مورخین کے واثق کی کنیت ابوالقاسم ہے۔ اِسکی ماں ام ولد تھی۔ جسکا نام قراطیس ہے روم کی رہنے والی تھی۔ ماہ شعبان ۱۹۶ھ ہجری کی ۱۹ یا ۲۰ تاریخ کو یہ خلیفہ پیدا ہوا۔ اور اپنے باپ کی زندگی ہی میں سلطنت کا ولیعہد قرار دیا گیا۔

خلیفہ معتصم باللہ کی وفات کے بعد، ماہ ربیع الاول ۲۲۷ھ کی ۱۹ تاریخ کو اس کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی۔ اسوقت واثق کی عمر اکتیس ۳۱ سال کی تھی۔ تخت پر بیٹھنے کے ایک برس بعد یعنی ۲۲۸ھ مین لشے ایک ترک کو اپنا ولیعہد بنایا۔ جس کا نام اشناس تھا۔ اِس شخص کو قیمتی لباس اور دو جواہرات کی حمائلین پہنائین۔ اور جواہرات کے مرصع تاج سے اِس کے فرق کو زینت دی۔

امام جلال الدین سیوطی صاحب تاریخ الخلفاء کا گمان ہے کہ یہ پہلا خلیفہ ہے جس نے ایک ترک کو بحیثیت بادشاہ کے اپنا ولیعہد خلافت مقرر کیا۔ گو اسکے والد معتصم باللہ کے ایام خلافت ہی مین ترک بکثرت حدود سلطنت مین موجود اور کاروبار سلطنت مین

متصرف ہو چکے تھے۔ ہم اپنے اگلے مضمون مین ظاہر کر چکے ہین کہ معتصم باللہ نے بے شمار ترکونکو غیر ملکون سے خرید کر اپنی دار السلطنت مین بھر لیا تہا۔ اور لشکرون میں بھی زیادہ تر ترک ہی بھرتی کیے گئے تھے۔ اور دفاتر مین بھی بڑے بڑے عہدون پر ترک رسوخ حاصل کر چکے تھے۔ لیکن اوس نے کسی ترک کو اپنا قائم مقام نہیں مقرر کیا تہا۔ اس کمی کو واثق باللہ نے پورا کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ واثق کا ترکونکی طرف رجحان اپنے باپ سے بھی زیادہ تہا۔ اسکا طرز عمل فارسی کی ضرب المثل ع

"اگر پدر نتواند پسر تمام کند"

کی پوری پوری تصدیق کر رہا ہے۔

۲۳۱ھ یعنی زمام حکومت ہاتھ لینے کے چار برس بعد گورنر بصرہ کی خدمت مین خلیفہ نے ایک مراسلہ اس مضمون کا بھیجا کہ ہمارے حدود مملکت کے تمام اماموں اور موذنون کا امتحان لیا جائے کہ وہ تحقیق قرآن کے قائل ہین یا نہین۔ اس مسئلہ کی ابتدا ہارون الرشید کے زمانہ مین ہوئی تہی۔ چنانچہ اوسکا بھائی معتصم بھی اسپر کاربند رہا۔ اور واثق نے بھی اپنے والد کی پوری پوری متابعت کی۔ اسی سال علامۃ الوقت امام عصر مولانا احمد بن نصر خزاعی قتل کیے گئے کیونکہ وہ خلق قرآن کے منکر اور قیامت کے دن خدا کا دیدار نصیب ہونے کے معترف تھے۔ اور واثق کا مذہبی جوش اسکے بالکل برعکس تھا۔ وہ حدوث قرآن کا قائل تہا۔ اور قیامت کے دن خدا کے دیدار نصیب ہونے سے انکار کرتا تہا۔ لیکن آخر عمر مین خلیفہ نے اس مذہب سے رجعیت کر لی تہی۔ اسکا ذکر آگے آئے گا۔

احمد بن نصر خزاعی بڑے پایہ کے بزرگ اہلحدیث تھے۔ خدا کے خوف سے ڈرنے والے اور تمام نیک کامون پر عمل کرنے والے اور خدا کے نواہی سے

پیچھے نوا لے تھے۔ اوس زمانہ مین بلند مرتبہ کے عالم اور قابل التعظیم بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ آپکا قیام بغداد مین تہا۔ چنانچہ وہان سے دار الحکومت "سامرا" مین قید کرکے لائے گئے۔ اور اون سے پوچھا گیا کہ قرآن مخلوق ہے یا قدیم؟ اور کیا خدا کا دیدار نصیب ہونا قیامت کے دن برحق ہے۔؟ احمد بن نصر خزاعی نے جواب دیا کہ قرآن تو مخلوق نہین۔ اور رویت باری تعالےٰ کے متعلق حدیث شریف موجود ہے۔ جس سے اس مسئلہ کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ اور اوسی وقت حدیث شریف پڑہکر سنائی۔ خلیفہ نے کہا کہ تم جھوٹے ہو۔ امام خزاعی کو حدیث شریف کا جھٹلانا نہایت ناگوار گزرا۔ اور آپنے (اپنی زندگی سے مایوس ہی ہو چکے تھے) جھنجلاکر کہا تو ہی جھوٹا ہے۔ واثق کو اس منہ زوری اور حاضر جوابی کی برداشت نہ ہوئی۔ فوراً حکم دیا کہ یہ ایک محصور مکان مین مقید رکھے جائین۔ سپاہی پہرہ دیتے رہین۔ اور امام سے کہا کہ جو لوگ اس مسئلہ کو زبان پر لاتے ہین اونکی یہی سزا ہے۔ اوسوقت فقہائے معتزلہ کی بھی ایک جماعت انکے پاس کھڑی تہی۔ اوس نے فتویٰ دیا کہ یہ شخص گردن مارے جانے کے لائق ہے۔ چنانچہ واثق نے تلوار منگوا کر کہا کہ آج مین خود اس حصول ثواب کی کوشش کرتا ہون۔ اور اپنی خطائین اسکی طرف منتقل کرتا ہون۔ جس نے خدائے تعالےٰ کو ایک ایسی صفت کے ساتھہ متصف کیا جسکو ہم باری تعالےٰ کے لئے کسر شان سمجھتے ہین۔ اور یہ کہکر واثق نے اُس کام کو اپنا فرض سمجھکر (نعوذ باﷲ) انجام دیا۔ اس واقعہ کے چند روز کے بعد خلیفہ کے بیٹے متوکل باﷲ نے اپنے باپ سے اپنا خواب بیان کیا کہ آج مین نے حضرت احمد بن نصر خزاعی کو قبلہ رو بیٹھے نہایت خوش الحانی کے ساتھہ سورۂ یٰسین پڑہتے دیکھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ واثق راہ راست پر نہین تہا۔ بلکہ امام خزاعی ہی سچے مذہب کے پیرو اور حق پر تھے۔ اس

واقعہ کو مورخین نے مختلف طریقون سے لکہا ہے۔ مگر ماحصل سب کا یہی ہے۔ اسی سال چھ سو قیدی مسلمان رہا کئے جانے والے تہے۔ مگر احمد بن ابی داؤد نے یہ شرط لگا دی کہ جو شخص اِن قیدیون مین سے قرآن پاک کو مخلوق کہے اوسے رہا کردو اور دو دو دینار عطا کرو اور جو انکار کرے وہ بدستور قیدخانہ مین بہجدیا جائے۔

مورخ خطیب کا قول ہے کہ احمد خلیفہ کے ہم نوالہ و ہم پیالہ مصاحبون مین تھا۔ اور اپنی زمانہ سازی کی بدولت خلیفہ کی طبیعت پر دسترس پا گیا تہا۔ اسکی عادت تھی کہ محض خوشامد سے خلیفہ کا ہم نوا بنجاتا۔ اور وقتاً فوقتاً خلیفہ کو اس بات پر آمادہ کرتا رہتا۔ کہ عوام کو خلق قرآن کے مسئلہ کی طرف ضرور بالضرور سختی کے ساتہہ رجوع کرنا چاہیئے۔

ایک دن کسی شہر سے منجملہ بہت سے قیدیون کے ایک شخص لوہے کی زنجیرون مین جکڑا ہوا واثق کے دربار مین لایا گیا۔ جب وقت یہ محل کے اندر پہونچا اتفاق سے اسوقت وہان احمد بھی موجود تہا۔ اِس قیدی نے محل مین داخل ہوتے ہی احمد بن ابی داؤد کی طرف مخاطب ہوکر یہ سوال کیا کہ پہلے مجھے یہ خبر دیجیے کہ جس مسئلہ کی تلقین کو آپ حضرات نے اپنا فرض عین سمجہہ رکہا ہے۔ اور زبردستی رعایا کو اس طرف بلا رہے ہین۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکا علم ہوگیا تہا۔ ؟ اور آپ جیسے ہادی برحق نے (جنکی شریعت پر آج ہم سب چل رہے ہین۔ اور جنکے حکم کی تعمیل کے لیئے اون کی امت بسروچشم حاضر ہے) قصداً اپنے برگزیدہ اصحاب کو خلق قرآن کی تعلیم دینے سے چشم پوشی کی۔ یا اس بدعت کا آنحضرتؐ کو علم ہی نہیں ہوا۔ ابن ابی داؤد اِس سوال کا صرف اتنا جواب دینے پایا تہا کہ ہان اِس رائے کو آنحضرتؐ جانتے تہے۔ پھر وہ آزاد قیدی

بول اٹھا اور اُس نے رعب دار آواز سے کہا کہ افسوس آنحضرتؐ جیسے باخبر رسول خدا نے علم ہو جانے پر بھی مسلمانوں کو اس نامبارک مسئلہ کی جانب توجہ نہ دلائی۔ اور اپنے اصحاب کو انکی حالت پر رہنے دیا۔ اور آپ لوگ جو حضور ہی کے ذلہ ربا اور حضور ہی کے قائم مقام کہلاتے ہین بلا سبب اسقدر تشدد کے ساتھ ہم غریب رعایا کو خلق قرآن کی جانب رجوع کرنا چاہتے ہین۔ اور ہماری مذہبی آزادی مین بے ضرورت خلل انداز ہو رہے ہین۔ یہ دندان شکن جواب سنکر تمام حاضرین اوسکا منہ دیکھتے رہگئے۔ اور کسی سے اسکا کچھ جواب نہ بن پڑا۔ واثق کو ہنسی آگئی اور ہنسی روکنے کے لئے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا کمرے مین چلا گیا۔ اور پاؤن پھیلا کر وہین بیٹھ رہا۔ اسوقت بھی اس حاضر جواب اونڈر قیدی کی زبان پر یہی کلمہ جاری تھا کہ سخت تعجب ہے آنحضرتؐ تو سکوت اختیار کرین اور قوم کو اس معاملہ مین آزادی دین اور آپ لوگ سختی سے پیش آئین چونکہ "واثق باللہ" قیدی کی یہ مدلل اور نہایت قابل قدر تقریر سنکر بہت محظوظ ہوا تھا۔ لہذا حکم دیا کہ اسی وقت تین سو دینار عطا کئے جائیں اور اپنے وطن پہونچا دیا جائے۔ قیدی کی تقریر کا خلیفہ پر اس قدر اثر پڑا کہ اوسی دن سے پھر کسی کا امتحان ہی نہیں لیا۔ یہ شخص (قیدی) ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن محمد ازدی۔ ابو داؤد نسائی مولف سنن نسائی کے استاد تھے۔

اور ابن ابی داؤد کو جو ہر وقت اسی تاک مین رہتا تھا کہ جب موقعہ ہو تب بادشاہ کو ابھارے، آج اپنی دوامی ناکامی پر سخت ندامت اٹھانی پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ ابن ابی داؤد نے بھی مرنے سے پہلے خلق قرآن کے مسئلہ سے رجعت کر لی تھی۔

ابن ابی الدنیا نے کہا ہے۔ کہ واثق نہایت حسین اور اوسکے جسم کا رنگ سفید

مائل بزردی تھا۔ ڈاڑھی خوشنما اور آنکھ میں پھلی تھی۔

یحییٰ بن اکثم نے کہا ہے کہ جس قدر نیکیاں حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی اولاد کے حق میں اس خلیفہ سے عمل میں آئیں۔ اتنی کبھی کسی خلیفہ نے نہیں کیں۔

واثق بڑے پایہ کا ادیب اور نغز گو شاعر تھا۔ اسے اپنے ایک غلام سے بہت محبت تھی جو مصر سے ہدیۃً اسکے دربار میں بھیجا گیا تھا۔ اتفاق سے کسی خطا پر خلیفہ اس غلام سے کشیدہ خاطر ہوگیا۔ اور عرصہ تک باہم گفتگو کی نوبت ہی نہ آئی۔ چنانچہ یہ غلام اپنے جوش جوانی اور غرور حسن میں میٹھا ہوا ایک دن اپنے بعض ہمعصروں سے کہہ رہا تھا۔ کہ بخدا خلیفہ اس خیال میں ہے کہ یقیناً کل تک اوس سے بات چیت کرنے لگونگا۔ لیکن مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ میں ایسا کیوں کرنے لگا۔ اتنے میں خلیفہ بھی وہاں پہونچگیا۔ اور اسی وقت اس نے یہ معشوقانہ مگر تمکنت آمیز تقریر سُنکر یہ اشعار کہے ۔ ؎

یا ذالذی بعذابی ظل مفتخراً　　　ما انت الا ملیک جاد اذ قدرا

اے شخص تو مجھے تکلیف پہنچانے پر فخر کر رہا ہے۔ تو غلام ملوک ہی تو ہے زیادہ قدر افزائی ہوئی تو سر چڑھ گیا

لولا الھوی لتجار بنا علی قدر　　　وان افق منہ یوماً فسوف تری

کاش اگر خواہش دعشق نہ ہوتی تو ہم دونوں ایک ہی انداز پر چلتے۔ اور اگر میں مرض سے افاقہ پاگیا تو عنقریب تو دیکھیگا تو

واثق باللہ کے بعض اشعار یہ ہیں جو اوسنے اپنے خادم کی محبت میں کہے تھے ۔ ؎

مہج یملک المہج　　　بسجایا اللحظ والدعج

مہجی جانوں اور دلوں کا مالک ہوجاتا ہے۔ کنکھیوں سے دیکھنے اور بڑی سیاہ آنکھیں کنارہ کرنے سے

حسن القد مختلف　　　ذو دلال وذو غنج

خوش قد اور خوش خرام ہے۔　　　نازنیں اور عشوہ پرداز ہے

لیس للعین ان تبدا عنہ باللحظ منعرج
نگاہ نہین پھر سکتی جب تک وہ کنکھیون سے دیکھتا ہے

صولی نے کہا کہ واثق باللہ بہ سبب اپنی ادبی قابلیت اور فضل کے مامون اصغر کے نام سے یاد کیا جاتا تہا۔ خود مامون بھی اپنی اولاد پر اسے مقدم رکھتا اور اُسکی بہت تعظیم کرتا تہا۔ اور واقعی واثق باللہ ہر چیز مین بہت زیادہ علم اور تبحر رکھتا تہا۔ اور شاعری مین اسے کامل دستگاہ حاصل تھی۔ چنانچہ چند اشعار اوس کے مذکور بھی ہو چکے ہین علم موسیقی اور گانے مین تمام خلفائے سابق سے بڑہکر مہارت حاصل تہی بیہ شعر طرح کی لئے سے گا سکتا تہا۔ اور ستار بجانے مین بھی بڑا استاد تہا۔

اور فضل نیر یدی کا قول ہے کہ بنی عباسیہ مین واثق سے بڑہکر کسی خلیفہ کو اشعار یاد نہ تھے۔ اسپر فضل سے کہا گیا کہ کیا واثق باللہ مامون سے بھی زیادہ شعر روایت کرنیوالا تہا۔ تو فضل نے جواب دیا۔ کہ ہان مامون نے علم عرب کے ساتھ علم نجوم اور طب اور منطق کو ایک راہ پر چلایا۔ اور واثق نے علم عرب کے ساتھ کسی اور علم کو یکدل نہین کیا۔

نیر یدہ حلبی کا بیان ہے کہ واثق کی خوراک بہت زیادہ تھی۔ اور ابن فہم کہتا ہے کہ اس خلیفہ کا ایک طلائی خوان تہا جو چار حصّون پر بنایا گیا تہا۔ ہر حصّے کو بیس آدمی اٹہاتے تھے۔ اور خوان مین تمام پیالے، رکابیان، کٹورے سب سونے کے تھے۔ ایک دن موقعہ پاکر ابن ابی داؤد نے عرض کی کہ ان برتنون مین کھانا شرعاً ممنوع ہے۔ چنانچہ واثق نے حکم دیا کہ انکو توڑ کر مشکوک کئے جائین اور روپیہ بیت المال مین داخل کر دیا جائے۔

حسین بن یحییٰ نے کہا ہے کہ واثق نے ایک رات خواب مین دیکھا کہ گویا خدائے تعالےٰ سے جنت مانگ رہا ہے۔ اور ایک کہنے والا کہتا ہے کہ اللہ تعالےٰ

اوسکو ہلاک کرتا ہے جسکا دل مثل چٹیل میدان والے صحرا کے ہو۔ جب صبح ہوئی۔ تو خلیفہ نے اپنے مصاحبون سے اِس خواب کی تعبیر پوچھی۔ لیکن کوئی اِس جملہ کے معنی نہ بتا سکا۔ پھر واثق نے ابی ملحم کو یاد کرکے بلوایا۔ اور اپنے خواب کی تعبیر اور مرت کے معنی دریافت کئے۔ ابی ملحم نے کہا کہ مرت اوس چٹیل میدانکو کہتے ہین جس مین کچھہ گھاس پھوس وغیرہ نہ اوگے ہون۔ اور اِس ہاتف غیب کے جملہ کے یہ معنی ہوئے۔ اللہ تعالےٰ اوسکو ہلاک کردیتا ہے...... جسکا دل ایمان سے خالی ہے۔ مثل اوس چٹیل میدان کے جو نباتات اور روئیدگیون سے خالی ہو۔ واثق نے فرمایا۔ مین چاہتا ہون کہ مرت کے جو معنی تمنے بتائے ہین اوسکی نظیر مین کوئی شعر اہل زبانکا پیش کرو۔ چنانچہ حاضرین مین سے ایک شخص نے تمثیلی شعر پڑہنے مین عجلت کی اور یہ شعر بنی اسد کا سنایا۔ ؎

وَمَرتٍ مَرُوتَاتٍ یُحَارُ بِهَا الْقَطَا [۲] ۔۔۔ فَیُصْبِحُ ذُو عِلْمٍ بِهَا وَهُوَ جَاهِلُ

اور بہت سے ایسے علف چٹیل میدان ہین جس مین قطا بھی حیران ہوجاتا ہے۔ اور اہل علم اوسمین جاہل ہوجاتا ہے

ابو ملحم نے کہا یہ شعر صحیح ہے۔ اور خدا کی قسم ہمیشہ پڑہتا رہونگا مین پھر ابو ملحم نے مختلف مشاہیر شعرا کے سو شعر پڑہے جنمین مرت کا ذکر تہا۔ واثق نے اِس وسعت معلومات اور تبحر کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھکر اوسی وقت خوشی و مسرت کے ساتھہ ایک لاکھہ دینار عطا کئے جانے کا حکم دیا۔

حمدون بن اسمٰعیل نے کہا کہ تمام خلفائے سابقین مین " واثق سے بڑہکر حلیم اور ایذا پر صبر کرنیوالا۔ کوئی خلیفہ آجتک نہین گزرا۔ اور اس بات پر تمام مورخین کا اتفاق ہے۔

---

[۱] مرت عربی مین ایسے صحرا کو کہتے ہین جو روئیدگی وغیرہ سے بالکل خالی ہو۔ مرتات اسکی جمع ہے۔

[۲] قطا ایک کنکر یو نیمز سبز کرنیوالے پرندہ کو کہتے ہین جو کنکر چر کہا تا ہے۔

احمد بن حمدون نے بیان کیا ہے کہ واثق کے اُستاد ہارون بن زیاد ایکدن واثق کے یہان آئے۔ خلیفہ نے اونکی نہایت تعظیم اور تکریم کی۔ جب وہ جاچکے۔ تو واثق سے پوچھا گیا کہ یا امیرالمومنین یہ کون صاحب تھے جنکی آپنے اسقدر خاطر و مدارات کی۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ یہ پہلے وہ شخص ہین جنہون نے خدا کی یاد مین میری زبان گویا کی اور خدائے برتر کی رحمت سے مجھے قریب کردیا ہے۔ اسی ضمن مین علی بن جہم نے واثق باللہ کی تعریف مین یہ اشعار کہے ہین۔ ؎

وثقت بالملک الواثق۔ باللہ النفوس   ملک یشقی بہ المال۔ ولا یشقی الجلیس

لوگ واثق باللہ ظل حمایت مین باطمینان ہین   یہ ایسا بادشاہ ہے کہ جسکے نزدیک مال ذلیل ہے اور ہم نشین عزیز

اسد یضحک عن شدّاتہ   الحرب العبوس

گویا شیر ہے۔ اوسکی سختی سے دانت کھٹے کردینے والی لڑائی جھک جاتی ہے۔

انس السیف بہ واستو   حش الطلق النفیس

تلوار بادشاہ سے مانوس ہے   اور درہم و دنیا اوس سے متوحش ہین

یا بنی العباس یأبی اللہ   الا ان تردوسوا

یعنی بادشاہ واثق بڑا تلوار بہادر   اور سخی واقع ہوا ہے

اس خلیفہ نے چھ برس خلافت کرکے "مقام سرمن رائی" مین (جو اس کے باپ معتصم نے آباد کیا تھا۔) چہارشنبہ کے دن ماہ ذیلحجہ ۲۳۲ھ کی چوبیس تاریخ کو وفات پائی اور نزع کی حالت مین یہ دو شعر اوسکے ورد زبان تھے ؎

الموت فیہ جمیع الخلق مشترک   لا سوقۃ منہم یبقی ولا ملک

موت مین تمام مخلوق شریک ہے   نہ عوام باقی رہتے ہیں اور نہ بادشاہ

ما ضرّ اہل قلیل فی تفارقہم   ولیس یغنی عن الاملاک ما ملکوا

جب فقرا جدا ہوتے ہیں اونکی مفلسی اپنے مالکون کو نقصان نہین دیتی اور بادشاہونکو اونکی ملکیتیں نفع نہین پہونچاتیں

کہا جاتا ہے کہ جب واثق نے وفات پائی۔ تو سب اسے تنہا چھوڑ کر متوکل کے ہاتھ پر بیعت کرنے چلے گئے۔ اتنے مین ایک نیولا آیا اور واثق کی آنکھ نکالکر کہا گیا۔

جعفر بن علی بن رشید سے صولی سند لاتے ہین کہ جعفر نے کہا ایک دن ہم صبح کے وقت خلیفہ کی خدمت مین حاضر تھے۔ اور شراب کے دور ہو رہے تھے کہ خلیفہ کے آگے اوسکے محبوب غلام مہج نے گلاب اور نرگس کے پھول کا ایک نہایت دلفریب گلدستہ بنا کر پیش کیا۔ غلام کی اداؤن سے واثق کی طبیعت کو اسقدر بالیدگی ہوئی کہ دوسرے ہی دن اس واقعہ کو نظم کا جامہ پہنا دیا۔ اور یہ پر لطف اشعار کہے ؎

حیاک بالنرجس والورد — معتدل القامت والقد

تجھکو اوس نے نرگس اور گلاب کے پھول کا تحفہ پیش کیا ہو جو میانہ قد ہے

فامبت عنیاہ نارالہوے — وزاد فی اللوعۃ والوجد

اوسکی دونون آنکھون نے آتش شوق بھڑکا دی اور سوزش عشق اور درد دلکو زیادہ کر دیا

املت بالملک لہ قربۃ — فصار ملکی سبب البعد

امید تھی مجھے اوسکے مالک ہو جانے سے قربت کی ہائے میری ملکیت تو دوری دوری کا سبب ہو گئی

ورنحتہ سکرات الہوے — فمال بالوصل الی الصد

نشہ عشق نے اوسے سرشار کر دیا — تو وصل سے اعراض کرنے لگا

ان سئل البذل ثنےٰ عطفیہ — واسبل الدمع علی الخد

جب اوس سے وصل کا سوال کیا گیا تو پیٹھ پھیرلی۔ اور رخسارہ پر آنسو جاری ہو گئے

غرّ بنا تجنیہ الحاظہ — لایعرف الانجاز للوعد

دھوکا دیا اپنی کنکھیون کی نوشیرینی سے — اور وہ وعدہ وفا کرنا جانتا ہی نہین

مولیٰ یشتکی الظلم من عبدہ — فانصفوا المولےٰ من العبد

مولےٰ اپنے غلام کے جور کا شاکی ہے — دادخواہی کرو مولیٰ کی اس غلام سے

اِس قصیدہ کے راوی جعفر کہتے ہین کہ تمام حاضرین نے اِس پر اتفاق کیا کہ خلفائے سابقہ مین سے کسی کے اِسقدر لطیف اور پسندیدہ اشعار نہیں ہوئے۔ صولی نے کہا ہے کہ مجھسے عبد اللہ بن معتز نے بیان کیا کہ بعض احباب مین سے کسی نے مجھے واثق باللہ کے یہ شعر سنائے۔ خلیفہ اپنے دو غلامونکو بہت چاہتا تہا۔ اور ایک ایک دن ایک غلام کی خلیفہ کی خدمت کے لئے باری مقرر تھی۔ اوسکو واثق اسطرح نظم کے پیرایہ مین ادا کرتا ہے۔ ؎

قلبی قسیم بین تغصین　　فمن رای روحاً بجسمین

میرا دل دو غصنون مین بٹا ہوا ہے　　کسی نے ایک روح دو جسمونمین دیکھی ہو

یغضب ذا ان جاد ذا بالرضے　　فالقلب مشغول بشجو بین

یہ غضب آلودہ ہوجاتا ہو اگر وہ رضامندی مین سبقت کرے غرضکہ میرا دل دو غمونمین مبتلا ہے

خریمی سے نقل ہے کہ ایک بار یہ شعر اخطل واثق کی مجلس مین گایا گیا۔ ؎

وشبان مرح بالکاس نادمنی　　لا بالحصور ولا فیہا بسوار

بہت سے ایسے جوان جام شراب پلانیوالے مجھسے قریب ہوگئے جو بخیل تھے اور نہ بزم کی صفت مشاعرہ میں سوار تھے

کہا گیا کہ سوار۔ یا سار تو واثق نے ابن الاعرابی کی طرف متوجہ ہوکر اسکا مفہوم اور معنی دریافت کئے۔ ابن الاعرابی نے (جو اسوقت امام لغت بڑے زبان دان، شمار کئے جاتے تھے) کہا کہ سواری سے وہ شخص مراد ہے جو مجلس مین بدمزگی پیدا کرے۔ اور پیالہ مین کھانے کے بعد جو پس خوردہ رہجاتا ہے اوسکو سار کہتے ہین۔ کلام عرب مین دونون الفاظ کا استعمال جاری ہے۔ واثق نے اسیوقت ابن الاعرابی کو بیس ہزار درہم انعام دئے جانے کا حکم دیا۔ اور خریمی نے کہا ہے کہ مجھسے میمون بن ابراہیم نے بیان کیا کہ مجھسے احمد بن حسین ہشام ایکدن کا واقعہ ذکر فرماتے تھے کہ واثق کے حضور مین ایک دن حسین بن ضحاک اور مخارق سے باہم اِس امر پر بحث ہونے لگی

کہ ابو نواس اور ابو العتاہیہ مین سے کس کو ایکدوسرے پر شاعرانہ فضیلت حاصل ہے کسی طرح قضیہ فیصل نہین ہوتا تہا۔ خلیفہ واثق نے کہا کہ اچھا تم دونون آخری فیصلہ کے لیئے کوئی شرط مقرر کرتے ہو؟ دونون نے اوسیوقت دو سو روپے شرط قرار دی کہ جو ہار جائے۔ وہ ادا کرے۔ واثق نے فوراً درباری علماء کو یاد کیا کہ کوئی حاضر ہے کہا گیا کہ حضور ابی ملحم حاضر ہین۔ اور وہ فوراً محل مین حاضر کیئے گئے۔ واثق نے بالتفصیل قضیہ بیان کیا اور ابی ملحم کو ثالث بالخیر تجویز کر کے اونکی رائے دریافت فرمائی ابو ملحم نے عرض کی کہ ابو نواس نہایت پُرگو شاعر۔ فن شعر مین بہت وسیع معلومات اور دخل رکھتے ہین اور تمام شعرا سے بڑھکر اصناف سخن پر قادر ہین۔ اشعار مین جدت۔ ندرت پیدا کرنا۔ شیوا بیانی اور معاملہ بندی ابو نواس ہی کا حصہ ہے۔ خلیفہ نے اسی وقت حکم دیا کہ مخارق حسین بن ضحاک کو دو سو دینار فوراً ادا کرین کیونکہ وہ ابو العتاہیہ کو ترجیح دیتے تھے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

محمد حسین محوی لکھنوی عفی عنہ

مفتاح الفرح

اے کامل عارفون کی حرز جان اور پیک مژدہ رسان عاشقان وہادئے پیرو پیغمبران و نور العین جوگیشران !!! تو ہی ہے !!! زاویہ دن کے جسم کی تاب و توان اور فرح بخش دل سالکان - اور ہے تیرا ہی سطح زمین پر بلند نشان !!! سچ تو ہی ہے قادر مطلق کے ایوان نوری کی دربان - اے کان صفات کلیہ تیرے حسن ہوشربا کے آگے - چودہوین رات کا چاند ماند !!! او حسینان روئے زمین کا حسن پھیکا تیرے قوت بازو کے مقابلہ مین شیر ببر بچہ روباہ - اور رستم اسفندیار کا زہرہ آب ہے - تیری حکمت کے آگے حکمت افلاطون و جالینوس بازیچۂ اطفال ہے - مشکل اور پیچیدہ مسئلون کا حل کرنا تیرا ہی کام ہے - تمام دنیا کے آہم دوکھون مین شریک غم ہونا تیرا ہی حوصلہ ہے - بجا ہے - اگر تجھکو مشکل کشا دنیا کہا جائے تیری عالمگیر فتوحات کا ڈنکا چار دانگ عالم مین بج رہا ہے - تیری حلیم الطبع اور منصف مزاجی اور سکوت ورزی کی تعریف مین تمام عالم کی زبان رطب اللسان ہے واقعی جسقدر تیری تعریف مین خامہ فرسائی کیجائے - تیرے حسن بیاض سے ایک کرشمہ بھی رقم کرنا اس ہیچدان کے حد امکان سے باہر ہے - تو تمام بندگان خدا کی خیر اور سب کو یکسان خوشی پہنچانے والی ہے - اور شاہ و گدا کو ایک نظر سے دیکھنا تیری طبع سرشت ہے - اے کامل عارفونکو صراط المستقیم پہ پہنچانیوالی - اور اس دار ناپائیدار کی فانی خوشیون سے مامون رکھکر سچی اور ابدی خوشی کو دینے والی زاہدون اور عابدونکو گلستان ارم مین پہنچاکر خوشگوار اور لذیذ میوہ جات سے

کھلانے والی۔ ٹھنڈا اور میٹھا آب کوثر پلانے والی۔ شہنشاہونکو ملکی وپیچیدہ مشورون اور خفیہ انتظامات اور ہوس ملک گیری اور فتح وشکست کے گوناگون تفکرات وبوقلمون ترددات سے یکدم جام بیہوشی پلاکر خوابگاہ سنگ مرمر پر بیفکری کا تکیہ سرہانے رکھکر سلادینے والی۔ ا!! دنیا دارونکو صدہا تکلیفات اور مصائب سے چھوڑانے والی۔ بیمارونکو جانکاہ جان خراش دکھون سے آرام بخشنے والی۔ بہت سے ننہے ننہے یتیم اور بیکس بچون کے سوزناک دکھڑون کو دیکھہ کر اپنی آغوش عاطفت مین لے لینا۔ اور میٹھی میٹھی سُر سے لوری اُن کے کان مین سنانا۔ جوانونکو فکر زن وفرزند وضروریات حاجات وجہ معاش زندگی کے صدہا تفکرات مین مبتلائے درد وآرام دیکھکر یکدم صحرائے آزادی مین لا بٹھانا۔ بوڑہونکو زیستی کے صدمے سہارتے ہوئے دیکھکر اپنے دِل مین تاب نہ لانا اور جھٹ انکی کٹہری پیٹھ کو سیدہا کر دینا۔ غریب اور مفلس وامدارونکی تباہ حالت اور روزانہ تاک کی سختیونکو برداشت نہ کرکے اپنی ضامنی دیکر فیصلہ کرادینا۔ المختصر دریامین ڈوبتون اور آگ مین جلتونکو بڑی ہوشیاری اور جوانمردی سے سنبھال لینا۔ کوڑہی اور چرک آلودہ کی حالت کو دیکھکر مطلق نفرت نہ کرنا۔ بلکہ اپنے دست مبارک سے انکو اٹھاکر اپنی صاف اور پوتر گود مین لے بیٹھنا۔ یہ تیرا ہی مادری دہرم اور پوتر کرم ہے۔ ایسے پردرد آلام مقام مین کہ جہان کوئی بھی آدمی کسی کے دکہہ اور مصیبت مین ساتھہ نہین دے سکتا۔ بلکہ ہر ایک آدمی اپنی اپنی جگہ بسمل پڑا تڑپ رہا ہے۔ اگر سچ پوچھو تو ان بے پایان دکھڑون سے بچانے والی اور آرام سے تھپک کر سلانے والی۔ اَے ہماری پیاری امان۔ موت تو ہی تو ہے۔ تیری علو ہمتی اور اولوالعزمی کے پرجوش حملون سے سارا جہان مغلوب ہے۔ درحقیقت تو صفات حسنہ اور برکات الہیہ کا کلی مجموعہ ہے پرکو منزہ

تیرے فیض قدوم میمنت لزوم سے اس باغ دنیا مین مثل غنچہ شگفتہ خاطر نظر آتا ہے جسکو دیکھو بس تیری ہی جستجو اور تلاش ہے۔ ہر ایک کے دل مین تیرا خیال۔ آنکھونمین تیری خوبصورت پیاری پیاری مبارک شکل بس رہی ہے۔ تیری سنجیدہ حالی اور صلح کل خیالی خود تیرے بے نظیر ہونے کی کافی نظیر ہے۔ اے میری پیاری امان موت۔ وے لوگ جو تجھے اپنا جانی دشمن سمجھکر تیری صحبت سے کوسون دُور بھاگتے۔ اور وے لوگ جو تیری لطیف شکل سے جو کہ دیکھنے مین نہین آتی کراہتے اور تیرے مبارک نام سے ناک چڑھاتے ہین !!! باوجودیکہ اسقدر انکی گمراہی اور بے مہری اور بے اعتنائی کے وے لوگ جو تیری محبت بھری نگاہون سے دُور بھاگے بھاگے پھرتے ہین۔ تو خود ہزارون کوس چلکر میدانونکی مسافتین طے کرکے پہاڑون اور جنگلون اور ندی نالونکی مصیبتین اپنے سر پر جھیل کر اُن کے پاس پہنچتی ہے۔ طرح طرح کے دکھون مین مبتلا اور پیشاب اور فضلہ مین آلودگون۔ زخمی اور خون بھرے پارچون مین لپٹونکو تو جھٹ دست مبارک سے اُٹھاکر اپنی محبت بھری گود مین لیکر پیشانی پر بوسہ دیتی اور سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ سینے سے لگاتی ہے۔ !!! آہاہا !!! چہ خوش میٹھی پریم لوری سناتی ہے۔ کہ پھر خواب سے چونکنے کو دل ہی نہین چاہتا ہے۔ اور یہی جی مین آتا ہے کہ تیری پوتر اور نرم گود مین برسون ہی سوتے رہین۔ اے ہماری مادر مہربان موت تو سچ مچ دیا کی پتلی ہی ہے۔ یا سراپا نور ہی نور ہے کہ تیری روشنی مین آکر جملہ مصائب جہالت خوبصورت مار و گژدم ہر دم جسم کو کاٹ کاٹ کر اذیت پہنچارہے تھے۔ یکدم دور ہو جاتے ہین۔ ایسی والدہ مکرمہ فیاضہ کے مبارک قدمونپہ میرا سیر نیاز بصد اعزاز خم ہے۔ منصف مزاجی تیری پر ہر ایک شخص خوش ہے صفائی تیری ضرب المثل ہے۔ خالق سے نے وفاداری کا مادہ تیرے پاک دل مین کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ تیرے پر جلال چہرہ پر رحمت اور شفقت کے آثار ات نمایان۔ الغرض تیری

ہر ایک نیک حالت پر صفائی بذاتہ خود تعریف کرتی ہے۔ مین جس پہلو سے تجھے دیکھتا ہون۔ تو اس قابل پائی جاتی ہے۔ کہ مین ہمہ تن سربسجود تیرے مبارک قدمون مین پڑا رہون۔ مجھے تیری سچی محبت اور دکھون سے چھوڑانے والی نگاہ ترحم نے اس قدر بیباک کر دیا ہے۔ کہ مین اس عارضی موہومی مفروضی موت کو جس سے بہت سے میرے مادر زاد بہائی ورطہ تلاطم مین پڑے ہوئے غوطے کھا رہے ہین۔ جنکو آب مین کنارے پر کھڑا ہوکر دیکھ رہا ہون۔ اور خوشی سے پھولا جامہ تن مین نہین سماتا ہون۔ اور دل کی زبان سے تیرا شکریہ ادا کر رہا ہون۔ ملے

میری پیاری امان مرگ مین تیری پوتر سرشٹی (پاک دنیا) مین

ایک ننہا سا بچہ ہون۔ میرے ناشایستہ حرکات کو دیکھ کر کہین مجھے اپنے قدمون سے جدا نہ کر دیجیو۔ مجھے اپنے پیارے بہائیون کی ہاہاکار اور تذبذب حالت دیکھکر خوف پیدا ہوتا ہے۔

مین چاہتا ہون۔ کہ انکی آنکھون مین بھی اپنا سچا جاہ وجلال کہ جس نورانی اور عافیت لباس مین ملبس ہے۔ ایکدفعہ تو نوری جہلک انکے کثیف اجسام پر ڈال تاکہ وہ بھی تیرے زیر سایہ آکر کلی آرام حاصل کرین۔ اور اپنی غلط فہمیونکا اعتراف کرین۔ مجھے ہر آن تیرا ہی دہیان ہے۔ تجھسے غافل ہونا ہی مرنا ہے۔ ؂

نکتہ۔ محققان علم الہی کی یہ پختہ رائے ہے۔ کہ یاد مرگ اعلی درجہ طریقہ خداشناسی کا ہے۔ عارفان کامل اسکی یاد سے ہر دم خدا کے حضور مین رہتے ہین۔ بلکہ یاد مرگ یہ ایک ایسا تیز دہار والا تبر ہے۔ کہ جو تمام برائی کے اشجار کو جڑ سے کاٹ ڈالتا ہے۔ یاد مرگ انسان کے ساتھ ایک ایسا انمول پہرہ ہے جو بد خیالاتکو احاطہ جسم کے اندر گھسنے نہین دیتا باہر سے بھی آئے ہوئے کو نکالدیتا ہے۔ باقی دارد

منشی دیو دیال

پتھر کا کوئلہ

پتھر کے کوئلے کو ناظرین نے انجن مین جلتے ہوئے دیکھا ہوگا- یہ زمین کے اندر سے کھود کر نکالا جاتا ہے- یہ کسی زمانہ کے نباتی اجسام کی تبدیل شدہ حالت ہے- کیونکہ کسی زمانہ مین سطح زمین کی حالت ایسی تھی کہ جسمین زیادہ تر نباتات پیدا ہو سکتی تھی زمین کی سطح کی حرارت زمانہ حال سے زیادہ تھی- مینہ برستے ہی بھاپ بنکر اٹھجاتی تھی- اور پھر اوپر پہنچکر شکل بادل لگاتار مینہ کا سلسلہ جاری رکھتی تہی- جو دونون باتین نباتی زندگی کے لئے بہت موافق ہین- زمین کی سطح بھی غالباً ایسی ہموار نہ ہوگی یعنی اونچی جگہ سے مٹی ڈہل کر نیچی جگہ کے گرے ہوئے درخت و پودونکو دبادیتی تھی- اسی طرح جنگل کے جنگل سطح زمین کے نیچے دب گئے- اور پھر مٹی کے بوجھ اور سالہا سال کی زمین کی اندرونی سطح کی حرارت سے ایک قسم کے کوئلے مین تبدیل ہو گئے- جسکو پتھر کا کوئلہ کہتے ہین- اِس زمانہ کو ہم حیاتی رو سے دنیا کا نباتی زمانہ کہہ سکتے ہین- گو کہ جیالوجسٹ اِسکو کوئلہ کا زمانہ کہتے ہین ہکسلے صاحب کی رائے مین یہ کم از کم ساٹھہ لاکھہ برس تک قائم رہا- اسوقت موجودہ جانورونمیں سے ایک بھی نہ تہا- صرف چند قسم کے بے ڈھنگے قوی ہیکل جانورونکی ہڈیان ملتی ہین- کہ جن مین سے ایک ہاتھی کی قسم بھی تھی-

پتھر کا کوئلہ دنیا کے بہت حصونمین ملتا ہے- ہندوستان مین جہانتک معلوم ہوا ہے- یہ تقریباً پینتیس ہزار مربع میل جگہ مین مل سکتا ہے- چین مین کہتے ہین کہ چار لاکھہ مربع میل کوئلے کی زمین ہے- لیکن ہندوستان کے اِس قلیل مقدار کوئلے کے میدانون میں سے صرف چند ہزار میل زمین

مین سے کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر جگہ سے کوئلہ نکالنا آسان نہیں ہے۔ بعض حصے مثلاً چھوٹا ناگپور کے مقام جھیریا مین کوئلے کی کان سطح زمین کے اسقدر قریب ہے کہ گز دو گز مٹی کھودنے سے کوئلہ نکل آتا ہے۔ لیکن کہین کہین مثلاً رانی گنج مین سینکڑون فٹ نیچے کوئلے کا پتہ لگتا ہے۔ پنجاب مین بھی کیوڑہ کے قریب ایک مقام ڈنڈوت ہے۔ جہان کوئلہ نکلتا ہے۔ یہ پہاڑ پر واقع ہے۔ لہذا پہاڑی کی بغل مین سرنگ کھود کر کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کوئلے کے کان کی سطح کے قریب کچھ اوسکے اوپر پڑی ہوئی مٹی کی تہ پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کوئلے کے میدان کسی زمانہ مین سطح زمین پر تھے۔ کوئی زمین کی اندرونی قوت سے اونچا ہو گیا ہے۔ مثلاً ڈنڈوت۔ کوئی نیچا جیسے رانی گنج۔ کوئی سطح زمین کے قریب آگیا ہے۔ مثلاً جھیریا۔ پھر ہر کان کا کوئلہ جلنے مین مساوی نہین ہوتا۔ کہتے ہین۔ کہ جس قدر کوئلہ پرانا ہوتا ہے اوسی قدر وہ آسانی سے جلتا ہے۔ چنانچہ ڈنڈوت کا کوئلہ رانی گنج کے کوئلے سے جلنے مین بہتر ہے۔ اور اسمین راکھہ کم ہوتی ہے۔ بعض مقامونمین پتھر کا کوئلہ اسقدر آسانی سے جلتا ہے کہ لوگ گھر دنین بجائے ایندھن استعمال کرتے ہین۔

کوئلے کی کان سے کوئلہ نکالنے مین بڑی بڑی دقتین پیش آتی ہین کیونکہ اسکے اندر ایک قسم کی جلنے والی گیس ہوتی ہے۔ کہ جس سے بھڑک اٹھنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد جو کاربونک ایسڈ گیس پیدا ہوتی ہے اس سے انسانی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ لہذا شروع شروع مین کوئلے کی کانونمین سینکڑون جانین ضائع ہوئین۔ لیکن سائنس نے اسکا بھی ایک تدارک کیا ہے۔ ڈی-وی صاحب نے ایک ایسی تجویز کی ہے کہ جسکی روشنی تارکی جالی سے گھری ہوئی ہے۔ پیتا اسقدر گرم ہونے نہین پاتا کہ جس سے باہر کے گیس کو آگ لگنے کا خطرہ رہے۔

پتھر کے کوئلے کا سب سے زیادہ استعمال انجنون مین بطور ایندھن جلنے کا ہے اسکو بند برتن مین رکھکر حدت پہنچانے سے اسمین سے گیس نکلتی ہے۔ جو کسی زمانہ مین بجلی کے طور پر بڑے بڑے شہر دنمین جلائی جاتی تھی۔ علاوہ اسکے اِسکا ایک پگلا ہوا حصہ تارکول بنجاتا ہے۔ تارکول مین سے بہت قسم کی ادویہ اور رنگ دستیاب ہوتے ہین انمین سے ایک چیز سیکرین بھی ہے جو خالص حالت مین چینی سے تین سو گنا زیادہ میٹھی ہوتی ہے۔

آج کل اکثر مشینین انجن کے ذریعہ سے چلائی جاتی ہین اور ان انجنونمین قوت زیادہ تر کوئلہ کی آنچ سے پیدا کیجاتی ہے گوکہ بعض انجن تیل اور پٹرول سے بھی چلائے جاتے ہین۔ پھر بھی دنیا کے بڑے بڑے کارخانجات صرف کوئلہ کی ہستی پر مبنی ہین۔ حساب سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا مین کوئلہ کا سالانہ خرچ تقریباً اسی کروڑ ٹن ہے۔ (ایک ٹن تقریباً ۲۸ من) اس حساب سے دنیا کے کوئلے کا مخزن تقریباً ایک ہزار برس مین ختم ہو جائیگا۔ آیندہ دنیا کے سامنے یہ سوال در پیش ہے۔ کہ اگر کوئلہ ختم ہو جائے تو کارخانجات کیونکر چلائے جاوینگے۔ شاید بغیر سوچے سمجھے بہت سے آدمیون کے دل مین بجلی کا خیال آئیگا۔ جب بجلی سے پنکھے چل سکتے ہین اور بیسیون مختلف کام ہو رہے ہین۔ تو کارخانونکی بڑی بڑی مشین بھی بجلی سے کیون نہ چلائے جائین۔ لیکن بسا اوقات بجلی کی قوت بھی کوئلہ سے مہیا ہوتی ہے۔ لھذا دقت وہی کی وہی باقی رہجاتی ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اور کوئی ذریعہ بھی ہے یا ہنین۔

شاید ناظرین کو خیال ہو گا کہ کسی زمانہ مین پن چکیان چلا کرتی تھین اسکا اصول یہ تھا کہ ایک بڑی مقدار پانی کو مثلاً نہر یا نالے کو ایک خانہ دار پہیہ پر

گرایا جاتا تھا۔ پانی کے بوجھ سے یہ چکر کھاتا تھا جس قوت کو چکی کے چلانے کے کام مین لاتے تھے۔ لیکن یہ کارروائی صرف انہی مقامات مین ممکن تھی جہان پانی کی افراط ہو اور خاصکر جہان پانی اونچی سطح سے نیچے گرتا ہو۔ چنانچہ امریکہ کے آبشار نایگرا کی اس لا انتہا قوت کو سائنس نے بجلی کی شکل مین تبدیل کر دیا ہے۔ جو کہ تار کے ذریعہ سے ڈیڑھ سو میل تک پہنچائی گئی ہے لیکن یہ ابھی ایک ابتدا ہے اور امید کیجاتی ہے کہ کسی زمانہ مین نایگرا کی قوت بجلی کی شکل مین اسطرف کے تمام بڑے بڑے شہرونمین پہونچائی جائیگی۔ کشمیر مین بھی جہلم کے آبشار سے بمقام بارہ مولا بجلی پیدا کیجاتی ہے امید ہے کہ ہمارے ملک مین دیگر مقامات مین بھی پانی کی قوت سے بجلی پیدا کیجائیگی علاوہ آبشار کے کہین کہین جوار بھاٹے کی قوت کو بھی اسی طرح استعمال کرتے ہین۔

لیکن جن اطراف مین پانی نہو وہان ایک اور ذریعہ قوت پیدا کرنیکا ہے ناظرین نے ہولی دوالی اور دیگر تہواروں کے موقع پر بازارونمین کاغذ کے پھول دیکھے ہونگے جو ہوا کے ذریعہ سے خوب زور زور سے گھومتے ہین۔ اگر اسی قسم کا انتظام بڑے پیمانہ پر کیا جائے تو اس قسم کے پنکھون کے ذریعہ سے کسی پہیہ کو پھرایا جا سکتا ہے۔ جسکی قوت مختلف کامونمین استعمال کیجا سکتی ہے۔ ولایت اور خاصکر ہولینڈ مین اس قسم کی ہوا چکیان جابجا کام کرتی ہین۔ امریکہ مین بعض بعض بنجر حصے ایسی ہوا چکیون سے پانی کھینچکر سیراب کئے گئے ہین جیسے کہ چھوٹے پیمانہ پر ادنے کسانون نے بھی ہوا چکیون سے اپنے کھیتون کو سیراب کیا ہے۔ ہوا چکی کے لئے لازم ہے کہ ہوا تند ہی ہوئی ہو۔ بالکل حبس یا جھکڑ مین یہ کام نہین دیسکتی ہے

جہان پانی اور ہوا دونون کسی وجہ سے استعمال نہین کر سکتے۔ وہان کیا کیا جائے ؟ دیکھنا چاہیئے کہ دنیا کی تمام قوتین کہان سے آتی ہین وہ سب کی سب سورج سے پیدا ہوتی ہین۔ ہم دیکھ چکے ہین کہ مشینین کوئلہ۔ پانی و ہوا کی قوت سے چلائی جاتی ہین۔ ہم ابھی بیان کر چکے ہین کہ پتھر کے کوئلے نباتی اجزا ہین جو کسی زمانہ مین بشکل درخت سطح زمین پر اگے ہون گے۔ لہذا اس مین جلنے کا مادہ جو اسکی قوت ہے سورج سے آیا ہے۔ پانی بھی سورج کی شعاعون سے زیادہ تر سطح سمندر سے بھاپ بنکر پہاڑونکی چوٹیون پر بشکل برف جمع ہوتا ہے۔ اور وہان سے دوبارہ سورج کی گرمی سے پگھل کر ندی نالے بنجاتا ہے جنکے ذریعہ سے ہماری پن چکیان چلتی ہین۔ ہوا بھی مختلف مقامات کے تفرقۂ حدت سے حرکت مین آتی ہے۔ یہان بھی سورج ہی مدد ہے۔ انسانون اور حیوانونکی جسمانی قوت غذا پر مبنی ہے۔ جو سورج ہی کی طاقت سے پیدا ہوتی ہے۔ الغرض دنیا کی تمام قوتین۔ (نیز اخلاقی و دماغی) سورج ہی سے پیدا ہوتی ہین۔ اور اگر متقدمین نے سورجکو بطور اپنے معبود اعلےٰ قرار دیا تھا وہ کم از کم سائنس کی رو سے حق بجانب ہے۔

اگر ہم ابتک تمام قوتین۔ سورج۔ کوئلہ۔ پانی۔ ہوا سے لیتے رہے ہین۔ تو کیون نہ ہم اب بغیر کسی ذریعہ اسی مخرج اعلےٰ سے تحصیل کرین۔ ناظرین کو معلوم ہوگا۔ کہ قدیم زمانہ مین بھی آرکمیڈیز نے آئینون کے ذریعہ سے سرکیوز بندر مین دشمنون کے جہاز جلا دئے تھے۔ اس قسم کے بڑے بڑے آتشی آئینون کے بنانے مین سائنس دان کچھ مدت سے مصروف رہے کئی مرتبہ ناکامیاب ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ اگر بہت سے چھوٹے چھوٹے

شیشے ایسے قاعدے سے جھکا کر رکھے جائین کہ ان سب کے عکس ایک ہی جگہ پر پڑین تو وہ ملکر ایک بڑے آتشی آئینہ کا کام دین گے۔ اسی بنا پر آتشی آئینون کے ذریعہ سے سورج کی گرمی لیکر بڑی بڑی مشینین چلائی جا رہی ہین ہمارے ملک مین بھی ایک صاحب نے اسی بنا پر ایک آلہ نکالا ہے۔ جسکو **بھانو تاپ** کہتے ہین۔ اِس کے ذریعہ بہ آسانی کھانا پکایا جاتا ہے۔ لیکن ان آلات مین قباحت یہ ہے کہ انکو سورج کی گردش کے ساتھہ ساتھہ گھڑی کی قسم کی مشینون کے ذریعہ سے حرکت دینا پڑتا ہے۔ اور دویم رات کو یا برسات کے زمانہ مین بالکل بیکار ہوتے ہین۔ اسدقت کو رفع کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ سورج کی حدت کو پہلے بجلی کی شکل مین تبدیل کرکے سٹوریج بیٹریونمین بھر لین اور بعد مین حسب ضرورت استعمال کرین لہذا کوئلے کے ختم ہو جانے پر ہمین کوئی مایوسی نہین ہوئی چاہیئے کیونکہ سائنس کے ذریعہ سے ہم نیچر کے دیگر خزانو نکو بہ آسانی قابو مین لا سکتے ہین۔ اور سب کے بعد سورج دیوتا تو ہمارا پروردگار ہے ہی۔

ایک ممبر ایس۔ پی۔ ایس۔ کے۔

شراب خواری

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن
اے ذوق اس جہان کو ہے زیب اختلاف

دنیا مین دیکھتے ہیں کہ ایک ہی چیز کے ہزارون درخت ہین اور ہر درخت مین لاکھون پتے ہین۔ مگر نہ دو درخت ایک سے ہین۔ نہ دو پتے۔ اسی رنگا رنگ اختلاف کا نام دنیا ہے۔ اسی طرح دنیا مین ہزارون برائیان ہین مگر وہ انمین سے یکسان برابر نہین ہین۔ بعض حکیم ان سب کو یکسان جانتے ہین۔ جو شخص نیکی کی راہ مستقیم سے سو قدم بے راہ ہو یا دس قدم دونونکو گمراہ جانتے ہین۔ اور اس گمراہی مین اوسکے واسطے خیر نہین جانتے۔ اُن کے نزدیک خواہ کوئی شخص ہر سب سے بے ادبی کرے۔ یا کوئی چیز چرائے دونون یکسان ہین۔ مگر یہ انکی ہٹ دہرمی ہے۔ بھلا اوپر کی صورت مین برائیون کے سبب کب آدمی یکسان برابر ہو سکتے ہین۔ غرض حکما کی رائے مین مثل اور مسایل کے اسمین بھی اختلاف چلا آتا ہے کہ برائیان سب برابر ہین یا نہین۔ گناہون کے درجون اور اندازونکو خلط ملط کرنا اندیشے سے خالی نہین۔ اگر سب گناہ برابر ہو جائین تو قاتل۔ خونخوار۔ دغا باز مکار۔ ظالم۔ جابر۔ اپنے تئین بڑے فائدے مین سمجھنے لگین۔ اور اپنی کانشنس کی خوب خوشامد کرین۔ اور یہ جانین کہ ہم بھی ایسے ہی ہین۔ جیسے کہ کاہل سُست نفس پرست۔ ریاضت و عبادت مین سُست لوگ ہین۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ ہر شخص غیرون کے گناہونکو کبیرہ اور اپنے گناہونکو صغیرہ جانتا ہے۔ ابتدا سے

اُن گناہون کے باب مین معلم ہمین درست تعلیم ہی نہین دیتے۔

سقراط نے لکھا ہے کہ حکمت کا کام ہے، کہ وہ نیک وبد مین تمیز کرنے کا ملکہ پیدا کردے۔ ہم مین سے جو زیادہ اچھا ہے وہ بھی بد ہے۔ اس لیئے ایسے علم کی بھی ضرورت ہے۔ کہ جو ایک برائی کی دوسری برائی سے تمیز کرنے کی استعداد پیدا کردے۔ جب تک یہ علم نہ سیکھا جائے تب تک نیک و بد ایسے خلط ملط معلوم ہونگے۔ کہ وہ پہچانے نہین جائینگے۔ غرض اس تمہید سے یہ ہے کہ شراب پینا برائی ہی نہین ہے بلکہ سب برائیونمین بدتر ہے۔ اور اس سے بڑھکر کوئی برائی نہین ہے اس لیے اسکو ام الخباثت کہتے ہین۔ اور برائیون کے کرنے مین بڑا حصہ روحانی ہوتا ہے۔ مگر اسمین صرف جسمانی حصہ ہے۔ یعنی اور برائیونمین علم محنت۔ دلیری۔ جرأت ہمت۔ ہوشیاری۔ تیزی چستی چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شراب پینے مین کسی کی ضرورت نہین۔ اُس کے واسطے کسی عقل کی ضرورت نہین۔ اور برائیان عقل وفہم کو تحلیل کرتی ہین۔ مگر شراب پینا دل کو بالکل ذلیل اور فنا کرتا ہے۔ اور جسم کو نکما بناتا ہے۔ جب شراب کا اثر اپنی پوری طاقت ہم مین دکھاتا ہے۔ تو تمام اعضا مین گرانی آجاتی ہے۔ اور ڈھیر ہو جاتے ہین۔ ٹانگین لڑکھڑاتی ہین۔ زبان بہکتی ہے۔ دل مین ہول اُٹھتے ہین۔ آنکھیں ابل آتی ہین۔ ہچکیان آتی ہین۔ جھگڑے کھڑے ہوتے ہین سب سے بدتر حالت انسان کی یہ ہے کہ اوسکو اپنے آپے کی خبر نہ رہے۔ اور وہ اپنے تئین سنبھال نہ سکے۔ جیسے پتیلی کی تہ مین جس چیز کو ڈالکر جوش دو اُسی کا ابال اسکے اوپر اٹھتا ہے۔ اسی طرح شراب کے نشے مین جو راز کہ دل کے اندر مخفی ہوتے ہین۔ وہ زبان پر آتے ہین جس کے دل کا حال دریافت کرنا چاہو اوسکو شراب پلا کے دریافت کرلو۔ سلاطین اور امرأ و وزرا کی بہت سی مثالیں ایسی تاریخ

تین لکھی ہین۔کہ انھون نے خود شراب پیکر اپنے اسرار کو برملا کہدیا جس سے
اُن کے سر پر آفتیں آگئیں۔ یا اورونکو پلا کر رازکی باتین معلوم کرلین۔ متقدمین
حکماء مے نوشی کی زیادہ تر مذمت نہین کرتے بلکہ بعض تو شراب پینے کو اچھا
بتاتے ہین۔ اور کہتے ہین کہ وہ آدمی کو تازہ و توانا کرتی ہے۔ مردہ دل کو
بھی زندہ بنا دیتی ہے۔ اُسکے پینے سے بعض آدمی نیک خیال ہو جاتے ہین اُنکے
ذہن اور عقل روشن ہو جاتے ہین۔

کیخسرو نے اپنے بھائی پر یہ فخر کیا تہا کہ مین تجہسے زیادہ شراب پیتا ہون۔

بعض اطبا اور اقوام شایستہ کا قول ہے کہ معدہ کے قوا جو ضعیف اور مضمحل
ہو جاتے ہیں اُن کے از سر نو قوی کرنے کے لیئے ایک مہینے مین ایک دفعہ شراب
کا کثرت سے پینا اچھا ہے۔ یہ ایک تازیانہ اُنکی سستی اور کاہلی کے لیئے
ہو جاتا ہے۔

ایک مورخ لکھتا ہے کہ مجالس مشورہ مین ایرانی شراب پیکر بیٹھتے تھے
جس سے اُنکی عقل اور ذہن مین تیزی پیدا ہو جاتی تھی۔ یون تو کوئی برائی
دنیا مین نہین ہے کہ جس کے طرفدار بعض آدمی نہون مگر سچ یہ ہے کہ شراب
خواری سے زیادہ کوئی برائی انسان کے حق مین مضر نہین ہے۔ اور اس سے
زیادہ کوئی احمقانہ اور ناشایستہ حرکت نہین ہے گو وہ اور برائیونکی طرح
غیرون کے لیئے ایذادہ اور ضرر رسان نہیں ہے۔ اور پبلک سوسائٹی مین
ہل چل نہین ڈالتی خاص اپنی ذات کے لئے بڑی ہوتی ہے۔

افلاطون اٹھارہ برس کی عمر تک شراب پینے کو منع کرتا ہے۔ اور چالیس
برس کی عمر تک اجازت دیتا ہے۔ اور آگے مین لگا ہے گاہے۔ کسی شادی
اور تیوہار کی تقریب مین شراب پینے کو منع نہین کرتا ہے۔

ایک حکیم شراب کی یہ تعریف کرتا ہے کہ وہ جوان کو حسین اور پیر کو جوان بناتی ہے انسان کے تمام شہوات نفسانی کو ایسا نرم کر دیتی ہے۔ جیسا کہ آگ لوہے کو۔ جن مجالس اور محافل کا انتظام ایسا ہو کہ کوئی شخص بیہودہ حرکت نہ کرنے پائے۔ تو انمین شراب کا دور چلنا بہت ہی نافع اور مفید ہے شراب سے ہر شخص کی طبیعت اور مزاج کا حال معلوم ہوتا ہے۔ وہ گویا معیار مرد ہے۔ کھوٹے کھرے کو فوراً بتا دیتی ہے۔ اوس سے روح مین اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ جسم بیماریون سے بچتا ہے وہ لڑائی کی تو جان ہے۔ مگر مجسٹریٹ و جج اور اون لوگونکو جو حقوق رعایا کا انفصال کرتے ہین۔ یا اور پیشے کرتے ہین۔ دن کو شراب پینی نہین چاہیئے۔ اور اوس رات کو بھی جسمین وہ حمل رکھوانے کا قصد کرتے ہون "

یہ ایک سوال بھی بڑے لطف کا ہے۔ قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے کہ شراب مین یہ طاقت بھی ہے یا نہین۔ کہ اسکا نشہ عقلمند حکیم کی روح کو مغلوب کر دے انسان بھی کیا کیا اپنی شیخی کے لئے اپنی نسبت نیک رائین لگاتا ہے۔ دانش و حکمت کیا انسان کی فطرت کو بدل دیگی۔ جو اوسپر شراب کا اثر ہوگا؟ جاہل ہو یا عاقل حکیم ہو یا احمق فالج کے اثر سے دونون ایکطرح بچ سکتے ہین۔ اسی طرح شراب کے اثر سے دونون ایک ہی طرح بچ سکتے ہین اور ایک ہی طرح مبتلا ہو سکتے ہین۔

بعض آدمی بیماری کی شدت مین اپنا نام بھول جاتے ہین بعض کی رائے اور عقل بالکل درہم برہم ہو جاتی ہے۔ غرض حکمت و دانش سے انسان آرام اور افزایش جسمانی سے محفوظ نہین رہ سکتا۔ شراب کے نشے کا جو اثر ہے وہ سب پر ہوگا۔ خواہ عاقل حکیم ہو یا جاہل گنوار جیسے کہ زمین کے مختلف خواص کے سبب ایک ہی درخت کے بیج طرح طرح سے پھولتے پھلتے ہین۔ اور مختلف

مزے رکھتے ہین۔ اسی طرح شراب کا حال ہے کہ انسانونکی طبایع مختلف پر اپنا اثر طرح طرح سے ظاہر کرتی ہے۔ کوئی شراب پی کر دیوانہ۔ وحشی جانور۔ درندہ ہوجاتا ہے۔ کوئی نہایت نیک بنجاتا ہے۔ کسی کو انتظام کا جوش اس سے اٹھتا ہے۔ کسی مین محبت و عشق کی آگ سلگتی ہے۔ غرض وہ بہت سے رنگ اپنے دکھاتی ہے۔ جسکو تم روزمرہ اپنی آنکھون سے دیکھتے ہو یا کانون سے سنتے ہو۔ ہندوستانی جو دایم الخمر رہتے ہین۔ اونمین بہت کم ایسے ہین۔ جو پینتالیس برس سے زیادہ جیتے ہین۔ اس ملک کے نوجوان رئیس زادے زیادہ تر اسی شراب کی بدولت اپنے جام عمر کو لبریز کرکے جرعۂ موت پیتے ہین۔ خدا اس سے بچائے یہ بری بلا ہے۔ جب منہ کو لگجاتی ہے۔ تو چھوٹتی ہی نہین۔

عرب کے ایک شاعر کا قول ہے۔

شعر

اترک الخمر ولو کنت فتیً　　کیف یسعیٰ فی جنون من عقل

شراب پینا چھوڑدے اگرتو جوان مرد ہے۔ کوئی عقلمند آدمی ایسا کی کوشش نہین کرتا کہ دیوانہ ہوجاوے

اہل فارس کا قول ہے کہ ”در ہوش چہ خطا دیدی کہ بیہوش شدی“

خانبہادر شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ

عشق میں امتیاز نہیں

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کاندرین راہ فلان ابن فلان چیزے نیست

قربان اس پاکیزہ خیال کے۔ نثار اُن منظوم پُر اثر اور معانی سے لبریز الفاظ پہ اور صد آفرین اسکے قائل پر! جامی۔ مولانا جامی۔ اگر آپ یہ شعر کہہ کر مجھ بے مایہ غریب اور ہیچمیرز کے سامنے پڑھتے تو واللہ باللہ اسکا صلہ دینے مین اپنی جان لگا دیتا۔ خود بک جاتا۔ اور آپکا منہ موتیون سے بھر دیتا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کس جوش و خروش سے آپ فرماتے ہین ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کاندرین راہ فلان ابن فلان چیزے نیست

"بندۂ عشق شدی" کیا تعلق قائم کیا ہے۔ بندہ ہونے کی صفت کیا ہے۔ اپنی ذات کو مولا کی ذات مین مستغرق کر دینا۔ پھر نسب کا امتیاز کیسا "چیزے نیست" واقعی چیزے نیست۔

اس مضمون کے پڑھنے والے سو مین کچھ تو ضرور ایسے ہونگے جو مضمون نگار کی اس خفیف الحرکاتی پر ضرور ہنس پڑیں گے۔ کیوں کہ انکا قیمتی وقت اور یہ بے سر و پا تعلق! ایک معمولی بات اور اتنا شور و شغب! یہاں پامال مضمون روز کے سنے ہوئے فقرے اور اون پر اتنا چکدار ملمع! اول بمقتضائے "عشق تست است الا جنون بسکے شعر کا ماخذ جنون۔ دوسرے بادی النظر مین اُسکے معانی اس قدر

عقل سے خارج اور مجنونانہ اُسپر طرّہ انشاپردازکی اتنی تعریف! سچ تو ہے۔ بھلا صاحب کسکو غرض پڑی ہے کہ بیٹھے بٹھائے اپنی اچھی بھلی جانکو روگ لگائے عشق کی نوبت پہنچائے اور پھر ترک نسب کا فتویٰ لیکر مندرجہ بالا شعر کا مزا اٹھائے مگر ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

واقعی دوسرے کے دلمین اپنا دل نہیں ڈالا جاتا۔ اِن الفاظ کی قدر کچھ وہی خوب جانتا ہے۔ جس کی جان پر گذری ہو گزرتی ہو یا کبھی گزرے انہیں استدلال اور منطق کی گنجایش نہیں ہے۔ اے باغ عالم کے رنگا رنگ پھولونکی بہار لوٹنے والو! یہ الفاظ نہیں۔ یہ بکسی ہوئی کلیاں ہین جو جلے ہوئے دل کی آہوں سے کملا گئی ہین۔ ابھی بو باس نہین کیون پسند آنے لگی۔ کسی اہل درد سے پوچھو کسی دِل جلے کے سامنے۔ یہ جگر کے ٹکڑے پیش کرو۔ ورنہ ہر بدمذاق کے لئے حکم ہے۔ کہ وہ کتاب بند کر دے اور دوسرا سبجکٹ دیکھے۔

آہ بے مثل شاعر۔ نہایت ہی باکمال۔ فاضل اجل اور علم الٰہی سے باخبر۔ حقیقت اور مجاز کی پوری تفریق کے جاننے والے انسانی جذبات اور حدوث واقعات پر گہری نظر ڈالنے والے فلاسفر نے مندرجہ بالا شعر مین کس قدر وضاحت سے ظاہر کیا ہے کہ جب انسان عشق کے پر اثر جذبات سے پورے طور سے متاثر ہوچکا تو اُسے امتیاز مدارج کیا؟ یہان ہمین لفظ عشق کے اُن معانی سے غرض نہین جو حکماء کے خیال مین ہین وہ تو عشقہ یعنی ایک بیل کھائی زرد گھاس سے ایک درختونکو سکھا دینے والی چیز سے دست وگریبان ہین مگر ہم ایماناً اور انصافاً کہتے ہین کہ عشق وہ نعمت ہے جو ہر تنگ ظرف کو میسر نہین

عشق ایک ایسا جلوہ ہے جسپر نظر پڑتے ہی انسان وہ کچھ دیکھتا ہے کہ آنکھیں ٹھٹک جاتی ہیں گو پلک جھپکانیکو جی نہیں چاہتا ہے ؎

درِ بزمِ وصال تو بہنگام تماشہ
نظارہ ز جنبیدنِ مژگان گلہ دارد

عشق وہ جذبہ ہے جس کے بغیر انسان اصلی شرفِ انسانیت تک فائدہ نہیں ہو سکتا بلکہ بمنزلہ ایک چلتی ہوئی مشین کے شمار ہوتا ہے جسکے مختلف کل پرزے اپنے مقررہ کاموں کو انجام دیتے ہیں لیکن اُس لذت سے ناآشنا ہیں جو اُن کاموں کی تکمیل سے حاصل ہوتی ہے اس عشق کے جذبات انسانی تمدن کے بندھے ہوئے قوانین کو نہایت دلچسپ اور خوش آئند طریق سے توڑتے ہیں اور انسانی زندگی کے واقعات کو ایک مشین کی چال سے ممیز کرتے ہیں اسلیئے کہ عاشق خواہ خاقانِ چین ہو یا قیصرِ روم خواہ شہنشاہِ وقت ہو یا سلطانِ دوران۔ اسے ہرگز یہ خیال نہیں رہتا۔ کہ مین کون ہون کہان ہون اور کیا کر رہا ہون اُدھر مطلوب کو بھی خواہ ادنےٰ سے ادنےٰ درجہ کا کیون نہ ہو یہ تمیز نہین ہو سکتا کہ اُسکا قدردان کس پایہ کا آدمی ہے۔ اور اُس سے کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور سچ پوچھیئے تو عشق کی حالت مین امتیاز مدارج کا خیال رکھنا شانِ عاشقی سے بالکل بعید اور معشوق اور عاشق دونونکی کمزوری ہے۔ کیونکہ ؎

مقامِ عشق مین شاہ و گدا کا ایک رتبہ ہے
زلیخا ہر گلی کوچے مین بے توقیر پھرتی ہے

سید محمد محسن۔ سیتاپوری

نوائے زمستاں

از

جناب مولینا محمد اسمٰعیل صاحب سابق مدرس فارسی گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول
آگرہ

سوارِ جہاں گرد خورشید رخشاں — گیا ناجدی جب بہ تقدیر یزداں
تو ماہِ دسمبر کی بچیسویں کو — ہوا جانبِ استوا گرم جولاں
مگر استوا پر نہ ٹھیرے گا ہرگز — کرے گا سفر تا گزرگاہِ سرطاں
نہیں خطِ سرطاں بھی جائے توقف — وہاں سے بھی پلٹے گا افتان و خیزاں
رہے گی اسی طرح اسکی تگ و دو — کہ ہے گردشِ گوئے محکومِ چوگاں
کبھی بقعۂ نورا رضِ جنوبی — کبھی سرزمینِ شمالی درخشاں
اگر ایک جانب خزاں کا عمل ہو — تو ہے دوسری سمت فصلِ بہاراں
اگر صبح دم شرق ہے اسکا منظر — تو ہے شام کو غرب اسکا شبستاں
کہیں دن ہے مستور ظلماتِ شب میں — کہیں رات، دن کی تجلی میں پنہاں
کسی منطقہ میں ہو گرمی کی شدت — کسی جا ہے آغازِ فصلِ زمستاں
جو سوچو تو یہ اختلافات بیّن — ہیں دراصل آثار الطافِ رحماں
کرو حمدِ خلاقِ عالم کہ جس نے — بنائے مہ و مہر و مریخ و کیواں
چنی دستِ قدرت نے کن خوبیوں سے — جبینِ فلک پر ستاروں کی افشاں
زمیں کے کرہ پر کئے اُسنے پیدا — جماد و نبات اور انسان و حیواں
پھر انساں کو اپنا خلیفہ بنایا — کیا اُس کو مامورِ عدل اور احساں
سنو عدل اقرارِ توحیدِ حق ہے — اور احسان ہے تصدیق و تکمیلِ ایماں

زباں سے بھی دل سے بھی افعال سے بھی
کرو پہلے ثابت کہ ہم ہیں مسلماں

مسلمانِ کامل کی ہے کیا نشانی!
کرے خدمتِ خلق تا حدِّ امکاں

مگر ایسی خدمت کہ پُر منفعت ہو
نہ ایسی کہ جس کا نتیجہ ہو نقصاں

گدایانِ مُبرم کو گر آج دو گے
تو پاؤ گے کل صبح پھر انکو نالاں

نہ دیتے تو کچھ یہ بھی کھاتے کماتے
یہ دینا ہے مستلزمِ قتلِ انساں

جو منگتا گدا ہیں تو داتا گداگر
گداگر کے معنی انہیں پر ہیں چسپاں

گدایانِ ملتاں کی شہرت تھی آگے
مگر اب تو ہر شہر و قصبہ ہے ملتاں

ذرا جمعہ کے روز مسجد میں دیکھو
کہ ہر صف میں ہیں کتنے سائل خراماں

خطیب اور واعظ کو ہوتی ہے دقت
مچاتے ہیں جب شور پھیلا کے داماں

نہیں ان سے خالی گلی اور کوچے
نہیں ان سے محفوظ بازار و دکاں

نہیں کوئی ہنگامۂ شادی و غم
نہ ہو جس میں جوش و خروشِ گدایاں

ترقی پہ ہے مفت خوری کا پیشہ
گدائی کا سیلاب ہے رو بطغیاں

انہیں کھو دیا دین و دنیا سے تم نے
ہزار آفریں ہے کیا خوب احساں

نہیں جورِ دشمن کی حاجت کچھ اسکو
کہ جس قوم کے ہوں شفیق ایسے ناداں

غلط بخشیوں نے بنایا اپاہج
ہے اوروں کے کندھے پہ اک نعشِ بیجاں

مُبرّات و خیرات ہرگز نہیں یہ
بہ فتوائے عقل و بہ فتوائے قرآں

لہو قوم کا جو پیئے جونک بن کر
تو امداد اُس کی ہے بدتر ز عصیاں

جو دی ایک کوڑی بھی نا مستحق کو
چبھویا غریبوں کے پہلو میں پیکاں

حقیقت میں محتاجِ امداد ہیں جو
نہیں اُنکے احوال کا کوئی پرساں

کوئی آستیں اُنکے آنسو نہ پونچھے
ہے اشکِ مصائب سے نم جن کی مژگاں

دلوں ہی میں کھاتے ہیں جوشِ آہ و زاری
لبوں سے نکلتی نہیں آہ و افغاں

خوراک اور پوشاک اُنکی نہ پوچھو   دمِ آب حاصل نہ پیدا لبِ ناں
نہ گرمی میں چادر نہ جاڑے میں کمبل   نہ ثابت ہے دامن نہ سالم گریباں
نہ تنکے نہ پتے کہ تاپیں جلا کر   نہیں مہرباں کوئی جز مہرِ تاباں
کرے کون یاد اُن کو وقتِ ضیافت   کرے کون اُن کی جڑاول کا ساماں
وہ گرمی میں ہیں مثلِ ماہی تڑپتے   وہ جاڑے میں ہیں صورتِ بید لرزاں
مُعاون ہیں جو پیشہ ور بھک منگوں کے   سمجھتے نہیں یہ بزرگ اُن کو انساں
نہیں غم کسی کو مصیبت زدوں کا   نہ فکرِ ایامیٰ نہ ذکرِ یتیماں
عیالِ خدا کی مدارات ایسی   اور اُس پر یہ دعویٰ کہ ہم ہیں مُسلماں
پھر ان سے بھی اک فرقہ محتاج تر ہے   کہ حاجات ہیں جسکی از بس نمایاں
وہ علمی فلاکت کے مارے ہوئے ہیں   جہالت نے کاٹی ہے اُنکی رگِ جاں
حمیت بہت مضمحل ہو گئی ہے   شرافت بھی ہے اب کوئی دن کی مہماں
بنا کر رہے گی زمانہ کی گردش   اُنھیں خلعتِ آدمیت سے عُریاں
جو اُن کی طرف سے رہی قوم غافل   تو کل قوم کہلائے گی ننگِ حیواں
نہ ہوگا کوئی چارۂ کار ہرگز   جو بعد از خرابی ہوئے بھی پشیماں
کبھی وقتِ فرصت میں سوچا بھی حضرت!   کچھ اس دردِ جانکاہِ قومی کا درماں
یہ بچے جو پھرتے ہیں آوارہ جاہل   گھسٹتے ہیں کانٹوں میں گلہائے خنداں
یہی بننے والے ہیں ارکانِ قومی   جو ارکان بودے تو ایوان ویراں
انہیں پر ہے موقوف اعزازِ ملت   بناؤ انہیں جلد زیبِ دبستاں
ہنر ہائے کسبِ معیشت سکھاؤ   کہ انکو ستائیں نہ سگ اور درباں
جہاں تک بنے اہلِ تقویٰ بناؤ   کہ تقویٰ ہے بیعانۂ باغِ رضواں
کرو ان کی شائستگی پر توجہ   کہ اِن سنگریزوں میں ہیں لعل پنہاں

اگر بچے معنی میں ہوں جنس اُن کو
تو بن جائیں یہ غیرتِ دُرّ و مرجاں

جو کوشش کرو تو انہیں میں سے پیدا
ابوالفضل و فیضی ہوں اور خانِ خاناں

کرو تربیت تو انہیں میں سے نکلیں
فلاطونِ عہد اور بقراطِ دوراں

یہی شافعی ہوں یہی بو حنیفہ
سکھاؤ اگر سرِّ احکامِ قرآں

ختم صبغۃ اللہ گر ہو میسّر
تو بن جائیں یہ پیرِ بسطام و خرقاں

جو ہوں اِن کے اعمال و اقوال راسخ
تو دُنیا میں کہلائیں یہ مردِ میداں

جو کسبِ معیشت سے کورا ہی رکھا
تو فقر اور فاقے سے ہونگے پریشاں

گر اوباش و بدراہ اِن کو بنایا
تو بنجائیں گے رونقِ کنجِ زنداں

بناؤ گے جو چیز بنجائیں گے یہ
فرشتہ بناؤ انہیں خواہ شیطاں

نہ کی ہم نے افسوس اُس وقت پروا
کہ تعلیم و تدریس تھی سخت ارزاں

ہمارے لئے برقِ خرمن بنا وہ
جو اوروں کے کھیتوں میں تھا ابرِ نیساں

ہماری ہی غفلت کا ہے یہ نتیجہ
نہیں کچھ خطائے فلاں اور بہماں

تغافل سے ہے اب باعثِ شرم و غیرت
تساہل سے ہے اب موجبِ ننگ و خذلاں

گیا دورِ پنجاہ سالہ مگر ہم
انہیں مخمصوں میں ہیں غلطان و پیچاں

گرفتارِ جہلِ مرکب ہیں یعنی
نہ عالم نہ جاہل نہ شہری نہ دہقاں

زمانہ بہت رائیگاں ہم نے کھویا
نہیں حاصلِ وقت جز یاس و حرماں

خلف سرخرو ہوں تو منہ لیکے بولیں
سلف ہی کے ہیں کارنامو پہ نازاں

کسی کو ہو دعویٰ تو آکر بتائے
کیا کونسا ہم نے کارِ نمایاں

فتوحاتِ علمی میں کچھ نام پایا؟
کیا تازہ خطہ کوئی زیرِ فرماں

کیا کوئی ایجاد ایسا سفینہ؟
کہ اڑتا ہو مانندِ تختِ سلیماں

جو ہوتی ضرورت تو ایجاد کرتے
مثل ہے "ضرورت ہے ایجاد کی ماں"

صناعت میں ترقی ہیں سوداگری میں — کیا ہو جو کچھ بھی تو بولو! مگر ہاں
ضرورت میں داخل ہے ناول نگاری — ہے ناول نگاری پہ شیدا سخنداں
ہوئے خواب بس چند لکھے فسانے — نہ وہ نجد و ناقہ نہ خارِ مغیلاں
نہ زنبیلِ عیار و لوحِ طلسمی — نہ دیوانِ قاف اور نہ اندر کی پریاں
مگر ناولوں میں بہ تقلیدِ یورپ — پرانا مرض ہے بہ تبدیلِ عنواں
بہا پھوٹ کر دوسری سمت پھوڑا — وہی خلطِ فاسد ہے مائل بہ سیلاں
ہمارے یہ قومی رسالے تو دیکھو — کھلاتے ہیں کیا گل خیاباں خیاباں
ہماری غذا ہیں یہ ماہانہ پرچے — تغزل کا تیار ہے خوانِ الواں
جوانانِ نوخاستہ بن گئے ہیں — ہزاروں غزل گو ہزاروں غزلخواں
جو واجد علی شاہ کے دور میں تھیں — ہیں غزلوں میں اب بھی وہی تنگ گلیاں
قتیلِ دہان و کمر ہیں ہزاروں — تو لاکھوں ہیں وارفتہ چشمِ فتاں
چراغِ خرد گل ہے پر اپنے تن کو — بناتے ہیں داغوں سے سرو چراغاں
پڑی گھر میں ہنڈیا تو پکتی ہے پھیکی — لبِ زخمِ دل پر ہے شورِ نمکداں
پہر دن چڑھے آپ اٹھتے ہیں سو کر — مگر صبحِ محشر ہے چاکِ گریباں
نہ سیکھا حساب اور نہ فنِ مساحت — رہے ناپتے طولِ شبہائے ہجراں
زمانہ میں ہیں پیش ملکی مسائل — کہ نظم و سیاست کا ہے دورِ دوراں
ہماری ہے یہ نظم اور یہ سیاست — "کہ دُرِ عدن آب ہے پیشِ دنداں
لبِ لعل کو دیکھ لے خواب میں گر — تو بہ جائے خوں ہو کے لعلِ بدخشاں"
کشش اور کوشش کا ہے وقت لیکن — یہاں پیش ہیں یہ خرافات و ہذیاں
اڑی پھر رہی ہیں تجارت کی ریلیں — ہے صنعت کی جانب بھی لوگوں کا رجحاں
ہمیں بھی تو ہیں یاد لفظی صنائع — ہمیں بھی تو ازبر ہے سودا کا دیواں

نہیں آنز سیال تو کیا غم! کہ ہم ہیں — سخن کی قلمرو کے فغفور و خاقاں
دعا ہے کہ دنیا ہو اور شاعری ہو! — چہکتے رہیں بلبلانِ خوش الحاں
نہیں کوئی دنیا و عقبیٰ کا دھندا — بس اب رہ گئے ہیں ہمارے یہ ارماں
اگر کوئی شاعر کا پوچھے مرادِف — بلا خوفِ تردید کہہ دو "مسلماں"
خبر لی نہ اب بھی تو بس قوم ڈوبی — کہ بڑھتا ہی جاتا ہے ہر لمحہ طوفاں
نظامِ تمدن کا صحرائے اعظم — رموزِ سیاست کا دریائے عماں
ہمیں پار کرنا ہے لیکن کریں کیا! — نہ کشتی نہ لنگر نہ خضر ہے نہ پالاں
گئے قافلے سب مگر ہم کھڑے ہیں — کنارہ پہ انگشتِ حیرت بدنداں
زمانہ کے پُر زور بازو نے کی ہے — عَلَم انقلابات کی تیغ برّاں
نہیں روک سکتا کوئی وار اُس کا — نہ گودرز و رستم نہ سام و نریماں
نہ طغرل نہ سنجر نہ تیمور و بابر — نہ مصر و مراکو نہ ترکی نہ ایراں
سر و سینہ و دست و بازو بچا کر — نہ بچ جائے گا کوئی بے ساز و ساماں
حفاظت کا ساز اور سامان کیا ہے؟ — ہنر خود ہے اور ہے علم خفتاں
نہیں غیر فضل و ہنر کوئی مامن — حوادث کا جس وقت ہو تیر باراں
جو باقی حمیت کی کچھ بھی رمق ہے — تو شیخ اور سید مغل اور افغاں
امیر و غریب اور ادنیٰ و اعلیٰ — قلی اور تاجر گدا اور سلطاں
کسان اور مزدور عامی و عالم — جوان اور بڈھے رجال و نسواں
تقاضائے وقت اور ضرورت کو سمجھیں — بنیں ایک کے ایک انصار و اعواں
فروعی نزاعات کو محو کر دیں — بھلا دیں لب اب فرق ایمان و توراں
جو آپس میں ہوں تفرقے سب مٹا دیں — خصومت پہ اب کھینچ دیں خطِ بطلاں
کریں جلد ملّت کے تدبیر ایسی — کہ بچے بنیں رشکِ اشاں و اقراں

بہت اگلی قوموں کو دورِ زماں نے — بنایا ہے گلدستۂ طاقِ نسیاں
نہیں چھوڑتا اُنکی ہڈی نہ پسلی — جنھیں کوٹتا ہے زمانہ کا سنداں
جو اپنی مدد کی نہ ہم نے تو ڈر ہے — بنا دے نہ ہم کو بھی گردِ بیاباں
نہیں وقت وہ اب کہ بند آنکھ کرکر — کسی صومعہ میں رہو بن کے رہباں
اُٹھو قوم کی آبرو کو بچاؤ — نہ بنتے وہ ہرگز غلامِ غلاماں
حدودِ جہالت سے اسکو نکالو — کرو رہبری مثلِ موسئ عمراں
ہنر کی جہاں دیکھو تو آبیاری — جہاں علم کا تازہ ہو باغ و بستاں
وہیں ڈالدو قوم کے جاکے ڈیرے — چُنو علم و حکمت کے گل اور ریحاں
مگر یہ سمجھ لو کہ جینا ہے مشکل — نہ محکم ہوں گر زندگانی کے ارکاں
دماغ اور دل ہوں نہ تن میں سلامت — تو بیکار ہیں سب عصب اور شریاں
اسی طرح تعلیم قومی کا مرکز — اگر ہو نہ قومی ضرورت کے شایاں
تو ہیں سب ہمارے خیالاتِ باطل — ترقی کا سودا ہے خوابِ پریشاں
کرو درستی اپنی پہلے مکمل — اسی پر ہے موقوف کُل جبرِ نقصاں
بہم تربیت ہو دلی اور دماغی — رہیں ہمقدم علم ادیان و ابداں
اگر قوم کی زندگی چاہتے ہو — تو ہے ورزشی چشمۂ آبِ حیواں
اطبائے حاذق کی تجویز ہے یہ — گھٹے گا اسی سے مذلت کا یرقاں
تلافیِ مافات کا گُر یہی ہے — کمر باندھ لو اور بنو مردِ میداں
اُٹھا دو سمندِ عزیمت کی باگیں — بجا دو بس اب کوسِ ایثار و احساں
گرجنے لگے ابرِ جود و کرم کا — برسنے لگے دام و درہم کا باراں
چمکنے لگیں بجلیاں سیم و زر کی — اُبلنے لگے چشمۂ جیب و ہمیاں
خزینہ دفینہ نہیں ہے تو کیا غم — نہ ہونا نہ ہونا نہ ہونا ہراساں

زراہِ خلوص ایک کوڑی بھی دوگے
تو رکھے گی وہ قدر لعلِ بدخشاں

کرو جمع جو جو تو ہو جائیں سو سو
بنے قطرہ قطرہ سے دریائے عماں

ہزاروں سے بڑھکر ہو لاکھوں کی نوبت
ہو لاکھوں سے بڑھکر کروڑوں کی میزاں

جو ہمت کرو تم تو حامی خدا ہے
خدا کے سوا کون ہے میر ساماں

ہے اُمید واثق کہ سرمایہ کافی
خزانہ میں داخل ہو تا ماہِ شعباں

جو دریا دلی قوم سے نے کی تو فوراً
ہمارے امیر[۵۱] اور نواب[۵۲] اور خاں[۵۳]

کریں گے یہ کوشش کہ امپرسٹی کا
مُزیّن ہو طغرائے شاہی سے فرماں

بنفسِ نفیس آئیں شاہِ معظم
کریں حصنِ علمی کی مرصوص بنیاں

کرو جد و جہد اب خدا کے بھروسے
ہمارا تمہارا خدا ہے نگہباں

کمر بستہ ہو کر کرے کام بھی کچھ
سُنے جو کوئی یہ نوائے زمستاں

خیر مقدم شاہی

مژدہ باد اے گلشنِ دہلی خوشا تیری نصیب
تیرے حصہ میں بہارِ بے خزاں آنے کو ہے

جارج پنجم شاہِ انگلستان۔ شہنشاہِ زماں
قیصرِ ہندوستاں۔ ہندوستاں آنے کو ہے

وہ مہِ اکلیلِ دولت نیّرِ برجِ سخا
مہرِ اعزاز و شرف۔ باعزّ و شاں آنے کو ہے

وہ امیرِ ذی حشم۔ نیکو شیم۔ والا ہمم
وہ سکندر بخت۔ وہ دارا نشاں آنے کو ہے

---

[۵۱] امیر۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی بالقابہ ۱۲

[۵۲] نواب وقار الملک بہادر بالقابہ ۱۲

[۵۳] خاں۔ ہز ہائنس سر آغا خاں بالقابہ ۱۲

اوج رفعت پر ہے شانِ سروری جسکی بلند　　جھک رہے ہیں جسکے در پر آسماں آنے کو ہے
ہے عطا و جود سے جسکی زمانہ فیض یاب　　رشک حاتم وہ ہی فیاضِ زماں آنے کو ہے
جس کی چوکھٹ پر ہو سر جمشید کا وہ ذی وقار　　در پہ رستم سے ہیں جسکے پاسباں آنے کو ہے
جس کی ہے بزم مسرت غیرتِ بزمِ فلک　　جسکا نجم بخت ہے مہر زماں آنے کو ہے
جس کا ڈنکا بج رہا ہے خلق میں ہر چار سو　　جس سے لرزاں ہیں زمین و آسماں آنے کو ہے
شش جہت میں دھوم ہے جسکے وقار و جاہ کی　　وہ امیر ذی شرف ہندوستاں آنے کو ہے

کیوں نہ اے آفسر رعایا کو ہو بے حد خرمی
بخشنے والا ہر اک غم سے اماں آنے کو ہے

آفسر (میرٹھی)

خوابِ غفلت

تضمین

غضب ہے میدانِ دہر جو ترا اُٹھتا نہیں قدم ہے　　ابھی تو کرنیکو طے مسافر تجھے یہ کُل منزل عدم ہے
تو راہ میں سو گیا ہے کیسا یہ کیسی غفلت یہ کیا ستم ہے　　سحر کی آمد ہے تو نہ چونکا اسی کا رنج و غم و الم ہے
نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

شباب آیا گیا لڑکپن کبھی ہنسی کا وہ دل لگی تھی　　اور اپنے ان دنوں کو بھولکر بھی کبھی یادِ آخرت کی نہ کی تھی
ولیکن جس وقت آئی پیری اور ہے جسے رخصت ہوئی جوانی　　ہوا یہ معلوم ہمکو اُس دم کہ چار دن کی یہ چاندنی تھی
نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

نظر پڑا گلشنِ جہاں میں عجیب ہمکو یہ اک تماشا　　کہ شاخِ گُل پر ہر ایک بلبل نے اپنا آکر کیا بسیرا
ٹھکانا تھا یہ بھی ہالکے بستر جو ایک شب کو پڑ کر رہا　　ابھی نہ گزری تھی ایک ساعت چٹک کے غنچہ نے یہ سنایا

نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

ہے زندگانی کا کیا بھروسہ سرائے فانی میں کیا ٹھہرنا — عبث ہے دنیا سے دل لگانا کہ اسکا اچھا نہیں نتیجا
کرو بہت جلد اب طیاری کہ وقت رخصت قریب آیا — اور اب بجا چاہتا ہے دم بھر میں دیکھنا کوچ کا نقارا

نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

کٹی گناہوں میں عمر ساری اسی کی ہر دم ہے شرمساری — نہ باز آئے گا اب بھی اے دل تو پھر ہی انجام کار خواری
لبوں پہ جان آ گئی ہے اپنے اور اب ہے کچھ دیر دم شماری — بس اب کرو صدق دل سے توبہ اسی کو کہتے ہیں ہوشیاری

نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

یہ بحرِ دنیا میں کشتیٔ عمر کی ذرا دیکھئے روانی — کہاں لڑکپن کہاں جوانی یہ سب بنی ہے اب کہانی
یہاں کسی کو بقا نہیں ہے یہاں کی ہر ایک شے ہے فانی — اُٹھاؤ اب اس سرائے سے ڈیرا چراغ سحری ہے زندگانی

نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

اس عمر جانیکا اے عزیزو کسیکو صدمہ کسی کو غم ہے — پر اب بھی کچھ سوچتے نہیں ہیں ستم ہے یہ اور اک ستم ہے
ڈرو خدا سے کرو عبادت اگر تمہیں خواہش بہشت ہے — نہ بھولنا اے صحیح یہ مصرعہ تمہارا جبتک کہ دم میں دم ہے

نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

جعفر حسین۔ صحیح

ہولی

وہ بھی دن تھے کبھی تھی حورشمائل ہولی — تھے اداؤں پہ کبھی ہم ترے مائل ہولی
دشنۂ غم سے نہ تھے یوں کبھی بسمل ہولی — پہلے ایسی تو نہ تھی جان کی قاتل ہولی

کب بلا ہوتی تھی طاعون کی نازل ہولی

پہلے کب مے کے عوض خونِ جگر پیتے تھے — زخمِ دل سوزنِ افکار سے کب سیتے تھے

عیش و عشرت میں وہ ایام عجب بیتے تھے سچ ہے مر مر کے ترے واسطے ہم جیتے تھے
اور دیوانے سے تجھ پر سرِ محفل ہولی

جورِ گیتی سے ہے اب کشت زمانہ پامال خاک اُڑتی ہے جہاں زور سے اُڑتا تھا گلال
چھائی چہروں پہ ہے کچھ ایسی اُداسی امسال متوحش سے ہیں تپ دق کے مریضوں کی مثال
ایسی سینے پہ اڑی تھی نہ کبھی سِل ہولی

جشن اگلے سے کہاں ہولی کے دن تو نہیں مشغلے اب کہاں اگلے سے خوش اوقاتوں میں
دلربائی کے وہ انداز کہاں باتوں میں ولولے وہ کہاں یاروں کی ملاقاتوں میں
داغ فرقت کے ہیں ماتھے کے ترے تِن ہولی

رنگ کی ہوتی تھی بھرمار گلی کوچے میں سرخرو ہوتے تھے اغیار گلی کوچے میں
ایکجا ہوتے تھے سب یار گلی کوچے میں پھولوں کی ہوتی تھی بوچھار گلی کوچے میں
پستے تھے سنگِ ستم سے نہ کبھی دل ہولی

وائے برحال مصیبت زدگانِ طاعون کب تھا ہولی میں کبھی وہم و گمانِ طاعون
نخل تابوت بنے تیر و کمانِ طاعون ہند سے جلد مٹے کاش نشانِ طاعون
تا پھر آباد ہو اجڑی ہوئی محفل ہولی

ہولی ہولی نہ رہی چہروں کی رنگت باقی ہولی ہولی رہی اب نام کو شہرت باقی
دل میں کتنوں کے فقط رہ گئی حسرت باقی ہے مٹے حال پہ بھی تیری محبت باقی
رنج و راحت میں ترے ہم رہے شامل ہولی

نظم ہولی میں نہیں کچھ گل و گلزار کا رنگ نہ شفق کا نہ حسینوں ہی کے رخسار کا رنگ
دیکھکر شہر میں طاعونِ دل آزار کا رنگ اے گہر پھیکا ہے ابکی مرے اشعار کا رنگ
شکر ہے مل گئی قسمت سے بمشکل ہولی

گہر۔ لکھنوی

موت

اے موت شہر لاکھوں تو نے اُجاڑ ڈالے　　　نقشے جمے جمائے تو نے بگاڑ ڈالے
رستم سے مرد تو نے کتنے پچھاڑ ڈالے　　　سرسبز نخلِ ہستی تو نے اکھاڑ ڈالے
انساں نے گو جہاں کو تسخیر کر لیا ہے
لیکن وہ تو ہے جس سے انکا بھی دم فنا ہے

اے قہر کے فرشتے اے دیوتا غضب کے　　　تیرا جلال وہ ہے سر خم ہیں جس سے سب کے
اسفندیار و رستم چلتے ہیں تجھ سے دب کے　　　لرزاں پڑے جہاں میں ہلنے سے تیرے لب کے
روباہ کی طرح سے ڈرتے ہیں شیر تجھ سے
تھراتے ہیں جہاں کے سارے دلیر تجھ سے

بہمن ہو یا سکندر ارجن ہو یا یدھشٹر　　　یا بو علی سا طب میں ہو کوئی شخص ماہر
تنہا ہو یا ہوں لاکھوں تو جس جگہ ہو ظاہر　　　دم بھر اے ستمگر تو کر دے سب کو تر بتر
تو وہ ہے دم میں زہرا شیروں کا آب کر دے
حسنِ حسین تن کو نقشِ حباب کر دے

بچے سے ماں کو ظالم اک آن میں چھڑا دے　　　اور داغ تو پدر کو فرزند کو دکھا دے
بزمِ خوشی کو دم میں ماتم کدہ بنا دے　　　داغِ جگر سے گلشن سینے میں تو کھلا دے
ٹل جائے کوہ لیکن ٹوٹے نہ آن تیری
مظہر ہے قہر کی تو عالی ہے شان تیری

تو قہرِ ایزدی ہے تو ہے غضب مجسم　　　صورت سے تیری ظالم ڈرتا ہے سارا عالم
تجھ کو نہیں ہے فرصت مل بیٹھنے کی باہم　　　مخلوق کے لئے ہے تو تو قضائے مبرم

ہر دم ہے تاک میں تو او چھپ کے آنے والی
ہر لحظہ کام تیرا خلقت کی پائمالی

مانا کوئی جہاں میں بے یار و آشنا ہو　　یا کلفت و الم میں بے طور پھنس گیا ہو
یا جس کا مبتلا ہو وہ مائلِ جفا ہو　　یا کھو کے نقدِ عزت جینے سے بھی خفا ہو

اُسکے لیے نشانی رحمت کی ہو تو ہو تو
صیقل اُسی کے زنگِ کلفت کی ہو تو ہو تو

لیکن غضب ہے ظالم جب اُسکو تو چھڑائے　　صبر و قرار جس کے چھٹنے سے چھوٹ جائے
سینے میں زخم کردے آنکھوں سے خوں رلائے　　دل پارہ پارہ کردے اور تن بدن گھلائے

کھٹکے دل و جگر میں پہلو کا خار ہو کر
سینے کو پھونک دے تو غم کا شرار ہو کر

آغوش ماں کی کردے لختِ جگر سے خالی　　یا کر کے زن کو بیوہ تو کردے سوگ والی
یا کاٹ دے چمن کی پھولی پھلی وہ ڈالی　　بس نخلِ خانداں کی ہو جس سے پائمالی

دے صدمہ جدائی یارانِ آشنا کا
دل پاش پاش کردے یارانِ مبتلا کا

اے فطرت صحیحہ میں تیرا راز سمجھا　　رمزِ حدوث و امکاں اے عشوہ ساز سمجھا
انداز تیرا پایا ہاں تیرا راز سمجھا　　تیرے ستم کا مطلب اے حیلہ باز سمجھا

لاریب تو ہے سنگِ طرحِ نظامِ دنیا
ہے اک جہان مردہ تو ہے دمِ مسیحا

تازہ ہے تجھ سے فطرت ہر چیز نو بہ نو ہے　　پختہ ہے تیرے دم سے گندم ہو یا کہ جو ہے
تو کاٹتی ہے اُسکو جو قابلِ درو ہے　　گر تو نہو تو دم میں ہر چیز تو بہ تو ہے

خلقت کا مقتضا ہے نقلِ مکام کرنا ہو

دم بھر قیام کرنا اور پھر سلام کرنا ہے

ہے انتقالِ حالت زیبِ بنائے ہستی آتش سے کوئی پوچھے لطفِ فنائے ہستی
صیقل ہے زنگِ دل کی یہ ابتلائے ہستی ہے نقش بے ثباتی رونق فزائے ہستی

ہر ذرہ مضطرب ہے اس وادیٔ محن میں
مرغِ درونِ بیضہ ہر مُردہ ہے کفن میں

ہو آگ یا کہ مٹی پانی ہو یا ہوا ہو ذرّہ ہو یا کہ قطرہ شبنم ہو یا صبا ہو
گُل ہو کسی چمن کا یا برگِ نخل کا ہو ہو ابر آسماں کا یا چشمہ سرا ہو

ہے اختلافِ کیفی شیوہ ہر ایک شے کا
رہتا نہیں سحر تک باقی سرور مے کا

ہے وقت خاتمہ کی کیا بحث لا کے ڈالی کوتاہ بیں نے اچھی کٹ حجتی نکالی
دیکھو چمن میں جا کر کیا کر رہا ہے مالی توڑی کہیں سے کونپل پتی کہیں نکالی

ہے یہ نظامِ عالم اس میں زیاں نہ سمجھو
نقص ہے سمجھ پہ ختم اُس کو گر امتحاں نہ سمجھو

بنتے ہیں روز ڈھانچے مٹتے ہیں روز نقشے کی غور لاکھ سب نے اس راز کو نہ سمجھے
قاصر ہیں حکمتی سب ناقص ہیں سب معقول ہوں اے سروشِ غیبی تیری صدا کے صدقے

نقش و نگارِ عالم سب بے گماں ہے فانی
باقی ہے ذات اُس کی اور سب جہاں ہے فانی

اختر الہ آبادی

نالۂ بیوگان

جہاں سے اُو مرے پروردگار واویلا
مرا سہاگ گیا سوگوار واویلا

یہ گورا گورا مصفّا بدن یہ رنڈسالا
لہو میں ڈوبا ہوا تار تار واویلا

یہ سن یہ سال یہ اُٹھتی ہوئی جوانی حیف
یہ حُسن اور یہ غم انتظار واویلا

اکیلی چھوڑ کے پردیس چلدیئے پیتم
نہ ایک دن بھی کیا مجکو پیار واویلا

یہ حُسن اور یہ غم جاں گزا دریغ دریغ
یہ سن یہ سال یہ آہ و بُکا دریغ دریغ

جگر میں دردِ تمنا۔ تپ دروں دل میں
زباں پہ نالۂ شورش فزا دریغ دریغ

شبِ فراق و غمِ انتظار واویلا!
ہجومِ یاس و دلِ مبتلا دریغ دریغ

یہ سونی سیج یہ راتیں ڈراونی ہر ہر!!
یہ کالی کالی فلک پر گھٹا دریغ دریغ

یہ آنسوؤں کی جھڑی اور یہ مینھ کی جھالر
یہ جوشِ موسمِ گل۔ یہ فضا دریغ دریغ

یہ اُودی اُودی گھٹائیں سیہ ہلکی ہلکی شفق
یہ بھینی بھینی چمن کی ہوا دریغ دریغ

اُدہر زباں پہ پپیہے کی "پی کہاں" کی صدا
میں پی کے غم میں اِدہر مبتلا دریغ دریغ

ہر اک کلی نے نکالا ہے رنگ روپ نیا
ہر ایک گل کی ہے دلکش ادا دریغ دریغ

پیا بغیر مگر یہ بہار کا عالم
مری نظر میں ہے وحشت فزا دریغ دریغ

میں وہ نہیں کہ مرے دل کی کلی صبا سے کھلے
جو گُل ہو داغ۔ وہ کیا جنبشِ ہوا سے کھلے

نسیمِ صبح نہ کر مجھ سے شوخیاں ہیہات
دماغ خندۂ گُل کا مجھے کہاں ہیہات

وہ روزگار کہاں۔ وہ بہارِ حسن کہاں
نہالِ قد پہ ہے چھائی ہوئی خزاں ہیہات

کہاں ہیں وہ مرے ہاتھوں کے خوشنما کنگھن — کدہر گئیں مرے کانوں کی بجلیاں ہیہات
کہاں ہے آہ! وہ چھاگل کی گھنگرو کی صدا — کدہر ہیں وہ مرے سونے کی بدھیاں ہیہات
مرے گلے کا وہ زیور کدہر گیا ہے ہے! — وہ دہگدگی ہے نہ منت کی ہنسلیاں ہیہات
کدہر ہیں رنگ برنگے وہ لہریے افسوس! — کہاں سہاگ کی وہ سرخ چندریاں ہیہات
شباب کی وہ امنگیں وہ جھولنا جھولا — جھڑی وہ مینھ کی۔ گانے کا وہ سماں ہیہات
کہاں ہے آہ وہ برسات سماں دلکش — کدہر گئیں مری ہمسن سہیلیاں ہیہات
سہاگ بھاگ سے لٹنا نہ مجھ غریب کو تھا — اوجاڑتا سبے مجھے کیونکر نہ آسماں ہیہات

فلک نے حال کیا خستہ و خراب مرا
کہ بیکسی کی ہے تصویر اب شباب مرا

بالک رام شاد

بخل و اسراف

کہا بخل سے یہ تبذر نے اک دن — کہ اے دشمن راحت و تیرہ باطن
ملال و ملال و صعوبت کے بانی — بہار جہاں میں خزاں کی نشانی
تردد سے بیزار عشرت پہ معترض — اصول جہاں سے جدا تیرا قانون
بنادے تو دولت سی شے کو بھی پتھر — امیروں کو کردے غریبوں سے بدتر
نہ کھانا نہ پینا صدا ہے یہ تیری — زمیں دوز ہو زر دعا ہے یہ تیری
کوئی گرسنہ بھوک سے جان بلب ہو — کوئی بینوا صرف رنج و تعب ہو

شتا میں برہنہ کوئی خستہ تن ہو — دیا کوئی مردہ پڑا بے کفن ہو
توقع نہیں تجھ سے جو وام دی تو — اگر دے بھی ظالم تو دشنام دے تو
جو ہیں تیرے محکوم سب خوار و خستہ — ترے جتنے پیرو ہیں از ہم گسستہ
سُنا بخل نے جب خطاب تشدد — کیا اس طرح رفع اپنا تکدر
کہ تو کوتہ اندیش ہے کم نظر ہے — فوائد کی میرے تجھے کیا خبر ہے
میں عسرت کی شیدا نہ راحت کی دشمن — جہاں کی بلاؤں کا ہے تو ہی مخزن
نہ پیرو مرا کوئی خستہ جہاں میں — جو خستہ بظاہر تو بستہ جہاں میں
مبذر ہی ہیں وہ کہ دو دن تو بانکے — ازآں بعد چیتھڑوں سے ہیں تن کو ڈھانکے
فلاکت جسے کہتے ام الجرائم — وہ ام الجرائم ترے دم سے قائم
نصیحت ہے میری کہ دُنیا ہے فانی — ہے بہتر جو کچھ چھوڑ جاؤ نشانی
جہاں تک ہو ممکن کفایت دکھاؤ — بہت اشتہا ہو تو تھوڑا سا کھاؤ
طریق بہائم ہے عشرت پسندی — صفت اولیا کی ہے محنت پسندی
لڑو نفس کافر سے عزت ہے اسمیں — کرو خوب محنت کہ راحت ہے اسمیں
دو روزہ تنعم ہے مخزن زیاں کا — ذرا پاس تو کیجیے پس ماندگاں کا
اثاثہ اگر ہے تو سوئم بھی ہوگا — مصلی بھی آئیں گے چہلم بھی ہوگا
اُڑا دو گے دولت تو ہے یہ نتیجہ — کہ ہوگا مرے پیچھے دو جا نہ تیجا
کہاں سے کفن آئے بیوی ہے ننگیں — جگہ فاتحہ کی ہے میتو نکی نفریں
کمایا تو کھا پی عدم کو سدھارے — مصیبت یہ چھوڑی سر پر ہمارے
تری پیروی میں بتا کیا دھرا ہے — گرفتار غم تیرا ہر مبتلا ہے
تو وہ ہے کہ ہے رنگ میں تیرے سرخی — مگر ذائقے میں ہے تلخی و تندی
وہ شربت ہے تو جو سراپا ضرر ہے — میں ہوں تلخ معجون پہ اچھا اثر ہے

جہاں تو ہو سب لوگ شیون کناں ہوں
جہاں میں ہوں لوگوں کے کیسے گراں ہوں

جو ہو پاس پیسہ تو حضرت فدا ہیں
جو کیسہ ہو خالی تو بس پھر ہوا ہیں

جو ہو بزم عشرت تو گاؤ بجاؤ
جو ہو شام غربت تو بس بھاگ جاؤ

مخالف نے کی اُنکی اس طرح حجت
کہ تیرہ اطوار مذموم خصلت

یہ احسن کو قبح کا جامہ پہنانا
یہ صالح کو طالح بنا کر دکھانا ہو

زباں پر بھلائی تو دل میں بُرائی
یہ کیا جو فروشی و گندم نمائی

مرے روبرو اور یہ گفتار تیری
مقابل میں شہ کے گدا کی دلیری

کہاں اتنی ہمت لڑے نفس سے تو
عمل حسب حکم شیطاں پہ اُلٹا کرے تو

جہادِ کبیرہ کا کر کے بہانا
خباثت کا ہے تجھکو جوہر دکھانا

مثل شیخ جی کی مجھے یاد آئی
کہ جا کر خرابات میں مے اُڑائی

تغنم ترنم میں تھے محوِ عشرت
نہ چھوڑی زمانے کی کوئی بھی بدعت

جو پوچھا کسی نے یہ جنجال کیا ہے
اجی شیخ جی آپ کا حال کیا ہے

تو بولے کہ تھی نفس کو ان سے نفرت
ہوئی اسلئے لازم ان سب سے رغبت

کہے نفس تم سے کہ خیرات کیجے
تو لازم ہے سائل کو دشنام دیجے

طبیعت کی خواہش ہو گر کعبہ جانا
تو تم دیر میں جاکے سرنا بجانا

سبھے دل جو تم سے پڑھو پنجگانہ
تو بھولے سے تم سوئے مسجد نہ جانا

نہ تفسیر معکوس کر مرد مجنوں
ہے استفتا قلبک کا موجود مضموں

کفایت نے کب بھوکوں مرنا بتایا
یہ کیا دودھ میں تونے پانی ملایا

سُنے خوب معنی کلو و اشربو کے
کہ کم کھاؤ روٹی بہت ہو جو بھوکے

نہ خیرات دینا نہ اکرام کرنا
پس اندوخت اندوخت پر تجھکو مرنا

یہ مرنے کی اچھی سُنائی سُنانی
کہی خوب پس ماندگاں کی کہانی

پسِ مرگ گالی ہو یا فاتحہ ہو — کوئی جیتے جی کیوں کسی کا بُرا ہو
خسیسوں سے نالاں ہے اولاد اُنکی — یہی ہے شب و روز فریاد اُن کی
کر یا رو کرو کچھ ادا حقِ یاری — یہی دوستی ہے ہماری تمہاری
طریقہ بتاؤ کہ باوا سدھاریں تو
تو پتھر کے نیچے سے تھیلی اُبھاریں

عبداللہ خاں خورجوی

ہم طرح کلام

حضرت غالبؒ

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اُتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے — جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنی ہی سی سہی — ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوے دوست
مشغول حق بندگی بو تراب میں

حضرت شیفتہ

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں — گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اسمیں محو اور وہ سب سے علاحدہ — آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں
معنیٰ کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول — کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں
سنے بادِ نوبہار ہی اب سنے شمیم گل — ہمکو بہت ثبات رہا اضطراب میں
حیرت سے ہے کیا نقاب میں گر رنگ نگ کے — نیرنگ جلوہ سے ہی تنوع نقاب میں
فرصت کہاں کہ اور بھی کچھ کام کیجئے — بازی میں جبہ صرف ہے شنبہ شراب میں
ذات وصفات میں بھی یہی ربط سمجھئے — جو آفتاب ور روشنی آفتاب میں
قطع نظر جو نقش ونگار جہاں سے ہو — دیکھو وہ آنکھ سے جو نہ دیکھا ہو خواب میں
طوبیٰ لہم جو کشتہ عشق عفیف ہیں — کیا شبہ اُس گروہ کے حسن مآب میں
مرنے کے بعد بھی کہیں شاید پتہ لگے — کھویا ہے ہمنے آپ کو عہدِ شباب میں

پھر بھی ہوا ہے مطرب دمے ہمکو شیفتہ
مدت گذر گئی ورع واجتناب میں

حضرت زکی

یہ شرمگیں نگہ یہ تبسم نقاب میں — کیا ہیجا بیاں ہیں تمہارے حجاب میں
صورت نہیں ثبات کی دہرِ خراب میں — ہستی ہے ایک نقش طلسم حباب میں
وہ نالہ ہاے درد سے چونک اُٹھی خواب میں — یہ اور اضطراب ہوا اضطراب میں

رشکِ عدو سے بزم میں جلتے تھے متصل
کچھ اگلی صحبتوں کا مزا ہے عذاب میں

اسکی طلب میں ہر نفس آغازِ شوق ہے
رکھتا ہے کون عمرِ گزشتہ حساب میں

جورِ فلک ستم زدۂ ناز پر کہاں
شانِ ادائے دوست ہے ہر انقلاب میں

ہر سو ہے میرے آتشِ داغِ جگر محیط
گویا سکون ہے کرۂ آفتاب میں

ہر بات میں حوالہ ہے ہر بحث میں سند
ناصح کو مانتے ہیں ہم اہلِ کتاب میں

ٹھہرا خمارِ بےخبری ذوقِ بےخودی
نشہ ہے چشمِ یار کا جامِ شراب میں

کہتے ہی مجکو آئی شبِ غم عدو کی موت
ہوتی ہے مستجاب دعا اضطراب میں

کیوں آؤں ہوش میں کہ ہو پھر حسرتِ فراغ
ذوقِ خیالِ یار سے ہوں محوِ خواب میں

اقرارِ بندگی سے نہیں بندہ پروری
مدِ نظر یہ تھا کہ سنیں ہاں جواب میں

لکھتے ہو اس قدر غزل مختصر ترکی
آزردہ ہونگے اہلِ مذاق انتخاب میں

حضرت اسمٰعیل

آخر یہ حسن چھپ نہ سکیگا نقاب میں
شرماؤ گے تمہیں نہ کرو ضد حجاب میں

پامال شوخیوں میں کرو تم زمین کو
ڈالو فلک پہ زلزلہ میں اضطراب میں

روشن ہے آفتاب کی نسبت چراغ سے
نسبت وہی ہے آپ میں اور آفتاب میں

دل کی گرہ نہ وا ہوئی در وا شبِ وصال
گذری تمام بست و کشادِ نقاب میں

رنجِ عتابِ زاہدِ مسکیں کو مفت ہے
یاں اتقا میں سعی وہاں اجتناب میں

جاں میں نے نامہ بر کے قدم پر نثار کی
تھا پیش پا فتادہ یہ مضموں جواب میں

ہنس ہنس کے برق کو تو ذرا کیجیے بیقرار
رو رو کے ابر کو میں ڈبوتا ہوں آب میں

واعظ سے ڈر گئے کہ نہ شامل ہوئے ہم آج
ترتیبِ محفلِ مے و چنگ و رباب میں

ساقی ادہر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں　　کچھ مستیِ نگہ بھی ملا دے شراب میں
داخل نہ دشمنوں میں نہ احباب میں شمار　　یہ فضول ہوں میں تمہارے حساب میں
کس کس کی جور اُٹھائیں گے آگے کو دیکھئے　　دشمن ہے چرخِ پیر زمانِ شباب میں

پیغامبر اشارۂ ابرو سے مر گیا
پھر جی اُٹھے گا لب بھی ملا دو جواب میں

تازہ کلام

ہمارے ہمعصر رسالہ کمال دہلی کے گزشتہ نمبر میں ایک غزل حضرت منشی سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی کی طبع ہوئی ہے اُسکے عنوان پر جو نوٹ ایڈیٹر صاحب رسالہ موصوف نے درج فرمایا ہے اُسکا منشا محتاج بیان نہیں مختصر یہ کہ یہ اُن کے ایماء کی تعمیل ہے کہ اُس غزل کے ہر قافیہ پر التزام ہمنے دہلی کے ایک یادگار خاندان کے ممبر جناب نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائل دہلوی سے غزل کہوا کر پیش کی ہے اور وہ وہ ذات ہے جس سے شاعری کی دُنیا بخوبی واقف ہے یہ ظاہر ہے کہ باعتبار مذاق سخن یہ دونوں ذاتیں ایسی ہیں کہ اگر اُن کے کلاموں کو ملا کر پبلک میں پیش کیا جائے تو نقادانِ سخن اور اس مذاق کے اہلِ طبائع کو انکے جدا کرنے میں ایک سخت دشواری کا سامنا ضرور ہوگا اسلئے ہم یہ رائے نہیں دیسکتے کہ ان دونوں غزلوں میں ۱۹ کونسی غزل ہے اور ۲۰ کونسی مختصر یہ کہ ایڈیٹر صاحب کمال کو اپنا وعدہ وفا کرنا چاہئے کہ مصنف کے کتب خانہ کیلئے ایک نسخہ دیوان ہمارے دفتر کے ذریعہ سے بھیجدیں اور اپنے رسالہ کو ایک سال

تک اُنکے نام بلا توقع وصول قیمت جاری رکھیں۔ آیندہ اسکی احتیاط رکھنی چاہیے کہ ایسے نوٹوں سے اہل دہلی کے کلاموں کو پبلک میں نہ پیش کریں ورنہ یا نہ معلوم کیا خیال کرے گی۔ یہ دوسری غلطی ایڈیٹر صاحب سے ہوئی ہے ہمیں یہ بات خاص طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ مصنف صاحب کی جانب سے روکا بھی گیا تھا کہ اُنکا کلام اس نوٹ سے طبع نکیا جاوے لیکن اڈیٹر صاحب نے اسپر اعتنا کرنی اپنے ارادہ کا خون کرنا تصور فرما کر کچھ خیال نہ فرمایا بالآخر ہمیں یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا کہ مندرجہ ذیل غزل حسب درخواست قافیہ بقافیہ ہے بلکہ مقطع مزید برآں امید ہے کہ اڈیٹر صاحب کمال ہمارے رسالہ کی غزل کو اپنی مہربانیوں سے اپنے کسی نمبر میں نقل و طبع کرنے کی تکلیف نہ گوارا فرمائیں ورنہ ہمیں شکایت ہوگی جب ہم خاص طور پر انکو اسکے نقل و طبع کرنے سے روکتے ہیں تو ساتھ ہی یہ یقین بھی کرتے ہیں کہ یہ مدعائے خاص ہمارا فاضل اڈیٹر موصوف نظر انداز نہ کرینگے۔ اڈیٹر

بتوں کے سینے پتھر ہیں جگر فولاد کے ٹکڑے
ملو لینے تو ہوتے ہیں دلِ ناشاد کے ٹکڑے

تعجب ہے کہ اُسکے کان تک پہنچا نہیں کوئی
ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں مری فریاد کے ٹکڑے

بس اب مشقِ ستم تو ہو چکی بیداد گر دیدے
ترے کس کام آئیں گے دلِ ناشاد کے ٹکڑے

نہ جانے دونگا جز بھی رائیگاں میں اپنی کلفت کا
پرو لونگا فغاں کے تار میں فریاد کے ٹکڑے

تری تصویر دل میں ہے سبب حسنِ تصور نے
اُڑا رکھے ہیں کلکِ مانی و بہزاد کے ٹکڑے

تم اپنے ابروئے پر خم کو آخر کیا سمجھتے ہو
یہ چھریاں ہیں یہ خنجر ہیں یہ ہیں فولاد کے ٹکڑے

مجھے دیوانہ جو کہتے ہیں وہ ہیں خود ہی دیوانے
جنا کرتا ہوں سنکے یا دلِ ناشاد کے ٹکڑے

دلیلِ نامرادی ہیں۔ برائے سخت جانی ہیں
گلے میں کیوں نہ باندھوں خنجرِ فولاد کے ٹکڑے

وہ مجھ کر ترک کر دینگے جفا و جور بیجا خود
اُڑے نالوں سے جب چرخِ ستم ایجاد کے ٹکڑے

نہ پھینک ان کو محبت کا گر خدا کا خوف لازم ہے
نہ آئیں پانوں کے نیچے دلِ ناشاد کی ٹکڑی

اگر یہ جان لیتا روزِ محشر داد چاہیں گے
تو قاتل پہلے کر دیتا لبِ فریاد کے ٹکڑے

کسی دن برق بنتے نالۂ بلبل کھا دیں گے
پڑے پائیں گے زیرِ آشیاں صیاد کی ٹکڑی

حساب ان کا تمھیں روزِ جزا دینا ہے سمجھو بھی
حفاظت سے ذرا رکھنا دلِ ناشاد کی ٹکڑی

تہیہ تھا کہیں بچ دیں یہیں کچھ مانگ کھائیں گے
مگر قسمت میں سائل تھی جہان آباد کی ٹکڑی

خلیق - منشی عبدالخالق صاحب دہلوی تلمیذ جناب ابو العظم نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائل دہلوی

ہم دل سے قدرداں تھے دل قدرداں ہمارا
اب اُنکے مخبروں میں ہے رازداں ہمارا

گھونٹے ہوئے ہے دم کو ضبطِ فغاں ہمارا
سُلگا رہا ہے دل کو سوزِ نہاں ہمارا

احوال جب کہے تو قاصد وہاں ہمارا
حسنِ بیاں ہو تیرا لطفِ زباں ہمارا

اللہ تیرے دم کو ہر دم رکھے سلامت
ہے تجھ سے بول بالا اے تو فغاں ہمارا

اک غیرتِ پری پر مر کر ہوئے سلیماں
تابوت بن گیا ہے تختِ رواں ہمارا

الفت میں گیسوؤں کی ہوش و حواس کھو کر
اک شب میں لٹ گیا ہے سب کارواں ہمارا

یاد آئیں جب وفائیں تربت سے آ کے لپٹے
کب مہرباں ہوا ہے نامہرباں ہمارا

دل جس طرح لیا ہے اس جان کو بھی لے لے
اتنا تو مان ظالم کہنا اے جاں ہمارا

حیلہ منانے کا ہو لپٹا نہ لیں گلے سے
یوں روٹھتا نہیں ہے وہ بدگماں ہمارا

آہِ رسا سے تیرے دم میں دُھوئیں اُڑا دیں
چلتا ہوا یہ جادو ہے آسماں ہمارا

اپنا سا گھر سمجھ کر بیٹھا ہے تیر دل میں
ہے بے تکلف ایسا یہ مہماں ہمارا

مٹی نہ قبر میں دو عاشق کی خاک اُڑا دو
رکھو نہ نام کو بھی نام و نشاں ہمارا

ہم سے خلیق سیکھیں اُردو زباں کے شایق
ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

فقط

دھوپ چھاؤں

ہندوستانی یونیورسٹیان | مسلم یونیورسٹی کی بابت ہم اپنے پچھلے نمبر میں ذکر کر چکے ہین اور اُمید ہے کہ یہ یونیورسٹی بہت جلد قائم ہو جائیگی۔ کیونکہ مسلمانون نے اِس معاملے میں قابل تعریف جوش و یگانگت سے کام لیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی سکیم پبلک مین پیش کرنے سے پہلے پنڈت مدن موہن مالوی نے ہندو یونیورسٹی قائم کرنی چاہی تہی۔ کیونکہ ہمکو اچھی طرح یاد ہے کہ جس سال کانگرس کا اجلاس بنارس مین ہوا تہا تو ہندو یونیورسٹی کی چھپی ہوئی سکیم کانگرس کیمپ مین تقسیم کیگئی تھی۔ مگر نہ معلوم کیون یہ معاملہ سرد پڑ گیا کیونکہ اسکے بعد ہندو یونیورسٹی کا کچھہ ذکر سننے مین نہین آیا۔ اِس کے بعد مسز اینی بسنٹ نے ایک ایسی ہندوستانی یونیورسٹی کے لئے کوشش شروع کی جو نہ ہندو ہو نہ مسلمان بلکہ وہ ایک قومی یونیورسٹی ہو اور جسمین ہندو مسلمان دونون شریک ہون۔ اور یہانتک یقین دلایا کہ مسز صاحبہ نے وزیر ہند لارڈ مورلے اور ویسرائے ہندوستان لارڈ منٹو سے نیچ کے طور پر اِس یونیورسٹی کی منظوری بھی لے لی ہے۔ مگر مسلمانون نے تو اسمین شرکت ہی نہ کی بلکہ دو چار لوگ شریک بھی ہوئے تو انکو انکے قومی اخبارون نے برا بھلا کہا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤن نے بھی مس بسنٹ کی کچھہ مدد نہین کی جسکی وجہ بعض لوگون کے خیال مین یہ ہے کہ جب سے ہندوستان مین نئی سپرٹ پیدا ہوئی ہے۔ مسز بسنٹ کو لوگ ایسی نگاہ سے نہیں دیکھتے جس نگاہ سے ایک سچے لیڈر کو دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے نزدیک مسز بسنٹ آخر پھر یورپین ہین ہندوستان کے ساتھہ انکو ایسی محبت نہیں ہو سکتی جیسا کہ ایک ہندوستانی کو ہو سکتی ہے۔ خیر اسکی وجہ کچھہ ہی ہو لیکن مسز بسنٹ کی تجویز کردہ یونیورسٹی کا چرچا کچھہ رکا ہوا سا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی کامیابی سے متاثر ہو کر پنڈت مدن موہن مالوی کو ان کے خیال نے پھر گدگدا دیا۔ کیونکہ سنا ہے کہ پنڈت صاحب کے دوستون نے دو تین لاکھہ روپیہ جمع کر لیا ہے۔ اور جلد ہی چند ہندو لیڈرون کی ایک کمیٹی ہونیوالی ہے جسمین ہندو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کو پختہ کیا جائیگا۔ لیکن بعض شخصون کا خیال ہے کہ ہندوؤن کو اپنی یونیورسٹی قائم کرنے میں ناکامیابی ہوگی۔ کیونکہ ہندوؤن مین کوئی ایسا بااثر شخص نہیں جسکے اشارہ پر لوگ فوراً

روپیہ دیدین - یا جنکی شخصیت کے سامنے ہندؤن کے مختلف فرقے اپنے اختلاف کو بھلا کر ایک ہو جائیں بعض شخصونکا خیال ہے کہ اگر مسٹر گوکھلے اِس کام کو ہاتھ مین لیں تو کامیابی میں شک نہیں لیکن مسٹر گوکھلے کسی ایسی بات مین جہان ہندو اور مسلمان ہون لگا ہوا ہو ہاتھ نہین ڈالتے - اور حالانکہ بعض ہندو اخبارات کے اس رویے کے شاکی ہین لیکن ابھی تک تو مسٹر گوکھلے اپنی بات پہ قائم ہیں اور ہمارے خیال مین مسٹر گوکھلے ہی ایک ایسے ہندوستانی ہین جو اِس بات کی سچی اور اصلی مثال ہین - کہ مین نہ ہندو ہون نہ مسلمان - بلکہ ہندوستانی ہاقی لوگ منہ سے کہہ تو دیتے ہین کہ ہم پہلے ہندوستانی ہیں پھر ہندو یا مسلمان -

لیکن کسی نیک کام کی کوشش مین اگر ناکامیابی ہو تو اسمین شرم کی کیا بات ہے - ہمارے خیال مین ہندؤنکو یہ خیال کہ شاید کامیابی نہ ہو دل سے نکال دینا چاہیئے اور بلا کسی جھجک کے کام شروع کر دینا چاہیے ہان کام شروع کرنے سے پہلے اِس معاملہ پر اچھی طرح غور کر لین اور پھر ہمت اور استقلال سے کام لین - تاکہ کامیابی میں شک نہ رہے -

لیکن ہم ہندو اور مسلمان دونون صاحبون کے فائدے کے لئے ایک نیک مشورہ دیتے ہین یعنی یہ بات اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے کہ بدقسمتی سے ہندو مسلمانوںمین تھوڑے دن سے بجائے یگانگت کے دشمنی بڑھتی جاتی ہے - اِسلئے کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اِن یونیورسٹیون کا معیار ایسا رکھا جائے جس سے علمی فائدے کے علاوہ ہندو مسلمان مین یگانگت بڑھے - اور وہ اپنے مشترکہ فائدہ کیلئے ایک ہو کر کوشش کرین ایسا نہ ہو کہ علمی رقابت قومی حد سے بدل جائے - اور ہندو مسلمان ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جائیں ہمارا علم - ہمارا وقت - ہمارا روپیہ ہماری عقل ہماری طاقت ہماری قومیت ہم ہی کو برباد کر دے -

لکھنؤ کے سنی شیعہ

ہم مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کی اِس تجویز کی دل سے تائید کرتے ہین کہ لکھنؤ کے سنی اور شیعونکو چاہیئے کہ وہ ہز ہائنس کو اپنا پنچ مقرر کر کے اِن سے درخواست کرین کہ آپ ہمارا فیصلہ کر دیجئے - اور پھر دونون فریق اِن کے فیصلہ پر کاربند ہو جائیں کیونکہ تفریق کا تماشا بڑھتا ہے - تفریق خواہ سنی اور شیعون مین ہو خواہ ہندو مسلمانونمین - ہم دونون [illegible]

لئے نقصان دہ۔

اخبار ہندوستان کے کئی نمبر میں اس مضمون پر متواتر بحث ہو رہی ہے کہ ہز ہائنس سر آغا خان کے ہزاروں ایسے ہندو پیرو ہیں جو انکو ایشور کا اوتار مانتے ہیں اور ہز ہائنس بھی ان سے اسطرح پیش آتے ہیں کہ وہ اصل وہ ایشور کا اوتار ہیں۔ اگر کسی عام آدمی کا معاملہ ہوتا تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی لیکن ہز ہائنس آغا خان کے نام کے ساتھ یہ بات واقعی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ آغا خان جیسے مہذب انسان اور سنجیدہ جنٹلمین کی شان اور کانشنس پر یہ بات بٹہ لگانیوالی معلوم ہوتی ہے۔ کہ جاہلوں کی جہالت سے فائدہ اٹھایا جائے اور ایک روشن خیال بزرگ ایسی خیال کی تائید کرے جسے دنیا بچوں کا سا خیال۔ خیال کرتی ہے۔

بابو شیو برت لعل ورمن سنتے ہیں کہ رسالہ سادھو کے اڈیٹر بابو شیو برت لعل ورمن۔ مشکل سے انٹرنس پاس ہیں اور ایم اے کی ڈگری انہوں نے ایک برائے نام امریکن یونیورسٹی سے خریدی ہے اگر کسی معمولی آدمی کے متعلق یہ افواہ اڑتی تو چنداں خیال نہ تھا لیکن بابو صاحب نے ایک مذہبی اخلاقی اور سب سے بڑھکر روحانی ریفارمر کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے ایسے شخص کا خریدی ہوئی ڈگری اختیار کرنا۔ روحانیت کی بلندی کو بٹہ لگاتا ہے اور بابو صاحب کی اخلاقی کمزوری ہے۔ جسکا علاج انہیں فوراً کرنا چاہیئے۔ ما نا کہ بابو صاحب نے قوم کے لئے ہزاروں صفحے لکھے ہیں عمدہ عمدہ مضمون پبلک کے سامنے پیش کئے ہیں لیکن اگر یہ افواہ صحیح ہے تو سب پہ پانی پھر گیا۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ افواہ غلط ہے اور بابو صاحب ویسے ہی پاک خیال اور نیکدل لوگ ہیں۔ جیسا کہ ان کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے۔

سرحدی لٹیرے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی سرحد پر ہمیشہ اس قسم کے ظلم ہوتے رہتے تھے کہ سرحدی لٹیرے چاہے جسکو لوٹ لیتے۔ چاہے جسکے بیوی بچے انکو اٹھا لیجاتے اور پھر منہ مانگا۔ روپیہ لیکر چھوڑتے۔ اور یہ سب کچھ برٹش قلمرو اور برٹش رعایا کے ساتھ ہوتا تھا۔ رعایا عرصے تک فریاد کر رہی تھی۔ مگر شنوائی ہی نہ ہوتی تھی۔ شکر ہے کہ بعض نیکدل افسر ادھر متوجہ ہوئے اور انہوں نے ان قبیلے کے آدمیوں کو گرفتار کر لیا جو برٹش رعایا کے آدمیوں کو پکڑ لے گئے تھے۔

اب کمشنر صاحب صوبجات سرحدی نے اعلان کردیا ہے۔
کہ جب کوئی سرحدی کسی کو پکڑنے جائے تو اوسکے کنبے والونکو چاہیئے کہ تاوان دیکر نہ چھڑائیں بلکہ ہم کو خبر کرین ہم رہا کرادیں گے۔ امید ہے کہ آئے دن کے ڈاکوؤنکا بھی انتظام کیا جائیگا۔ کیونکہ جب گورنمنٹ ہماری جان و مال ہی کی حفاظت نہیں کرسکتی اور ہماری تکلیفونکا خیال نہیں کرتی تو گورنمنٹ کے انصاف کو بٹہ لگتا ہے۔ سرکار کے رعب مین فرق آتا ہے۔

دلائی لاما ہم نے یہ خبر بڑے تعجب اور خوشی سے پڑہی کہ گیا جاتے ہوئے بدہون کے گرو دلائی لاما بنارس مہامنڈل کے گردوارہ مین تشریف لے گئے۔ جہان اِنکا شاندار استقبال کیا گیا۔ لاما کو طلائی کرسی پر بٹھایا۔ اور ایک اڈریس پیش کیا جسمین ہندو مذہب کی بزرگی اور بدہ مذہب کے ساتھ اسکے گہرے تعلق کا ذکر تہا۔ لاما صاحب اڈریس سے بہت خوش ہوئے۔ ایک ریشمین چادر اور چند اور تحفہ مہامنڈل کو عنایت کیے۔
دو ایسے مذہب کے لیڈرون مین۔ جن مین کسی وقت خونی رقابت کے نظارے پیش تھے محبت اور یگانگت تازہ ہونا خوش نصیبی کی علامت ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ عرصہ سے روٹھا اور پردیس گیا ہوا بھائی پھر وطن مین آئے۔ اور خدا وہ دن جلد لائے کہ دونون پرانی کرامتین بھول کر ایک ہو جائیں۔ اور آپس مین ملکر رہین۔

اجب رویس

کی کودکنی تو زور کس نے دیکھا — اور قیس کا بن میں شور کس نے دیکھا
کرنا ہے سو ہم کرینگے تیرے در پر — ناچا جنگل مین مور کس نے دیکھا

حتی الامکان صلح کر جنگ نکر — ہان چھوڑ ذموم نیکی مین ننگ نکر
مخلوق سے متواضع ہو شنکر اور دل — بے ظرف محبت ہے سرسنگ نکر

ہری شنکر

متفرقات

دہی اور درازی عمر

انسان کا خیال ہمیشہ سے درازی عمر کی طرف رجوع رہا۔ ہزاروں تدابیر نکالی گئیں۔ سینکڑوں نسخہ جات تجویز ہوئے۔ لیکن کوئی ترکیب کارآمد ثابت نہیں ہوئی حتے کہ چند اشخاص نے تو یہی کہدیا کہ تو یا سو سے اوپر جو لوگوں کی عمریں بیان کیجاتی ہیں وہ محض ضعیف الاعتقادی کا نتیجہ ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ بہت سے بوڑہوں کو اپنی پیدایش کا سن بھی ٹھیک یاد نہیں ہوتا۔ بعض لوگ سنجیدگی سے دوسروں پر اپنی باتوں کا اثر ڈالنے کے لئے اس قسم کی باتوں سے مثلاً غدر کیوقت میری عمر تمہارے برابر ہوگی، اپنی عمروں میں دس پندرہ برس تک کا فرق ڈال دیتے ہیں۔ تاہم جدید تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ انسان سو برس یا اس سے کچھہ زیادہ بھی جی سکتا ہے۔ مگر ایس محتاجی بے روزگاری بھی کے زمانہ میں تو شاید ہی کسی قسمت والے کو اس حد تک پہنچنا نصیب ہوتا ہے کچھ عرصہ ہوا کہ پروفیسر مٹش کوف مرحوم نے جو فرانس کے مشہور محقق پاسچر صاحب کی جانشینی کے لئے ملک روس سے بلائے گئے تھے۔ جنوبی یورپ میں بغرض تحقیقات سفر کرتے ہوئے اس بات پر مشاہدہ کیا کہ بلگیریا کے دہقان بمقابلہ اور مقامات کے بڑی عمروں پر پہونچتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے چہروں پر قبل از وقت بڑھاپے کے نشانات نہیں پائے جاتے۔ پروفیسر موصوف نے ان کے تمام کھانے پینے رہنے سہنے کے حالات دریافت کرنے کے بعد یہ پایا۔ کہ ان کی غذا میں خصوصیت سے دہی شامل ہوتا ہے جو غالباً انکی درازی عمر کا باعث ہو۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ دودہ میں ایک خاص قسم کی جرم پیدا ہوکر دہی

بنتا ہے جو بذات خود انسانی معدہ و آنتون کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچاتا۔ بلکہ بعض دیگر مضر اجرام کو دفع کر کے جو انسانی آنتوںمین پرورش پاتے ہین۔ انسانی صحت کو کچھ کچھ درست رکھنے اور عمر کو دراز کرنے مین مدد دیتا ہے۔ دہی کے ان مفید آثار پر ہمارے ملک مین متقدمین نے مشاہدے کئے تھے۔ انکو یہ معلوم تھا۔ کہ چھاچھ ایک نہایت عمدہ غذا ہے۔ جو یورپ مین لیبک کے زمانہ تک انسانی غذا کے لائق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ بعض بعض مہلک امراض مثلاً سنگرہنی مین چھاچھ ایک غذا اور دوا ہے جو مریض کو موت کے منہ سے بچا سکتی ہے۔ دہی کو وہ ایک نہایت ہی مقوی اور لطیف غذا تصور کرتے تھے۔ اور مرض پیچش مین اسکا مفید اثر ہندمین عورت مرد سب کو معلوم ہے۔ لیکن باوجود ان معلومات کے ہمین ابتک کہین اس بات کا پتہ نہین لگا ہے۔ کہ آیا انکو دہی کی اصلی حقیقت سے بھی واقفیت تھی یا نہیں۔ جسکو پروفیسر مِنِٹی کوف نے ظاہر کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کی رائے غرض ایک تھیوری نہیں ہے جو یورپ مین بکثرت ایجاد ہوتی ہین۔ کیونکہ اسکے ظاہر ہوتے ہی مختلف تجربون نے اسکی اس قدر تائید کی ہے کہ یورپ و امریکہ کے کئی دوا سازی کے کارخانون مین دہی کے اجرام ٹکیون کی شکل مین بنائے جانے لگے۔ اور تعجب یہ ہے کہ ہندوستان مین یہ گران ٹکیان خوب فروخت ہوئیں۔ گویا کہ ہندوستان مین دہی دستیاب نہیں ہوسکتا تھا۔

مین ناظرین رسالہ زبان کو دہی اور اُسکی ٹکیون کی بابت جو عنقریب تجربے ہوئے ہین اُس سے آگاہ کرنا چاہتا ہون۔ امید کرتا ہون کہ آپ کان دھر کر سنین گے۔ گو کہ بات تو کسی قدر کھٹی ہے۔ بازار کے دہی مین علاوہ اُس کے خاص اجرام کے جو آنتون کے حق مین مفید ہے۔ اور بھی کئی مضر اجرام رہتے ہین۔ لہذا بغرض دافع امراض اسکا استعمال درست نہین ہے۔ ولایتی ٹکیون میں بھی یہی قباحت

دیکھنے مین آئی ہے۔ اسلئے خالص دہی کے توڑے گھر پر دہی جانا روزمرہ کے استعمال اور طبی امراض کے لیئے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن افسوس بہت سے اشخاص گھر مین بہ دہی نہین بنا سکتے۔ اس کے اصول کو نہ سمجھنے یا اسکے بنانے کے طریق مین کافی احتیاط نہ رکھنے سے انکا دہی جمتا ہی نہین ہے۔ نہ کھٹا ہوتا ہے۔ اور بعض دفعہ بدذائقہ اور متعفن ہوتا ہے جو کہ صریحاً نقصان دہ ہے۔ ہم مفصلہ ذیل طریقہ خالص دہی تیار کرنیکا درج کرتے ہین جو کہ غالباً ناظرین کے مفید مطلب ہوگا۔

ایک صاف ڈھکنے دار تام چینی کا برتن اور ایک اسیکا چمچہ لیکر برتن مین کافی مقدار صاف پانی ڈالکر آگ پر چڑھا دین۔ اور پاؤ گھنٹہ تک جوش کھانے دین تاکہ برتن اور اسکے اندر کا چمچہ اور پانی اجرام سے پاک وصاف ہو جائین۔ پھر اس برتن مین کسقدر صاف اور تازہ دودہ (جسکے دوہنے مین ہاتھ اور برتن وغیرہ صاف رہنا چاہیئے) ڈالکر تقریباً گھنٹہ بھر جوش دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ دودہ اجرام سے بالکل پاک ہوجائے اور اسمین شامل شدہ پانی جل جائے۔ اسی ڈھکی حالت مین اسکو ٹھنڈا ہونے دینا چاہیئے جبتک کے اسکی حرارت فارن ہائٹ تھرمامیٹر مین ۱۰۴ درجہ کی ہو پھر اس کے بعد اسمین دہی کا خالص توڑ جو کہ کلکتہ میں دستیاب ہوسکتا ہے ملالین اور برتن کو ایک انکیوبیٹر کے اندر قریب آٹھ گھنٹے تک رہنے دین۔ کہ جسمین دودہ کی حرارت اس درجہ پر قائم رہتی ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے۔ کہ دہی کا جرم ایک جاندار شئے ہے۔ جو کہ دودہ کے اندر پلتا ہے۔ اسکی نشو ونما کے لئے ۱۰۴ درجہ کی حرارت نہایت ہی موزون ہے۔ تیز حرارت مین یہ اجرام ضایع ہو جاتے ہین اور کم حرارت مین بڑہ نہیں سکتے۔ ان تمام کارروائی مین صفائی کی اتنی ضرورت ہے کہ بغیر خاص تعلیم لیبوراتیری کے کوئی شخص یہ احتیاط نہین کرسکتا۔ اور نہ ہر ایک کے گھر مین انکیوبیٹر ہونا ممکن ہے لہٰذا گھر مین صاف دہی جمانے کے لئے یہ دوسرا قاعدہ تجویز کیا جاتا ہے۔

ایک ڈھکنے دار تام چینی کے برتن مین تقریباً سیر بھر دودہ لین اسمین تقریباً نصف سیر یا پاؤ بھر صاف پانی ڈالکر آگ پر جوش دین۔ گھنٹہ آدہ گھنٹے کے اندر یہ پانی جل جائیگا۔ پھر جب یہ اس قدر ٹھنڈا ہو جائے کہ جلد کو بہت گرم نہ معلوم ہو یعنی ۱۰۴ درجہ فارن ہائٹ، اسمین تازہ دہی کا توڑ ملا کر چولہے کے اوپر جسمین سے آگ نکالی ہو۔ رات بھر ڈھک کر رکھدین۔ تاکہ تقریباً یہی حرارت کئی گھنٹہ تک قائم رہ سکے۔ صبح کیوقت یہ دہی خاصہ جما ہوا اور ترشی ملیگا۔ زیادہ دیر رکھنے سے یا اور بھی زیادہ دگر میہ نہیں ایک دن دچار و نہین دو دن، ترش ہو جائیگا۔ یہ ترشی دہی کے اجرام کا محاصل ہے۔ اور اسی سے دودہ جمکر دہی بنجاتا ہے۔ لیکن اسکی زیادتی سے وہ خود بھی مر جاتے ہین اور دہی مین دیگر مضر اجرام پیدا ہو جاتے ہین۔ لہذا توڑ خواہ بازار کا ہو یا لیبواٹیری کا تازہ ہونا چاہیئے ورنہ اسکے اندر دہی کے خاص اجرام نہین رہتے۔

بغرض دافعہ چند امراض دہی کے اجرام بہت مفید ہین۔ جیسے کہ بیان ہو چکا ہے۔ لیکن دہی کا استعمال خاص خاص صورتونمیں خالی از علت نہین ہے۔

اوّل چند اشخاص دودہ کو کسی شکل مین بھی برداشت نہین کر سکتے۔

دویم ترشی معدہ سے مبتلا اشخاص مین یہ مضر ہے۔

سویم کھانسی و جوڑ پٹھون کے درد والونکے لئے بھی مضر ثابت ہوا ہے۔ لہذا ان حالات مین بجائے دہی کے خالص توڑ کو جو لیبواٹیری سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ استعمال کرانا بہتر ہے۔ کہ جسمین دہی کے اجرام ہون۔ لیکن زیادتی ترشی سے مبرا ہو۔

منیجر

بدنامیاں سر پہ لیں تمہاری خاطر　　رسوائیاں جھیلیں سب تمہاری خاطر
کچھ شکوہ بھی ہے ہماری خاطر منظور　　یا ہم ہی کیا کریں تمہاری خاطر

ہری شنکر

نوٹس

ذاتی حالات انسانی زندگی ہر قدم مین رنج ست پُر ہے۔ متعلقان رسالہ زبان کو پچھلے دو سال کے اندر کئی صدمے اٹھانے پڑے ہین۔ جس سے کہ رسالہ کے کام مین بھی ابتری واقع ہوئی ہے۔ ہم ناظرین سے اِسکے لئے معافی کے خواستگار ہین۔ لیکن اپنی رنج کی کہانی دوسرونکو سنانے سے زیادہ تر یہ مقصد تھا۔ کہ ہم تجربہ سے کہہ سکتے ہیں کہ رنج و دکھ انسانی روحانی تمدن کے سامان ہین۔ بیشک اِسکا پہلا اثر دماغ کو اسقدر پریشان کرتا ہے کہ انسان دنیا کا کچھہ بہی بہیانک منظر دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن جون جون اسپر غور کرتے ہین۔ یہ ثابت ہوتا جاتا ہے۔ کہ ہر ایک سم آگ کی طرح نفس کو جلا کر اسکو پاک و صاف کرنے میں مدد دیتا ہے۔ دنیاوی طور پر بھی ہمین اِس خاص حادثہ سے یہ سبق ملا ہے کہ جن لوگونکو ہم بہ احتیاط مذہب۔ ذات وغیرہ بندشون سے الگ سمجھتے ہین۔ وہ اسوقت ہمدردی سے لپٹے ہین سگے ہین۔ لہذا معلوم ہوا کہ بنی آدم اعضائے یکدیگر اند۔ لیکن کب تک یہ گیا اور موہ (یعنی نادانی) انسانکو انسان سے مذہب۔ ذات۔ رنگ اور اس سے بھی ناچیز پولیٹیکل حقوق کے بہلاوون سے الگ الگ رکھیگا۔

منیجر

موجودہ وقت کی چند خصوصیتین ۱۔ تعجیل و پھرتی۔ ہر کام کو خواہ کیسا ہی اہم ہو ادا دسکے شروع کرنے سے پہلے لمبے ہی طول طویل منصوبے باندہے ہون۔ جھٹ پٹ چٹکی بجانے مین ختم کرنا چاہتے ہین۔ مکان بنوائین گے تو نہایت سنگین جسکے قائم رہنے کی

امید پرانے قلعہ سے زیادہ کرتے ہین۔ مگر اسکا ختم کرنا جلد ہی چاہتے ہین۔ اسی طرح اور کامونکی بابت خیال کر لیجیے۔ کہ شروع کرتے وقت تو بڑی لمبی لمبی پربنا رکھتے ہین۔ مگر تھوڑی ہی دیر مین اُس قصہ کو ختم کر ڈالنے کی فکر ہو جاتی ہے۔

۲۔ ہر کام کا دیرینت یعنی الٹا ہونا۔ جس گھر یا طبقے مین کوئی پیدا ہوا ہے۔ اُسکے متعلقہ فرائض یا دھرم سے متنفر ہو کر دوسرون کے کامونکو پسند کرنا اور نازیبا کو زیبا دکھا کر آزادی کا دم بھرنا۔ پیدا ہوئے بنیئے کے ہان اور مزاج پٹھانی رکھتے ہین۔ سپاہی کی اولاد کرین بقالی۔ اور کلبہ رانی۔ مزارعہ و زمیندار ہی منشی مفتی یا بابو بنے پر عش کرتے ہین برہمن و پنڈت کہلاتے ہین۔ مگر علم سے نا فرا اور خدمتگاری و زر اندوزی پر فدا۔ اور دن کی پھیر کیا شکایت ہے۔

۳۔ کسی بات کا اعتقاد یا کسی شخص پر اعتماد برائے نام ہونا۔ اگر ہوا بھی تو بہت تھوڑی دیر کیلیے آج ایک بات کو صحیح و درست مانکر اوسکے پیچھے ہوئے تو کل چھوڑی کنارہ بیٹھا اسکے پیچھے پڑ گئے آج ایک نتیجہ نکالا کل اوسکا منہ کالا۔ غرضیکہ سبک سیری اور تیتری طرح ایک جگہ نہ ٹکنا اسوقت اپنا شعار ہے اور ترقی کا عین مدار بلکہ اعلی معیار ہے۔ ایک ہی ڈگر چلے جانا۔ یا ایک بات پر بہت دیر تک قائم رہنا ترقی کے حق مین زہر ہے۔

۴۔ ترقی کے معنی آگے بڑھکر پھر پیچھے لوٹنا ہے۔ مگر اسوقت ترقی اسکو کہتے ہین۔ کہ ہر روز نئی بات اختیار کیجائے۔ پرانی باتونکو یک قلم ترک کر دیا جائے۔ یا انمیں ترمیم و تبدیلی تو بہت جلد ہو جاتے۔ مگر تھوڑی ہی مدت مین پھر وہی باتین کسی اور پیرایے مین ادل بدل کر اختیار کر لیجائین۔ اور یہ کہکر معذرت مانگ لیجائے۔ کہ وہ تو صرف تجربہ تھا تجربہ کی خاطر ایسا کیا تھا۔

۵۔ شیخ سعدی صاحب کے مداح نہیں بلکہ چیلے اس زمانہ مین بہت کثرت سے پھیل گئے ہیں انکا عمل آپکے اس قول پر ہے کہ ہمکس را عقل خود بکمال و فرزند خود بجمال مے نماید۔ خود رائی کا پورا پورا دور ہے۔ ہر ایک شخص دوسرون کے نقص نکالنے کو ہر وقت مستعد کمربستہ ہے

وہ خواہ کتنا ہی بزرگ اور تجربہ کار ہو۔ ہمارے ہمعصر ونکی فراست و نکتہ سنجی کے سامنے انگلی رکھ رہی ہے۔ جیسا کہ ایک انگریزی عالم رائے باصواب کی تعریف اسطرح فرماتے ہیں۔ رائے باصواب کیا ہے؟ میری اپنی رائے۔ اور غلط رائے کونسی ہے؟ دوسرے شخص کی رائے۔ یہ تعریف کتنی مکمل اور بالطف ہے۔ فی زمانہ اسپر کتنا عمل ہو رہا ہے۔ دنیا مین کوئی بیماری ایسی نہیں جسکی تشخیص ہونے پر اسکا علاج نہ ہو سکے لہذا مندرجہ بالا امراض کی بھی دوا ہے۔ بشرطیکہ انکی تشخیص ہو جائے۔

گمس

غم

اگرچہ یہ لفظ بذات خود ایک باہوش ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ بازاوقات رنج دہ ثابت ہوا ہے جسکو ہر انسان مجبوری برداشت کرتا ہے۔ کیونکہ اسکی تلافی غیر ممکن ہے۔

یہی ہمارے معزز اور مفتخر عنایت فرما جناب ڈاکٹر بی۔ کے متر صاحب بالقابہ کو برداشت کرنا پڑا جسکی وجہ یہ ہے کہ آپ کے صاحبزادے نے بعمرہ سال اس عالمگیر موذی مرض کی دست درازی سے مجبور ہو کر چند گھنٹہ میں جان شیرین اسکی نذر کر دی۔ یہ جیسا حادثہ ہے جس کے تحریر کرنے سے قلم بھی صفحہ کاغذ پر سیاہ آنسو جاری کر رہا ہے۔ جو کچھ صدمہ ڈاکٹر صاحب کو ہوا اسکا بیان کرنا غیر ممکن ہے کیونکہ جب بیٹے کی از حد محبت ہو اور وہ یکبار اس سے جبراً چھین جائے اور اسکے لوٹنے کی پھر امید بھی نہ ہو کیا ہو سکتا ہے؟ غم!

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو صبر دے اور اسکا نعم البدل بھی۔

فوٹیر

حمایت بیوگان

بموجب فرمایش لالہ امیر چند صاحب سیکرٹری ودھوا سہایک سبھا ہندوستان
یہ بات قرار پائی ہے کہ رسالہ زبان حمایت بیوگان میں ہمیشہ ایک مضمون شائع کیا کرے
اسمیں ہر فریق کی رائے درج کی جا سکتی ہے لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ ودھوا سہایک سبھا
ہندوستان یا اڈیٹر رسالہ زبان ان سے ہو بہو اتفاق کرتے ہیں۔ اڈیٹر

عقد بیوگان کا مسئلہ پر مدت سے بحث ہو رہی ہے لیکن اب بھی ہمارے ہموطنوں نے اس کی ضرورت کو پوری طرح سے محسوس نہیں کیا۔ اور جنہوں نے محسوس کیا انکو کافی موقعہ نہیں ملا کہ وہ اپنے اعتقاد کے بموجب کاربند رہ سکیں۔ لیکن علاوہ اسکے ایک قباحت اور آکر واقع ہوئی ہے۔ جسکا نام ہے **ضد**۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ یہ ضد صرف برعکس پارٹی میں ہے۔ جو عقد ثانی کے متفق نہیں ہیں بلکہ افسوس کہ ہماری پارٹی میں بھی یہ کسی حد تک نمودار ہوئی ہے۔ ضد ایک وہ چیز ہے۔ جو کہ ایک کے دیکھا دیکھی دوسرے میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ بجلی کے قریب سے معمولی اجسام میں بھی برعکس قسم کی بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ضد کی بھی حالت ہے۔ لیکن یہ سوال ایسا نازک ہے۔ کہ طرفین کو ضد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ضد سے ہم گمراہ ہوتے ہیں۔ ایکدوسرے کے دلائل کو سمجھ نہیں سکتے ایک دوسرے کو غیر سمجھنے لگتے ہیں۔ مثلاً میں اپنی پارٹی کی ایک دلیل سناتا ہوں جو عموماً پیش کیجاتی ہے۔ لیکن چونکہ اسکی بنیاد میں ضد شامل ہے اسلئے وہ باوجود ایک منطقی دلیل ہونیکے دوسرے کے دلوں میں نقش نہیں ہوتی۔ چنانچہ تمام شاستروں کو چھان بین کر چند آیتیں۔ احکام۔ اور تمثیلیں اسکے ثبوت میں پیش کیجاتی ہیں کہ ہندو شاستروں کی رو سے بدھوا بواہ پرانے زمانہ میں بالکل جائز تھا۔ لیکن چونکہ اسکے اندر ضد شامل ہے پس نے ہم اپنے آپ کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں۔ لہذا ہماری دلیل کا کچھ اثر برعکس پارٹی پر نہیں ہوتا

اِس دلیل پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے۔ اور مونز نگاہون سے اسکی تشریح کیجائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دلیل بالکل بے بنیاد ہے۔ مین اپنی پا۔ٹی والون سے تھوڑی دیر کے لئے معافی چاہتا ہون۔ کیونکہ میرے خیال مین کسی اچھے کار کی تائید میں بھی جھوٹ کا سہارا انہین ڈہونڈنا چاہیئے۔

اَب اِس دلیل پر غور کیجئے کہ اول ہندو شاستر مختلف زمانون میں ویدون کے زمانے سے لیکر پرانون کے زمانے تک تقریباً عرصہ چار ہزار برس کے اندر مختلف اشخاص سے قلم بند کئے گئے ہین۔ اور اسکا اصول ہمیشہ سے یہ رہا ہے۔ کہ زمانہ اور شخص کی ضروریات کے بموجب اِس کے احکامونمیں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ مثلاً رامائن کی کتھا کو اگر ہندو اجتماعی زندگی کا آئینہ تصور کیا جائے تو اِس سے ظاہر ہوگا۔ کہ خود رامچندر جی نے تارا و مندو دری کے لئے ایک سٹینڈرڈ اور سیتا جی کے لئے دوسرا مقرر کیا۔ اور مجھے تعجب یہ ہوتا ہے۔ کہ سیتا جی چھتری کل مین پیدا ہوکر بھی کیونکر رامچندر جی کے نزدیک اہلیا سے اونچے سٹینڈرڈ پر رکھی گئین ہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ کتھا کی رو سے سیتا جی لکشمی کا اوتار تھین۔ لہٰذا سیتا۔ اہلیا۔ تارا۔ اور مندو دری کے سٹینڈرڈ مختلف ہونے چاہئین۔ اِس بنا پر ہندو شاستر سے ایک اشلوک پیش کرنا کوئی خاص اثر نہین رکھتا جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ یہ ہم پر عاید ہوتا ہے۔

عقد بیوگان کے حامی اِن معدودے چند احکامون اور تمثیلون پر جو کہ ہندو شاسترون سے نکالے جاسکتے ہین۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہین۔ کہ یہ زمانہ قدیم مین بالکل رائج تھا لیکن کیا کوئی شخص تمام ہندو لٹریچر کو پڑھکر صدق دلی سے اِس بات کی تائید کر سکتا ہے ؟۔ البتہ ہندو تمدن مین کوئی زمانہ ایسا بھی تھا۔ کہ جب قیود و ازدواج اِس قدر ڈھیلے تھے کہ ہم اُس زمانہ کی تمثیل پر آج کاربند نہیں رہ سکتے۔ اور نہ ہندو شاستر ہمین کہین یکتی یعنی دلیل و مصلحت کے بخلاف کوئی کام کرنے کے لئے مجبور کرتے ہین۔ بلکہ ہر قدم پر یکتی یعنی دلیل ہی ایک وہ کسوٹی ہے۔ جسکے ذریعے سے ہم احکام شاستر کو دیکھ سکتے ہین۔ کہ وہ کہانتک ہماری موجودہ حالت مین ہم پر آیدہ ہین

اس مسئلہ کو طے کرنے مین ہمین بجائے شاسترون کے حوالہ دینے کے اور زبردستی شاسترون سے غلط نتائج نکالنے کے لئے جیسے کہ عموماً کیا جاتا ہے۔ بے تعصبانہ طور پر تمام ہندو لٹریچر کی شہادت لیکر اپنی عقل و دلیل سے ثابت کرنا پڑیگا۔ کہ اسوقت ہماری موجودہ حالت مین عقد بیوگان ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں۔ جہانتک مین ہندو لٹریچر سے واقفیت رکھتا ہون۔ اس ملک مین بیوگان کا عقد ثانی گو کہ کہین کہین اعلیٰ خاندانون مین بھی ہوتا رہا ہے۔ لیکن وہ (آپت دھرم) ایک مجبوری کی حالت کے لئے جائز سمجھا گیا ہے۔ لہذا اگر ہم اس سوال مین ہندو شاستر کا حوالہ تلاش کرین تو ہم اسکو زیادہ سے زیادہ آپت دہرم سمجھ سکتے ہین۔ چونکہ آپت دہرم دہرم ہے۔ اس مین کوئی بات بے ضابطہ یا ناجائز نہین ہے۔ اسی لئے ہمین بجائے لوگونکو یہ سمجھانے کے کہ ہندو شاسترون مین عقد بیوگان بالکل رائج تھا یہ بتانا چاہیئے کہ ہندو شاستر کے بموجب آپت دہرم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا بالکل غلطی ہے اسوقت جو ہمارے ملک مین لاکھون بیوائین ہماری اس غلطی اور ظلم سے اپنے آپت دہرم کو پالنے سے محروم رہتی ہین اس کے لئے کون ذمہ دار ہے۔ میرے خیال مین ہم سب کے سب اسکے لئے ذمہ دار کئے جا سکتے ہین۔ لہذا ہمین اپنی ذاتی ضد اپنی علمیت کے غرور اور اپنی تحقیقات کے فخر وغیرہ سب بالائے طاق رکھکر صدق دلی سے یہ سوچنا چاہیئے۔ کہ ان بیچاری بیواؤن کے لئے ہم کیا کر سکتے ہین۔ کیا ہم انکو انکی قسمت پر چھوڑ دین کیا ہم ان کو اس رزم زندگی مین بیکار سمجھکر کسی خندق مین دفنا دین۔ کیا ہم ان کو اس سے بھی خوفناک دوزخ کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کرین۔ کیا ہم یکجہتی سے انکی حالت بہتر کرنے کے لئے کوئی تدبیر نکال سکتے ہین۔ شاید ہماری برخلاف پارٹی بھی اس مین ہم سے اتفاق کریگی۔ کہ کوشش اور ہمت سے ان بیوگان کی بہتری کے لئے ہم کوئی تدبیر نکال سکتے ہین۔ بیشک عقد ثانی ایک تدبیر ہے۔ جسکو شاستر نے آپت دہرم قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک پارٹی اس تدبیر میں ہم سے کسی وجہ سے سر دست

اتفاق نہ کر سکے لیکن باقی تجاویز مثلاً ان کے سہنے سہنے کا ٹھیک بندوبست کرنا - اور سب سے بڑھکر کم عمری کی شادی کو ہٹا کر بیوگان کی تعداد کم کرنا - سبکے سب ایسی ہیں جنمیں دونوں پارٹیاں اتفاق کرتی ہیں - اور ان کو بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا چاہیئے - لیکن ہائے .. .. ضد -

(ایک ممبر برہما سماج دہلی)

ایک ودھوا کی ضرورت ایک دیش اگروال بھائی عمر ۳۲ سال ایک ہم ذات ودھوا سے فوراً شادی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ خواندہ ہیں۔ قریب تیس۳۰ روپیہ ماہوار کی آمدنی ہے۔ اولاد کوئی نہیں۔ مزید مفصل حالات کے لئے اور بواہ کے متعلق خط و کتابت بہ پتہ ذیل ہونی چاہیئے۔

سیکرٹری امیر چند دیش ودھوا سہایک سبھا پٹیالہ۔ پریم دہام دہلی۔

ضرورت و اطلاع اس سبھا کو ودھوا وواہ پرچار کے لئے خاصکر دیش جاتی میں ایک اپدیشک کی ضرورت ہے۔ جو سنسکرت اچھی طرح جانتا ہو۔ اور شاستروں سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو۔ اگر برہمن ہو تو بہتر۔ اچھا چال چلن ضروری شرط ہے۔ بھجن منڈلی کے ساتھ بیرونجات میں دورہ بھی کرنا ہوگا۔

یہ سبھا دہلی اور بیرونجات میں ودھوا وواہ پرچار کے لئے لائق و تجربہ کار اپدیشکوں و پنڈتوں کے لیکچر دینے کا انتظام کرنے کے لئے تیار ہے۔ اور جن صورتوں میں ضروری ہوا انکا سفر خرچ وغیرہ بھی دے سکتے ہیں۔ تمام خط و کتابت ہر دو امور کے متعلق پتہ ذیل سے ہونی چاہیئے۔

سیکرٹری امیر چند دیش ودھوا سہایک سبھا پٹیالہ۔ پریم دہام دہلی۔

قیمت سالانہ عہ

حجم ۴۰ صفحے

رسالہ زبان دہلی

فانوس میں یہ شمع ہے نور انجمن میں ہے

معززِ اخبارات و رسائل کی رائے ہے کہ "زبان" ہر لحاظ سے قابل قدر پرچہ ہے

اگرہ اخبار - صاف ستھرا ہو کس طرح بیانِ دہلی جو نور کے سانچے میں ڈھلی ہے زبانِ دہلی رسالہ زبان کا منشا رخاص یہی ہے کہ ہندوستان والونکو دہلی کی زبان سکھائی جائے تاکہ وہ اسکے باریک ترپہلوؤں پر کافی غور کر کے اپنی زبان کی اصلاح کریں۔

سرمۂ روزگار اگرہ - ماشاءاللہ رسالہ زبان ہر طرح قابلِ قدر پرچہ ہے بعض بعض مشاہیرِ اہلِ قلم کے مضامین نظم و نثر اسمیں جو شایع ہوتے ہیں وہ اگر مبالغہ نہ سمجھا جاوے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان اردو کے سرمایۂ ناز ہیں۔

رہنمائے تعلیم لاہور - "زبان" کیا حسن ظاہری کیا حسن معنوی ہر لحاظ سے دلکش اور نہایت پسندیدہ ہے ... مضامین اسقدر اعلیٰ اور دلچسپ ہوتے ہیں کہ جبتک کل نظم و نثر کے مضامین ختم نہ ہولیں رسالہ ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا ..... الغرض رسالہ ہر ایک لحاظ سے نہایت اعلیٰ درجہ کا بلکہ قریبًا ہندوستان کے کل ماہوار رسالوں سے بڑھا چڑھا ہے۔

نظام المشائخ دہلی - زبان دہلی کا شہرۂ آفاق ماہواری رسالہ ہے ... مضامین نہایت مفید اور کارآمد با تو نہر لکھے جاتے ہیں ..... دہلی کا فعل غالب مرحوم کے بعد پھر اس رسالہ نے قائم کیا ہے

کمال دہلی - مضامین نظم و نثر قابل قدر ہوتے ہیں - کاغذ بت عمدہ و نفیس یکساں ہے اور سب سے بڑھکر خود ناظم کے قلم میں جبکا ایک ایک دائرہ خورشید جہانتاب سے ہمسری کر رہا ہے جناب ڈاکٹر بی کے مترا صاحب مہتمم رسالہ ہذا کے مضامین ڈاکٹری کے متعلق نہایت اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ قسم اول عہ ہے اور قسم دوم عہ اس خوبی کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہے منیجر رسالہ زبان دہلی سے طلب کیجئے۔

زبان

(۱) زبان - اُردو کا ایک باتصویر ماہواری رسالہ ہے جو اُردو زبان کی ٹکسال (دہلی) سے شائع ہوتا ہے۔

(۲) زبان - روحانی - اخلاقی - مجلسی - جسمانی - مالی اور قوم کی دیگر ضروریات پر بحث کرنے کے علاوہ موجودہ زمانہ کے سائنس نئی نئی علمی تحقیقات - عام فائدے اور مذاق کے مضمون اور لایق اشخاص کی سوانحمریاں بھی پیش کرتا ہے۔

(۳) زبان کو مفید بنانے کیلئے چونکہ ہر زبان کے فاضل اور قوم کے بہترین دماغ کوشش کر رہے ہیں اسلئے زبان میں - ہر زبان - ملک - مذہب وملت اور خیال کے بزرگوں کی رائے معلوم کرنیکا موقع ملتا ہے۔

(۴) زبان - چونکہ بیہودہ لٹریچر گندے مضامین سے ہمیشہ پاک رہتا ہے اسکے مضامین زباندان اصحاب کی قلم سے نکلتے ہیں اور لکھائی چھپائی میں آپ اپنا نظیر سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے طلبار کی اخلاقی درستی اور زباندانی سیکھنے کا رسالہ زبان بہترین ذریعہ ہے۔

(۵) زبان کا نہ کوئی خاص مذہب ہے نہ کسی فریق سے واسطہ بلکہ جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے اسکا مشن علمی خدمت کرنا ہے اسلئے نامہ نگار صاحبان سے التجا ہے کہ زبان کے لئے مضمون تحریر کرتے وقت ہمارے اصولونکا خیال رکھیں اور ملک کی ترقی کے دلدادہ ہماری مالی اور قلمی مدد کریں تاکہ جو خدمت ہمنے اپنے سر لی ہے اُسے پورا کر سکیں۔

(۶) قیمت سالانہ قسم اول اعلیٰ کاغذ معہ تصاویر حجم ۲۰ صفحہ ۳ روپے قسم دوم معمولی کاغذ عہ

(۷) طلبار سے اسکی قیمت عہ لیجا سکتی ہے۔

خادم - ڈاکٹر بی کے - مترا - مینیجر

رجسٹرڈ نمبر ۷۷۲

اپریل ۱۹۱۱ء

نمبر ۴ جلد

قلعہ معلی یادگار دلی ٹکسال



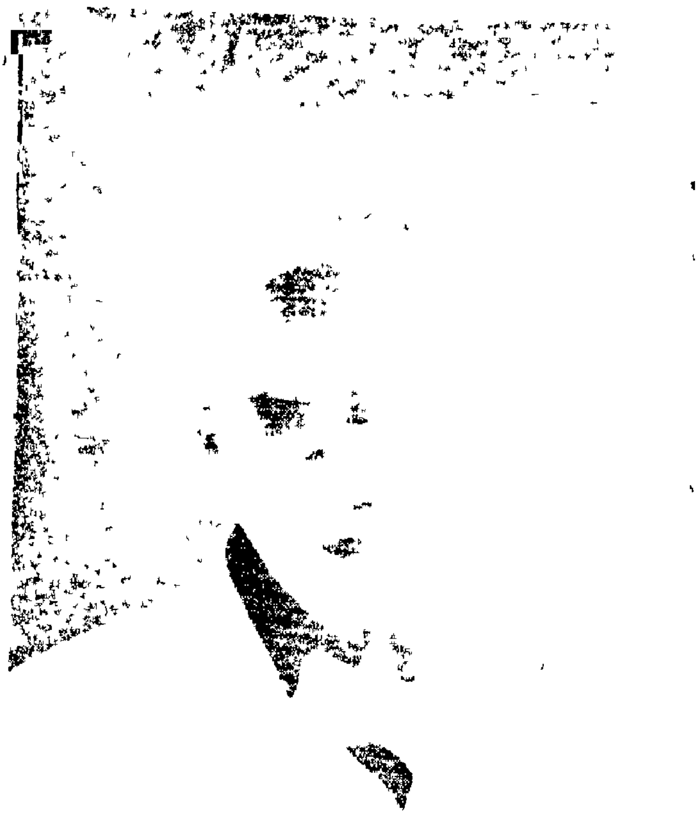
زبان

دہلی

ایڈیٹر نازک رقم اکبرآبادی

فہرست مضامین

زبان پریس دہلی میں چھپا



THE "ZABAN"-DELHI.

زبان

ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات

یہ مضمون مسٹر شنکر ناتھ مرحوم ایم۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لا نے (جنکی تصویر شروع رسالہ میں دی گئی ہے) سنہ ۱۹۰۳ء میں لندن کی کسی ہندوستانی انجمن کے سامنے پڑھا تھا اور پھر تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ سنہ ۱۹۱۰ء میں دوبارہ لکھکر دہلی میں راما تھیئیٹر میں پڑھا گیا اور بشکل کتاب شائع ہوا۔ اس وقت رسالہ زبان میں اسکو اردو میں شائع کرنے کی ضرورت بوجوہات چند محسوس کی گئی ہے چنانچہ [illegible] صاحب کا قول [illegible] ہے اسپر یہ مضمون [illegible] صاحب مرحوم کے کل خیالات کی درست [illegible]

کے سامنے نمونہ بھی پیش کرنا ہے۔

شہر والے بیرسٹر صاحب مرحوم کو زیادہ تر ایک سودیشی کارکن سمجھتے تھے بلکہ انکے انتقال کے کچھ ہی قبل انکا نام پولیٹکل اجی ٹیٹر کے زمرہ میں شامل ہوا لیکن ہم ذاتی واقفیت سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے خیالات و محسوسات بہت وسیع اور اعلیٰ تھے۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ اپنے ملک سے محبت کرتے تھے۔ ہر کس و ناکس جو کسی شکل میں محب وطن ہونے کا دم بھرتا تھا ان کی دوستی کا مستحق ہو جاتا تھا گو ہمیں تحقیق معلوم ہے کہ اپنے بعض ساتھیوں سے وہ بالکل اتفاق نہیں کرتے تھے ۱۹۰۸ء ماہ فروری میں لالہ چند والال صاحب چاول والے نے اُن کی ایک چھوٹی سی سوانح عمری رسالہ زبان میں درج کی جو دفتر زبان سے مل سکتی ہے موجودہ مضمون جو ایک مہربان نے ہمارے لئے ترجمہ کیا ہے اسکا آخری حصہ اس قدر منتخب کیا گیا ہے کہ بیرسٹر صاحب مرحوم کے خیالات کا اندازہ نہیں ہو سکتا پھر بھی اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیرسٹر صاحب مرحوم علاوہ سودیشی یا پولیٹکل باتوں کے سوشل باتوں پر زیادہ غور و پرداخت کیا کرتے تھے البتہ ان کے خیالات کچھ زمانے سے آگے رہتے تھے اسلئے وہ اپنی حین حیات میں مقبول عام نہوئے۔

اسی قسم کا ایک اور مضمون متعلق گداگری انکا انگریزی میں شایع ہو چکا ہے۔ اگر ناظرین رسالہ زبان پسند کریں تو اسکا خلاصہ بھی کسی موقع پر پیش کیا جائے گا۔

منیجر

اگر کوئی شخص اُن تبدیلیوں اور ترقیوں کی تاریخ لکھنے بیٹھے جو انیسویں صدی میں وقتاً فوقتاً معقول اور پسندیدہ آئیڈیل تک پہونچنے کی غرض سے اہل ہند کے خیالات میں ہوتی رہی ہیں تو ایک امر واقعہ تو ضرور اسکو ایسا نظر آئے گا جس کا حل کرنا اور جس کے لئے کافی اور مستقل وجہ بہم پہنچانا اگر دشوار نہیں تو کچھ آسان کام بھی نہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ

صدی میں جبکہ آزادی کی ہوا ہندوستان میں خوب زور شور سے چل رہی تھی اور ہند کے بچے بچے کے دل میں بے قید اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کا خیال جوش زن تھا سوشل تمدنی۔ پولٹیکل کوئی بھی قومی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر اعتراضات نہ کئے جاتے ہوں یا جس پر بحث نہ کی جاتی ہو۔ کوئی کہتا تھا کہ نمک پر ٹیکس کم ہونا چاہئے۔ کوئی رائے زن تھا کہ ہندوستان کو اب ہوم رول ملنا چاہئے۔ کوئی اخراجات شادی و بیاہ کے گھٹانے کی فکر میں رہتا تھا۔ کوئی تعلیم نسواں و آزادیٔ پردہ کا حامی تھا۔ کسی کو قومی یونیورسٹی قائم کرنے کی دُھن سوار تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ نہیں سب سے پہلے ہندوستان میں ایک عام زبان ہونی چاہئے۔ اس دماغی ہل چل کے زمانہ میں اگر کوئی مسئلہ ایسا رہگیا تھا جس پر بالکل بحث نہیں کی گئی تو وہ اہل ہنود و اہل اسلام کے باہمی تعلقات کا مسئلہ تھا۔ حیرت کا مقام ہے کہ تمام زمانہ کے اُمور پر تو غور و فکر کیا جاتا تھا۔ اس سے کچھ مطلب نہیں کہ وہ ضروری ہیں یا غیر ضروری۔ مگر ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات جیسے اہم مسئلہ کے حل کرنے کا کسی روشن خیال اہل ہند کو ذرا بھی خیال نہ آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال احتیاطاً نہیں چھیڑا گیا۔ کیونکہ ملک کے لیڈر یا تو خود حد سے زیادہ راسخ الاعتقاد تھے یا وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں ایسے مضمون پر بحث کرنے سے ان کے ہموطن آزردہ خاطر ہوجائیں۔ یہ کہنا کہ ملک اس مسئلہ پر بحث کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ گویا اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ہند کے کسی لیڈر میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ وہ اس سوال پر فکر کرے اور اس کی گتھیاں سلجھا کر اسے قوم کے پیش نظر کرے۔ ممکن ہے کہ ہم اپنے گزشتہ غفلت کی معقول وجہ دے سکیں۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اس مسئلہ کو فضول سمجھکر بالائے طاق نہیں رکھ سکتے۔ ہماری آیندہ بہبودی و مضبوطی بلکہ ہماری آیندہ قومی زندگی کا دارومدار بہت کچھ اسی مسئلہ کے

صحیح حل پر ہے اور وہ وقت آپہنچا ہے کہ ہم اپنا بہترین وقت اور دماغ اس مسئلہ کے غور کرنے میں صرف کریں۔ ہمارا ملک ان دو گروہ میں منقسم ہے اور یہ تقسیم رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقہ کی طرح کسی خاص مذہبی اصولوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ ہندو اور مسلمان بلحاظ سوسائٹی دو جداگانہ فرقہ ہیں جو ازل سے علیحدہ چلے آرہے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ ابد تک اسی طرح علیحدہ رہیں گے۔ کیا کوئی شخص خیال کر سکتا ہے کہ جس قوم میں اس قسم کے دو فرقے ہیں وہ قوم کبھی ایک ہو سکتی ہے یا جس ملک میں اس قسم کی سوشل تقسیم ہو وہ ملک کبھی ترقی کر سکتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تو پھر کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم سب اس مسئلہ پر غور کریں اور اپنے اپنے طور پر قومی استحکام اور قومی فلاح کے وسائل اور تدابیر سوچیں اور اُن کو عمل میں لائیں۔

ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ ان دو فرقوں کے ہوتے ہوئے بھی ملک ترقی کر سکتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر ایک فرقہ کا الگ الگ اپنی بہبودی چاہنا کل قوم کی ترقی کے مانع نہیں ہے۔ بلکہ ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ سوشل اتحاد کے ذریعے یکجہتی قایم کرنا ایک امر محال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری قوم عمر رسیدہ قوم ہے اور عمر رسیدہ قوم عمر رسیدہ شخص کی مانند کایا پلٹ تبدیلی نہیں کر سکتی اُن کے خیال میں ہندوستان میں مختلف فرقوں کا ایک مجموعہ قائم ہو سکتا ہے اور اس مجموعے کے قائم کرنے کے لئے ہم سب کو کوشش کرنی چاہئے لیکن میرے نزدیک عمر رسیدہ قوم و عمر رسیدہ آدمی کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ ہے۔ قوم کا جوان یا عمر رسیدہ ہونا کسی خاص زمانہ پر منحصر نہیں ہے۔ جو قوم آج جوان ہے وہ پچاس برس پیشتر عمر رسیدہ ہو سکتی تھی یا جو اب عمر رسیدہ ہے وہ پچاس برس بعد پھر جوان ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جوان اور عمر رسیدہ یہ دو الفاظ کئی معنی میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہما

ہندوستان عمر رسیدہ بھی ہے اور ساتھ ہی جوان بھی ہے۔ عمر رسیدہ تو اس وجہ سے ہے کہ یہ زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے اور جوان اس خیال سے ہے کہ اسکو زمانہ کی رفتار کے مطابق چلکر اپنے تئیں ایک زبردست اور طاقتور قوم بنانا ہے۔ اس لئے ہم اس معنی میں ناقابل ریفارم نہیں ہیں جس معنی میں کہ ایک عمر رسیدہ آدمی ناقابل ریفارم ہے۔ جہاں جہاں ہم اصلاح نہیں کر سکتے ہیں وہاں ہماری اولاد اصلاح کر سکتی ہے جن جن باتوں میں ہمارے بزرگوں نے ریفارم نہیں کیا ہے ان میں ہم ریفارم کر سکتے ہیں۔ کوئی مجموعہ مختلف فرقوں کا قائم نہیں رہ سکتا۔ تاوقتیکہ وہ مختلف ریاستوں کا مجموعہ نہو اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ مختلف ریاستوں کا مجموعہ نہو اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ مختلف فرقوں کا لحاظ رکھکر قائم نہیں رہ سکتا تاوقتیکہ وہ مختلف ریاستوں کا مجموعہ نہو اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ مختلف فرقوں کا لحاظ رکھکر ہندوستان کی تقسیم کر دیجائے۔ اور ہر اک فرقہ کو اسکا حصہ رسدی دیدیا جائے ظاہر ہے کہ ایسی تجویز پر عمل کرنا گویا اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارنا ہے۔ ہندو مسلمانوں میں اگرچہ اختلافات ہیں اور زبردست اختلافات ہیں مگر تو بھی آپس میں مصالحت ہے اس تقسیم کے ذریعے تو آئے دن جھگڑا اور فساد ہونے کا اندیشہ ہے اور جو تھوڑی بہت قابل اطمینان حالت ہند کی اس وقت ہے وہ بھی معرض خطر میں آجائے گی آیندہ ترقی و بہبودی کا تو ذکر کیا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ جب تک مذہب ایک نہو اسوقت تک قوم ایک نہیں ہو سکتی ہے گویا اُنکے نزدیک مذہب ہی اک ایسی چیز ہے جسپر قومی عمارت قائم رہ سکتی ہے یہ خیال بھی ایک حد تک قابل پذیرائی نہیں ہے۔ قومیت کیلئے تمام ملک کا ہم مذہب ہونا ضروری نہیں بلکہ قومیت کے لئے ضروری بات یہ ہے کہ ہم سب کی گذشتہ تاریخ ایک ہو ہم سب کی ر(اتحاد ایک ہو)

بعض اصحاب انگلستان کی مثال لکھکر کہیں گے کہ اگر انگلستان مسیحی مذہب اختیار نکرتا تو انگریز کبھی ایسی زبردست اور متفق قوم نہیں ہوسکتے - مگر ان کو شاید یہ بات معلوم نہیں ہے کہ انگلستان میں مسیحی مذہب کے ہوتے ہوئے بھی بہت سے فرقے ایسے موجود ہیں جو بلحاظ مخالفت و تعصب باہمی کسی حالت میں ہمارے ملک کے مختلف مذہبی فرقوں سے کم نہیں ہیں - اس میں شک نہیں کہ قومی پود کے نشو و نما میں مذہب ایک حدتک حصہ لیتا ہے مگر یہ کہنا کہ اس کے لیے صرف مذہب ہی ضروری شے ہے اور باقی سب باتیں غیر ضروری تاریخ کی عبارت کو غلط جامہ پہنانا ہے - تاریخ کا ایک ہونا - ہم وطنی - ہمزبانی - ایک ہی قسم کی تعلیم و تربیت پانا - ایک ہی نسل سے ہونا وغیرہ وغیرہ یہ باتیں ہیں جو دراصل قوم کی ترکیب میں حصہ لیتی ہیں - مذہب کے جزو اعظم بلکہ جزو ضروری خیال کئے جانیکی بڑی بھاری وجہ غالباً وہ ظالمانہ و شرمناک حرکات ہوئی ہیں جو اگلے زمانہ کے فرمانرواؤں سے اپنی رعایا کو اپنا ہم مذہب بنانے کی غرض سے سرزد ہوئیں لازم تھا کہ اس قسم کی کوشش رائیگاں جائیں چنانچہ وہ رائیگاں گئیں - اور طرفہ یہ ہے کہ جس قدر اور جس حدتک لوگوں کو ستا ستا کر مذہب پھیلانیکی کوشش بے سود ہوئی - اسی قدر اور اس حدتک اس قوم میں ترقی اور عروج کے آثار نمایاں ہوتے گئے - موجودہ زمانہ کی بڑی بڑی قوموں کو دیکھئے - جہانتک کہ قول و اعتقاد و خیالات کا تعلق ہے ہر ایک بشر اپنا آپ مالک و خود مختار ہے - چاہے جیسے اُسکے ذاتی خیالات ہوں چاہے جیسے اسکے مذہبی عقائد ہوں - کسی دوسرے شخص کی مجال نہیں ہے کہ اُسکو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے اس پر کسی قسم کا جبر کرسکے - اور یہی ان قوموں کی عظمت و بزرگی کا بڑا بھاری راز ہے - اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جس ملک میں مذہبی آزادی نہیں ہے وہی ملک روز بروز تنزل

کرتا جاتا ہے اور آخر کار برباد ہو جاتا ہے اور واقعی بات بھی ہے کہ مذہب تو صرف ایمان اور اعتقاد کی بات ہے سوشل اور پولیٹکل معاملات سے اسے کیا بحث۔ مگر ہمارے ملک میں اسنے ایسا سکہ جما دیا ہے کہ عقل حیران ہے۔ زمانہ بھر کے معاملات میں خواہ اسکے متعلق ہوں یا نہوں یہ زبردستی دخل دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سنگ نشان بننے کے بجائے یہ ہماری ترقی کا سنگ راہ بن رہا ہے

پس اگر ہندو اور مسلمانوں میں ملک کی تقسیم کرنا ایک محال اور احمقانہ کارروائی ہے اور تمام ہند میں ایک مذہب کا رائج کرنا اک ناممکن اور جاہلانہ خیال ہے تو کیا ہم اس شگاف کو کسی اور طریقہ سے بند نہیں کر سکتے۔ یہ صاف عیاں ہے کہ اصلی اتفاق جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ کسی طرح وہ سب باتیں رفع کی جائیں جنکی باعث سے قوم دو مختلف سوشل فرقوں میں منقسم ہے۔ اور ان کے رفع کرنے کی صرف یہی ترکیب ہو سکتی ہے کہ دونو قوموں میں شروع شروع میں باہمی خورونوش اور بعد میں باہمی ازدواج کی آزادی ہو۔ یہ اس قسم کی آزادی نہونے کی وجہ تھی کہ ہندو مسلمان آپس میں ایکدوسرے کو دو جداگانہ قوم تصور کرتے ہیں۔ اور یہ خیال کہ ہم دو قومیں ہیں برابر قائم رہیگا جب تک کہ دونو قومیں ایک ہی دسترخوان پر کھانے پینے نہ لگیں اور آپس میں ایک دوسرے سے اس قسم کا برتاؤ نکریں جیسا کہ برادری میں ایک بھائی دوسرے بھائی سے کرتا ہے اسی آزادی کے ذریعے سے ہم موجودہ درز کو بند کر سکتے ہیں۔ اسی آزادی کی بدولت فریقین یہ سمجھ سکتے ہیں کہ باوجود مذہبی تفرقات کے وہ دونو درحقیقت ایک ہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی لمبی ذقن ہے مگر ایسے فرقوں میں جو ہمیشہ سے ایکدوسرے کو سوشل نقطۂ نظر سے اپنا متضاد سمجھ رہی ہیں باہمی اتحاد پیدا کر کر ان کا ایک قوم بنانا بھی تو کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہی

ایک علاج ہے جس سے مختلف فرقوں میں اتحاد ہو سکتا ہے۔ یہی ایک ترکیب ہے جس سے ہم لوگ ایک قوم بن سکتے ہیں۔

بعض لوگ اس سوشل اتفاق کی فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف نسلوں سے ہیں اور اسلئے ان کے باہمی اختلافات ایسے زبردست ہیں کہ ان میں سوشل اتفاق نہیں ہو سکتا۔ مگر جو لوگ اس قسم کا اعتراض کرتے ہیں وہ شاید ہند کی تواریخ اور خصوصاً ہند کی تبدیل مذہب کی تاریخ سے واقف نہیں ہیں۔ اسلام چونکہ اک غیر مذہب ہے اسلئے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اہل اسلام بھی غیر نسل کے ہونگے۔ مگر یہ اُن کی سراسر غلطی ہے۔ یہ تو تاریخی واقعہ ہے کہ ہند کے بیشمار مسلمان اس نسل سے ہیں جو اہل اسلام کے آنے سے پیشتر ہند میں آباد تھی۔ ساتھ ہی ہمکو یہ خیال بھی رکھنا چاہئے کہ جن مسلمان قوموں نے ہند پر حملے کئے اُن میں بہت سی اس نسل سے تھیں جس سے کہ زمانہ سلف کے ہندو تھے۔ چنانچہ ہم بلحاظ نسل بھی ایک ہی ہیں۔ اہل اسلام میں سے چند خاندان جو اپنے تئیں غیر نسل کا ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں وہ بھی اب ہندوستانی کہلائے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ اُنہوں نے اس سرزمین کو اختیار کر لیا ہے۔ اور محض یہ امر کہ وہ اصل میں غیر نسل سے ہیں فی زمانہ کسی صورت میں سوشل اور قومی اتحاد کے مائل نہیں ہو سکتے ہیں۔ ہم کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم سب ایک ہی ماتا یعنی ہندوستان کی اولاد ہیں۔ ہماری بہتری یا بربادی سب کے ساتھ ہے۔ اگر ہم گریں گے تو سب کے ساتھ گریں گے اور اگر ہم اُٹھیں گے تو سب کے ساتھ اُٹھیں گے

بعض آدمی کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ بہت بجا اور صحیح ہے مگر ابھی ہندو مسلمانوں میں سوشل اتحاد کا وقت نہیں آیا ہے۔ ان کی رائے میں یہ کام

ہندوؤں میں جو مختلف ذاتیں یا شاخیں ہیں اول انہیں سے شروع ہونا چاہیے اور جب ان شاخوں یا ذاتوں میں آپس کھانا پینا اور شادی بیاہ ہونے لگیں اسوقت اس سوشل ایجاد کی کوشش کیجائے۔ اصلی اور پائدار سوشل ترقی یک لخت نہیں ہوسکتی۔ ایک ایک زینہ چڑھکر آدمی بلندی پر پہونچتا ہے۔ سوشل ترقی ہمیشہ بتدریج اور سہولیت کے ساتھ ہونی چاہیے۔

بڑی بھاری غلطی جو اس دلیل میں ہے وہ یہ ہے کہ شروع ہی میں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اتفاق کی تکمیل تک پہونچنے کے لئے یہی قدرتی رستہ ہے کہ پہلے چھوٹی چھوٹی ذاتیں ملائی جائیں اور پھر ان سے بڑی ذاتیں ملائی جائیں اور پھر ان سے بڑی ذاتیں۔ حتیٰ کہ آخر میں دو بڑے اور مختلف فرقے مثلاً ہندو و مسلمان خلط ملط کر دئے جائیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ وہ اس وجہ سے قدرتی معلوم ہوتے ہیں کہ وہ ہمیں سوسائٹی کی چھوٹی تقسیم سے بڑی تقسیم کی جانب لیجاتے ہیں۔ مگر اس امر کو وہ لوگ یاد نہیں رکھتے کہ موجودہ سوشل تفریق اور امتیاز بذات خود نہایت ہی فرضی اور مصنوعی ہیں۔ موجودہ صورت میں ترقی بلاشبہ بتدریج ہوگی لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ ترقی انہیں طریق پر ہو جسکی کہ یہ لوگ صلاح دیتے ہیں۔ قدرتی طریقہ یہ نہیں ہے کہ پہلے مختلف فرقوں کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ایک ہوں اور پھر اسکے بعد وہ مختلف فرقے ملیں بلکہ قدرتی طریقہ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی شاخوں اور ذاتوں کے اتحاد کی نظیروں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے فرقوں کے اتحاد کی نظیریں بھی ظہور میں آتی جائیں۔ اس طرح سے سوسائٹی میں قوتیں کام کرتی ہیں اور اپنا اثر دکھاتی ہیں۔

وہ زمانہ جبکہ اہل ہند اپنے ملک کی چار دیواری میں اپنے تئیں بند رکھنا اپنا دھرم سمجھتے تھے اب جاتا رہا ہے اور غالباً ہمیشہ کے لئے جاتا رہا ہے ہم اب دنیا کی

دیگر قوموں کے ساتھ ربط و ضبط پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ غیر اقوام کو ہندمیں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور نہ ہم ہی دیگر ممالک میں سیاحت کئے بغیر رہ سکتے ہیں سیر و سیاحت ایسی تعلیم ہے کہ جو سخت سے سخت تعصب کو موم بنا دیتی ہے آجکل کی تہذیب ان طریقوں سے باہمی تفاوتوں اور اختلافات کو برابر کر رہی ہے اسی قسم کی تہذیب کی موجودگی میں کیا ہندوستان اپنی پرانی حالت پر قائم رہ سکتا ہے۔ کیا وہ ان قوتوں کے مقابلہ میں ٹھیر سکتا ہے جو اسکے تعصب کے مضبوط قلعوں پر حملہ کر رہی ہیں۔ کیا مذہب سے خورد و نوش اور شادی بیاہ کی بجائے روز بروز ایمان اور اعتقاد مراد نہیں لیجاتی ہے۔ ذرا ان ہندوستانیوں کی مثال لکھکر دیکھو جو غیر ملک میں شادی کرتے ہیں اور غیر اقوام کی بیویاں لیکر اپنے وطن کو واپس آتے ہیں۔ کیا اس کارروائی کی بابت تعجب روز بروز کم نہیں ہوتا جاتا ہے اور کیا اس قسم کی شادیوں پر مخالفت روز بروز بیکار ثابت نہیں ہوتی جاتی ہے۔ پس اگر ہم غیر ملک کے باشندوں کے ساتھ کھا پی سکتے ہیں غیر اقوام کی اناث کو اپنی زوجیت میں لا سکتے ہیں تو کیا یہ خیال کہ ہم اپنے ہموطنوں کے ساتھ کھا پی اور شادی بیاہ نہیں کر سکتے عجیب اور بیہودہ معلوم نہیں ہونے لگا ہے بعض مذہبی فرقوں مثلاً آریہ سماج اور سکھوں نے اپنے مذہبی خیالات اور عقائد کو ترقی دینے کے جوش میں ان لوگوں کو اپنے میں شامل کرنا شروع کر لیا ہے جو پہلے کسی حالت میں شامل نہیں ہو سکتے تھے ایسے لوگوں کی تعداد اسمیں شک نہیں ابھی بہت کم ہے لیکن یہ آثار ہیں اس امر کے کہ ایک نئی قوت ایسی پیدا ہو چلی ہے جو قوم کو ایک بنانے میں بہت بڑا اثر رکھیگی۔ ممکن ہے کہ ہمارے مسلمان اور عیسائی بھائی اپنے مذہبی خیال سے اس قسم کی تبدیلی خیالات کو پسندیدہ خیال نہ کریں مگر حسب نقطہ نظر کے ہم سوسائٹی کو دیکھتے ہیں اس نقطہ نظر سے یہ علامت ہے اس بات کی

کہ زمانہ بدل رہا ہے۔ یہ علامات بتا رہی ہیں کہ پرانی دیواریں گرتی جا رہی ہیں اور سوشل فرق و امتیاز کے بلند بلند پہاڑوں کا سلسلہ جو قوم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کئے ہوئے تھا اب ناقابلِ عبور و گزر نہیں رہیگا۔ اور ایک دن ایسا آنے والا ہے جبکہ یہ سوشل تفاوتیں بالکل معدوم ہو جاوینگی اور در جو اب نظر آتی ہے بالکل بند ہو جائے گی۔

مگر مذکورہ بالا سطور سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم ان دقتوں اور ان مشکلات کو جو اس راہ میں پیش آئیں گی تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ فی الحال تو ہم صرف ابتدا کر سکتے ہیں۔ پورے پورے اتفاق اور اتحاد کے واسطے زمانہ چاہئے مہم بڑی سخت اور زبردست ہے۔ پیچ اور تعصب بڑی زیادتی پر ہیں۔ ایک مسلمان لڑکی کا ہندو خاندان میں یا ہندو لڑکی کا مسلمان خاندان میں ہونا آن زمانہ دو مخالف عناصر کی جنگ سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بھی اس قسم کا خیال کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ خیر یہ سب دقتیں تو ہیں ہی مگر ان کے علاوہ ایک اور مشکل بڑی بھاری یہ ہے کہ ہندوؤں کے دھرم شاستر اور مسلمانوں کے شرع میں خاصکر شادی اور وراثت کے بارے میں بہت کچھ اختلافات ہیں۔ سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں پر جو اس طور پر شادی کریں یا ان کی اولاد پر کس قانون کا اطلاق ہوگا۔ اور واقعی یہ ایسا سوال ہے جس کا حل کرنا ضروری ہے پیشتر اسکے کہ اس قسم کے سوشل اتحاد کی کوشش کیجائے۔

بادی النظر میں اتفاق قومی نہایت ہی مشکل اور ناممکن معلوم ہوتا ہے مگر مشکلات گو بہت ہیں لیکن ایسی نہیں ہیں کہ حل بھی نہ ہو سکیں۔ جذباتی روک اور تعصبات اس وجہ سے سدِ راہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے خیالات اس کے عادی ہو گئے ہیں جب یہ عادت بدلیں گی تو پھر ان رکاوٹوں کا بھی پتہ نہیں رہیگا۔ شروع شروع

میں ہمیں آزاد اور روشن خیال آدمیوں کی جو ان امور میں دلچسپی رکھتے ہیں ایک کمیٹی بنانی چاہئے جو یہ صلاح دے کہ اس تجویز پر کس طرح عملدرآمد ہونا چاہئے اور کیا کیا طریقہ اور ذریعہ اختیار کئے جاویں تاکہ کام برابر سرگرمی سے جاری رہے قانونی مشکلات کے حل کرنے میں کمیٹی بعض حالتوں میں موجودہ قانون پر کاربند رہنے کی صلاح دے سکتی ہے اور اگر ضرورت محسوس ہو تو گورنمنٹ سے درخواست کرسکتی ہے کہ نیا قانون بنایا جائے جو ان لوگوں پر عائد ہو سکے۔ اس کے علاوہ کمیٹی اُن وقتوں کے رفع کرنے کی تدبیر بھی نکال سکتی ہے جو محض سوسائٹی یا ذاتی جذبات سے تعلق رکھتی ہیں۔

مگر ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کام کی ابتدا روشن اور آزاد خیال طبقہ میں ہو اور وہ بھی شروع شروع میں گھر کے اور دلی دوستوں میں۔ ورنہ سوشل اتحاد ناممکن ہے۔ تھوڑے سے آدمی بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ اگر مہینہ میں ایک دفعہ یا دو دفعہ دوست احباب اک جگہ اکٹھے ہوا کریں۔ بات چیت کیا کریں ساتھ مل کر کچھ کھایا پیا کریں تو اس سے بھی سوشل اتحاد کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایک شخص اپنے گھر کے لوگوں کا دوسرے دوست کے گھر کے لوگوں سے (بشرطیکہ وہ آپس میں سچے دوست ہوں) تعارف کرائے اور اس بات کا موقعہ دے کہ وہ کھانے پینے کے معاملہ میں آپس میں اسطرح برتاؤ کریں گویا وہ ایک ہی پایہ اور ایک ہی ذات کے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو تفاوت اور فرق ان کے تعلقاتِ باہمی میں اس وقت نظر آتا ہے وہ رفتہ رفتہ بالکل جاتا رہے گا۔ اور چونکہ دونوں فریق کو پوری پوری آزادی دیجاوے گی اسلئے بہت ممکن ہے کہ اس قسم کی پرائیویٹ ملاقات بڑھتے بڑھتے بعض حالتوں میں شادی کا باعث ہوجائیں۔ ہمیں چاہئے کہ شائستہ اور مہذب سوشل جلسوں میں

باہمی اتحاد بڑھانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیں اور جہانتک ہوسکے تبدیلی خیالات وجذبات کے ذریعے ایک دوسرے کی طبیعت اور مزاج کے سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ ہم میں دوسروں کی غلطیوں کو درگزر کرنے اور آپس میں میل جول بڑھانے کا خیال اور شوق پیدا ہو۔

ہندوستان میں سوشل اتحاد قائم کرنے کا خیال بجا اور سلیم اور حب الوطنی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ یہ خیال ہماری قومی غرض اور مفاد کے لئے مفید ثابت ہوگا گو کٹر اور پرانے خیالات کے لوگ اسکی مخالفت کریں اور یقین ہے کہ وہ ضرور کرینگے مگر ہماری ہمت بڑھانے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ ہم تبدیل شدہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ چل رہے ہیں۔ بقول کسیکے ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

ہم مغرب کی ایسی تہذیب اور روشنی کے قدم بقدم چل رہے ہیں جسکی وجہ سے ایسی ایسی انسانی طبیعتوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوگیا ہے جس میں پیشتر بلحاظ خیالات میلوں بلکہ کوسوں کا تفاوت تھا۔ اور یہ ایسا وصف ہے جسنے موجودہ تہذیب کے تمام عیوب کو چھپا دیا ہے۔ مختلف فرقوں کو ملکر اب ایک قوم بننا چاہیے تاکہ وہ قومی غرض اور قومی مفاد کی ترقی میں زیادہ کامیاب ہوسکیں اور ان قوتوں پر جو انکی قومی ہستی کے مخالف ہیں فتح پا سکیں۔ اور نہ صرف مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب تر آنا چاہیے اور ملکر کام کرنا چاہیے تاکہ وہ قدرت پر غلبہ پا سکیں اور اسکی قوتوں کو زیر کر کر ان کی مدد سے اس اعلےٰ مقصد تک پہنچ سکیں جو ایک نہ ایک دن ان کو حاصل کرنا ہے۔

ہم سب کے لئے خواہ ہم سوشل یا مذہبی ریفارمر ہیں خواہ ہم اخلاقی معلم ہیں خواہ ہم پولیٹکل لیڈر ہیں، ہم سب کے لئے باہمی کوشش اور یکجا کام کرنے کے واسطے

ایک ہی پلیٹ فارم ہے۔ ایک ہی وسیع میدان ہے۔ یہاں ہم سب سچے اتفاق سچی شانتی سچی محبت اور سچے اتحاد کی تعلیم کر سکتے ہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر ہم نیک نیتی اور عقیدتمندی سے کام کرینگے تو ہماری کوششوں کا درخت ضرور پھل لائے گا۔ اور ہماری محنت و مشقت کا اجر ہمیں ضرور ملیگا۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری قوم کو ضرور عروج ہوگا۔ اور وہ زندگی کے مقصد اعلےٰ کے حاصل کرنے میں قابلِ تحسین حصہ لے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری قوم اور اُسکے ساتھ ساتھ نوعِ انسانی کے ناچیز ذرّے بلند ہوتے ہوتے ایک نہ ایکدن رفعت و بزرگی کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکیں گے۔ آؤ ہم سب ملکر علو ہمتی اور قوی اُمید کے ساتھ اس پسندیدہ مقصد تک پہنچنے کی سعی اور کوشش کریں۔ اور اس پاک اور مقدس کام کے سرانجام دینے میں ایکدوسرے کی مدد کریں۔

(ترجمہ) شمبھوناتھ۔

لطیفہ

ڈاکٹر صاحب۔ ادھر تمہارے یہاں بڑے مچھر معلوم ہوتے ہیں۔

مریض۔ نہیں جناب مچھر تو آجکل نہیں ہیں۔ کچھ پسوؤں کا زور ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ (کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے) غضب! غضب!!

مریض۔ کیوں جناب آپ تو مچھروں ہی کو خراب بتاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب۔ اب وہ موڈریٹ ہو گئے ہیں۔

مریض۔ تو کیا پسو ایکسٹریمسٹ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ بیشک ان سے بھی کہیں بڑھکر۔ انکو تو تھیلنسٹ سمجھنا چاہئے۔

شاعری جزویست از پیغمبری

پیغمبر اور شاعر میں صرف فرق یہ ہے کہ پیغمبر رموزِ فطرت کے اخلاقی پہلو کو دیکھتا ہے یعنی نیکی کا سکہ دلوں پر بٹھاتا ہے اور شاعر بقول جرمن فلسفیوں کے اُن رموز کے ایسٹھیٹک پہلو پر نگاہ ڈالتا ہے یعنی حسن اور اُسکے امثال پر اول الذکر ہمارے طریقِ عمل کو منضبط کرتا ہے اور آخر الذکر ہمارے مذاق اور پسند کو صحیح کرتا ہے لیکن دراصل انمیں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ پیغمبر بھی انھیں باتوں پر عمل کرنیکا حکم دیتا ہے جو قابلِ پسندیدگی ہوں۔ دنیا میں سب سے زیادہ دلفریب آواز یہ ہے "لالہ زار پر نگاہ کرو۔ اُسکا خوشنما لباس کسی نے کاتا ہے نہ بُنا ہے جو شان اُسمیں نکلتی ہے وہ نہ صرف حضرت سلیمان کی زرق برق پوشاک کو نصیب ہوئی نہ دنیا کے کسی شاہنشاہ کو" یہ پھول کاہے کو ہیں خوبصورت آنکھیں ہیں جو حسن کے بے پایاں اندرونی سمندر سے نکل کر اہلِ دنیا پر نگاہ ڈال رہے ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ گو دنیا بظاہر کتنی ہی بھاری کیوں نہو حسن کا دریائے ناپیدا کنار اُسکے اندر موجیں مار رہا ہے۔ اس پر کزنی کا قول یاد آتا ہے جو بظاہر حدِ اعتدال سے متجاوز ہے مگر کچھ معنی ضرور رکھتا ہے وہ کہتا ہے کہ حسن کا درجہ نیکی سے بھی بڑھا ہوا ہے کیونکہ حسن کے اندر نیکی بھی شامل ہے واقعی حق اور حسن باطل سے اس قدر ممتاز ہے جیسے بہشت دوزخ سے یہانتک تو پیغمبر اور شاعر کا فرق بیان ہوا۔

زمانۂ قدیم اور زمانۂ حال میں ہم اپنے زعم میں بعض شاعروں کو کامل تصور کرتے ہیں عیب جوئی کرنا الحاد سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ یہ امر قابلِ غور ہے۔ یہ بھی ایک اچھی بات ہے لیکن بغور دیکھیے تو اسمیں بڑا دھوکا ہے۔ سچ پوچھیے تو کامل شاعر کوئی نہیں ہو سکتا۔ شاعری

کا ایک مذاق سب کے دل میں موجود ہے لیکن کوئی شخص شاعری کا کامل ہوتا نہیں ہو سکتا اگر ہم کسی نظم کو مزا لیکر پڑھیں تو ہم شاعر ضرور ہیں۔ جو خیال ڈینٹی کے "دوزخ" کے حالات کے مطالعہ کے وقت ہم پر ایک ہولناک اثر ڈالتا ہے کیا وہ اُسی قوت کا جزو نہیں ہے جو خود ڈینٹی میں موجود تھی؟ گو وہ اُس سے کمتر درجے پر کیوں نہ ہو شیکسپیر کے سوا کسی کی طاقت تھی کہ سیکسو گریمٹیکس سے ہملٹ سا پُر اثر قصہ پیدا کر دے لیکن ہر پڑھنے والا کسی نہ کسی طور پر اُس سے ضرور ہوتا ہے اسمیں کمی اور بیشی کا ہونا اور بات ہے۔ اسکے متعلق کوئی کلیہ قائم کرنے کی کوشش فضول ہوگی جن دو چیزوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا اُن کی علیحدہ علیحدہ تعریف کرنا مشکل ہے۔ مثلاً شے مدور اور شے مربع کے درمیان امتیازی اصول قائم کرنا دقت سے خالی نہیں ایسے امتیازی اصول اگر ہو سکتے ہیں تو اعتباری ہو سکتے ہیں پایۂ شاعری کا مسلم ہونا صرف باعتبار مقابلہ ہوا کرتا ہے۔ یہ بات صرف اُنھیں کے لئے نہیں ہے جو کسی خاص قوم میں شاعرانہ حیثیت سے ممتاز ہوں بلکہ اُن کے لئے بھی جو دنیا کے شعرا میں ممتاز ہیں اور جن کو ہم بے عیب تصور کرتے ہیں۔ جو شخص معمولی شعرا کے مقابلہ میں ایک خاص حد تک ممتاز ہو اُسکو دنیا کے مشہور شاعروں میں جگہہ دیدی جاتی ہے لیکن یہ امتیاز فی الحقیقت محض اعتباری ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ بعض شاعر بھی مثل اور معمولی لوگوں کے کم و بیش ایسے خیالات رکھتے ہیں جو تمام عالم کے لئے پسندیدہ ہوں لیکن کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُسمیں سراپا یہ وصف بھرا ہوا ہے۔

کارلائل

طاعون

جب یہ مرض ہند میں مدت دراز کے بعد دوبارہ نمودار ہوا تب ہم سمجھتے رہے کہ جاڑوں میں نہیں گرمیوں میں۔ اِس سال نہیں دوسرے سال یہ ضرور ہی دفع ہوجائیگا لیکن برخلاف امید اِس نے رفتہ رفتہ اپنا پاؤں ایسا پھیلایا کہ اب تو یہ بھی فصلی بخار کی طرح جاڑوں کے اختتام پر ہندوستان کے کسی نہ کسی حصہ میں باقاعدہ نمودار ہونے لگ گیا ہے۔ اِس سے کتنی جانیں ضایع ہوتی ہیں اِسکا ٹھیک اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اِسکا صحیح اندازہ میونسپلیٹی کے رجسٹر اموات سے ہرگز نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ اکثر اشخاص دانستہ یا نادانستہ متعدی امراض کو "بخار" لکھواتے ہیں البتہ ایک ذریعہ صحیح تعداد اموات طاعون نکالنے کا یہ ہوسکتا ہے کہ پچھلے دس سال کی اموات کی تعداد انہی مہینوں کی کہ جب طاعون پھیلا کرتا ہے (مثلاً ہمارے شہر دہلی میں جنوری سے لیکر مئی تک) لے لی جائیں اور پھر اِن میں سے جن سالوں میں کہ طاعون نہ تھا اُنکی تعداد کو جمع کرکے اِن مہینوں کی اوسط اموات نکال لیجائے۔ پھر باقی سالوں کی بھی کہ جن میں طاعون تھا۔ اوسط موت اِسی طرح سے نکال لیجائے تو اِن دونوں اوسطوں کے فرق سے اموات طاعون زدہ کی تعداد کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ البتہ اسمیں مردم شماری اور دیگر کسی خاص مرض کی تعداد کو بھی (اگر ہو) مدنظر رکھنا پڑیگا۔ مثلاً اگر اِس شہر کی امن کے سالوں میں اپریل کے مہینے کی اوسط تعداد موت تیس ۳۰ روزانہ ہو اور اِس سال ۵۰ ہو تو ہم خیال کرسکتے ہیں کہ اِس سال تقریباً بیس ۲۰ اشخاص روزانہ طاعون سے ضایع ہوئے۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین رسالہ زبان کے چند محب قوم کچھ تکلیف اُٹھا

گوارہ کرکے اپنے شہروں کی اموات طاعون کی تعداد جو رجسٹروں میں درج ہے اور جو اس طریقہ سے نکلتی ہے مفصل لکھ کر ہمیں شکریہ کا موقع دینگے۔ اور پھر جو تجاویز آئندہ سال اس موذی مرض کے روکنے کے لئے پیش کیجاتی ہیں اسکے متعلق اپنے خیال سے ہمیں مطلع کرینگے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کبھی دفع بھی ہوگا یا نہیں۔ میرے خیال میں کچھ عرصہ کے بعد یہ دفع تو ضرور ہو جائیگا۔ جیسا کہ تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوا ہے۔ کہ پہلے بھی یہ ہندوستان میں کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔ اور جلد جاتا رہا ہے۔ لیکن اُن زمانوں میں چونکہ آمد و رفت کی اس قدر سہولت نہ تھی اسلیئے یہ بیماری نہ تو کبھی عالمگیر ہوئی اور نہ اتنے دنوں تک قائم رہی۔ جہاں ہوتی تھی وہاں کے تمام ایسے شخصوں کو کہ جنمیں اس زہر کے قبول کرنے کی خصوصیت تھی ختم کرکے چند دنوں کے اندر معدوم ہو جاتی تھی۔ اب یہی کارروائی کل ہندوستان پر ہو رہی ہے اور اس لیئے ایک مدت دراز اور کثیر التعداد اموات کے بعد غالباً یہ ہند سے جاتی رہے گی۔ البتہ اگر ہم کُل ملکر اسی قدرتی طریقہ حفاظت کی مدد کریں تو ہم ضرور اسکی مدت اور تعداد اموات کو گھٹا سکتے ہیں۔ وہ کیونکر۔ دیکھنا چاہیئے۔ کہ جس وقت وبا کسی گھر میں پھیلتی ہے تو غالباً اسی مکان کے جتنے رہنے والے ہیں سب کچھ نہ کچھ اسکے زہر سے موثر ہوتے ہیں۔ اسمیں سے چند یا تو بوجہ خاص کمزوری یا مقدار زہر کی زیادتی سے فوت ہو جاتے ہیں۔ باقی بچ جاتے ہیں۔ اور غالباً اس زہر کے عادی ہو جاتے ہیں اسی بنا پر ہیفکن صاحب کا ٹیکہ نکالا گیا ہے اسمیں خاص مقدار پلیگ کا کُشتہ[1] زہر جسم کے اندر اس مقدار میں ڈالا جاتا ہے۔

[1] معمولی حالت میں خفیف مقدار پلیگ کا زہر بھی انسانی جسم میں بیج کی طرح پھیل کر باعث ہلاکت ہو سکتا ہے اسلیئے مرا ہوا زہر ٹیکہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

کہ بغیر کسی خاص نقصان وہ انسانکو چھ ماہ یا سال بھر کے لئے پلیگ سے محفوظ کر دیتا ہے۔ اور اسطرح باقاعدہ کوشش سے ملک کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

ہماری رائے میں اس مرض کے دفعیہ کے لئے جب تک عوام الناس میونسپلٹی یا گورنمنٹ کے ساتھ ملکے کام نہیں کرینگے۔ تو کوئی یکطرفہ کوشش سے کامیابی کی امید نہیں رکھنی چاہئیے۔ ہمیں شرم کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ اب بھی سینکڑوں جاہل اس وبا کے لئے گورنمنٹ پر الزام لگاتے ہیں۔ میرے ایک اُستاد نے جو کہ پنجاب کے ہیلتھ افیسر تھے۔ اثناء لیکچر میں یہ فرمایا تھا۔ کہ عوام الناس کا یہ خیال ہے کہ فی موت انکو سرکار سے پانچ روپیہ ملتے ہیں افسوس!۔ ایسے جاہل مُلک سے یہی امید کیجا سکتی ہے۔ پھر طاعون کے ٹیکہ کی بابت جو عجیب وغریب افواہیں ہیں وہ بھی سرکار کی نیک کوششوں کی سدراہ بنجاتی ہیں۔ ہم سرکار کے سامنے یہ طریقہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ بجائے سرکاری ڈاکٹروں کے ٹیکہ کا کام عام معالجوں کے سپرد کرتی تو کم از کم بڑے بڑے شہروں میں یہ نہایت کم خرچی سے ہو جاتا۔ اور ایک دفعہ جب اسکی بابت اچھی رائے قائم ہو جاتی تو گاؤں میں بھی وہ دقتیں پیش نہ آتیں۔ چنانچہ مجھے بتایا گیا کہ شاہدرہ میں بہت سے اشخاص ٹیکہ کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور طاعون سے بچنے کے لئے ایک نئی دیبی بنام گلٹی دیبی ایجاد کر دی!

دوئم۔ علاوہ ٹیکہ کے چوہوں کا باقاعدہ پکڑوانا اور سرکاری آدمیوں کے ذریعہ سے روزمرہ محلہ کے ہر ایک گھر سے اُنکا جمع کروانا۔ اور باقاعدہ دفع کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ ورنہ اپنے گھر کی بلا ہمسایہ کے یہاں

ڈالنا ہم لوگوں کے یہاں بڑا دھرم کا کام سمجھا جاتا ہے! لیکن ہمارے یہاں کے پرانے دھرم شاستر یعنی ویدونمیں چوہے اور کاٹنے والے کیڑوں کو (مثلاً بتو، مچھر وغیرہ) مارنے کے لئے حکم موجود ہے۔ غالباً آپ یہ بزرگ ان کے نقصان دہ آثار سے واقف تھے۔ ظاہر ہے کہ انسانکی جان چوہے سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ مرض شروع شروع چوہونمیں پھیلتا ہے اور پھر چوہوں سے پسوؤں کے ذریعہ انسان میں سرایت کرتا ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے۔ کہ تازہ مرے ہوئے چوہے پر سے پسو اڑکر انسان کے بدن پر جا بیٹھتا ہے۔ اسلئے تازہ مرے ہوئے چوہے کے پاس کچھ عرصہ نہیں جانا چاہیئے۔ خاصکر کالا چوہا اس مرض میں زیادہ مبتلا ہوتا ہے۔ لیکن گھر کے معمولی بھورے چوہے یہانتک کہ چوہیونکو بھی طاعون میں مبتلا دیکھا گیا ہے۔ لہذا سب چوہونکو دفع کر دینا صحت انسانی کے علاوہ نقصان کے خیال سے بھی ضروری ہے یہ بات قابل لحاظ ہے کہ چوہے ٹین کے برتن کو نہیں کاٹ سکتے۔ اور بودار چیزوں سے بھاگ جاتے ہیں۔ لہذا گھر میں کھانے پینے کی چیزیں ٹین یا دیگر دھات کے برتنونمیں بند رکھنی چاہیئں۔ اور انکے بلوں کے پاس مٹی کا تیل چھڑکنا چاہیئے۔

سوئم۔ مکانونکی تعمیر کے متعلق میونسپلٹی کو چند طبی اصولونکا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ کوئی مکان آیندہ بغیر مقابل کھڑکیوں کے دکراس وینٹیلیشن نہ بننے پائیں۔ یعنی ہر ایک مکان کے ارد گرد کچھ زمین چھوڑی جائے۔ مکانونکی موری اور فرش کی بناوٹ پر بھی میونسپلٹی کی نظر ہونی چاہیئے اور پھر کرایہ کے مکانونمیں فی مکان کتنے آدمی بسائے جائیں۔ اس پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ صیغہ مکانات میں ہم کسی اور موقعہ پر یہ بھی تجویز کر چکے

ہیں کہ سرکار اگر لوگونکو گنجان شہرون کے باہر افتادہ زمینوں میں عمدہ مکان بنانے کے لیئے امداد کرے تو کچھ دنوںمیں شہر کے باہر ایک نہایت خوبصورت بستی آباد ہوسکتی ہے۔ جس سے میونسپلیٹی کو بہت فائدہ ہوگا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ فی زمانہ تمدن کی رو سے بڑے بڑے شہرونکی آبادی بمقابلہ گاؤن اور قصبہ جات بہت تیز رفتاری سے بڑہتی جائیگی۔ اِس کثرت آبادی کے لئے اگر رہنے کا معقول انتظام ہو تو صحت پر اسکا مضر اثر پڑتا ہے ایک دوسری تدبیر یہ ہے۔ کہ گنجان محلوں کے بیچ میں سے ردی مکانات خرید کر بڑے بڑے چوک بنوا دئے جائیں اور اُن کے چاروں طرف دکانیں آباد کردی جاویں کہ اسمیں شروع میں بہت روپیہ کی ضرورت ہے۔ پھر بھی میونسپلیٹی اور ممالک کی طرح پر دمیسری نوٹس کے ذریعہ سے روپیہ جمع کرسکتی ہے۔

چہارم۔ علاوہ اِن تجاویز کے جو مرض کے روکنے میں پیش کی گئیں ہیں اِس وبائی مرض کے علاج کے لئے بھی خاص ہسپتال کی ضرورت ہے کیونکہ گھروںمیں نہ صرف مریض کی اسقدر خدمت ہوسکتی ہے۔ جتنی کہ طبی رو سے ہونی چاہیئے۔ بلکہ تیمارداری کے قواعد نہ جاننے سے علاوہ مریض کو نقصان پہونچنے کے یہ وبا محلومیں پھیل جاتی ہے۔ اِس لیئے اسکا علاج شہر کے باہر کھلی جگہون پر خاص ہسپتالوںمیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں پبلک ہسپتالونکا خوب تجربہ ہے اور شاید ہم کسی حالت میں خود اِن ہسپتالوںمیں جانا پسند نہ کریں۔ لیکن جب تک پبلک ہسپتال قابل اطمینان نہ ہو جائے (جسکے لئے ہمیں گورنمنٹ کی توجہ دلانی چاہیئے)۔ ہمیں خود پرائیویٹ ہسپتال کھولدینے چاہئیں۔ جسکا انتظام تعلیم یافتہ

معالج اور سمجھدار پنچونکے سپرد کیا جائے۔ ہمارے ہموطن ہزاروں روپیہ مندر مسجد دہرم شالہ۔ کوؤں وغیرہ پر لگاتے ہیں کیا ایسے کام کے لئے انکا فرض نہیں ہے۔ کہ شہر کے باہر ایک مستقل احاطہ بنوادیں کہ جسکے اندر عارضی طور سے حسب ضرورت چھپر کے مکان بنوادئے جاوین۔ (جو بعد استعمال جلادئے جاوین) زمانہ سلف میں بھی طاعون و دیگر وبائی امراض کے لئے کورن ٹین کا قاعدہ جاری تہا۔ لیکن جسوقت سرکار عالیہ نے اُسکو تجویز کیا اسوقت ہمارے حب الوطن بھائیون نے بجائے اسکی دقتون کے رفع کرنے کی کوشش کے اصول کورن ٹین کے برخلاف بڑبڑانا شروع کیا حتیٰ کہ سرکار کو وہ مفید کارروائی چھوڑ دینی پڑی۔ کسی زمانہ میں کورن ٹین کے قواعد اس قدر سخت تھے کہ آجکل ہم اسکو وحشیانہ بتلائیں گے۔ چنانچہ کتھا کوشش کے ایک قصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں اگر کسی مکان میں وبائی مرض یعنی ماری روگ ہوتا تہا تو دروازے میں تیغہ لگا کر زندہ و مردہ سبکو بند کر دیا جاتا تہا۔ لیکن آجکل کیا ہم اتنی تکلیف گوارا نہین کرسکتے کہ مریض کو کسی خاص ہسپتال میں بھیج دیں کہ جس سے نہ صرف اسکو فائدہ ہو بلکہ خلق خدا اُسکی بدقسمتی سے مصیبت میں نہ پڑے۔

متعلق علاج ہم ناظرین کو بیشمار اشتہاری مخفی ادویہ کے خطرون سے آگاہ کرتے ہین جنکی تعریف کے طومار سے خوف زدہ پبلک تو درکنار بعضے ضعیف الاعتقاد معالج بھی بھلاوے میں آجاتے ہین۔ میں صرف مخفی ادویہ کا ذکر کرتا ہون جسکی اونچ نیچ اور طریقہ اثر کی بابت استعمال کرانے والے کو ہرگز کافی واقفیت نہیں ہوتی۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ بعض اوقات خاصکر وبا کے شروع اور آخیر کے دنوںمیں مرض کا زہر اس قدر ہلکا ہو جاتا ہے۔ کہ بعض

بغیر کسی علاج کے آرام پا سکتے ہیں۔ ایسے وقت مین معمولی بخار کی ادویہ دینے
میں بھی کوئی ہرج نہیں لیکن مخفی ادویہ پر بھروسہ کرکے خواہ اسمیں کتنے ہی
آدمیونکے سرٹیفکٹ موجود ہون۔ جو طب کے اصول سے ناواقف ہیں مریض
کی جان کو جوکھوں میں ڈالنا اور اسکو معقول طبی مدد سے محروم کرنا سخت غلطی
ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ سرکار عالیہ ضرور ان اشتہاری ادویہ کے متعلق کوئی
قانون بنائیگی جیسا کہ ولایت میں موجود ہے۔

مریض کے علاج کے علاوہ اسکے مکان اور کپڑونکا باقاعدہ ڈس انفیکٹ
کرنا اور دھکی حفاظت کے لئے بالکل لازمی ہے۔ سب سے آسان ڈس انفیکٹ
کرنے کا قاعدہ مکان کے اندر آگ دہکانا اور مریض کے بستر و کپڑے وغیرہ
کو کچھ دنوں کے لئے چھت پر دہوپ و ہوا میں ڈالنا ہے۔ چھوٹے موٹے
کپڑونکو جو مریض کے بول و براز و تھوک سے گندے ہوئے ہوں جلا دینا
چاہئیے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ کبھی کبھی دہوبی کے گھر سے آئے ہوئے کپڑے
اور نائی کے اوزاروں سے بھی اسکی چھوت پھیل سکتی ہے۔ اسلئیے دُہلے
ہوئے کپڑونکو بھی دہوپ و ہوا میں کئی دن تک رکھوانا چاہیئے اور نائی کے
ہاتھہ اور اوزار کاربولک سوپ سے خوب دُہلوانے چاہیئے۔

اخرش۔ سب سے ضروری اور مقدم بات یہ ہے کہ عوام الناس پر
ابتدائی تعلیم خواہ لڑکا ہو یا لڑکی فرض کردینی چاہیئے۔ بہتر ہے کہ خاص ٹکیس
قائم کرکے یہ تعلیم بغیر فیس کر دیجائے۔ تاکہ غربا کو بھی بار نہ معلوم ہو جبتک
عوام الناس کو پبلک ہیلتھ کے متعلق کچھہ واقفیت نہ ہو یہ کیونکر ممکن ہے کہ
وہ سرکاری اعلے و ادنےٰ افسرونکے ساتھہ ملکر کام کرسکیں۔ جو جو تدبیرین طاعون
کے دفعیہ کے لئے بتائی گئی ہیں یا جن پر ابتک عمل کیا گیا ہے۔ ان سے

کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آیا ہے۔ کیونکہ عوام الناس سرکار کی ہدایت کے بموجب کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اسکے لئے تعلیم کی ضرورت ہے جسپر ہماری قوم کے ایڈیٹر گوکھلے آج کل گورنمنٹ عالیہ کی توجہ دلا رہے ہیں۔

ناظرین رسالہ زبان سے ہماری یہ التجا ہے کہ وہ ایکدفعہ اس بات پر غور کریں کہ طاعون ہیضہ چیچک۔ تپ دق۔ اور ملیریا وغیرہ متعدی امراض سب کے سب کوشش سے کسی حد تک دفع ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے سبب سے جو سال بسال ہزاروں اشخاص قبل از وقت موت کے منہ میں جاتے ہیں اسکے لئے ہم ضرور کچھہ نہ کچھہ ذمہ ور ہیں۔ یاد رکھنا چاہئیے کہ موت علاوہ شخصی کے ایک قومی اور مالی نقصان بھی ہے۔ اسلئے محض اپنی جان لیکر طاعون سے بھاگ جانا۔ اور دوسروں کے لئے کچھہ نہ کرنا بھی ایک قسم کا گناہ ہے۔ جسکی سزا ہمیں ضرور ملیگی۔

ہر ایک دقت کو گورنمنٹ کے سر ڈالنا نہایت آسان ہے لیکن اپنے گریبان میں بھی منہ ڈالکر دیکھنا چاہئیے کہ ہمنے کہانتک سرکار کے ساتھہ کام کیا ہے خاصکر اس زمانہ بیداری میں جب ملک میں چاروں طرف سودیشی کی تحریک ہو رہی ہے۔ ہمت مرداں مدد خدا کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ کیا ہم بھی ان ناشکر گزار کج بحثوں کی طرح تمام رفارم کا بوجھہ گورنمنٹ کے سر ڈال کر گھروں میں آرام سے لیٹیں۔ آؤ ہمت کرو۔ جو جس سے ہو سکے۔ بلکہ ملک میں واقفیت پھیلا دیں۔ اور اگر ہماری طاقت سے باہر ہو اُس کے لئے گورنمنٹ سے التجا کریں ❖

بی۔ کے۔ متھرا۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔
ممبر۔ ایس۔ پی۔ ایس۔ کے

ہند میں نصاریٰ کی ناکامیابی

اِس مضمون کے لکھنے میں میں زیادہ تر اپنے دلی خیالات کا اظہار کرونگا جسمیں کسی خاص کتاب کا سہارا نہیں لیا گیا ہے۔ لہذا اگر میں نے کہیں غلطی کی ہو یا نادانستہ کسی فریق کو آزردہ کیا ہو تو اُسکے دست بستہ یہ التجا ہے۔ کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ اپنے خیال ناقص کے بموجب صدق دلی سے آپ صاحبانکی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اور امیدوار ہوں کہ وہ میری غلطیوں سے مجھے اور نیز ناظرین رسالہ زبان کو مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں ؎

گو کہ ہند وہ ملک ہے کہ جہاں علاوہ برہمنوں کے کوئی بھی شخص اپنا مذہبی جھنڈا ایسے مستقل طور سے نہیں گاڑ سکا کہ پرانے مذہب کو بالکل دبا کر تقریباً نابود کر دے جیسے کہ ایران میں اسلام نے ایک پرورش شدہ مذہب کو چند دنوں میں تقریباً معدوم کر دیا۔ یا سلطنت رُومہ میں فرقئے نصاریٰ نے اپنے قیصروں کو ہمیشہ کے لئے مرید بنا لیا۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہند کی زمین میں یا ہندوستانیوں میں کوئی خاص قوت ایسی ہے جو غیر مذاہب کو ٹکنے نہ دے۔ اِس سائنس کے زمانہ میں ہم ایسے خاص معجزوں کے قائل نہیں ہیں۔ جو انسانکی فطرت ایران و روم میں ہے وہی ہند میں ہونی چاہیئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان مہذب قوموں میں پرانے مذہب نو خیالات کی طغیانی سے بہ گئے۔ لیکن ہند میں اپنے ہی گھر کا پودا بھی سرسبز نہ ہو سکا۔ مجھے اس لفظ معجزہ پر ایک پھر سے بے ساختہ نکلا ہے یاد پڑتا ہے کہ میری طالب علمی کے زمانہ میں ایک بڑے علامہ دین نصاریٰ نے چند

مسلسل لیکچر گبن کی اِس دلیل کو رد کرنے کے لئے دئے تھے۔ جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ شروع کی صدیوں میں سلطنت روم کی دماغی اخلاقی و سیاسی حالت ایسی واقع ہوئی تھی کہ جو دین عیسےٰ نے یورپ کے دِل میں جلد گھر بنالیا۔ گویا کہ یہ انقلاب عظیم محض قدرتی وسائل پر واقع ہوا۔ پادری صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ زیادہ تر مدد خدا سے واقع ہوئی۔ مجھے یاد نہیں کہ اور سامعین کے دِل پر اسکا کیا اثر ہوا۔ لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اسکو محض کج بحثی تصور کیا ‪:‬

ناظرین سے میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ میں اسمیں زیادہ تر اپنے ذاتی خیالات و محسوسات کا اظہار کرونگا۔ لہٰذا بار بار اس ذاتی حوالونکے لئے آپسے معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جن وجوہات سے مجھے مطالعۂ دین عیسیٰ میں مایوسی ہوئی غالباً وہی اسباب اور متلاشیوں کے دلونکو بھی پریشان کرتے ہونگے اسلئے اِسکی واقفیت نہ صرف ہندوستانیونکو بلکہ دین مسیح کے مستند معلمونکو بھی ہونی چاہئے۔ ‪:‬

الف۔ اول لیجئے دماغی وقتیں۔ جو ہندو اپنے مذہب کو کسقدر پیچیدہ سمجھ کر انجیل کی تعلیم کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اسکو وہی پیچیدگیاں دوبارہ عبور کرنی پڑتی ہیں بلکہ اپنے یہاں تو ایک سہارا استعارے کا بھی تھا۔ کہ رامائن وغیرہ انسانی زندگی کے ناٹک سمجھے جاتے ہیں لہٰذا ناٹک کے اندر مبالغہ جات کسی حدتک جائز ہوسکتے ہیں۔ لیکن وہاں ہر ایک چیز تواریخی بتائی جاتی ہے۔ ہنومان کا ایک پہاڑ اٹھالانا۔ تعلیم یافتہ ہندو ایک قصہ ہی سمجھتا ہے۔ لیکن جب اوس کو بتایا جائے کہ چاند و سورج کی حرکت میں اختلاف یا اسی قسم کے بیشمار ناممکن امور خدا کے حکم سے ہوتے اور ضرور ہوئے تو بیچارہ بقول ایک انگریزی کہاوت اپنی حالت

کڑھائی سے نکل کر چولھے میں پڑنے کی برابر سمجھتا ہے۔

اور آگے چلیئے۔ ہندو فلسفہ کی باریکیاں مثلاً ویدانت کا لوویت وا ودودھدانت، مسلہ آواگون۔ کرم وپھل وغیرہ کے مقابلہ میں وہاں بھی ویسے ہی مسئلے دپیش ہوتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم ہنیں آیا کہ یہ سالہا سال کی تعلیم سے یا حقیقت میں زیادہ قرین القیاس ہونے کی وجہ سے بہ نسبت مسلہ تثلیث۔ کفارہ یا مستقل جنت ودوزخ ہندو طبیعت کو بہت سہل اور تسلی بخش معلوم ہوتے ہیں۔

ان سب میں گوکہ بحث کرنے کے لئے مسلہ تثلیث مسلمانوں کو بہت الجھاتا رہا ہے۔ لیکن ہندو کے لئے تثلیث کا مسلہ ویسا ہنیں ہے۔ بلکہ میرے خیال میں یہ مسلہ ہندوستان ہی سے نکلکر جماعت سکندریہ کے ذریعہ سے یورپ میں جا پہنچا۔ میرے ایک پادری دوست نے مجھے ایکدفعہ یہ بتایا تہا کہ یوحنے کی انجیل کے باب اول کی چند نا فہم آیتوں کی سمجھ انکو ہندوستان میں آنے کے بعد ہی کچھ کچھ ہوئی ہے۔ بلکہ اثنائے گفتگو میں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب انہوں نے اسی بات کو ولایت میں مطالعہ کیا تہا۔ تو انکے اُستاد کو بھی اُسکی ٹھیک سمجھ ہنیں تھی۔ خیر یہ ایک شخصی رائے ہے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہندؤں کے یہاں چند فلسفی جماعتوں میں بھی اُس واحد ذاتِ خدا کی مختلف شخصیت کا خیال پایا جاتا ہے۔ اسلئے ہندؤنکو اسکے مان لینے میں بہت دقت ہنیں ہوتی۔

لیکن متعلق مسلہ کفارہ زمانہ حال کے ہندو جنکے دماغ سے ایک غیور اور پرانتقام خدا کو منانے کے لئے قربانی کا خیال مہاتما بودہ کی تعلیم کے اثر سے بالکل جاتا رہا۔ یہ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کہ خدا ان کے گناہوں سے ناراض ہے اور وہ ایک عظیم ملیدان کا خواہان تہا۔ جو کہ مسیح نے پورا کیا۔ البتہ مسیحی بھگتی مارگ رامانج اور چیتین دیو وغیرہ ہادیان وشنو دہرم کی تعلیم سے کہیں کہیں

اس قدر مطابقت رکھتا ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اونکو حضرت عیسیٰ کی سوانحعمری سے واقفیت تھی۔ لیکن دراصل جہانتک معلوم ہوا ہے یہ بات نہیں ہے۔ ہر ایک پریمی محب بنی انسان چاہے وہ کہیں اور کسی زمانہ میں پیدا ہو۔ ایک ہی نتیجہ پر پہونچیگا۔ جو شخص اپنی زندگی میں ایک عالمگیر پدریت کا وجود تصور کر سکتا ہے۔ پھر اسکو کل مخلوقات میں بھائی چارہ نظر آتا ہے۔ بلکہ ہندو اس بھائی چارہ کو حیوانات نباتات وجمادات میں بھی لے گئے۔ اور چونکہ اکثر ہندوؤنکو مہاتما بودہ کے زمانہ سے لیکر ابتک کسی نہ کسی ذریعہ سے اس عالم گیر میستری (یعنی پیار) کی خوراک ملتی رہی ہے۔ اسلئے وہ مسیح پریم مارگ سے بہت جلد فریفتہ ہوئے۔ کہتے ہیں کہ قرون وسطیٰ میں ہزاروں ہندو سنیٹ زیویر کے مرید بنگئے۔ ان کے بعد بڑے بڑے باعلم ہندو بھی مثلاً راجا رام موہن رائے۔ کیشب چندرسین۔ سوامی رام کرشن پرم ہنس اور ہزاروں گمنام اشخاص مسیحی پریم سے موثر ہوئے۔ لیکن پھر بھی دین مسیح علاوہ معدودے چند شریف گھرانون کے صرف نیچی قوموں میں محدود رہا۔ جسکی وجوہات میں آگے بیان کرونگا۔

ب علاوہ مذکورہ بالا دماغی دقتوں کے چند سوشل دقتیں بھی ایسی ہیں کہ جو مبتدئ دین عیسیٰ کے رستہ میں حارج ہوتی ہین یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ بہت ہی کم اشخاص صرف مذہبی تشنگی کی خاطر ہی اسکے متلاشی ہوتے ہین۔ مذہبی زندگی کے ساتھ سوشل زندگی کم از کم ہندو کے خیال میں اسقدر ایک جان ہو رہی ہے کہ وہ موجودہ عیسائیوں کی سوشل حالت پر بغیر غور کئے نہیں رہ سکتا۔ علاوہ سوال ذات کے جو اسکے دل کو کبھی کبھی پراگندہ کرتا ہے۔ موجودہ تعلیم یافتہ ہندو کو جو سب سے بڑی قباحت نظر آتی ہے وہ نقصان قومیت ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے ایک ایسی برادری میں شامل

ہونا ہوگا کہ جبکہ میمبر ہندوستانیوں کی تمام اعلیٰ امید و تمناؤں سے نہ صرف سرد مہری کرتے ہین بلکہ انکو مشکوک نگاہون سے دیکھتے ہین۔ اسلئے بعضے متلاشی اس پریشانی میں اس حد تک پہونچتے ہین۔ کہ وہ ایک نامعلوم روحانی موکش کی امید پر صریحاً دنیاوی بہبودی کے رستہ میں جسپر ہماری اخلاقی زندگی مبنی ہے کانٹے بونا گناہ سمجھتے ہیں۔

ایک اور دقت یہ بھی ہے کہ برخلاف دستور اسلام اور دیگر ایشیائی مذاہب کے جہان کلمہ پڑہنے کے بعد سب ایک ہی بھائی چارے میں شامل ہوجاتے ہیں خواہ وہ ترک ہو یا ہندی اس نووارد مغربی مذہب مین رنگ کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل یورپ کے نزدیک رنگدار قومیں مذہبی معاملات میں بھی خودمختاری کے لائق نہیں ہیں اور اگر یہ صحیح ہو تو بیشک بہت سے چڑچڑے متلاشی حر در جنت کے دروازے سے بھی لوٹ جاتے ہونگے!

ایک تیسری دقت اسی صیغہ میں جو بعض متلاشی محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ تھیوری اور عمل میں بڑی نامطابقت پائی جاتی ہے گو کہ اس قسم کی نامطابقت تعلیم اور عمل کے اندر سارے مذاہب میں کچھ کچھ دیکھنے میں آتی ہے۔ لیکن مسیح کی عالمگیر محبت کی تعلیم کے ساتھ ڈارون کے "جس کی لاٹھی اسکی بھینس،، والے مسئلہ پر عمل انسانی طبیعت کے بنیادی قوانین کے برخلاف پڑتا ہے کم از کم میرے دلکو تو ایسا ہی معلوم ہوا۔ بیشک سرمن اونڈی ماونٹ سنکر میرا دل پگھل گیا۔ اس سے پہلے میں نے ایسی پریم کی بھاشا کہیں نہیں سنی تھی۔ مسیح ہمیشہ کے لئے میرا اشٹ دیو بنگیا۔ لیکن اس نوزائیدہ خیال کی پرورش کے لئے کوئی معقول گرو نظر

نہیں آیا۔ میں نے مسیح کو اپنا مانس گرو بنایا جیسے کہ ہزاروں پرمیوں نے بنا رکھا ہے۔ لیکن غالباً نصاریٰ اس قسم کے گرو کا طریقہ جیسے کہ ایک لویو[۱] نے درونا چارج کو بنایا تہا۔ جائز نہیں سمجھتے۔ اسلئے یہ بات پادریوں کو بُری معلوم ہوئی لہذا مجھے مجبوراً اُنسے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔

یہاں ایک اور ذاتی مشاہدہ کا بھی درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جو میں نے تمام دینی لوگوں میں (خواہ وہ ہندو۔ مسلمان۔ یا عیسائی ہوں)، پایا کہ وہ رسومات کو اصول سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ لہذا مسیح کو جاننا اور پہچاننا اسقدر ضروری نہیں ہے۔ جیسے کہ چند بیرونی قیود کو ادا کرکے اسبات کو ظاہر کرنا کہ میں مسیحی ہوں۔ میں نے کئی ہندؤں کو عام عیسائیوں سے زیادہ مسیح کو جاننے والا پایا۔ اور کتنے ہی ایسے بھی دیکھے ہیں کہ جبکو مسیح "اپنا" کہنے میں فخر کریگا گو کہ انہوں نے کبھی مسیح کا نام سنا بھی نہیں ہے۔ لیکن مستند جماعت نصاریٰ کے نزدیک وہ ہمیشہ کے لئے

---

[۱] کہتے ہیں کہ ایک لویو نے (جو ایک نیچ ذات کا آدمی تہا۔ درونا چارج سے (جو راج کنواروں کو فن رزم سکہایا کرتے تہے)، شاگردی کی درخواست کی۔ ذات کے خیال نے جو تمام سفید قوموں میں شدومد سے موجود تہا، بچارے ایک لویو کو اس امید سے محروم رکھا لہذا اسنے درونا چارج کی مورت بناکر اور اسکو اپنا مانس گرو تصور کرکے علم تیراندازی میں وہ کمال حاصل کیا کہ درونا چارج کے پیارے شاگردوں سے بھی سبقت لیگیا۔ اوسوقت درونا چارج نے ایک چالاک برہمن کی طرح اس سے ایک عجیب گرودکشنا مانگی کہ تو اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا کاٹ دے تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے تیراندازی سے محروم رہے۔ سیاہ فام شاگرد نے جو اپنے منزل مقصود پر پہونچ گیا تہا۔ بڑی خوشی سے اپنا انگوٹہا کاٹ کر گرو کے حوالے کیا اور ہمیشہ کے لئے ہند کے لٹریچر کے ماتھے پر ٹیکا لگا گیا۔ کہ عظمت کسی ذات کی موروثی ملک نہیں ہے۔

* * * * * * * * * *

غاست ہو گئے۔ میں جہانتک مسیح دین کی بابت سمجھ سکا ہون کہ خود حضرت عیسے اور پہلی صدیون کے بزرگ اس قسم کا تنگ خیال نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک مسیحی زندگی کے معنی نیک زندگی ہوا کرتی تھی۔ جسکی تشریح اس جگہ بوجہ طوالت چھوڑی جاتی ہے۔

آخرش مسیح کی تعلیم کا ایک حصہ انسان کی اجتماعی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ ناظرین کو شاید معلوم ہو گا کہ مسیح اپنے زمانہ کا سوشیلسٹ تھا۔ اسی لئے حکام زمانہ نے مسیح کو سزا دی۔ اندیشہ تھا کہ کوئی بلوہ نہ ہو جائے۔ گو کہ مذہبی جماعت کا بیان بالکل مختلف ہے۔ پھر بھی اگر انجیلون پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ مسیح امراسے نفرت کرتا تھا۔ غریبون سے محبت کرتا تھا۔ امرا کی اخلاقی زندگی کی بابت وہ اپنے اصول کے بخلاف ناامید تھا۔ ہر جگہ اسنے اپنی آواز دولت وعیش وعشرت کے برخلاف اور افلاس رنج وغم کی تائید میں بلند کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ شروع میں ہر جگہ پنچ ذات ہی مسیحی فرقے میں داخل ہوئے۔ لیکن مسیحی تعلیم صرف یک طرفہ اور محدود سوشیلزم نہیں تھی۔ اسکی اخلاقی روحانی تعلیم عالمگیر ہے لہذا رفتہ رفتہ قیصران روما بھی اس حلقہ میں شامل ہو گئے۔ لیکن ہندمین اسکا اثر اور طرحسے پڑا۔ پنچ قوم کے ابھارنے میں مسیح تعلیم نے بدستور عمل کیا۔ مگر جہان سوال

"بنی آدم اعضائے یکدیگر اند"

آن پڑا وہین سب بغلیں جھانکنے لگے۔ لہذا با علم لوگون نے سمجھ لیا کہ اصلی مسیح مذہب سردست کسی قوم کا موروثی حصہ نہیں ہو سکتا۔ یہ محض معدودے چند لوگونکا ہمیشہ آئیڈیل رہا اور غالباً ایسا ہی رہیگا۔

دراصل ہندو کے نزدیک مسیح ایک سدھ ہے۔ اور ہندو اصول کے بموجب ایسے مہاپرش ہر ملک و ہر زمانہ میں جب کبھی انکی ضرورت ہوتی ہے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ تواریخی زمانہ میں بھی ایسے بہت سے سدھ اور سادھ پیدا ہوئے ہیں ہمارے ملک میں انکی کوئی کمی نہیں ہے۔ مثلاً گرونانک۔ کبیر، چیتن۔ رام کرشن پرم ہنس، رام تیرتھ وغیرہ سب اسی زمرہ کے لوگ ہیں سچے ہندو کے نزدیک مولانا روم سینٹ فرانسس وغیرہ غیر اقوام کے بھگت بھی اتنی ہی عزت و تعظیم کے مستحق ہیں۔ جتنے کہ اپنے یہاں کے مہاتما۔ چنانچہ عملی طور پر اعلےٰ سے اعلےٰ ہندو ایک نیچ ذات۔ اور مسلمان بھگت کبیر اور ہری داس مسلمان۔ جو چیتن دیو کا پیارا شاگرد تھا۔ قدمبوسی کو اپنا فخر سمجھتے ہیں[۵۱] مذہب بھی ہندو بالالحاظ وید اور سمرتی اور دھرم شاستر مہاپرشوں کو اپنا اشٹ دیو بنا سکتے ہیں۔ جسکی تاریخی مثال مہاتما بودھ ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ اگر مہاتما بودھ کے ماننے والے ہندو رہتے اور مہاتما بودھ ایک ہندو اوتار بنایا گیا۔ تو کیا وجہ کہ مسیح ایسا نہ بنایا جائے۔ الغرض نصاریٰ کا مقابلہ ایک نہایت ہی عجیب رقیب کے ساتھ ہے۔ جسپر اسکی ایک بھی ضرب نہیں پڑ سکتی ہے۔ لیکن جہالت و ضد نے ہندو کو عارضی طور سے گمراہ کر رکھا ہے۔ اسلئے ہندو کے بہت سے بچوں نے اسکے عالمگیر بتخانہ کو چھوڑ کر اپنے اپنے معبودوں کو لیکر علیحدگی اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن جسدن انہیں اصلی ہندو دھرم کی روشنی پیدا ہوگی وہ باوجود مختلف مذاہب ہونے کے "ہندو" کہلائینگے۔ ❊

پریمانند ودھیارتھی

---

۵۱ طرح ستیارتھ پرکاش نے گرونانک اور راجہ رام موہن رائے کو مسلمان کہا ہے۔

بے نیازی یا استغنا

"ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے"
"بے نیازی تری عادت ہی سہی"

"الانسان حریص فی ما منع" عربی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے اسکے یہ معنی ہیں کہ جس چیز سے روکا جائے اوسی کی طرف انسان حرص کرتا ہے۔ مگر مذہب اور ہمارا اخلاقی طرز معاشرت بتاتے ہیں کہ حرص نہایت نقصان دینے والی چیز ہے چنانچہ اکثر راہ شایان قوم و مذہب نے بھی اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ لیکن جسقدر استغنا اور بے نیازی کی ضرورت ہے وسی قدر ہم میں طول عمل اور حرص کی عادتیں طبیعت ثانیہ بنی ہوئی جھلکیاں دکھا رہی ہیں۔
انسانی تخلیق کا اصل راز یہ ہے کہ عبادت الٰہی میں محو ہو جائے اور عروس دنیا کی رنگی پر وارفتہ نہ ہو۔ مگر تجربے اور مشاہدے سے ہم اس نکتہ پر پہنچے ہیں کہ جبتک نیاوی لذائذ اور اپنی بے پایان تمناؤں کی طرف سے استغنا نہ ہو تب تک ہم اس منشائے تخلیق سے بہت دور ہٹے ہوئے ہیں اور اس حالت میں اطاعت الٰہی سے کوئی نفع نہیں اٹھا سکتے پس ہمیں چاہیئے کہ استغنا کی عادت ڈالیں اور دنیا کے غیر مستقل تعلقات سے بے پروا ہو جائیں۔ تاکہ تقرب خداوندی حاصل کرنے میں آسانی ہو۔
اس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم دوامی لذائذ کے مستحق ہو جائینگے اور جس چیز کا خدائے تعالےٰ نے اپنے متقی بندوں کے لئے وعدہ فرمایا ہے اوسے آخرت میں حاصل کر سکیں گے۔ اسکے لئے سب سے پہلے علم دینی کی ضرورت ہے۔ جس کی بدولت استغنا کی خوبی اور بے نیازی کا فائدہ معلوم ہو جائے۔ اس لئے کہ طلب مجہول مطلق محال ہے"

پس جب تک استغنا کے تمام فوائد ذہن نشین نہ ہو جائیں تب تک حرص کے ظالم پنجے سے رہائی دشوار ہے۔ چنانچہ ہمارے اکثر مذہبی پیشواؤں نے بتایا ہے کہ "طول امل اور حرص نہایت مضر چیزیں ہیں۔ اور دنیا کی بے ثبات زندگی میں انسان کو حریص نہ ہونا چاہیئے"۔ اس قول کی کہنے والی اتنی بڑی جماعت ہے۔ جس پر جھوٹ کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اسقدر قابل اعتماد ہے کہ اگر کسی چیز کا حکم دے تو اوسکی تعمیل ہم فرض عین اور باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اور بغیر شک و احتمال کے تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ جماعت ہمارے نفع کی بات بتا رہی ہے بلکہ اس قول میں خود ایک ایسا مجزنما اثر پایا جاتا ہے جو آپ ہی اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ اس موقعہ پر ہم ایک حدیث بجنسہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ جو استغنا کا بہترین الفاظ میں سبق دے رہی ہے۔ وہ یہ ہے۔

یعنی عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا بعض جسم پکڑ کر فرمایا کہ تو دنیا میں اسطرح رہ جس طرح کوئی غریب الوطن پردیس میں عارضی قیام رکھتا ہے۔ یا مثل ایک راہ گیر کے اور اپنے نفس کو اہل قبور سے شمار کر۔ یہ حدیث بخاری نے روایت کی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کو اپنی عزت مال و دولت اور جان سے بھی زیادہ محبوب ہے چنانچہ اکثر ایسے واقعات نظر سے گزرے ہیں جنمیں بمقابلہ عزت کے دولت اور جان کی کوئی ہستی نہیں سمجھی جاتی۔

آپ چاہیں تو کسی عدالت میں حاکم کے اجلاس پر پہنچکر دو چار مقدموں سے معلوم کر لینگے کہ عزت کے لئے جان و مال پانی کی طرح بہائے جا رہے ہیں اور دیکھیئے کہ ہمارے اکثر رؤسا چندہ وزہ اعزاز کے لئے سینکڑوں روپیہ خرچ کر کے گورنمنٹ سے خطاب حاصل کرتے ہیں

گو میرے خیال میں جو عزت ایک مستغنی المزاج کو حاصل ہے۔ وہ کسی بڑے سے بڑے متمول کو نصیب نہیں۔ اسلیئے کہ اسے ہر وقت ہجوم افکار کا سامنا رہتا ہے اور ناکامی کی بری گھڑی دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ گدا ہے کسی کے در کی خاک نہیں چھانی پڑتی۔ وہ خوشامد سے الگ تھلگ اور چاپلوسی کی ذلت سے بری ہے۔ اور اسے یہی تمام بلائیں گھیرے ہیں:

جہاں حریص عارضی طور پر کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہاں اسے ناکامی کا ناقابل برداشت خمیازہ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اور بعض وقت تو ذاتی سرمایہ اور عزیز جان بھی حرص کی بدولت جاتی رہتی ہے۔ لیکن مستغنی المزاج کی زندگی نہایت بے فکری سے گزر جاتی ہے۔ اب ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ

انسان کو جب متوسط الحال میسر ہے تو حرص چھوڑ کر خدا کی بندگی میں سربسجود رہنا چاہیئے۔ گو کچھ دنون دلکو پریشانی اور طبیعت کو وحشت ہوگی مگر جب استغنا کی پر فضا اور دلفریب راہیں پائے طلب کو گدگدائیں گی تو خود بخود کشش شوق کھینچکر ایک ایسے مقام مقصود پر پہنچا دیگی۔ جہانکی دلکش ہوائین وہ مقناطیسی اثر رکھتی ہیں۔ کہ دنیا وی بھول بھلیاں خود بخود ہمیشہ کے لئے ہم دل سے بھول جائیں گے - اور یہ بے نیازی ہمپر ایک ایسی خود فراموشی طاری کر دے گی کہ دنیا کے دشوار گزار ایام۔ عالم برزخ کی نامعلوم مدت آخرت کی دوامی خوشگوار زندگی میں کچھ فرق مین نہ رہیگا۔ لیکن ابھی تو بقول شخصے ؎

"ایک ہی گل کے نہونے سے خلش ہے اتنی"
"ہیں مجھے برگ و گل خار و ثمر چار دن ایک"

محمد حسین محوی لکھنوی

فلسفہ افلاس

بوقتِ تنگدستی آشنا بیگانہ میگردد
صراحی چون شود خالی جدا پیمانہ میگردد

روئداد مفلسی یا فلسفہ افلاس کی تقسیم جن مختلف صورتون میں بالتفریح بیان ہوسکتی ہے اُسکے پانچ حصہ ہیں۔

(۱) مفلسی کسے کہتے ہیں۔
(۲) مفلسی کے اسباب کیا ہیں۔
(۳) مفلسی کی حالت
(۴) عموماً مفلسی کی کیا رفعداد کرتے ہین اور وہ کس حدتک فائدہ مند ہے۔
(۵) کن ذرائع سے مفلسی دور ہوسکتی ہے۔

(۱) مفلسی کے سب سے بہتر اور مختصر تعریف ذرائع معاش کا مسدود ہوجانا اور پچھلے سرمایہ کا باقی نہ رہنا ہے لیکن عام طور پر مفلس اُسے کہتے ہین جسکی گانٹھ خالی ہو۔ اور زیادہ تشریح مفلسی کی یہ ہوسکتی ہے کہ وہ تندرست کو بیمار، عالم کو جاہل، ہنرمند کو بے ہنر، عزت دار کو بے عزت، عقلمند کو بیوقوف بنانے کا بہترین آلہ ہے۔ یا معصوم بچون پر ترس نہ کھانے۔ اندہے لنگڑے۔ جوان بڈہون پر رحم نہ کرنے اور انسانکو بے موت مارڈالنے والی چیز ہے۔
بعض یہ بھی کہتے ہین کہ مفلسی دولت کی قلت نہیں بلکہ حوائج کی کثرت ہے۔

(۲) اسکے اسباب کی کوئی انتہا نہیں مصداق "حیلہ رزق بہانہ موت" انسان کا ہر فعل اور ہر خیال مفلسی کا ذریعہ بن سکتا ہے لیکن بالعموم مفصلہ ذیل اسباب افلاس کا

پیش خیمہ خیال کئے جاتے ہیں۔
(۱) ایک معقول سرمایہ کا کسی وجہ سے یک بیک علیحدہ ہو جانا۔
(۲) تجارت۔ زراعت یا ملازمت میں ایک غیر معمولی دھکا لگنا۔
(۳) اخراجات کی زیادتی اور آمدنی کی کمی۔
(۴) خودغرض یاردوستونکی ایک ایسی جماعت کا پیدا ہو جانا۔ جنکی دوستی صرف فارغ البالی تک محدود ہو۔
(۵) کفایت شعاری کے اصولونپر کاربند نہوکر دولت کو بیجا طور پر صرف کرنا۔
(۶) کسی سرپرست کے معزول ہو جانے پر مدخل آمدنی کا بند ہو جانا۔
(۷) شراب خواری۔ زنا اور ایسی قسم کے دوسرے بیہودہ اخراجات میں رفتہ رفتہ تمام سرمایہ کا تمام ہو جانا وغیرہ . . . .

یہ اسباب ہیں جن سے افلاس کی آمد شروع ہوکر ایک غیر معمولی تغیر کے بعد انسانی زندگی کی حالت روبہ تنزل ہونے لگتی ہے۔

۳۔ جب مفلسی اپنا رنگ آجاتی ہے تو انسان اپنے آپ کو ایک دوسرے دور میں پاتا ہے۔ جسکے عمل گو تکلیف دہ ہیں۔ مگر ہیں عبرتناک۔ وہی دولت جو خوشحالی میں، پسینہ پر خون چھڑکتے اور دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے۔ اب کترا کر چلنے لگتے ہیں۔ اور وہ عزیز جو کسیوقت جان تک نثار کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اب صورت سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ افلاس میں نہ ادس کی طاقت کام دیتی ہے نہ علم و ہنر مدد کرتا ہے۔ لوگون سے اگر بے غرض ہی ملے تو خوشامدی اور غرضمند کہلائے۔ اوسکی صلاح دانشمندانہ ہی کیون نہ ہو۔ کبھی بے غرضی پر محمول نہ ہوگی۔ کون سنتا ہے کہ یہ کون ہے۔ اور کیا بک رہا ہے۔ نہ سلطنت کی نگاہون میں اسکی وقعت ہے نہ بیوی بچے اوسے محبت بھری

نظرون سے دیکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اوسکا دل ایک ماتم کدہ ہے جسمین ہزارون تکلیفیں اور سینکڑون رنج نکلکر اوسکے کاٹنے کو دوڑتے اور بے موت مار ڈالتے ہیں

۴۔ روپیہ بہت بڑی طاقت ہے یون کہئیے کہ ایک شہنشاہ ہے جسکی امداد کے بغیر ہمارے معمولی سے معمولی کام بھی انجام نہیں پا سکتے۔ عمدہ مکانات نفیس پوشاک۔ ملکونکی سیاحت۔ یاردوستونکی محبت۔ کتابیں۔ زیور۔ غرض کوئی چیز بغیر روپیہ نہیں ملتی۔

جب مفلسی چارونطرف سے گھیر لیتی ہے اور روزانہ ضرورتیں مجبور کرتی ہیں تو انسانی دماغ میں افلاس کی رفعداد کے چند مضر خیال پیدا ہوتے ہیں۔ جنمین **قرض** اور ناجائز **وسائل** قابل ذکر ہیں

اوّل وہ کوشش کرتا ہے کہ جس طرح بن پڑے قرض ادھار لیکر اپنے اخراجات بدستور جاری رکھے۔ اور لوگونکو خندہ زنی کا موقع نہ دے مگر **قرض** سب سے بدترین صورت ہے یار دولت اور عزیز اقارب تو مفلسی کی آمد سے پہلے ہی غیرون سے زیادہ سخت نبجاتے ہین۔ البتہ وہ قرضخواہ جو عموماً ایسے لوگون کی تلاش رکھتے ہین۔ اپنی چکنی چپڑی باتون اور روپیہ کی امداد سے اس کی دستگیری کرتے اور رفتہ رفتہ باقی ماندہ سرمایہ پر قابض ہو کر بھیک مانگنے کے قابل بنا دیتے ہین۔

دوسرے ناجائز وسائل جنمیں چوری۔ جُوا۔ وغیرہ شامل ہیں بہت جلد مفلس کی آمدنی کا ذریعہ بنجاتے ہیں۔ مگر اسمیں اول تو تنگدست شرفار پھنستے ہی کم ہیں اور جو پھنستے ہین وہ تمام عمر ذلیل و خوار رہتے اور جیلخانہ میں ایڑیان رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہین۔

مفلسی کی رفعداد کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ انسان علاوہ ہمت سے کام لے

اول تو ابتدا ہی سے ایسے سامان کرنے چاہئیں جن سے ان اڑے وقتوں میں مدد ملے اور اگر بالفرض مفلسی کے جال میں گرفتار ہی ہو جائے تو جہانتک ہو سکے "کاہلی" کو خیرباد کہکر محنت اور جانفشانی کے ساتھ جن وسائل سے ممکن ہو سکے "روپیہ" پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ "بیکاری" مفلسی اور زوال کا پہلا دروازہ ہے۔ اگر ہماری آمدنی ایک پیسہ کی نہ ہو اور خرچ پچاس روپیہ کریں تو افلاس ہمکیسے نہیں گھیریگا۔

اس مفلس شخص کو جسے مفلسی نے تنگدست کر رکھا ہو ذیل کے چند اصول یاد رکھنے چاہئیں

۱۔ مفلسی کی رفعداد کا بڑا ذریعہ ہمت اور استقلال ہے۔

۲۔ اگر تمہارے دوست تم سے منہ پھیر کر چلتے یا عزیز و اقارب تمہاری شکستہ حالت دیکھکر ہنستے ہیں تو اوسکا خیال مت کرو۔ کیونکہ زمانہ ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا ہے

۳۔ مفلسی میں ناشکری مت کرو کیونکہ خدا نے بندوں کی آزمائش کیلئے طرح طرح کی تکلیفیں بھیجتا ہے

۴۔ دنیا کی تمام چیزیں فانی ہیں رفتہ رفتہ تمہارا اسد غم اور مصیبتیں بھی فنا ہو جائینگی۔

۵۔ اس بات کی ہوس مت کرو کہ ہمکو پہلا ہی سا عروج یا دولت ملے تھوڑا تھوڑا ملکر بہت ہو جاتا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ تم اپنی محنت اور استقلال کی بدولت پہلے سے زیادہ مرتبہ پاؤ۔

۶۔ سب سے بڑی دولت پس اندازی ہے اور سب سے بہتر اصول کفایت شعاری۔ جو اس پر کاربند رہیگا۔ وہ کبھی روپیہ سے خالی نہیں رہتا۔

۷۔ جنکے پاس چار پیسے ہیں دنیا اوسکی خواہاں ہے۔ تجارت سے صنعت سے جسطرح ممکن ہو کمانا چاہیئے

۸۔ صبر۔ ہمت۔ استقلال۔ قناعت۔ سچائی۔ اور نیکی ترقی کی کنجیاں ہیں جب تم نے ان پر قبضہ کر لیا۔ تو مفلسی کا قفل کھولنا کچھ مشکل نہیں۔

سید مظہر حسین۔ اختر

مفتاح الفرج

(گذشتہ سے پیوستہ)

وقت کی قدر جو خالق کی جناب اعلیٰ سے ہمکو وزن کرکے دیگئی تھی۔ ایسی ہی کے سہارے سے ہوتی ہے۔ ناجائز تعلقات سے آدمی اپنے اصلی وطن کے راستہ سے بھولا ہوا اس مرگ کی رہنمائی سے پھر اپنے وطن میں خراماں خراماں پہنچ جاتا ہے۔ یادِ مرگ انسان کو ایسے ہیبب قبیح ارادوں سے کہ جنکے ذریعہ ورطۂ ہلاک مین پڑنے کا احتمال ہوتا ہے۔ صاف بچ جاتا ہے۔ یادِ مرگ یہ وہ جوہر علوی ہے کہ گدا کو تخت شاہی پر بٹھا دیتا ہے۔ یادِ مرگ عاشق صادق کو اوس نور لازوال کے جمال سے متجلاّ بناتی ہے۔ کہ جسکے دیدار پرانوار سے انسان سراپا نور کا ہی پتلہ بنجاتا ہے۔

ناظرین آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہ موت کوئی ایسی ویسی شے ہے نہین یہ وہ پاک العنور سے منور لطیف جوہر علوی ہتی کہ جسکے ایکدفعہ چشم ترحم کے مقابل ہوتے ہی وہ بیخودی حاصل ہوتی ہے کہ بس۔ علت غائی اس کلام سراپا خیر انجام سے یہ ہے کہ جب آدمی پر خوف مرگ غالب ہوگا۔ تو مالک کل کے وصیان مین سچے دل سے ہمہ تن مصروف ہوگا۔ جسکی مصروفیت کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ لازوال سلطنت کو حاصل کریگا۔ دنیا میں پیدا ہونے کی مراد سے فائز المرام ہوگا۔ یا تماشے دیدار میں سرشار ہوگا۔ ذرا نظر تعمق سے دیکھئے کہ موت کو یاد رکھنا کیسا اعلیٰ ذریعہ بچاؤ جملہ افعال قبیحہ کا ہے۔ ہرگز آدمی برے کاموں کی

جانب توجہ نہیں دیتا۔ اور ہر دم خالق مطلق کے قدموں میں لو لگائے رہتا ہے۔

جو آدمی ہر دم موت کو اپنے سر پر کھڑا سمجھتا ہے۔ بلکہ جو اپنے ہر دم کو دم واپسیں سمجھتا ہے۔ وہ جملہ بدافعالیوں سے مبرا و معرا رہتا ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر مجھے ایک ضرب المثل کہانی یاد آتی ہے۔ جسکا بیان کرنا خالی از لطف نہوگا۔ وہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ کا لڑکا طاقت مردی سے جو کہ عورات کی خوشی اور توالید نسل کا باعث ہوا کرتی ہے۔ مطلق نہین رکھتا تھا۔ اس سبب خاص سے شاہزادہ دن بدن لاغر و نحیف ہوتا جاتا تھا۔ اور اپنا دلی راز کسی کے آگے ظاہر نہ کرتا تھا۔ آخرالامر ایک قلبی دوست کے آگے شہزادہ نے راز سربستہ کھولا۔ اور کہا کہ جلدی اس بیماری کا علاج ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مجھے اپنی بیگموں سے سخت ندامت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس رفیق شریک غم نے شہزادہ کو کہا کہ فلاں پہاڑ میں ایک مرد مرتاض رہتے ہیں۔ امید واثق ہے۔ کہ اگر ہم دونوں اس مرد حق کی خدمت میں پہونچکر اپنا ماجرا بیان کریں۔ اور اس سے اس درد کی دوا چاہیں۔ خدا کرے تو ضرور دلی مراد پاویں۔ بعد باہمی مشورت کے شہزادہ نے کہا کہ چلو اب تاخیر کیا ہے۔ جس قدر اس کام میں جلدی ہو اچھا ہے۔ مناسب تحفہ تحایف ساتھ لیکر یہ دونوں یکجہتی دوست فقیر صاحب کی خدمت میں پہنچے اور اپنا حال عرض کیا۔ فقیر صاحب نے تھوڑی دیر کے بعد ایک بوٹی شہزادہ کے ہاتھ میں دی۔ اور کہا کہ اسکو آپ نوشجان فرمادیں۔ اگر پھر کبھی ضرورت پڑے تو اور لے جایو۔ شہزادہ نے وہ بوٹی درویش کامل سے لیکر مع اپنے ہمراہی کے گھر کی راہ لی۔ گھر میں پہنچتے ہی وہ عطیہ درویش کامل بصد شوق نوشجان کیا۔ کچھ دیر کے بعد شہزادہ کے جسم میں اسقدر غلبہ شہوت پیدا ہوا۔ کہ اس وقت صبر نہ ہو سکا۔ باری باری تمام ایک حرم سے حظ ہم بستری حاصل کیا۔ یہ نادر تماشہ شہزادہ دیکھکر پھر دوسرے

روز فقیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر سائل کام کی پڑیا کا ہوا۔ فقیر صاحب نے پھر وہی بوٹی شہزادہ کو لاکر دی اور وہ چند حصہ بوٹی اپنے منہ میں ڈال لی شہزادہ نے خوشی خوشی وہ بوٹی راستہ میں ہی کھالی۔ گھر میں پہنچتے ہی شہزادہ کام کا پتلہ بنگیا۔ اپنی تمام بیگموں کے ساتھ حظ نفسانی خاطر خواہ حاصل کی۔ پھر بھی اسکو اپنے جسم میں کمزوری محسوس نہ ہوئی۔ اور شہوت کی بدمستی میں بدمست رہا۔ کچھ کے بعد جب کام کا بھوت سر سے اترا۔ تو شہزادہ کو ہوش آیا۔ تو فقیر صاحب کے دو چند بوٹی کھا لینے کا بدظن دلمیں گزرا۔ اور دلمیں خوض کرنے لگا کہ میں نے تو تھوڑی سی بوٹی کھائی تھی۔ تو نوبت اس درجہ تک پہنچی۔ او ہو! فقیر صاحب کا کیا حال ہوگا۔ اس حیرت انگیز معاملہ میں دو گھڑی رات بھی شہزادہ کو بسر کرنی دوبھر ہوگئی۔ صبح نمودار ہوتے ہی شہزادہ پھر اپنے ہادی کامل کی خدمت میں پہنچا۔ وہ مرد خدا شہزادہ کو دیکھتے ہی جھٹ جان گئے کہ شہزادہ آج ہمارے امتحان کے لئے آیا ہے۔ فوراً ہی بوٹی لاکر شہزادہ کی نذر کی۔ اور کہا کہ اے بیٹا اسکو تم کھالو۔ اور اپنے محل شاہی میں پہنچکر اچھی طرح اپنے دل کی ہوس نکالو۔ کیونکہ کل فلاں وقت تم اس دنیا سے چل دوگے۔ یہ ہوش ربا کلمہ بادشاہ کا لڑکا سنکر بصد مشکل اپنے گھر میں پہنچا۔ باقی دارد

دیوی دیال۔

خیرات

بان بھلا کر ترا بھلا ہو گا۔
اور درویش کی صدا کیا ہے

انسانی فضائل میں بہت کم ایسے ہیں جنکا بیجا استعمال اس قدر آسان اور اس قدر مضر ہو جتنا فیاضی کا۔ کیونکہ اس فضیلت کی بگڑی ہوئی صورت بھی خواہ باعتبار نتائج کے کتنی ہی مضرت رسان کیون نہ ہو۔ ایک پسندیدہ صفت سمجھی جاتی ہے اور اسی وجہ سے سچی اور جھوٹی فیاضی کا امتیاز تمام اخلاقی مسائل میں سب سے زیادہ نازک مسئلہ ہے۔ قدیم مشرقی ریفارمرون نے اس اہم اور نازک مسئلے پر وہ روشنی نہیں ڈالی جسکی زمانہ حال میں ضرورت معلوم ہونے لگی ہے اور اسکے مفید اور غیر مفید پہلوؤں پر بالکل غور نہیں کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ پبلک کے نزدیک ذاتی خیرات کو وہ رتبہ حاصل ہو گیا جو قومی فیاضی کا حق تھا اور اسی خیال کے لازمی نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومی کام جنکی بنیاد گو وہ کام کتنا ہی مفید اور ضروری کیون نہو قومی فیاضی کی امداد سے محروم رہکر اسقدر کمزور اور ناپائدار ہو جاتی ہے کہ ان ضروری اور مفید نتائج کا اوس سے پیدا ہونا جن کے لئے وہ کام ہاتھ میں لیا گیا ہے ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ قومی فیاضی کا رخ زیادہ تر افراد کی مدد کی طرف ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ مشرق میں شخصی حکومت کے قدیم رواج کی وجہ سے مشرقی ریفارمرون کے نزدیک کسی قومی کام کا قومی فیاضی پر منحصر ہونا ایسا ہی ناممکن الوقوع امر سمجھا گیا ہو جیسے انسانی طاقت سے مینہ کا برسنا یا بالیدگی اور روئیدگی کا ہونا۔ انکے

نزدیک ہر قومی ضرورت کی حاجت روائی صرف بادشاہ کی ذات پر منحصر تھی اس لیئے قومی خیرات کے قومی رفاہ کے کاموں میں استعمال کو ایک غیر ضروری امر تصور کرنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

لیکن زمانہ نے ایک زبردست پلٹا کھایا اور دنیا کی قسمتوں پر ایسی اقوام کو حکمران کر دیا۔ جنکا سب سے پہلا خیال یہ ہے۔ کہ اپنی مدد آپ کرو۔ اس خیال کو انھوں نے عملی صورت میں لاکر دکھا دیا کہ قومی قوت کے مقابلے میں بدرجہا زبردست ہوتی ہے۔ یورپین طرز حکومت میں کم و بیش ہر جگہ رعایا کی مداخلت ایک مسلم اور ضروری امر تصور کیا جاتا ہے۔ جس بیت المال کا خازن زمانہ سلف میں صرف بادشاہ تھا اور جسکے مناسب یا نامناسب استعمال کے لئے کوئی اُس سے بازپرس کرنیوالا نہ تھا۔ وہ آج رعایا کے ہاتھ میں ہے۔ اور بادشاہ و مشیران سلطنت صرف بحیثیت رعایا کے ایسے امین اور کارپرداز ہونے کے اُس پر دسترس رکھتے ہیں جو ہر وقت قوم اور ملک کا منہ دیکھتے رہتے ہیں کہ جس طرف اُس کا رخ پھرے اسی طرف وہ بھی چل نکلیں۔ اور پھر باوجود اسقدر ذمہ داریوں کے بھی وہ صرف انہیں امور کے کفیل ہیں جو براہ راست سلطنت کے استحکام اور سیاست کے انتظام سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور قوم نے انکو ان روزمرہ کے کاموں میں بالکل دخل نہیں دیا۔ جو براہ راست قومی ترقی اور بہبود سے متعلق ہیں۔ ملک داری کے لئے فوج کی اور نظام سیاست اور حفاظت حقوق باہمی کے لئے انتظامی عہدے داروں اور جوڈیشل حکام کے تقرر کی ضرورت ہے لیکن ان امور کا انتظام بادشاہ سے تعلق رکھتا ہے۔ گو اسمیں بھی خاص حیثیتوں سے رعایا کو کم و بیش مداخلت ہے۔ لیکن اپنی تعلیم اپنی حفظان صحت اور اپنی آسایش کے لئے مدارس شفاخانے اور سڑکیں بنانا اور قائم رکھنا خاص طور پر رعایا کے ہاتھ میں ہے اور بادشاہ و مشیران سلطنت محض صلاح کاروں

اور معاونوں کی حیثیت سے اِن کاموں میں دخیل ہوتے ہیں۔ اِس انتظام کی معقولیت ہر پہلو سے ظاہر ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہر کام کو وہی خوب انجام دیگا جسکا نفع و نقصان براہ راست اُس کام سے تعلق رکھتا ہو۔ اسکے علاوہ اِس قسم کے کاموں میں دخیل ہونے سے ایک مادہ ذاتی اغراض پر قومی اغراض کو ترجیح دینے کا پیدا ہوتا ہے۔ قومی کاموں کی انجام دہی کا سلیقہ ہو جاتا ہے۔ اور متحدہ قومی حقوق کی حفاظت کا خیال مستحکم ہوتا ہے۔ غرضکہ ایک نیا احساس ایک نئی زندگی ایک نیا رشتہ تعلقات وجود پذیر ہوتا ہے جو ذاتی اور نفسانی اغراض سے جدا اور اکثر اوقات اُس کے مغائر ہوتا ہے۔ یہی بات ہے جسکی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ یورپین اقوام اپنی فلاح اور بہبود کے کاموں میں اپنے پاؤں سے دوڑ کر چلتی ہے بخلاف ایشیائی قوموں کے۔ جن کو چلانا گویا زبردستی سے چلانا ہے گویا مغرب میں رہنمایان قوم کا کام صرف یہ ہے کہ سیدھا راستہ بتا دیں اور مشرق میں رہنمایان قوم کو صرف راستہ بتانا نہیں بلکہ اندھی اور اپاہج قوم کو پیٹھ پر لاد کر لے چلنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے ملکوں میں جس قدر کام قومی چندوں سے چلتے ہیں انکا قیام سلطنت کے کاموں سے زیادہ یقینی اور دوامی سمجھا جاتا ہے بہ خلاف مشرق کے جہاں "چندہ برائے چندے" ایک مشہور مثل ہے۔

ایک قرن ہوتا آتا ہے کہ ہمارے قومی رہنما ہمکو قومی خیرات اور قومی چندوں کا سبق دے رہے ہیں اور ستو ستو طرح سے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی ضروریات کو ہمیں خود بہم پہنچانا چاہیئے۔ اسلیئے کہ سلطنت کی مصلحتیں عام ہیں اور شاہی خزانے کا مصرف ایسا نہیں ہو سکتا جس میں خاص فرقوں کی ضروریات کا لحاظ رکھا جاسکے۔ لیکن ہم پھر بہک کر اُسی طرف جا پڑتے ہیں اور خیرات کا مناسب مصرف صرف مسٹنڈے اور کام چور بھک منگوں کی پرورش کو تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں

تعلیم نے ہزاروں برس سے ہمارے دل ودماغ کو مسخر کر رکھا ہے ہمارے رہنماؤں کا کام واقعی سخت مشکل ہے. کیونکہ ایسی لکڑی کا سیدھا کرنا جو ہزاروں برس کمان کیطرح خمیدہ رہ چکی ہو آسان نہیں ہے. جب اُسکو سیدھا کرکے چھوڑ دیجئے گا وہ پھر اپنی سابق کی شکل پر عود کر آئے گی. ہاں اوسکا سیدھا کرنا اُسوقت ممکن ہے جب اوسکو حب قومی کی آگ کی سینک پہونچائی جائے اور لعنت وملامت کے شکنجے میں وہ بار بار دبائی جائے اسی وجہ سے اکثر مصلحان قوم ایک ہی بات کو بار بار بیان کرتے ہیں جس پر بسا اوقات ہم جھنجلا کر کہہ اٹھتے ہیں کہ "یہ پرانی باتیں ہیں اُن کے دہرانے سے کیا فائدہ لیکن ریفارمر کا یہ کام ہے کہ جھڑکیون کو برداشت کرے دھمکیون کو پی جاوے اور اپنی دُھن سے باز نہ آئے.

مجھے یاد ہے کہ جب میرے محترم دوست اڈیٹر رسالہ ہذا نے اس رسالے کو جاری کرنے کا قصد کیا تھا. تو اسی سکندرآباد کے ایک لائق اور معزز حضرت سے میری موجودگی میں امداد مضامین کی درخواست کی تھی اور یہ کہا تھا کہ "آپ لوگون کی امداد سے شاید یہ رسالہ بھی قومی ترقی کے خادمون میں شمار ہوسکیگا" اس کے جواب میں اُنھون نے نہایت متانت سے فرمایا تھا کہ "میں ان باتونکا معتقد نہیں ہون" مجھے تعجب ہوا کہ ایسے روشن خیال اور جدید تعلیم کے معزز منتہی نے کیونکر ایسا خیال ظاہر کیا میں اسی سوچ میں رہا کہ مجھے اُنکی ذاتی لیاقت کے اعتبار سے کہاں تک اس مقولے کی وقعت کرنی چاہیئے. میرے دلمیں یہ سوالات پیدا ہوگئے. کہ کیا آجتک دنیا کے زبردست ریفارمرون اور بانیان فلسفۂ تمدن و اخلاق نے جس قدر محنت کی ہے وہ سب محض لغویت تھی؟ کیا اُن کے نام کی جو وقعت دنیا کر رہی ہے. وہ محض ڈھکوسلا ہے؟ اور کیا اُنکا اثر دنیا کے واقعات پر پڑنا اور اُسکو بالکل بدل دینا محض افسانہ ہے؟ ان سوالات نے مجھے سخت انتشار میں

ڈالا تھا۔ لیکن یہ انتشار کچھہ دیر پا نہیں ثابت ہوا کیونکہ مجھے یاد آگیا کہ لایق منگو حال میں بعض ذاتی معاملات میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور تفکرات اور تردداتِ کی حالت میں جو دیوجانس فلاسفی انسانی جذبات کو کلبی حوض میں مقید کر دیتی ہے وہی اُن پر بھی اُسوقت شاید غالب آ رہی ہوگی۔ اِس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مطلب ہے کہ گو قومی اور ذاتی خیرات کا مسئلہ تھوڑے دنوں سے بار بار دہرایا جا چکا ہے تاہم قومی توجہ کو دوبارہ اسطرف مبذول کرنا فعل عبث نہ ہوگا۔

اتنی بات سب کو معلوم ہوگی کہ یورپ کے ممالک میں دریوزہ گری قانوناً ممنوع ہے اور جو شخص اِس فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور اپنی خوشی سے اُن محتاج خانوں سے مستفید نہیں ہوتا جو ایسے لوگوں کے فائدے کے لئے قومی چندوں سے قایم ہیں اُسکو بجبر پکڑ کر محتاج خانے میں لیجاتے ہیں۔ جہاں جاکر اگر وہ کام کے لایق ہوا تو کوئی کام سیکھتا ہے۔ اور ایک مدت مقررہ کے بعد آزاد کر دیا جاتا ہے۔ کہ جہاں چاہے جائے اور اُس دستکاری سے اپنی پرورش کرے جو اُسکو سکھائی گئی ہے۔ لیکن اگر وہ بالکل اپاہج اور بیکار ہے تو وہ ہمیشہ قومی خیرات کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور محتاج خانے میں اُسکی پرورش اور آرام اور صحت کی کفالت کیجاتی ہے۔ گویا اِس صورت سے ہزاروں ایسے لوگ جو بصورت دیگر نکمّے دریوزہ گر بنتے اِس بےحیائی اور بیکاری کی زندگی سے بچ جاتے ہیں اور قوم پر بارگران ہونے کے بجائے اُس کے کارآمد اجزا اور اعضا بنجاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسا کوئی انسٹیٹیوشن موجود نہیں ہے اسلئے بہت سے نقلی محتاج قوم کا خون چوستے ہیں اور اصلی محتاج دربدر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اِس حالت میں یہ تعلیم کہ محتاجوں مسکینوں بیواؤں اور یتیموں کی امداد بالکل بند کر دیجائے۔ نہایت سنگدلانہ تعلیم ہوگی۔ جب تک کہ معقول انتظام اُنکی کفالت کا موجود نہ ہو۔ اور اسمیں کچھہ شبہ نہیں کہ قومی خیرات کی تعلیم کے ساتھہ ساتھہ قومی

محتاج خانوں کے قیام کی کوشش اور دریوزہ گری کی قانونی ممانعت کی گورنمنٹ عالیہ سے درخواست کرنا ضروری اور لابد ہے۔ موجودہ طریقہ خیرات میں پانے والون کی دنائت اور بے حیثیتی میں ترقی ہونے کے علاوہ یہ بہت بڑی خرابی ہے کہ اصلی محتاجون کے حقوق زیادہ تر موٹے تازے اور آسودہ حال بھک منگون کو ملتے ہیں اور اس آسان کمائی کا رواج روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ جس سے قوم کے وہ اجزا جو کارآمد ہو سکتے تھے صرف بیکار ہی نہیں ہو جاتے بلکہ قوم کے جان پرور خون کو چوس لیتے ہیں اور اس طور پر وہ قومی دولت جس کا مناسب استعمال اصلی قومی قوت کا منبع ہوتا اس طرح برباد ہوتی ہے جس سے علاوہ اسقدر روپیہ کے ضایع ہونے کے قومی تنزل کے اسباب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہ وہ نقصان ہے جسکی تلافی اُسوقت تک ممکن نہین جب تک ہم متفقہ کوششون سے اس طریقہ خیرات کا انسداد نہ کریں جو اسوقت جاری ہیں۔ اور جب تک اصلی محتاجونکی کفالت کا انتظام کافی نہ کریں اور جب تک مسٹنڈے بھک منگون کو کام کرنے پر مجبور نہ کریں۔

لیکن اسکا انسداد اسوقت تک کیونکر ہو سکتا ہے جب تک ہمارے دل میں یہ خیال جاگزین ہے۔ کہ ہر دریوزہ گر کو ہماری فیاضی سے حصہ لینے کا قدرتی اور مذہبی حق حاصل ہے۔ کثرت سے ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے دل میں اچھی طرح سمجھتے ہین کہ ہم ایک غیر مستحق شخص کو خیرات دے رہے ہیں مگر پھر بھی دینے سے انکار کرنا معیوب سمجھتے ہین۔ کیا روزمرہ یہ مثالیں ہمارے دیکھنے میں نہیں آتیں کہ پیرجی۔ شاہ صاحب۔ مہنت جی۔ شاعر۔ میلاد خوان مرثیہ گو بگڑے ہوئے نواب زادے لٹے ہوئے مسافر مسجد مندر یا چاہ کے بانی وغیرہ کے مختلف بھیس میں بڑے بڑے موٹے اور مسٹنڈے بھک منگے ہمکو روزمرہ لوٹتے اور ہمارا خون چوستے ہین باقی آئندہ

انعام اختر۔ الہ آبادی

اداۓ بے نیازی

مرے دلکو بھا گئی ہے یہ اداۓ بے نیازی | کہ ہو بے نیاز ہو کر تمہیں پاس دلنوازی
یہ عدم کے جانیوالے ہیں تمہارے ہی تو شائق | کوئی رہ گیا ہے پیچھے کوئی لے گیا ہے بازی
مجھے آرزوے وصلت تمہیں عاشقوں سے نفرت | مجھے دلدہی کی عادت تمہیں خوۓ بے نیازی
مرا منہ ہے جو کہوں میں کہ نہیں خیال میرا | یہ تمہیں تو کر رہے ہو مرے دل کی چارہ سازی
جو سحر پہ منحصر ہو رخ مہروش کا جلوہ | تو نہ عاشقوں کو کھٹکے شب ہجر کی درازی
نہیں اعتنا جو میری تو نہ ہو کہ تم ہو یکتا | جو میں سر پہ تم کو واروں تو ہے میری سرفرازی
مرا ہند گو وطن ہے کوئی جستجو تو دیکھے | کہ چلا ہوں سوۓ یثرب پۓ دلبر حجازی
یہ مرے دل و جگر ہیں جو تمہارے ہو گئے ہیں | مری جان سخت مشکل ہو و گر نہ عشقبازی
جو ہو فرد حسن میں تم تو میں عاشقی میں کامل | تمہیں فکر بے نیازی ہے مجھے فخر جانگدازی
کوئی مر مٹے گا لیکن نہ جھلک دکھاؤ گے تم | وہی دید روز محشر کی کرو گے حیلہ سازی
یہ تمہارا آستاں ہے کہ ہے دیر بھی حرم بھی | یہیں جمع ہیں برہمن یہیں جمع ہیں نمازی

کسی سنگدل سے جلکر جو یہی ہیں گرم آہیں
تو کریگی نرم محوی اسے میری دلگدازی

محمد حسین محوی

اسیرانِ عدم

اے طلسمِ روزگار! اے ہستیِ ناپائدار
اب وہ راتیں ہیں نہ باتیں ہیں نہ وہ لیل و نہار

وہ جوانی اب کہاں۔ وہ شانِ برنائی کہاں
لطفِ صحبت وہ کہاں وہ محفل آرائی کہاں

جوشِ وحشت کی نہ پوچھو آہ! کچھ سرتابیاں
دن کو ہیں بیتابیاں شب کو پریشاں خوابیاں

دیدۂ تر سے رواں شام و سحر ہے جوئے خون
آ رہی ہے حسرتِ خونِ گشتہ سی اب بوئے خون

بیکسی یاروں کے غم میں نالہ کش اب دل میں ہے
اپنی لیلی آہ! اب ماتم نشیں محمل میں ہے

کیا لگائیں تجھ سے اے دنیائے فانی! دل کو ہم
اک خرابہ اب سمجھتے ہیں تری محفل کو ہم

آہ دنیائے دنی! تو سخت ہے ناپائدار
تیری بزمِ عیش سے ہنگامۂ رقص و سرور

وہ دلِ زندہ کہاں وہ عیشِ دنیا اب کہاں
چشمِ نظارہ کہاں ذوقِ تماشا اب کہاں

کس کو گلگشتِ چمن کا اے صبا! ہے اب دماغ
دیدِ گل کا ہم اسیروں کو ملے ہے کب دماغ

ہم ہیں پابندِ قفس اٹکھیلیاں ہم سے نہ کر
اے نسیمِ صبحگاہی! شوخیاں ہم سے نہ کر

سیرِ گل تم کو مبارک! ہم صفیرانِ چمن
گیت آزادی کے گاؤ مل کے مرغانِ چمن

ہو گیا جب آہ! اپنی آرزوں کا فشار
ہم کو کیا اے گلستاں ہے ہو خزاں یا اب بہار

آہ! اے عیشِ زمانہ ہو گیا دل تجھ سے سرد
شہر میں رہ کر کریں کیا ہائے! ہم صحرا نورد

صحبتِ احباب کا وہ مشغلہ جاتا رہا
ہائے وہ زندہ دلی کا سلسلہ جاتا رہا

محفلِ یاراں ہے اب شہرِ خموشاں ہو رہا
مجمعِ احباب ہے۔ گنجِ شہیداں ہائے! ہائے

بانکے رام شاد۔ بجواڑیہ

ہمتِ مردانہ

آ ہمتِ مردانہ کہ دلمیں تری جا ہے　　　مت آنکھ چرا مجھ سے یہی شرطِ وفا ہے
تو ہو مری دمساز تو پروا مجھے کیا ہے　　　سایہ ترے شہپر کا یہ از بال ہما ہے
تو فضل الٰہی کی نشانی ہے جہاں میں
واللہ کہ چرچا ہے ترا کون و مکاں میں

احباب اُٹھو ہمتِ مردانہ وہ آئی　　　ہمراہ لئے شوکتِ شاہانہ وہ آئی
اب پھینک دو کچکول گدایانہ وہ آئی　　　کس ٹھاٹھ سے آتی ہے عروسانہ وہ آئی
مردوں سے تو ملنے میں اُسے عار نہیں ہے
نامرد سے البتہ سروکار نہیں ہے

ہم مرد توانا ہیں کوئی چیز نہیں ہیں　　　دنیا میں کوئی چیز ہیں ناچیز نہیں ہیں
آزاد ہیں پابستۂ دہلیز نہیں ہیں　　　بل بیٹے سے پس جائیں وہ کشنیز نہیں ہیں
کیوں بحرِ حمیت نہ بھلا جوش میں آئے
جب ہمتِ مردانہ خود آغوش میں آئے

اب کام جو کرنا ہے وہ مردانہ کریں گے　　　ہر حال میں برتاؤ شجاعانہ کریں گے
محنت سے علاجِ دلِ دیوانہ کریں گے　　　رنج و غم و اندوہ کی پروا نہ کریں گے
رہتا نہیں اندوہ جہاں حسنِ عمل میں
مردوں کو بلا دور یہ مشہور مثل ہے

ہم مرد ہیں غیروں کا سہارا نہیں لیتے　　　پیراک ہیں دریا کا کنارا نہیں لیتے
جو شیر ہیں صید اور کا مارا نہیں لیتے　　　ہو آہوِ صحرا کہ چکارا نہیں لیتے

لالچ کی نگاہوں سے نظر تک نہیں کرتے
ہاں راہِ خیانت سے گزر تک نہیں کرتے

ہیں مرد جو محنت سے کبھی جی نہ چرائیں   اوقات معین پہ ہر اک کام کو آئیں
بیکار نہ بیٹھیں کہیں بیکار نہ جائیں   ہمت یہ ہے دوسروں کا ہاتھ بٹائیں

مفلس ہوں تو کچھ غم نہیں ہمت تو ہے عالی
بلور سے بہتر ہے انھیں جام سفالی

ہے نانِ جویں انکو مزعفر سے زیادہ   ٹوپی ہے انھیں تاجِ سکندر سے زیادہ
کمل ہے انھیں خلعتِ پرزر سے زیادہ   ہے وسعتِ خانہ انھیں کشور سے زیادہ

ہے دولتِ جاوید پسینے کی کمائی
آئینہ خجل ہو یہ ہے سینے کی صفائی

وہ دولتِ قاروں کے لئے جھوٹ نہ بولیں   اور ملکِ فریدوں کے لئے جھوٹ نہ بولیں
عشقِ لبِ مے گوں کے لئے جھوٹ نہ بولیں   یا دِقدِ موزوں کے لئے جھوٹ نہ بولیں

اندوختۂ غیر کو چھونے سے غرض کیا
مردوں کے لئے خواہشِ بیجا کا ضرر کیا

اک دانہ جو ہاتھ آئے تو وہ بانٹ کے کھائیں   افسردہ لئیموں کی طرح منہ نہ بنائیں
محسن ہوں پر احسان کسی پر نہ جتائیں   لیتے رہیں دن رات ضعیفوں کی دعائیں

کیا ہے انھیں تولے جو کوئی زر کی برابر
وہ زر کو سمجھتے نہیں پتھر کی برابر

جو مرد ہیں رشوت نہیں لیتے نہیں دیتے   یہ مردِ دیانت نہیں لیتے نہیں دیتے
کونین کی نکہت نہیں لیتے نہیں دیتے   انصاف کی قیمت نہیں لیتے نہیں دیتے

رہتے ہیں ہر اک حال میں انصاف کے پابند

آئینہ کی صورت ہیں دل صاف کے پابند

بیکار رہ وہ دن زیست کے دنیا میں گزارے محتاج جو ہو جائے کسی در کے دوارے
یا بیٹھ گیا ہو یم ہستی کے کنارے کچھ کر نہ سکے قوتِ بازو کے سہارے
مردانِ اولوالعزم نہیں بیٹھتے بیکار
اوروں کے بھروسے پہ نہیں رہتے زناں وار

کیا ناز ہے ہم خود تو نہ کچھ ہاتھ ہلائیں اوروں کی مشقت سے جو پیدا ہو وہ کھائیں
واللہ کہ غیرت کو اگر کام میں لائیں مر جائیں مگر غیر کا احسان نہ اٹھائیں
وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

کاہل نہیں طامع نہیں نامرد نہیں ہم بیکار پڑے کیوں رہیں دل سرد نہیں ہم
دیں اور کو تکلیف وہ بیدرد نہیں ہم ہیں مردِ جفاکش کوئی شبگرد نہیں ہم
محنت میں جو پابندی اوقات کریں گے
کیوں پست ہم اپنے یہ خیالات کریں گے

پابندی ناموس ہے کام اہلِ حیا کا نگرانیِ افعال ہے شیوہ عقلا کا
لغزش نہیں کرتا قدم اربابِ صفا کا انداز پسندیدہ ہے مردانِ خدا کا
ہر صورتِ خوش دیکھ کے کرتے نہیں آہیں
قبضے میں وہ دل رکھتے ہیں قابو میں نگاہیں

ہر شکل پہ دلدادہ و شیدا نہیں ہوتے ہر شوخ سے سرگرمِ تمنا نہیں ہوتے
در در صفتِ نقش کفِ پا نہیں ہوتے ہرجائی نہیں بنتے ہیں رسوا نہیں ہوتے
قبضے میں نہ جب دل ہو تو مردانگی کیا ہے
اتنی بھی نہ ہو عقل تو فرزانگی کیا ہے

مردانِ خدا آؤ کریں عہد بہم ہم — اب کیوں رہیں وابستۂ زنجیر الم ہم
بیکار نہ ہوتے پھریں ہر بزم میں خم ہم — کوشش کریں ہو جائیں ذو المجد و کرم ہم
جو ڈھونڈتے ہیں دور وہ نزدیک ملیگا
دیکھیں بہ تعمق تو ہمیں ٹھیک ملے گا

منکوحہ گل اندا موں سے عشرت نکریں کیوں — ہیں جن کے لئے اُنسے محبت نکریں کیوں
خود لائے جنھیں بیاہ کے الفت نکریں کیوں — مطلوب رضا جو سے مروت نکریں کیوں
مہجور پھریں کس لئے اُن سیمتنوں سے
جادو نظروں حور وشوں گلبدنوں سے

یہ صاحبِ عصمت یہ وفادار یگانہ — یہ زینتِ ایوان یہ رونق وہ زنانہ
آنکھوں میں حیا دل میں ادب طرز بتانہ — بیجا نہ تکلم نہ تبسم نہ ترانہ
ہمراہ رہیں تا نفسِ باز پسیں یہ
ہم شاد تو یہ شاد حزیں ہم تو حزیں یہ

اے خالق اکبر مجھے توفیق عطا کر — باندھوں میں کمر تیری رضا پر تجھے پا کر
نالے کو مرے اپنی حضوری میں رسا کر — عشرت دے مجھے خاک مذلت سے اُٹھا کر
تجھ سے ہی ترا احمدی امداد طلب ہے
فریاد کناں در پہ ترے داد طلب ہے

نواب غلام احمد۔ احمدی

جناب عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی

نہ لوہے کے چنے کرتے ہیں نہ فولاد کے ٹکڑے
جو کلمے سخت کرتے ہیں دلِ ناشاد کے ٹکڑے

بنیں گے چاند - اس آئینۂ فولاد کے ٹکڑے
وہ مہ پارہ کرے میرے دلِ ناشاد کے ٹکڑے

بکا کرنے سے بھی نکلا نہ اس دل کا بخار اکدم
اُڑے تھم تھم کے بادل کی طرح فریاد کے ٹکڑے

سُنائیں دل شکن باتیں عدو پر ڈھال کر مجھکو
کئے در پردہ یوں میرے دلِ ناشاد کے ٹکڑے

تری تیغِ نظر نے وہ کیا سینہ فگار اُسکا
ہوئے اک وار میں دو خامۂ بہزاد کے ٹکڑے

دمِ کشتن اگر لغزش ہوئی ہاتھوں میں اے قاتل
تو ہو جائیں گے گر کر خنجرِ فولاد کے ٹکڑے

جلا اے آہ دل ایسا - تماشا دیکھے عالم
دھوئیں کی شکل اُڑیں چرخِ ستم ایجاد کے ٹکڑے

نہ تو دُرِّ عدن یہ ہیں نہ یہ لعلِ بدخشاں ہیں
ہمارے اشکِ خونی ہیں دلِ ناشاد کے ٹکڑے

زباں کے ساتھ کاٹے ہونٹ بھی ظالم نے دانستہ
کئے فریاد کے ڈر سے لبِ فریاد کے ٹکڑے

اسیرانِ قفس ہرگز نہ کھائینگے نہ کھائینگے
اگر دانے کے بدلے ہوں دلِ صیاد کے ٹکڑے

یہ سوزِ دل سے بلبل نے دعا مانگی کہ ای خالق
اُڑا دیں بجلیاں گر کر تنِ صیاد کے ٹکڑے

وہ بھولیں یاد کر کر کے میں رووں ہچکیاں لیکر
اُدھر ہوں یاد کے ٹکڑے - ادھر فریاد کے ٹکڑے

گیا مرگِ عدو کے بعد جو اسکو مرا نامہ
کئے ظالم نے اُس خطِ مبارکباد کے ٹکڑے

نہ توڑ اس طرح ای گلچیں چمن میں پھول چُن چُن کر
ہوئے جاتے ہیں قلبِ بلبلِ ناشاد کے ٹکڑے

خلیق اس ظلم کو دیکھو کہ اک صیاد ظالم نے
اُڑائے نوچ کر پر بلبلِ ناشاد کے ٹکڑے

تازہ کلام

جناب نواب محمد عمر خاں صاحب بہادر وفا حیدرآباد دکن

گزرگاہ آ گئی جس دم نظر اُس حور طلعت کی
حقیقت کھل گئی زاہد پہ سب گلزار جنت کی

خدا نے شکل زیبا یار کو ایسی عنایت کی
گلوں کا فق ہے چہرہ وجہ سے فرطِ خجالت کی

پریشانی نہ پوچھو ہم گرفتاران الفت کی
لگی رہتی ہے اپنے تن بدن میں آگ فرقت کی

ترقی جیسی جیسی عمر میں ہوتی گئی گویا
بڑھی ہیں شوخیاں حد سے سوا ان کی طبیعت کی

مرا خط دیکھ کے قاصد اُس مسیحا دم سے کہہ دینا
ذرا تو لے خبر آکر مریضِ دردِ فرقت کی

فراقِ یار میں تھی ایک اک ساعت کٹھن ہم پر
ہوا جب وصل اُس سے ٹل گئیں گھڑیاں مصیبت کی

نہیں ہے نام کو باقی نشاں تک اپنے مدفن کا
پس مردن بھی یہ کچھ خاک اُڑائی اُس نے تربت کی

وفا اُس یار کے کوچے میں جب سے اپنا بستر ہے
نہ حوروں سے ہے مطلب اور نہ خواہش ہے جنت کی

مکالمات

ماسٹر امیر چند صاحب کی طرف سے رسالہ زبان ماہ جنوری میں موجودہ طریقہ تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کی حالت کے چند نقائص شائع ہوئے جنمیں سے بعض ایسے ہیں جنکا دور کرنا خود معلمونکا ذمہ ہے اور بعض ایسے جنکو حکام بالا دست محکمہ تعلیم بآسانی دور کر سکتے ہیں مگر زیادہ تر تعلیم کے نقص تعلیم سے ہی دور ہو سکتے ہیں۔

۱۔ آپ لکھتے ہیں کہ پڑھانے مدرس سند یافتہ تو ہوتے ہیں۔ مگر اصولوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انکو سند کس بنا پر عطا ہوتی ہے۔ اور کس بات کی یہ سند سے تصدیق ہوتی ہے۔ جبکہ وہ اس بات سے ہی واقف نہیں جسکی وہ سند ہے۔ انکو تو صرف اصولوں سے واقفیت یعنی اصولونکا علم ہی نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ انکو پورے طور سے عمل میں بھی لانے کی قابلیت رکھنی ضروری ہے۔ تب وہ سند کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ شاید اصول تعلیم کے علم و عمل کے علاوہ اور کسی قابلیت کے صلہ میں بھی سند معلمی بجاتی ہوگی مگر سند میں انکی معلمی کی قابلیت پر تو ضرور صواد ہوتا ہوگا :

۲۔ آپنے فرمایا ہے کہ بعض مدارس میں جو مذہبی تعلیم ہوتی ہے۔ وہ برائے نام بے قاعدہ اور خراب طریقہ پر ہوتی ہے۔ اور آگے جاکر اس بات سے مایوسی ظاہر کرتے ہیں کہ بہت کم نوجوانوں کی زندگی فی الواقع دھارمک اور اعلیٰ درجہ کی نیک نہیں ہوتی۔ یہ بھی اجتماع ضدین معلوم ہوتا ہے۔ جب تعلیم ہی غلط اور بے قاعدہ، اور برائے نام ہے تو اعلیٰ درجہ کی نیک کیا۔ کچھ بھی نیک ہونی دشوار ہے بس تعلیم کا ناقص اور بے قاعدہ ہونیکا ذمہ وار کون۔ مدرسین یا طلباء؟ پہلے مدرسوں کی تعلیم ٹھیک ہو تو وہ اور کو بھی ٹھیک سکھا سکیں گے۔ لہذا تعلیم کے نقص دور کرنے کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے اور اس اشد ضرورت تعلیم کو ایسا خفیف اور بے قاعدہ بنانے سے نہیں معلوم کیا ثواب یا

مکالمات

رسالہ زبان نمبر ۴ سنہ ۔۔

خواہ کچھ ہی سکھاؤ اور کتنا ہی تھوڑا سکھاؤ اسلئے جو کچھ بھی
یاد ہو گا ۔ حاصل ہو تو اسے ۔ طلباء تو کچھ نہ کچھ سیکھتے ہی ہیں ۔
سکھایا جائے وہ صحیح اور باقاعدہ ہونا ضروری ہے ۔
۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان کا انٹرنس کے امتحان کے امیدواروں کو بے سوچے سمجھے نیک چلنی کا سرٹیفکٹ دیدینا
ایک ماسٹر کی قلم سے ایسا بڑا نقص لکھا گیا ہے جسکو پڑھکر عوام کی نظر میں ان عالی وقار صاحبوں کا ملکا پن ظاہر
ہے ۔ کیا وہ نیک چلنی کے معنی نہیں سمجھے یا تحقیقات کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں یا جان بوجھکر قانون اخلاق کے خلاف
کرنے پر کمربستہ ہیں ؟؟ شاید یہ سبب ہو گا کہ اگر وہ اپنے طلباء میں سے کسی کو بھی سرٹیفکٹ مذکور کے
دینے سے انکار کریں تو اپنے آپکو ملزم ٹھیرائیں یعنی اپنی تعلیم کو ناقص تسلیم کریں کیونکہ انکے شاگرد نیک چلنی کے
معیار سے گرے ہیں ۔ یا یہ وجہ ہوگی ترقی و ثبات زیادہ طلباء کے بھیجنے اور پاس کرانے میں ہوتی ہے اسلئے
اگر تعداد میں کچھ کمی ہو جائے تو باعث نقصان و بدنامی ہے ۔ یہ نقص تو بڑا سنگین ہے اور اسکو تو سارا محکمہ اگر وہ
۔ جب ہی دور کر سکتے ہیں لیکن چال چلن کا بہت سا الزام والدین یا دردست و رشتہ داروں پر بھی عاید
لگا ۔ ہو سکتا ہے ہیڈ ماسٹر صاحبان کو ہی کیا خطرہ ہے مگر کیتی نیک چلنی دنیا دی نیک چلنی سے مختلف سمجھی گئی ہے جو
سے سرٹیفکٹ نیک چلنی مدرسہ پر صحبت عطا ہو جاتا ہے ۔ باہر خواہ کوئی کچھ بھی خیال کیا کرے مدرسہ کی دنیا عام دنیا سے علیحدہ ہے ۔
۴ ۔ نیک و بد طلباء کے یکجا مدرسہ میں رہنے کا نقیض تحریر کیا ہے اور اسکو لاعلاج بتلایا ہے ۔ اسمیں بھی
آپ ہی قصور وار ٹھہرتے ہیں جس طالبعلم کی بابت یہ امر تصدیق ہو چکا کہ وہ بد ہے ۔ پھر وہ اسکو نیک طلباء
سے علیحدہ نہ کرنا ماسٹر یا ہیڈ ماسٹر کی کمزوری بلکہ اپنے شاگردوں پر بے رحمی کے سوائے اور کیا
کہا جا سکتا ہے ۔ ایک بھیڑ سارے گلے میں بیماری پھیلاتی ہے ۔ اسلئے پہلے ہی اس بیمار بھیڑ کو
دور کیوں نہ کیا جائے مگر شاید وہ بھیڑ بہت زبردست ہو اور چرواہے کے قابو میں نہ آتی ہو ۔
۵ ۔ کریکٹر کے معنی ادب اطاعت خاموشی اور پابندی وقت کے نہیں تو اور کیا ہونے چاہئیں
طلباء میں اگر یہ خوبیاں پائی جائیں تو اس سے بہتر ہو کیا ۔ اگر طالب علم مطیع اور وقت کا پابند ہے
تو اسکو اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ کی کریکٹر والا بنا سکتے ہیں نہ صرف طالب علم بلکہ ہر محکوم کی نیک
خصلت کا معیار ۔ دیکھی اطاعت و فرمانبرداری ہوگی ۔ پنڈت ۔ کشمیر دیال

نوٹس

برہمو چریہ آشرم شانتی نکیتن بولپور۔ یہ درسگاہ ہے۔ جو مہارشی دیوندر ناتھ ٹھاکر نے قائم کی ہے اسکا اصول تقریباً گروکلون کے طریقے پر ہے۔ بولپور ریلوے اسٹیشن سے ڈیڑھ میل دور ایک چٹیل میدان پر واقع ہے۔ آب و ہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے۔ طلباء کو سنسکرت۔ بنگلہ انگریزی۔ حساب۔ سائنس۔ تاریخ وغیرہ کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اور جو طلباء چاہتے ہیں اونکو انٹرنس کے امتحان کے لئے بھی تیار کیا جاتا ہے۔ اس درسگاہ کی خصوصیت یہ ہے کہ طلباء کو نیک چلن استادون کے ساتھ ہر وقت رہنا پڑتا ہے جس سے اُنکی اخلاقی درستی پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ پڑھائی کا طریقہ مستند معلمونکی رائے سے معلوم ہوا ہے کہ معمولی مدرسون سے نہایت آسان اور عمدہ ہے لیکن اسی عرصہ کے اندر انٹرنس تک کی پڑھائی ختم کردی جاتی ہے۔ جتنی کہ سرکاری مدرسونمیں ہوتی ہے۔ سبق کو کبھی وبال نہیں بنایا جاتا ہے۔ عادات کی سادگی پر بھی بہت زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ غریب اور امیر سب لڑکونکو ایک ہی حیثیت میں رکھا جاتا ہے۔ غذا مین گوشت کی ممانعت ہے۔ کل سامان جو لڑکون کے ساتھ ہوتا ہے وہ یہ ہے۔ کمبل۔ توشک۔ تکیہ۔ لحاف۔ چادر۔ اور تہری پہننے کو سات فرد دھوتی۔ کرتے چار۔ رضائی اور انگوچھے۔ برتن۔ ایک لوٹا۔ دو کٹورے۔ اور گلاس۔ البتہ پڑھنے کے دیگر سامان میں کوئی کفایت شعاری نہیں کیجاتی ہے۔ طلباءً کا ماہواری خرچ فیس مع بورڈنگ تقریباً پچیس ۲۵ روپیہ ہے۔

ہمارے خیال میں ایسے مدرسون کے خرچ چندہ سے جمع کرکے تھوڑی فیس پر ہونے چاہئیں۔ اس سال طلباء کی تعداد ایک سو چالیس ۱۴۰ ہے۔ اور معلمین ۲۳ ہین۔ اور مہرشی کے لائق جانشین سری جیتندر ناتھ ٹھاکر اسکے منتظم ہین۔ امید ہے کہ ملک میں ایسے اور مدرسے جاری ہون۔ تاکہ قوم کو فائدہ پہنچے ؂

نوٹس

رسالہ زبان نمبر ۴ سنہ ۱۱ء

تعلیم عام مسٹر گوکھلے کی تجویز متعلق تعلیم عام پر ہر ایک خواندہ ہندوستانی غور کر رہا ہوگا
سنا جاتا ہے کہ بعض پرانے خیال کے اشخاص عام تعلیم کو اس بنا پر نا پسند کرتے ہیں کہ اس سے ملازم
پیشہ لوگ اور بھی کمیاب ہو جائیں گے یہ دقت اب بھی ملک میں عام طور پر محسوس ہو رہی ہے
پھر پڑھ لکھکر ہر ایک کہار کا لڑکا "بابو" بن جائیگا - یہ اعتراض تو بظاہر کسی قدر معقول معلوم
ہوتا ہے لیکن اسمیں ایشیائی حکومت کی بو آ رہی ہے - جو کسی ذات کو ہمیشہ کے لئے اونچا اور
کسی کو نیچا بنا دیتی ہے - ظاہر ہے کہ تھوڑا پڑھ لکھ جانیسے "ہر کس و ناکس" "بابو" نہیں بن سکتا
البتہ جو ذہین اور ایماندار ہو وہ قدرتی طور پر ترقی کریگا - اسمیں پیدائشی بابوؤں کو شکوہ نہیں ہونا چاہیئے -
ایک دوسری قسم کا اعتراض جو اس عام تعلیم کے متعلق پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے
کہ قلم پیشے اور دستکاروں کے بچوں کی تعلیم الگ الگ طریقوں پر ہونی چاہیئے - کیونکہ دستکاروں
کو آگے چلکر زیادہ تر اپنے ہاتھ پیر نگاہ وغیرہ حواس خمسہ سے کام لینا ہے لہذا انکو دس سے
چودہ برس تک قید خانوں میں بند کرکے - انکی آئندہ ضروری تعلیم کے حق میں مضر ثابت ہوگا
اسکے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حواس خمسہ کی تربیت قلم پیشہ لوگوں کے بچوں کے لئے
اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ دستکاروں کے بچوں کے لئے ہے لہذا اگر انکو بھی بجائے معمولی
مدرسوں کی پڑھائی کے کنڈرگارٹن کے طریقے سے سکھایا جائے تو بہتر ہوگا - لیکن ب
عشق تیں نیں (ع) اسلیئے ہندوستان میں ایک نیا کنڈرگارٹن کا طریقہ نکالنا پڑیگا
تیسرا اعتراض یہ بھی ہے کہ ہندوستان اونچے نیچے درجہ کے لوگوں میں اسقدر اخلا
تفاوت ہے کہ انکے بچوں کو ایک جا تعلیم دینا کسی قدر باعث اعتراض معلوم ہوتا ہے - اسکے
ریاست میسور کا طریقہ تجویز کرتے ہیں کہ جہاں مختلف قوموں کے لئے بموجب ان کی حیثیت
وغیرہ کے علیحدہ علیحدہ کیفیات الگ الگ مدرسے قائم کئے گئے ہیں ؎

ترمیم متعلق قانون ازدواج عام قاعدہ تکمیل ازدواج کا چند مذہبی رسومات
کرنے کسے ہوا کرتا ہے - لیکن جو اشخاص ہندو - مسلمان - عیسائی وغیرہ کسی مستند

تعلق نہیں رکھتے ہیں انکے ازدواج کے لیے طریقہ سرکاری رجسٹری قرار دیا گیا چنانچہ ۱۸۷۲ء میں ایک ایکٹ خاصکر برہمو فرقے کے لئے بنایا گیا۔ لیکن اوسمیں فریقین کو یہ اظہار کرنا پڑتا تھا کہ وہ مذکورہ بالا مذاہب میں سے کسی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ لہذا چند برہمونکو یہ اعتراض تھا کہ وہ اس قسم کا کوئی اظہار دینے کے لئے تیار نہیں ہیں لیکن ساتھ ہی اگر انکا ازدواج اس قانون کے مطابق رجسٹری ہوجائے تو وہ ناجائز ہوتا تھا۔

اس دقت کو رفع کرنے کے لئے آنریبل مسٹر بھوپیندر ناتھ باسو نے یہ ترمیم پیش کی کہ مستند مذاہب سے انکار اس کا ضروری حصہ نہ سمجھا جائے۔ اوس سے یہ فائدہ ہوتا کہ صرف برہمونکی مذہبی شکایت جاتی رہتی بلکہ اسکا فائدہ ہندو مسلمان اور دیگر فرقون کو بھی پہنچتا۔ کیونکہ بہت سے اشخاص ایسے ہیں کہ جنکے باہمی تعلقات عقد مذہبی قیود سے جائز نہیں۔ لیکن سوسائٹی کے وسیع قانون کی نظر میں وہ قابل اعتراض نہیں سمجھے جاتے۔ مثلاً ایک بنئے اور کھتری کا تعلق یا ایک ہندو اور مسلمان کا تعلق عموماً مذہبی رو سے جائز نہیں سمجھا جائیگا۔ حالانکہ ہندوستان کے کسی کسی حصہ میں مثلاً ریاست نیپال اور حیدر آباد دکن میں رائج ہے۔ اس ترمیم کے بموجب ایسی ایسی شادیان قانوناً جائز ہوسکتی تھیں۔ لیکن اس بدقسمت ملک میں جو بہتری اُنکے لئے سوچی جاتی ہے اوسکو وہ مشکوک تصور کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ اس ترمیم کے برخلاف بہت سے ہندو اور مسلمان صاحبان نے مخالفت کی۔ اس ترمیم سے مذہب کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا۔ کیونکہ محض شادمانی کی خاطر جیسے پہلے کسی کو اپنے مذہب سے انکار کرنے کا موقع تھا۔ اسمین وہ بالکل ہی جاتا رہا۔ اسکے پاس ہوجانے سے یہ ضروری نہیں کہ عام طرح سے مختلف فرقونکی شادی ہونے لگے۔ گو اُسمیں ہم ذاتی طور پر کوئی قابل اعتراض بات نہیں پاتے ہیں۔ اس ترمیم کا ایک فائدہ رائج الوقت ازدواج میں بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اسکے بموجب کوئی شخص ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادی

نوٹس

رسالہ بان نمبر ۲ ۱۹۱۱ء

نہیں کر سکتا ہے۔ کثیر الازدواجی کے نقصانات سے ہر ایک مذہبی بھی آگاہ ہے۔ لیکن عیاشی کے لئے مذہب کا سہارا بعضونکو بہت آسانی سے ملجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی کو اس طریقہ سے رجسٹری کرا لے تو وہ اون خطرون سے نجات پائے گا۔ جو کبھی کبھی اس ملک کے مسلمان اور نیز ہندؤن میں ہوتے رہتے ہیں ❊

لہذا عوام الناس کا اس ترمیم کی بابت اعتراض محض بے بنیاد ہے۔ اور ہم گورنمنٹ سے التجا کرتے ہین کہ وہ چند مذہبی اشخاص کے شور وشغب سے سوسائٹی کے قدرتی حقوق کی پائمال نہیں کرے گی۔ ہم تمثیلاً گورنمنٹ کو ایج آف کونسنٹ بل کے زمانہ کی ناراضگی کی یاد دہانی کرتے ہیں۔ ❊

دہلی دربار ماہ حال ابیاکھ، بنگلہ رسالہ پربانی میں جو بابو رامانند چیٹرجی کلکتہ سے نکالتے ہیں۔ دہلی دربار کے متعلق ایک سوال یہ ہے ہ کیا وجہ کہ ہندوستان گورنمنٹ برطانیہ سے اس موقع پر چوگنا خرچ کریگا۔ ایڈیٹر صاحب سوال کرتے ہیں کہ کیا ہندوستان ولایت سے چوگنا متمول ہے۔ یا وہان کے لوگونکی بادشاہ پرستی یہان سے چوتھائی ہے وغیرہ وغیرہ لیکن انکو یہ نہین سوجھتا کہ یہ ایشیائی ملک ہے یہان رعایا بادشاہ کے لئے جان تک دینے کو ہمیشہ تیار رہی ہے۔ مال کیا چیز ہے! اسوقت شاید ہی کوئی کمبخت بادشاہ کے مبارک قدم بوسی کے خیال سے خوش نہ ہو رہا ہوگا۔ دیکھنا چاہئے کہ یہ خوشی اونکے جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے یا نہیں۔ اس عالمگیر مسرت اور امید کے ایام میں صرف ایک اور قسم کے اشخاص کو بھی کچھ گلہ ہیگا کہ جو دلی میں اسوقت اپنی دوکان اور مکانون سے اٹھائے جاتے ہین یا ڈیوڑھے دُگنے کرایہ دینے کو مجبور کئے جاتے ہیں!

مگس

حمایت بیوگان

اس عنوان سے ہم رسالہ زبان میں بموجب فرمایش لالہ امیر چند صاحب سیکریٹری بدھوا سہایک سبھا پٹیالہ ایک مضمون شایع کر رہے تھے۔ لیکن فروری مارچ نمبر کا مضمون سیکریٹری صاحب مذکور کو اتنا ناپسند ہوا کہ ہم آیندہ اُنکی بغیر اجازت کوئی مضمون اُن کی سبھا کی طرف سے شایع نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم ہمیشہ حمایت بیوگان کے لئے اس رسالہ میں کچھ جگہ دینے کو تیار رہیں بشرطیکہ اسمیں عوام الناس دلچسپی لے سکیں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ بیوہ نانی جان کے عقد ثانی کی تائید ہی میں لکھا جائے۔ یا برعکس خیال ظاہر کیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ سکریٹری صاحب سبھا کی طرف سے گذشتہ نمبر کے مضمون کو اسی رسالے کے ذریعہ سے تردید کرینگے ؎

پریمانند ودیارہی

جناب ایڈیٹر صاحب۔ آپکے رسالہ ماہ فروری و مارچ سنہ ۱۹۱۲ء میں حمایت بیوگان کے عنوان سے جو مضمون ایک ممبر صاحب سبھا کی طرف سے شایع ہوا ہے اسکو پڑھکر ناظرین رسالہ کو اس بات کی کہ سانچ کو آنچ نہیں راستی کسی نہ کسی پیرایہ میں اور کبھی نہ کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ صاحب ممدوح نے جو بیوگان کے عقد ثانی یا ازدواج مکرر کو آیت حرام لکھا ہے۔ اور یہ تحریر فرمایا ہے کہ اس بارے میں شاستر میں عام حکم جو سب حادی ہو ہرگز نہیں پایا جاتا بلکہ خاص اور شاذ صورتوں میں بر وصمرم پر بحث کیا گیا ہے۔ اسکی کوئی کوئی مثال ملتی ہے راستی پر مبنی ہے۔ ان مثالوں اور نظیروں کو لیکر بعض حامیان بیوگان ہند ایک عام اصول یا قاعدہ تمام بیوگان کے لئے اپنے جوش ہمدردی میں آکر اور عقل سلیم و قوت ناطقہ سے کام نہ لیکر قائم کیا

رسالہ زبان نمبر ۱ سنہ ۱۱ء

چاہتے ہیں۔ وہ بیشک راقم مضمون بالا کے قول کے مطابق ضد بلکہ ہٹ دہرمی ہے یہ بات تو آج کل عام تعلیم کے زمانہ میں عموماً نوجوان طلبا تک جنہیں نیا خون دورہ کرتا ہے۔ اور ہر بات میں جوش و جودت ظاہر کرتے ہیں جانتے ہیں کہ ایک دو یا چند اشخاص سے کوئی عام قاعدہ یا اصول قائم کرنا بڑا علمی جرم ہے۔ اور اس علمی خطا پر اگر عمل بھی کیا جائے۔ تب تو وہ جرم بے حد بڑھ جاتا ہے لہذا تھوڑا سا فائدہ پہنچانے کی خاطر بہت بڑا گناہ یعنی غلط بیانی کرنے سے کیا حاصل۔ بیوگان کی حمایت بلکہ دل و جان سے مدد کرنی کون شر ہے جو نہ چاہتا ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ امداد صرف ازدواج ثانی کی صورت میں ہی ہو سکتی ہے یا کوئی اور بھی طریقہ ہے جس سے اُن کم نصیبوں کی امداد ہو سکے؟ کیا محتاج اور بے کس و بے وارث بیوگان کو روپے سے۔ یا کوئی ہنر و دستکاری سکھا کر اور دہرم کی تعلیم و تدریس دیگر سہارا نہیں پہنچا سکتے؟ یہ سچ ہے کہ آپت دہرم بھی ایک دہرم ہے جسکو ہر ایک فرد بشر کے لئے تسلیم کرنا لازم ہے مگر وہ دہرم ہر وقت اور بالعموم بلکہ بلا استثنا نہیں برتا جا سکتا۔ لہذا اس دہرم کے برتنے اور اسپر کاربند ہونے کی ضرورت کو غور سے دیکھنا بہت ضروری بات ہے۔ ناواجب جوش و ضد سے ایسے بڑے کاموں میں بجز نقصان و جگ ہنسائی کے اور کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ چند اشخاص کی خوشی و آرام سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ تمام دنیا کے لوگ اسطرح عمل کرنے سے ضرور ہی خوشی و آرام پائینگے غلط معلوم ہوتا ہے۔ طبیعتیں اور حالات زندگی مختلف ہوتے ہیں ایک معیار سے سب کو جانچنا اور ایک ہی رسی سے سب کو باندھنا یعنی ایک ہی قاعدہ و قانون کے تابع کرنا جبکہ وہ قانون و قاعدہ پکی و گہری بنیاد پر قائم نہو بڑی زبردستی اور مطلق العنانی ہے ؛

پنڈت رگھبر دیال۔ بی۔ اے۔

زبان

فانوس میں یہ شمع ہے نور انجمن میں ہے

معزز اخبارات و رسائل کی رائے ہے کہ "زبان" ہر لحاظ سے قابل پرچہ ہے۔

اگرہ اخبار۔ صاف ستھرا ہو کسطرح بیانِ دہلی ہنور کے سانچے میں ڈالی ہے زبانِ دہلی رسالہ زبان کا منشا یہی ہے کہ ہندوستان والونکو دہلی کی زبان سکھائی جائے۔ تاکہ وہ اسکے بارییک تر پہلوؤں پر کافی غور کرکے اپنی زبان کی اصلاح کریں۔

سفیر روزگار اگرہ۔ ماشاء اللہ رسالہ زبان ہر طرح قابل قدر پرچہ ہے بعض بعض مشاہیر اہل قلم کے مضامین نظم و نثر اسمیں جو شایع ہوتے ہیں وہ اگر مبالغہ نہ سمجھا جاوے۔ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان اُردو کے سرمایہ ناز ہیں۔

رہنمائے تعلیم لاہور "زبان" کیا حسن ظاہری۔ کیا حسن معنوی ہر لحاظ سے دلکش اور نہایت پسندیدہ ہے...... مضامین اسقدر اعلیٰ اور دلچسپ ہوتے ہیں کہ جبتک کل نظم و نثر کے مضامین ختم نہ ہویں رسالہ ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا...... الغرض رسالہ ہر ایک لحاظ سے نہایت اعلیٰ درجہ کا بلکہ قریباً ہندوستان کے کل ماہوار رسالوں سے بڑھا چڑھا ہے۔

نظام المشائخ دہلی۔ زبان دہلی کا شہرۂ آفاق ماہواری رسالہ ہے... مضامین نہایت ضروری اور کارآمد باتونپر لکھے جاتے ہیں...... دہلی کا تعلق غالب مرحوم کے بعد اب پھر اس رسالے نے قایم کیا ہے۔

کمال دہلی۔ مضامین نظم و نثر قابل قدر ہوتے ہیں۔ کاغذ بہت عمدہ اور نفیس۔ لکھائی میں ایڈیٹر صاحب خود نازک قلم ہیں جنکا ایک دایرہ خورشید جہانتاب سے ہمسری کر رہا ہے۔ جناب ڈاکٹر بی کے تترا صاحب منیجر رسالہ ہذا کے مضامین ڈاکٹری کے متعلق نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں قیمت سالانہ قسم اول ہے اور قسم دوم ہے اس خوبی کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے منیجر رسالہ زبان دہلی سے طلب کیجئے۔

زبان

(۱) زبان۔ اردو کا ایک باتصویر ماہواری رسالہ ہے جو اردو زبان کی ٹکسال دلی سے شایع ہوتا ہے۔

(۲) زبان۔ روحانی۔ اخلاقی۔ تعلیمی۔ جسمانی۔ مالی۔ اور قوم کی دیگر ضروریات پر بحث کرنے کے علاوہ موجودہ زمانہ کے سائنس نئی نئی علمی تحقیقات عام فائدے اور مذاق کے مضمون اور لایق اشخاص کی سوانحعمریاں بھی پیش کرتا ہے۔

(۳) زبان کو مفید بنانے کے لئے۔ چونکہ ہر زبان کے فاضل اور قوم کے بہترین دماغ کوشش کر رہے ہیں اسلئے زبان میں۔ ہر زبان۔ ملک۔ مذہب و ملت اور خیال کے بزرگوں کی رائے معلوم کرنے کا موقع ملتا ہے۔

(۴) زبان چونکہ بیہودہ و لٹریچر گندے مضامین سے ہمیشہ پاک رہتا ہے اسکے مضامین زباندان اصحاب کی قلم سے نکلتے ہیں اور لکھائی چھپائی میں آپ اپنا نظیر سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے طلبا کی اخلاقی درستی اور زباندانی سیکھنے کا رسالہ زبان بہترین ذریعہ ہے۔

(۵) زبان کا نہ کوئی خاص مذہب ہے نہ کسی فریق سے واسطہ بلکہ جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اسکا مشن علمی خدمت کرنا ہے۔ اسلئے نامہ نگار صاحبان سے التجا ہے کہ زبان کے لئے مضمون تحریر کرنے وقت ہمارے اصولونکا خیال رکھیں اور ملک کی ترقی کے دلدادہ ہماری مالی اور قلمی مدد کریں تاکہ جو خدمت ہمنے اپنے سر لی ہے اُسے پورا کر سکیں۔

(۶) قیمت سالانہ قسم اول اعلیٰ کاغذ معہ تصاویر حجم ۲ے صفحہ ۴ قسم دوم معمولی کاغذ دو روپیہ ۲

(۷) طلبا سے اسکی قیمت ۱۲ لیجا سکتی ہے۔

خادم۔ ڈاکٹر بی کے۔ مترا۔ مینجر



فہرست مضامین

زبان پریس دہلی میں چھپا

The "Zaban" Delhi.



Prof. F. C. Andrews, M. A. Delhi.

زبان

بوسۂ خنجر

نگپور ایک بہت ہی چھوٹا سا گاؤں ہے۔ آبادی بھی اسمیں دس پندرہ ہی گھروں کی ہے لیکن نگپوریوں سے قوم کی خدمتیں ایسی بن آئی ہیں کہ تاریخ انکے نام پر فخر کرتی ہے۔ نگپور اور نگپور کے بھیل۔ راجپوتانے میں عزت اور بھروسے کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دن ڈھل چکا ہے۔ سورج چھپا ہی چاہتا ہے۔ شہر و زمین اسوقت بھیڑ کا یہ عالم ہے کہ راستہ چلنا مشکل ہے بھیڑ بھاڑ کی۔ ہو ہو ہو ہو کی آوازوں گھنٹیوں کی ٹناٹن سے کان پھٹے جاتے ہیں جب دیکھو اُجلے کپڑے پہنے بنا سنورا چلا جا رہا ہے لیکن نگپور اسوقت کچھ اُداس سا نظر آتا ہے۔ دو تو سر پر نیار کا بوجھا دے بیلوں کو آگے آگے ہنکاتے ہوئے کسان گھروں کو آ رہے ہیں حالانکہ نگپور بہت بیل ہل کی کھیتی کرتا ہے۔ سنا بھی تک ڈھور ڈنگر ہی جنگل سے آئے ہیں۔ اور نہ کام سے پھرتی ہوئی مزدورنیوں کا گیت سنائی دیتا ہے۔ نہ کہیں کُٹی کٹ رہی ہے اور نہ کوئی گائے بھینسوں کے لئے سانی کر رہا ہے۔ گاؤں کی چوپاڑ ہی سونی پڑی ہے صرف ایک سایہ کے نیچے۔ جھکی پیٹھ ایک اٹھیری سی عمر کی عورت اور اسکے سامنے چٹائیوں پر پندرہ سولہ مرد۔ پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ مگر ہیں سب چپ چاپ کسی گہرے فکر میں۔ یکایک کالے سے ننگ دھڑنگ آدمی بڑھیا چوکی پر بیٹھی کے سامنے سو چکا کہ ایسی آواز ہے جسے سارے بیٹھنے والے بھی سن لیں کہنے لگی اتنے میں ہی ایک شخص جوتیاں اتار۔ آگے بڑھ عورت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

راول جی کے نام میں خدا جانے کیا جادو تہا کہ سب کی نگاہیں اٹھ گئیں اور چوکی نشین عورت نے بھی آنکھ اٹھا کر سامنے کھڑے ہوئے آدمی کیطرف دیکھکر کہا کہ راول جی کنور کی لاش مل گئی۔

راول جی۔ رانی جی۔ کیا عرض کرون۔ صبح ہی آپ کی آگیا انوسار میں نے جگت سنگہ کو تو دشمن کے کیمپ کی طرف روانہ کیا اور خود لاش ڈہونڈنے لگا۔ سارا میدان جنگ چھانڈ لا۔ ڈہونڈتے ڈہونڈتے دوپہر ہو گئی۔ لیکن لاش کا پتہ نملا۔ ساری محنت اکارت گئی۔

رانی۔ لیکن میں نے قلعہ کے کنگورے سے خود کنور کو لڑتے لڑتے زخمی ہوکر بھیڑ میں گرتے اور پھر سیکڑون لاشون کے نیچے دب جاتے دیکھا ہے۔ لاش وہان سے کہاں جائیگی۔

راول جی۔ لاش تو وہین تھی جہان آپ فرما رہی ہین۔ لیکن میرے پہنچنے سے پہلے دشمن کے آدمی وہان سے لاش نکال لے گئے۔

رانی۔ یہ تمہین کیونکر معلوم ہوا۔

راول جی۔ جب میں لاش کی تلاش مین مقدور بھر کوشش کر چکا اور اقرار کیموافق جگت سنگہ بھی کیمپ سے نہیں پھرے تو مجھے کیمپ کی طرف کا فکر ہوا۔

رانی۔ کیمپ کی طرف کا کیا فکر تہا۔ کل شام ہی کو تو تم نے کہا تہا کہ اسوقت تک راجہ جی اسی پنجرے مین قید ہین جسمین انکو قید کر رکہا ہے۔ اور ابھی تک انکے لئے کچھ فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ پھر اسوقت کیمپ کا خیال کیون آیا۔ لیکن خیر تو ہے تم ہین کیمپ کی طرف کا فکر ہو آگئے۔

راول جی۔ اور مین دیوانون کے بھیس سے کیمپ کی طرف روانہ ہوا۔ چلتے چلتے جب میں اس جگہ پہنچا جہان پنجرا رکہا رہا کرتا تہا تو کیا دیکھتا ہون کہ کنور۔ جگت سنگہ۔ اور راجہ جی تینون کی لاشیں پنجرے کے سامنے پڑی ہین یہ کہکر راول جی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

راول سنگہ رام سنگہ جیسے بہادر کو بچون کی طرح روتے دیکھکر سب کے دل بھر آئے اور لگے سب رونے مگر رانی کا ضبط بلا کا ضبط تہا۔ اسکا دل امڈا پلکین جھپکیں۔ آنسو ڈبڈبا آئے مگر ایک بھی نہین جو ان پیارا آنکھون کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ مگر اف تک نہ کی

خاوند کے مرنے اور سہاگ لٹجانے کی خبر بھی اسنے بڑے استقلال سے سُنی اور چپ چاپ روتے ہوئے راولجی کی طرف دیکھتی رہی۔

جب راولجی اچھی طرح جی بھر کے رو چکے۔ تو رانی نے ایک ایسے لہجہ مین جس سے اُسکا دلی اطمینان اور ہمدردی دونون ٹپکتے تنے۔ کہا۔ راولجی ہونا تہا سو ہوچکا۔ رونے دہونے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ کچھ کرنے کا وقت ہے نہ کہ رونے پیٹنے کا۔ ذرا دلکو روکو اور پہلے کمپ کی پوری کیفیت سنا دو۔ ہان تو آپنے دیکھا کہ تینون لاشین بیخبر کیسے سامنے پڑی ہیں کس حالمین

راولجی۔ دیوی یہ نہ پوچھو۔ کیونکہ جگت سنگہ اور راجہ دونون کے بدن زخمون سے چہلنی ہو رہے تہے۔ اور اسوقت تک کئی جگہ سے خون بہ رہا تہا۔

رانی۔ تو کیا اونہین چھریون سے حلال کیا گیا۔

راولجی۔ جی نہیں۔ دونون بیر لڑکر چھتریون کی موت مرے ہین۔ گو ان کے پران انت ہو چکے لیکن بشرے سے ابتک جلال ٹپکتا ہے۔ چہرے کی کانتی اور مکھ کی سوبہا بنی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دونون میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔

رانی۔ اور لڑائی کس بات پر ہوئی۔

راولجی۔ بات یہ ہوئی کہ کل راجہ جی کے سامنے۔ رہا کر دینے کے اقرار پر۔ دشمن کیطرف سے چند شرطین پیش کی گئی تہین۔ مگر راجہ جی نے انہین منظور نہین کیا۔ کل کی لڑائی مین جب کنور بہی سن تیاد بستر مرگ پر سو گئے تو دشمن کے آدمی اُنکی لاش راجہ کے سامنے لے گئے کہ شاید اب بہی راجہ کا دل پگہل جائے۔ اور یہ کل والی شرطین مان لین چنانچہ پہلے دن والی شرطیں دوبارہ سنائی گئین۔ اور کہا گیا۔ کہ اگر اب بہی تمہین ہماری شرطیں منظور ہون تو ان کرلو۔ اگر تمہاری قسمت ہی نے دہکا دیدیا ہے تو تم جانو۔ لیکن یاد رکہو۔ اب کی دفعہ جہان تمہارے منہ سے نہین نکلی اور تمہاری بوٹیان اڑین۔ اسپر راجہ جی نے بگڑ کر کہا۔ اسکا جواب میں نے تمہیں کل ہی دیدیا تہا۔ میرے لڑکے کی لاش یہان لانے سے تمہارا اگر یہ خیال ہے کہ مین

ایسا نیچ ہون جو بیٹے کی محبت سے بدل جاؤنگا۔ تو میرا جواب پھر سُن لو اور اچھی طرح سُن لو تاکہ مجھے بار بار کہنا نہ پڑے۔ سنو یہ چند روزہ زندگی سائے کی طرح بدلجانیوالے عیش و آرام تمہارے یہ مطلبی اور جھوٹے خطاب میرا ایمان نہین بدل سکتے۔ نہ مجھ سے اپنی ضمیر کا خون ہو سکتا ہے خواہ میری جان ہی جاتی رہے۔ مجھسے قوم کے ساتھ دغا نہین ہونی۔ تمہارا جی چاہے سو کرو مجھے تمہاری شرطیں ہرگز منظور نہین۔ ایکبار نہین لاکھ بار منظور نہین۔ نہین نہین نہین نہین!

اسپر بہت سے سپاہی ایکدم پنجرے پر ٹوٹ پڑے مگر ٹھیک اُسیوقت ایشور جانے کوئی زمین میں سے پیدا ہو گیا یا آسمان سے آپڑا ایک شخص ننگی سُوتے جھٹ پنجرے کے پاس آکھڑا ہوا اور لگا چوہتی مارنے۔ اتنے میں راجہ بھی پنجرے کی سلاخ توڑ باہر نکل آئے اور ایک سپاہی کی تلوار چھین لگے حملہ کرنیوالونکو کاٹنے۔ مگر کہان تک۔ کہان دو۔ کہان سو۔ بلکہ سوا سو۔ ہاتھی اور چیونٹی کی کیا لڑائی۔ تھوڑی ہی دیر مین دونون تھکا کر گر پڑے مگر پھر بھی چالیس کو مار کر مرے۔ آپ سمجھ گئین ہونگی۔ یہ وقت پر آڑے آنیوالا کبھی کا لیا دیا دہرم پر قربان ہو جانے اور دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑنے والا۔ کہنے کو منہ بولا۔ مگر سچا بھائی ٹھاکر سنگرام سنگہ رنگپور۔ یہ تھا یہ کہکر راول جی چپ ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر تک سب طرف خاموشی رہی۔ کہ رانی نے گردن اٹھائی اور مجمع کیطرف مخاطب ہو کر کہا۔ کہو سردارو اب کیا کرنا چاہیئے۔ مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ رانی نے دوبارہ کہا۔ بولو جی کیا مرضی ہے۔ پھر بھی سب نیچی گردن کئے بیٹھے رہے۔ رانی نے پھر اپنا روئے سخن ایک بڈہے سے آدمی کی طرف کر کے سہ بارہ کہا۔ ٹھاکر صاحب آپ ہی فرمایئے ہمیں اب کیا کرنا چاہیئے۔

بڈہے ٹھاکر نے نیچی نگاہ کئے کئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ دیوی جی ہمارا کام ہمارا دہرم یہ ہے کہ آپ آگیا دین اور ہم اسکی تعمیل کرین آپ ہم سے کیا پوچھتی ہین۔ حکم دیجئے حکم۔

رانی۔ ٹھاکر صاحب آپنے اسوقت وہ بات کہی ہے جو آپ جیسے ایک چہتری پرش کو کہنی چاہیئے تھی۔ ویر یون ہی کہا کرتے ہین۔ کیلجے والونکی یہی شان ہوتی ہے لیکن ٹھاکر صاحب

آپکو یہ بھی معلوم ہے کہ اس سبھا مین اسوقت ایسے لوگ بھی موجود ہین جو مجھے گود دیوتین کہلا چکے ہیں اور کئی بزرگ ایسے بھی بیٹھے ہین جو اپکے راجہ کے ساتھ سورجگڈھ سے مجھے بیاہنے چڑھے تھے آپ لوگون کے سامنے مین پہل کرتی کیا بھلی معلوم ہوتی۔ لیکن اگر آپ کی اگیا یہی ہے کہ مین پہلے ہی کچھ کہون۔ تو میرے خیالمیں تو۔ راجپوتی تعریف۔ بیر ونکی بیرتا۔ شیر دنکے منہ۔ مائی کے لالون کی بات۔ چھتریونکی آن۔ اور نڈر دن کی شان اسوقت ہے۔ جب تینون بیر ونکی لاشین۔ دشمن کے کمپ مین جلنے یا دفن ہونے کے بجائے کل کی ریت کے موافق ہماری بان ندی کے کنارے چتاؤنمین بھسم ہون۔ آگے جیسی آپ کی مرضی یہ کہکر رانی چپ ہوگئی۔

رانی کے چپ ہونے پر بھیلون کے چودھری رنگ راج نے اٹھکر کہا اگر اجازت ہو تو اسیوقت تھوڑے سے بھیلون سے جا پڑون اور لاشین کمپ سے نکال لاؤن۔

رانی ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک اور نوجوان سا راجپوت کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر کہا اگر ٹھاکر چاچا کے ساتھ مجھے بھی جانے کی اگیا دیدیجائے تو ایک لاش تو مین بھی ہزارون میں سے لادلاؤن۔

اسپر

رانی نے کہا۔ لیکن کوکا جی تمہین یہ بھی معلوم ہے۔ کہ انکا شمار ہزارون سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ اور تم اسوقت سب مل ملاکر پورے تو دو کنار آدھے چھوڑ چوتھائی ہزار بھی نہیں۔ بیر دیور یہ میں جانتی ہون کہ تم لاکھون کے سامنے منہ موڑنے والے نہین۔ رہین تمہارا قدم آگے ہی پڑھے گا۔ لیکن اپنے سے کئی گنے دشمن سے کھلے میدان لڑنا۔ بن آئی مر جانا۔ اور چینے کی طرح بھاڑ مین بھن جانا ہے۔ جسطرح اور کٹ گئے۔ تم بھی قربان ہو جاؤگے۔ مگر بے فائدہ مرنے کا پھل نہ پایا۔ کٹنے کا مزا نہ آیا۔ زندگی اکارت گئی۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ جب اپنے مین دشمن کے مقابلے کی طاقت نہ دیکھے تو اوسوقت ٹلجائے۔ موقعہ کا منتظر رہے۔ اپنے کو اچھی طرح لیس کرکے میدان میں آئے۔ جبتک دشمن سے ٹکر لینے لائق نہ ہو۔ تب تک صبر کرے۔

دوسروں کے طعنے اور جھڑکیاں سہے۔ مجھے تم لوگوں پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ اور مین جانتی ہون تم جو کہہ رہے ہو۔ کر گزرو گے لیکن ایسا نہ ہو کہ وقت دغا دیجائے اور تم اپنا ارادہ پورا کئے بغیر شہید ہو جاؤ۔ ٹھیرو۔ جلدی نکرو۔ شاید کوئی تدبیر نکل آئے جس سے لڑے جھگڑے ہی کام نبجائے۔ یا جسمین تمہاری رائے کی نسبت کامیابی کی اُمید زیادہ ہو۔ لیکن۔ رانی ذرا چپ سی ہوئی۔ گویا دلمین آئی ہوئی بات کے کہنے مین ذرا تامل ہے۔

کوکا۔ ہان ہان کہے جلیئے۔ اور کوئی بات خیال مین ہے تو فرمایئے۔ ہم سب سُن رہے ہین

رانی۔ لیکن وہ بات ایسی ہے۔ جسمین ذرا۔ رانی پھر ذرا خاموش سی ہوئی۔

کوکا۔ ذرا چالاکی سے کام لینا پڑے گا۔

رانی۔ میں کہنا تو کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ لیکن تمہارے منہ سے چالاکی نکلا ہے تو چالاکی ہی سہی۔ اور اگر ایسی مجبوری کی حالت آپت کال (مصیبت کا وقت) مین ہم اپنی سلامتی کے لئے ذرا چالاکی سے کام مین تو کیا پاپ ہے۔ بزرگوں کی نشانیاں زمین کا پیوند ہوگئین جن سے کچھ امید تھی کہ وقت پہ مدد کرینگے۔ وہ نمکحرام نکلے کہ ذرا سے لالچ مین کلنگ کا ٹیکا لگا کر لگے اپنے بھائیوں ہی کو مارنے اور راجپوت راجپوت کا گلا کاٹنے۔ پھر مقابلہ بھی کیسے دشمن سے ہے جسے نہ تو اپنے عہد کا خیال۔ اور نہ اپنی بات کا پاس کہنے کو سب کچھ کرنے کو کچھ بھی نہین۔ لینے کو لاکھوں کروڑوں دینے کے نام گھر کے کواڑ بھی دیکر نہ سوئین۔ منہ سے کہین کچھ اور کر گزرین وہی جو پہلے سے سوچ لیا گیا تھا۔ زمانہ گواہ ہے کہ ہم ہمیشہ دھرم کی لڑائیاں لڑتے رہے ہین۔ ہمیں ہمیشہ اپنی بات کی پیچ رہی ہے۔ ہم نے آنکو جان کے ساتھ نبھایا ہے۔ لیکن افسوس کہ کھیتی بنجر زمین میں کیگئی۔ واسطہ ایسے دشمن سے پڑا کہ چالاکی۔ دغا۔ دکھاوا۔ اپنا مطلب نکال لینا جسکی رگ رگ مین بھرا ہے۔ ہم نے چاہا تھا۔ ہم ویسے ہی بنے رہین

جیسے ہمارے بزرگ تھے۔ لیکن افسوس کہ دنیا نے ہماری سادگی۔ ہماری بردباری۔ ہمارے رحم۔ ہماری کشادہ دلی۔ سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اور یہان تک دبایا۔ کہ اب ہم برباد ہوا چاہتے ہین۔ اب ہم اگر دشمن پر وہی ہتھیار چلائین۔ جو وہ ہم پر چلا رہا ہے۔ تو کیا گناہ ہے۔ ایسی حالت میں نیتی دیولسی، کام لانے کا عذاب دشمن کے اعمالون کے سر نہ ہمارے ذمہ۔ غرضیکہ میرے خیال مین نہ تو یہ بات اچھی ہے کہ ہم دشمن کے خوف سے ڈر کر بالکل بے حس و حرکت ہو کر بیٹھ جائین۔ اور نہ سو۔ سوا سو آدمیون کے بھروسہ پر ہزارون سے بھڑ جانا بھی مجھے ٹھیک نہین معلوم ہوتا۔ اب صرف نیتی ہی کا بھروسہ ہے۔ شاید تدبیر کرشمہ دکھا جائے۔ لیکن تدبیر سوچنے سے پہلے اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہئے کہ ہمین ایسا کرنا بھی چاہیئے یا نہین یعنی دغاباز کے ساتھہ دغابازی سے کام لینا۔ یا چالاک دشمن کے مقابلہ مین چالاکی برتنا۔ یہ کہتے کہتے رانی کے چہرہ پر پسینہ آگیا۔ بولتے بولتے منہ خشک ہو گیا۔ اور وہ چپ ہو کر اوڑھنی کے آنچل سے منہ کا پسینہ پونچھنے لگی۔

اس پر سب نے ہاتھہ جوڑ کر کہا۔ رانی جی۔ آپ ہماری مالک ہین۔ آپ ہماری سردار ہین۔ آپ ہمارے لئے ایشور کا اوتار ہین۔ آپ ہماری رہبر ہین ہمین آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔

رانی۔ اچھا تو اب تو سب کے نت کرم (روزانہ فرض خاصکر خدا کے متعلق) اور بھوجن کا وقت ہے۔ اسوقت تو آپ سب صاحب جائین۔ اور آٹھہ بجے تک ہتھیارون سے لیس ہو کر یہین آجائین۔

سب کھڑے ہو کر ہاتھہ جوڑ جوڑ کر چلنے لگے۔ جب سب جا چکے تو رانی بھی اٹھہ کھڑی ہوئی۔ (باقی آئندہ)

واقع نگار

رام کرشن سیواشرم

ہم بڑی خوشی کے ساتھ ناظرین کو ایک انجمن بنام سیواشرم کی جو کہ بندرابن میں واقع ہے اطلاع دیتے ہیں۔ اسکو چند محب الوطن اشخاص نے ۱۹۰۷ء میں بغرض مصیبت زدہ اشخاص کی خدمت و پرورش قائم کیا تھا لیکن مستقل کارکنان کی کمی کی وجہ سے ۱۹۰۸ء میں رام کرشن مشن کے سپرد کر دیا گیا یہ بات قابل افسوس ہے کہ بندرابن کیطرح مشہور قومی زیارتگاہ میں ابتک کوئی ہسپتال اس قسم کا نہ تھا کہ جسمیں مصیبت زدونکی خبرگیری کیجائے۔ لہذا رام کرشن مشن کے خادم اس ضرورت کو قدرے رفع کر کے ہمارے شکریہ کے مستحق ہوئے۔ گو کہ اب بھی ہسپتال اور اشرم کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے پھر بھی ان چند سال ہی کے اندر سیواشرم نے ہزاروں آدمیونکو اپنی خدمت سے فیض پہونچایا۔ وہ کیونکر۔ اوہنون نے نہایت افلاس زدہ و بیمار اشخاص کو اپنے یہاں رکھکر کھانا۔ کپڑے۔ ادویہ سے مدد دی جو اس قابل تھے کہ کھانے پینے کا خرچ خود برداشت کر سکے۔ انکا مفت میں علاج کیا۔ سویم پردہ نشین عورتونکو انہون نے مدد پہونچا کر موت کے منہ سے چھڑایا اور آخرش بہت سے مفلس و لاوارث اشخاص کے جنازونکا باقاعدہ ستکار کیا۔ اس کام میں کسی مذہب۔ ملت و ملک کا خیال نہین رکھا گیا۔ انہون نے بلا امتیاز ذات ہر کس و ناکس کی خدمت کی۔ جس وقت ہمکو اس اسپتال کے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسوقت پانچ چھ مریض انڈور یعنی ہسپتال کے اندر زیر علاج تھے۔ ان میں سے بعض نہایت گندی بیماریونمیں مبتلا تھے۔ اور چونکہ یہ ہسپتال ایک مندر کے اندر واقع ہے اسکے مندر کے قاعدے کے بموجب اسکے اندر مہتر نہیں آسکتا۔ لیکن آفرین ان شریف ہندو خسرون پر جنہوں نے انسانی خدمت کے لئے گندا سا گندا کام اپنے ہاتھ سے انجام دیا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اہل ہنود جلد اس ہسپتال کے لئے چندہ کر کے معقول مکان بنوا دینگے۔ اور یہ بھی ہندو جاتی انکی حفاظت کے لئے جنکے ساتھ ہندو بھی کبھی نہایت ظالمانہ برتاؤ کرتے ہیں اس ہی اشرم کے ذریعہ سے آسایش کا کوئی عمدہ انتظام کرینگے۔ پریانندہ

مطالعۂ قدرت

(۲)

ماسٹر جی۔ اور رام۔ شام۔ محمود۔ اور سعید چار طلباء کی گفتگو

(گذشتہ سے پیوستہ)

ماسٹر جی پچھلی دفعہ جو اس باغ مین مباحثہ ہوا تھا اور چند مشاہدے کئے گئے تھے اُس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام چیزین جو ہم حواس خمسہ سے معلوم کر سکتے ہین۔ دو بڑی بڑی قسمون مین تقسیم کیجا سکتی ہین۔ ایک جاندار دوسری بیجان جاندار چیزین وہ ہین جو اوّل بیرونی مادہ کو جزو بدن بناکر اپنے جسم کی پرورش کرتی ہین جسکو نشو و نما کہتے ہیں۔ دوئم وہ جو اپنے جسم کے کسی حصہ کو الگ کرکے اپنی ہی طرح ایک دوسرا وجود پیدا کرتی ہین جسکو تولید کہتے ہین۔ سوئم اُن کو بیرونی دنیا کی اور نیز اپنے جسم کے اندرونی تغیرات کی ایک خاص آہٹ ہوتی ہے۔ جس کا جواب وہ کسی نہ کسی طریقہ سے دیتے ہین۔ اِس مرکب فعل کو ہم حس و حرکت کہیں گے

جن اجسام مین یہ تین بڑی بڑی حیاتی خاصیتیں موجود ہوتی ہین خواہ وہ حیوانات یا نباتات میں ہون ہم جاندار کہتے ہین اور ونکو بیجان۔

پھر جاندار چیزونکے دو بڑے بڑے حصے کئے گئے ہین یعنی حیوانات و نباتات جنکے تفاوت پر بھی کچھہ مشاہدے ہو چکے ہین۔ اسدفعہ ہم خاصکر حیوانات و نباتات کے تفرقہ پر بالتفصیل بحث کرینگے۔ اچھا رام تم از سر نو بتاؤ کہ درختون اور جانورونمین کیا فرق ہے۔؟

رام جناب پہلے شکل کو لیجئے۔ درختون اور جانورونکی شکل میں بڑا فرق ہے۔ جانورون کے اعضاء اکثر گٹھے ہوئے اور دو طرفہ واقع ہوتے ہین بخلاف

اس کے درخت کے حصے منتشر و بے ترتیب رہتے ہیں۔
شام۔ کیون جناب ابر مردہ و مونگا وغیرہ چند سمندری جانور کے اجسام بالکل درخت کی طرح منتشر نہیں ہوتے۔؟
ماسٹر جی۔ بیشک اونکو استثنا سمجھنا چاہیئے نہ کہ قاعدہ۔ اچھا تم کوئی اور فرق بتاؤ۔
شام متعلق شکل ایک اور فرق یہ ہے کہ جانورون کے رنگ گونا گون ہوتے ہین۔ درختون میں علاوہ پھول کے ایک خاص سبز رنگ پایا جاتا ہے جس کو کلوروفیل کہتے ہین اور یہ علاوہ ایک آدھ نیچے درجہ کے سمندری جانورون کے حیوانات میں نہین پایا جاتا۔
ماسٹر جی۔ اچھا محمود تم کچھ اور بتاؤ
محمود۔ ایک بڑا فرق جانورون اور درختون مین یہ ہے کہ درخت اپنی غذا ہوا۔ پانی۔ اور سادی معدنی اشیا سے حاصل کرتے ہین اور اُن سے پیچیدہ کیمائی مرکبات بناکر اپنے جسم مین جمع کرتے ہین۔ حیوانات کا فعل تقریباً اس کے برعکس ہے۔ یعنی وہ بواسطہ یا بلا واسطہ پیچیدہ مرکبات حاصل کرکے اپنے جسم کی پرورش کرتے ہین جسمین وہ ٹوٹ کر دوبارہ سادے معدنیات مین تبدیل ہوجاتے ہین گویا درخت معدنیات کو جوڑکر اپنے جسم کے پیچیدہ کیمائی مرکبات بناتے ہین۔ اور جانور انہی کو توڑکر پھر سادے معدنیات بنا دیتے ہین۔
سعید۔ جب ہی درختون میں کھاد وغیرہ حیوانی فضلات دئے جاتے ہین۔ خیر یہ تو مان لیا۔ لیکن ان سبھون مین اصلی فرق جو درخت اور جانورون مین موجود ہے اسکا ذکر بھی نہیں کیا کہ جانورون مین حرکت کرنے کی قوت ہے جو درختون مین نہین ہے۔

شام۔ بیشک اکثر درختوں مین معمولی حرکت نہیں۔ لیکن چھوئی موئی کا پتہ چھونے سے فوراً حرکت کرتا ہے۔

سعید۔ چھونے ہی سے کرتا ہے نہ کہ خود بخود۔ اسطرح کوک لگا دینے سے گھڑی کے مختلف پرزون میں بھی حرکت ہوتی ہے یہ "خودی" جو کہ حیوانون مین موجود ہے۔ روح کی ایک خاصیت ہے۔ جو جانورون مین زیادہ ظہور مین آئی ہے۔ درختون مین نہیں ہے۔

محمود۔ (چلاکر) جناب پچھلی دفعہ یہ کہتے تھے کہ روح صرف انسان ہی میں ہے۔ اب یہ روح کو جانورونمیں ماننے لگ گئے۔

ماسٹر جی۔ ابھی تو ابتدائے مشاہدہ ہے (م) آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

رام۔ لیکن جناب چھوئی موئی اور بعضے درخت مثلاً ببول جو رات کو اپنے پتے بند کر لیتے ہین انکی حرکت کو استثنا سمجھیں گے نہ کہ قاعدہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درختو نمین عام طرح پر حرکت کی قوت نہین ہے۔

ماسٹر جی۔ اچھا ذرا غور کرنا چاہیئے کہ جانورونمین حرکت کیونکر ہوتی ہے۔ دیکھو میں اپنے بازو کو قائم رکھکر کہنی پر سے ہاتھ کو موڑتا ہون اور پھیلاتا ہون۔ اس سادی حرکت کو پہلے دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ میرے بازو کے سامنے کے عضلات جسوقت سکڑتے ہین اوسوقت ہاتھ گویا کہ کھنچ آتا ہے۔ جسوقت بازو کے پیچھے کے عضلات سکڑتے ہین اُسوقت ہاتھ پھیل جاتا ہے گویا کہ ہاتھکی حرکت ان عضلاتون کے سکڑنے اور پھیلنے پر مبنی ہے۔ ہڈیان صرف جسم میں لیور کیطرح کام کر رہی ہین اسلیئے قلیل عضلاتی فرق ہمیں اکثر ہڈی کے دوسرے سرے پر بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔ لہذا اصلی حرکت عضلات مین ہے پھر عضلات تمہین معلوم ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے پروٹوپلازمک سیلز یعنی حیاتی ذرون سے بنے

ہین۔ اگر یہ ثابت کیا جاسکے کہ درختون کے حیاتی ذرون مین بھی اسی قسم کی اندرونی حرکت ہے۔ جیسے کہ جانورون کے سیلز مین ہوتی ہے۔ تو ہم درختونمین حرکت ضرور مان لین گے۔ خواہ انہین اسکو ظاہر کرنے کے لئے ہڈیونکی طرح لیور ہے یا نہین چھوئی موئی مین اتفاق سے ایسے لیور موجود ہین۔ اسلئے اسکی حرکت ظاہر ہے۔ لہذا ہم اگر بغیر امداد اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ سے درختونکی لطیف حرکت کو محسوس نہ کرسکین۔ تو یہ کہنا جائز نہ ہوگا۔ کہ درختون مین حرکت نہین ہے۔

سعید۔ ایک بات یہ میری سمجھ مین بالکل نہین آتی ہے۔ کہ بظاہر چھوئی موئی اور دوسرے درختون کی ساخت مین کچھ فرق نہین ہے پھر انکی حرکت کیون نہ مشتثنا سمجی جائے۔

محمود۔ فرق ضرور ہے۔ تمہین یاد نہین اُسدن جماعت مین ماسٹر جی نے تختے پر چھوئی موئی کی حرکت کرنے کی ترکیب دکھائی تھی۔ اسکے جوڑ جوڑ پر بعضے سیلز ایسے ہوتے ہین کہ جو ذراسی حرکت یا دیگر محرکون سے اپنے اندرونی پانی کو خارج کردیتے ہین۔ لہذا ایکطرف سیلز کی جسامت گھٹ جانے سے ٹہنی یا پتیان مڑ جاتی ہین۔ اگر یہی سیلز ٹہنی کے چارونطرف واقع ہوتین تو باوجود احساس محرکات واندرونی حرکات ٹہنی جنبش نہین کرسکتی۔

سعید۔ میری ٹھیک سمجھ مین نہین آیا۔

ماسٹر جی۔ اُسی مثال کو لو کہ ہمارا ہاتھ سامنے کے عضلات کے کچاؤ سے مڑ جاتا ہے۔ اور پیچھے کے عضلات کے کچاؤ سے پھیل جاتا ہے۔ یعنی ہڈیونکی حرکت عضلاتی حرکت پر مبنی ہے۔ لیکن اگر کسی موقع پر آگے اور پیچھے کے عضلات ایک ہی وقت مین سکڑین تو باوجود عضلاتی حرکت کے ہڈیون مین حرکت نہ ہوگی

ہلنا اور درختون کی ٹہنیون کے حرکت دکرنے سے یہ ظاہر نہین ہوتا ہے کہ انکے اندر چھوئی موئی کی طرح حس وحرکت کرنے والے سیلز بھی ہنیں۔

شام۔ مین نے پڑہا ہے کہ عنقریب پروفیسر جگدیش چندر بوس نے چند برقی آلات ایسے نکالے ہین کہ جنکے ذریعہ سے نہ صرف درختون کی حرکات ظاہر کیجا سکتی ہے۔ بلکہ مختلف اشیاء کے محرک اور سکونت پیدا کرنے والے اثر بخوبی اندازہ کئے جاسکتے ہین۔ چنانچہ انہون نے ظاہر کیا ہے کلوروفورم۔ ایتھر وغیرہ حیوانی سمیات نباتات کو بھی اسیطرحسے موثر کرتے ہین۔ اور ہوا جسطرح جانورونمین ان سمیات کے اثر کو دور کرتی ہے اسی طرح نباتات کو بھی تازگی بخشتی ہے۔ بلکہ ان تجربونمین انہون نے نباتات کے احساس کے متعلق یہ بھی معلوم کیا ہے۔ کہ حیوانات کی طرح ان کا بھی ایک معین لیٹس پیریڈ ہوتا ہے جو کہ تحریک اور اوسکے جواب کے درمیان وقفہ خاموشی ہے۔ . . . .

محمود۔ بلکہ ان کی تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نباتات کی جان بھی حیوانات کی طرح ایک خاص موقع پر نکلجاتی ہے۔ جس کے بعد انمین حرکات کا احساس اور ان کے جواب دینے کی قوت زائل ہوجاتی ہے گو کہ بظاہر ہم انکو اسوقت زندہ سمجھتے ہین۔

سعید۔ تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ نباتات مین بھی روح ہے۔

محمود۔ مین لفظ روح کے استعمال کے برخلاف ہون کیونکہ عام طرح پر مذہبی وفلسفی جماعت اس اصطلاح کو مختلف معنونمیں استعمال کرتے ہین۔ لیکن اگر آسایش کے لئے نباتات وحیوانات کی احساس اور انکے جواب دینے کی قوت کو روح کہا جائے۔ تو انسانی۔ حیوانی۔ و نباتاتی زندگی مین کوئی

حیاتی فرق نہین ہے۔ بلکہ پروفیسر بوس کی تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جمادات مین بھی ایک قسم کی آہٹ اور جواب دینے کی قوت ہے۔ چنانچہ انھون نے ثابت کیا ہے کہ مختلف دہات سمیات کے ذریعہ سے جانور کے عضلات کیطرح موثر ہوتے ہین۔ - - - - - - - - - - -

سعید۔ گویا کہ جمادات۔ نباتات۔ وحیوانات مین کوئی فرق نہین رہا۔

شام۔ پروفیسر بوس کے تجربون سے یہ نتیجہ نہین نکلتا کہ اُن مین کوئی فرق نہین ہے۔ بلکہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایک ہی قوت ان تینون عالم حیوانات۔ نباتات وجمادات مین کام کر رہی ہے۔ ایک جگہ پر وہ محض کیمیائی فعل میں محدود ہے۔ دوسری جگہ اسمین چند پیچیدہ فعل ایسے پیدا ہوتے ہین جنکو حیاتی کہتے ہین اور آخر مین ان مادی قوتونکی لطیف حالت وہ ہے جسکو ہم حواس خمسہ کے ذریعہ سے جان نہین سکتے اور اسکا نام ہمارے بزرگون نے آتما یعنی روح قرار دیا ہے۔

ماسٹر جی۔ مین بھی روح کی بابت مباحثہ کے برخلاف ہون۔ کیونکہ ہمارا مدعا اسوقت حواس خمسہ کے ذریعہ سے قدرتی اشیا کا مشاہدہ ومطالعہ ہے جو چیزین حواس خمسہ کے باہر ہین انکی بابت خواہ مخواہ قیاس دوڑا کر رائے قائم کرنے سے مین ذاتی طور پر خاموشی کو بہتر سمجھتا ہون۔ لیکن ساتھ ہی ہماری ناواقفیت کے اظہار سے یہ مطلب ہرگز نہین ہے۔ کہ ہم ہر کس وناکس کی رائے کو جو انکی بابت واقفیت کا دعوی کرتے ہین بغیر تحقیقات تسلیم کر لین۔ لیکن بیشتر اس کے کہ ہم آج کی گفتگو کو ختم کرین۔ ہم دو چار باتین ایک اور قسم کے حیاتی اجسام کی بابت کہنا چاہتے ہین جو کہ ارتقاع کی رو سے جمادات ونباتات کے درمیان

واقع ہوتے ہین۔ لیکن بلحاظ جسمانی فعل حیوانات سے زیادہ مشابہت رکھتے ہین۔ اسلئے اُن کو حیوانات و نباتات کے درمیان تصور کرنا چاہیئے یہ زمین پانی اور ہوا مین موجود ہین۔ گویا کہ ان سے بچنا بظاہر ناممکن ہے۔ جہان ہم ہین وہان یہ بھی ہین۔ یہ اجسام اس قدر چھوٹے ہین کہ بغیر خوردبین کی مدد دکھائی نہین دیتے۔ پھر بھی انسانی بہبودی کے لئے انکی واقفیت اتنی ضروری ہے کہ اس ابتدائی مشاہدے مین انکا ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہون۔ یہ خوردبینی اجسام بلحاظ انکی شکل گول یا لمبے ہونے پر مختلف اصطلاح مثلاً مائکروکاکس بیسی لس وغیرہ سے نامزد کئے گئے ہین۔ لیکن آسائش کے لئے ہم ان سب کو جرم کہین گے۔ انکا جسم اکثر ایک ہی سیل کا ہوتا ہے۔ لیکن بعض مرتبہ طریقۂ تولید سے لڑیوں کی طرح یا دو دو کے جفت یا کئی ایک ملکر مجمعی حالت مین واقع ہوتے ہین۔

انکی بیشمار قسمیں ہین۔ لیکن اونمین سے چند ایسی ہین کہ بوجہ انسانی زندگی کے لئے خاص طرح سے مضر یا مفید ہونے کے ہمین انکے حالات سے آگاہ رہنا چاہیئے۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہین کہ بلحاظ جسمانی فعل برعکس نباتات کے حیوانات سے مشابہت رکھتے ہین۔ اسلئے یہ بجائے سادی کیمیائی اشیا سے اپنی خوراک حاصل کرنے کے جیسے کہ اکثر درختوں مین ہوتا ہے۔ حیوانات کی طرح پیچیدہ مرکبات سے اپنی پرورش کرتے ہین۔ لہذا انمین سے اکثر جانور اور درختون کے مردہ جسم کو سڑا کر نشو و نما پاتے ہین اسکا یہ کام نباتات حیوانات کے حق مین بہت ہی مفید ہے۔ کیونکہ یہ سڑتے ہوئے مادے کو کیمیائی طور پر توڑ کر بہت جلد صرف انکو بے ضرر کر دیتے ہین۔ بلکہ اون کو درختون کے نشو و نما کے مفید مطلب بنا دیتے ہین جسکا فائدہ حیوانات کو ملتا ہے

لیکن انمین سے چند ایسے ہین کہ جو بجائے مردہ اجسام کے زندہ اجسام سے اپنی خوراک مہیا کر سکتے ہین۔ یہ اجرام حیوانی جسم مین بیماری پیدا کرتے ہین چنانچہ بہت سے امراض مثلاً موسمی بخار۔ تپ دق۔ ہیضہ۔ طاعون۔ چیچک خسرہ نمونیہ یعنی ذات الریہ وجع مفاصل حتیٰ کہ لوکا بخار اور بہت سے دیگر عارضات انہی مختلف اجرام سے پیدا ہوتے ہین۔

لہٰذا اسکا طریقۂ عمل اور وجوہات پیدایش اور طریقہ دفعیہ وغیرہ جاننا انسانی بہبودی کے لئے ضروری ہے۔ سردست تمہین اتنا جاننا کافی ہے کہ طب جدید نے ان معلومات پر بہت غور کیا ہے۔ اور قوی امید ہے۔ کہ عنقریب ان تمام متعدی امراض کا نہایت معقول اور صحیح علاج معلوم ہو جائیگا۔ قدرت نے جس قدر اسباب امراض پیدا کئے ہین۔ اُس قدر اُنسے حفاظت کی قوت بھی جسم کے اندر مہیا کی ہے۔ اگر ہم خلاف مرضیٔ قدرت اپنے جسمانی قواع کو بیجا حرکات اور اذیتوں سے ضایع کرین تو ہم ان اجرام کے جلد شکار بنجاتے ہین صحت کے لئے ہمین بہت سی جڑی بوٹی اور دیگر ادویہ کی ضرورت نہین ہے صرف سادہ اور عمدہ غذا کھائین۔ صاف ہوامیں رہین۔ اور آرام دہ کپڑے پہنیں۔ دماغی محنت کے ساتھ جسمانی کسرت کو نہ چھوڑین۔ اور آرام کے ساتھ نیند لیکر سوئیں۔ اور سب سے بڑھکر اعتدال سے زندگی بسر کرین۔

بی۔ کے۔ متر۔ ایل۔ ایم۔ ایس
ممبر ایس۔ پی۔ ایس۔ کے

فقیر عزیز الدین

اُس شورش زمانے میں جبکہ سلاطین مغلیہ کا اقتدار روز بروز گھٹتا جاتا تھا۔ ایک زبردست عالم فقیر عزیز الدین نامی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر فرمانروائے پنجاب کے دربار میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھا۔ یہ شخص بخارا کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ اِس کا باپ حکیم غلام محی الدین وسط ایشیا سے لاہور میں آیا۔ کیونکہ حکمت انکا آبائی پیشہ تھا۔ اسلئے عزیز الدین کو بھی طب کی اعلیٰ تعلیم دلائی گئی اور ۱۷۹۹ء میں اسے مہاراجہ صاحب کے حضور میں باریاب ہونے کا موقعہ ملا۔ صورت یہ ہوئی کہ لاہور پر قابض ہونے کے بعد ہی مہاراجہ صاحب ایک مرض میں مبتلا ہوئے۔ متعدد حکماء کے علاج سے ناکامیابی ہونے کے بعد فقیر عزیز الدین کے دست شفا سے صحت یابی حاصل ہوئی۔ اور مہاراجہ صاحب نے اِسکے حسن خدمات کے صلہ میں ایک معقول جاگیر عطا فرمائی۔

۱۸۰۹ء میں جبکہ مہاراجہ صاحب اور سرکار انگلشیہ کے معاملات میں پیچیدگی پڑی تو اِس شخص نے اپنی دانائی سے دونوں میں صلح کرائی اسکے بعد اور چند ایسے ہی ایسے امور پیش آئے جن سے مہاراجہ صاحب کے دل میں عزیز الدین کی طرف سے ایک خاص جگہ پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ بلا اِس نوجوان ہونہار شخص کی صلاح کے کوئی کام ہی نہ کرتے تھے خصوصاً دوسری سلطنتوں سے جو سیاسی تعلقات تھے اُنمیں مہاراجہ صاحب اسی کی رائے پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ عام طور پر مشہور ہے کہ اسی شخص کی بدولت مہاراجہ صاحب کی اتنی بڑی سلطنت کے زمانہ میں سکھوں اور انگریزوں کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ اور وابستہ رہے

اور اسکے مرنے کے بعد ہی دونوں قوموں میں سخت لڑائی واقع ہوئی۔ اور سکھ بالکل پامال ہو گئے۔ عزیز الدین ایک بڑا ایماندار آدمی تھا۔ مہاراجہ کو اس پر بڑا بھروسہ تھا۔ وہ اکثر اس کو معدودے چار اہلکاروں کے دار السلطنت میں چھوڑ کر خود فوجی مہمات پر روانہ ہو جاتے تھے۔ عزیز الدین نے بارہا فوجی خدمات بھی انجام دیں۔ اور جب ضرورت پڑی سفارت کا کام بھی کیا چنانچہ ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بینٹنک اور امیر دوست محمد خان کی حضوری میں سفیر بنکر گیا۔

عزیز الدین نہایت آزاد منش۔ صوفی مشرب۔ بامروت اور حلیم آدمی تھا۔ ایک موقعہ پر مہاراجہ نے اس سے پوچھا کہ تم ہندو مذہب کو اچھا سمجھتے ہو یا اسلام کو۔ اس نے جواب دیا کہ میں ایک ایسا آدمی ہوں۔ جو ایک زبردست دریا کے بیچ دھار میں شناوری کرتا ہے۔ دونوں طرف زمین کو تکتا ہے لیکن دونوں کناروں میں سے کسی میں بھی اسے کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ مہاراجہ صاحب اس جواب سے نہایت خوش ہوئے۔

عزیز الدین اپنے وقت کا ایک زبردست عالم تھا تقریر اور تحریر دونوں میں اسے اعلیٰ قابلیت حاصل تھی۔ اس کے لکھے ہوئے مسودے اسکی تہذیب اور ذہانت کے گواہ ہیں۔

سر لیپل گریفن اسکی نسبت کہتے ہیں کہ وہ تمام مشرقی علوم کا فاضل تھا۔ اسنے اپنے ذاتی خرچ سے عربی فارسی کی تعلیم کے لئے لاہور میں ایک کالج بنایا اور اسی کالج کا صدقہ ہے جس سے پنجاب کے عالم ہمہ دانی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

عزیز الدین ایک بڑے رتبہ کا شاعر بھی تھا۔ اس کے کلام میں ایک قسم کی جدت پائی جاتی ہے۔ اسکی تصنیفات سادی اور نہایت فصیح ہیں۔

اسکا علم حرف علم ادب پر ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ ایک اچھا حکیم۔ ایک لایق مدبر اور عمدہ قانون دان تھا۔ بیرن چارلس ہوگل نامی یورپین جس نے ۱۸۳۵ء میں پنجاب کا سفر کیا۔ عزیز الدین کی نسبت ایک عمدہ خیال ظاہر کرتے ہوئے مہاراجہ کے دربار میں اتنے بڑے فاضل کو ایسے وقت میں دیکھکر تعجب کرتا ہے۔ جبکہ ہمارے ملک سے علم رخصت ہو رہا تھا۔ اور طوائف الملوکی۔ بدنظمی اور زبون حالی کا دور شروع تھا۔

۱۸۳۸ء میں عزیز الدین سفیر کی حیثیت سے فیروزپور میں لارڈ ایلن برو سے ملا وہاں اس نے سکھوں کے لئے ایسی عمدہ خدمات دانجام دیں جو کسی طرح قابل فراموشی نہیں ہیں۔ لارڈ ایلن برو نے اپنی سونے کی گھڑی اُسکے نذر کی۔ سر لیپل گریفن اپنے تذکرۂ رنجیت سنگھ میں لکھتا ہے کہ میں نے اسی گھڑی کو اکثر اسکے بیٹے کے پاس دیکھا ہے۔ جو کتنے ہی برس تک لاہور میں میرا سکرٹیری رہا۔

سکھوں کی اول جنگ کے ختم ہونے پر ۱۸۴۵ء میں اسکا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنی حیات میں ہرچند کوشش کی کہ سکھ فوج دریا ستلج کے پار نہ جائے۔ کسی نے اِس کی بات پر عمل نہ کیا لیکن نتیجہ وہی ہوا جو اس نے پہلے کہدیا تھا۔ یعنی سکھوں کو فاش شکست۔

اِس کے بھائی امام الدین اور نور الدین مہاراجہ کے دربار میں اہلکار ضرور تھے۔ مگر اسکی سی عزت اور شہرت کہاں۔ وہ دونوں پکے پابند مذہب تھے اور یہ آزاد مشرب۔ خیالات کی آزادی جو موجودہ زمانے میں خاص حسینہ اور قوم ترقی کا زینہ سمجھی جاتی ہے۔ پوری پوری اِس شخص کو حاصل تھی ایک مصنف لکھتا ہے کہ کوئی ملک اصلی شائستگی یعنی علم حکمت۔ اور سائنس میں

ترقی نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ اسمیں کامل مذہبی آزادی نہو۔

موجودہ زمانے کی مہذب سوسائیٹیوں کا اعتقاد ہے کہ مذہبی جوش نوع انسان کا دشمن ہے۔ ان سب باتوں پر خیال کرکے میں اچھی طرح کہہ سکتا ہوں کہ فقیر عزیز الدین اپنے زمانے کا ایک زبردست فاضل تھا۔ اس کی قابلیت دانائی اور پیش بینی کا لحاظ کرکے۔ اگر میں یہ کہوں کہ جو بیکن انگلستان کے لئے یوو کس گرینڈا کے لئے تھا۔ وہی عزیز الدین پنجاب کے لئے تھا۔ تو شاید بیجا نہو گا۔

حامد اللہ۔ افسر
(میرٹھی)

لطیفہ

(پروفیسر صاحب جو کہ طب کے معلم تھے تختہ پر لکھ گئے)

"آج میں جماعت کو اس خوشی کے لئے چھٹی دیتا ہوں کہ حضور شہنشاہ نے مجھ ناچیز کو اپنا اونریری معالج قرار دیا ہے یہ ہمارے سب کے لئے فخر کی بات ہے"

(اسی کے نیچے ایک طالب علم بڑے بڑے حرفوں میں لکھ گیا)

"خدا بادشاہ کو سلامت رکھے!"

مجمی

ملکی بے چینی

علاوہ اُن وجوہات کے جو سب پر عیاں ہیں اِس بے چینی کی ایک وجہ قوم کی ناخواندگی ہے لہٰذا ہم اِس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کرینگے کہ جہالت اسکی سب سے بڑی وجہ ہے۔

بہت سے اشخاص اِس ناخوشی کو محض پولیٹیکل سمجھتے ہیں گویا کہ چند تعلیم یافتہ لوگوں نے ہی جنکو پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا ہے۔ یہ شورش پھیلا رکھی ہے۔ جس سے ہند میں اسوقت ایک عجیب ناخوشی پیدا ہو رہی ہے اگر یہ مان بھی لیا جاوے کہ یہ چند تعلیم یافتہ لوگوں کی کارروائی ہے۔ تو اسپر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ جو فرقہ پچاس برس پیشتر گورنمنٹ کا سب سے بڑا حامی تھا۔ آج وہ شورش پھیلانے میں اسقدر سرگرم ہے۔ بعض کہیں گے کہ یہ کسی خاص فریق کا کام نہیں ہے۔ بلکہ قومی ہے! اگر قوم کی جائز ضروریات بخوبی پوری ہو سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لوگ ناخوش رہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہر فرد بشر کی خوشی اور ناخوشی کس پر مبنی ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ صرف حاجات کے پورے ہونے یا نہونے سے ہوتی ہے اسی لئے ہندوشاستروں نے حاجات کو کم کرنے کی تحریک کی ہے۔ لیکن یہ ہر زمانہ میں اور ہر فرد بشر یا قوم کے لئے یکسان نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ کسی وقت میں بنی نوع انسان مانند اپنے قدیمی موجودوں کے درخت کی ٹہنیوں پہ آرام سے گزارہ کر سکتے تھے تو یہ ضروری نہیں کہ موجودہ مکانات کو ہم بیجا عیش و عشرت کے سامان سمجھیں۔ جو کسی زمانہ

لئے عیش و عشرت کے سامان ہوں۔ وہ دوسرے زمانہ کے لئے بالکل ضروری اشیاء زندگی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ میں ہم دہلی سے کلکتہ چھ مہینے میں صحیح سلامت پہنچکر اپنے معبود کی نذر و نیاز پوری کرتے تھے۔ لیکن آج اگر کیوجہ سے ریل گاڑی کو بجائے ڈھائی دن کے تین دن لگ جائیں تو ہم ناخوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ نقصان ہمارے خلاف امید ہوتا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اگر کافی تدارک کیا جاتا تو ہرگز ایسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح تمام امور زندگی میں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد سے بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر بھی یہ سوال رہجاتا ہے۔ کہ آیا ہم رفتار زمانہ کے لحاظ سے بہتر ہیں یا نہیں۔ یا ہمارے موجودہ وسائل سے ہماری حالت بہتر کیجا سکتی ہے۔ یا نہیں۔ میرے خیال میں زیادہ تر اشخاص جو اس شورش کے مرتکب سمجھے جاتے ہیں حقیقت میں ملک کی بہتری کے لئے اپنی آواز بلند کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ملک میں ناخوشی کے اسباب موجود ہیں۔ اسلئے وہ بہ آسانی متحرک ہو جاتا ہے۔ کیا ہر زمانہ اور ہر سوسائٹی میں کچھ تعداد ناخوش پاگلوں کی نہ تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کسی زمانہ میں ہم ایک عالمگیر شادمانی اور کسی زمانہ میں ویسے ہی افسردگی پاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ اپنے خیالات کا ٹھیک اظہار کر سکیں یا نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ شانتی اور اطمینان جو برٹش گورنمنٹ کے مبارک قدم سے حاصل ہوتا چلا آتا۔ اب کم از کم لوگوں کے خیالات سے معدوم ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر یہ سچ ہو تو اسپر نہ صرف گورنمنٹ بلکہ رعایا کو بھی شدت سے توجہ دینی چاہئے۔

ہمیں ان اکثریت سے کوئی اتفاق نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ گورنمنٹ کی تبدیلی سے ہی یہ دقت رفع ہوگی۔ کیونکہ گورنمنٹ بذات خود کسی مستقل قوانین

کا نام نہیں ہے۔ لہذا جن اصلاحوں کے لئے وہ ایک ناجائز شورش کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ ہم انہی اصلاحوں کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی تجاویز پیش کرتے ہیں۔

اس چھوٹے سے مضمون میں یہ نا ممکن ہے کہ ہم بالتفصیل ہر ایک صیغہ اصلاح کو قلم بند کریں لیکن موٹے موٹے اصول پیش کئے جائیں گے کہ جن پر ہم گورنمنٹ اور نیز ہر ایک محب قوم کی توجہ دلانے کی مودبانہ درخواست کرینگے

(۱) یہ دیکھنا چاہیئے کہ فی زمانہ ضروریات کے لحاظ سے ہر ایک شخص کی آمدنی کافی ہے یا نہیں۔ یا کم از کم کافی آمدنی پیدا کرنے کا موقع ہے یا نہیں۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ پچھلے بیس سال کے اندر اشیاء خوردنی میں تقریباً دوگنے کا فرق ہو گیا ہے۔ جسکا اثر رہنے کے مکان اور دیگر ضروری اشیاء پر اسی قدر پڑا ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ساتھ ہی ہماری معاشرت بھی اسی رفتار سے بڑھی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں بڑھی ہے تو اسکا قرار واقعی انتظام ہونا چاہیئے۔

(۲) ہماری صنعت و حرفت جسپر ہماری معاشرت۔ لہذا قومی بہبودی زیادہ تر مبنی ہے دیگر اقوام کے مقابلہ میں اسی رفتار سے بڑھ رہی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اسکا کچھ انتظام بذریعہ حفاظت سودیشی تجارت ہونا چاہیئے۔ ورنہ قوم کو خوش کرنے کیلئے اگر گاؤں گاؤں میں بھی تھیٹر کلب گھر کھول دئے جائیں اور دھوم دھاری برٹش راج کے منگل گانے پر آمادہ کئے جائیں۔ تو بھی ہندوستان کی بھوکی آتما کو وہ راگ شادمانی تسلی نہیں دے سکتا۔

(۳) یہ دیکھنا چاہیئے کہ ملازمان گورنمنٹ اپنے فرائض کو ٹھیک ادا کرتے ہیں یا نہیں کم از کم ٹھیک ادا کرنے کے سامان بھی مہیا کئے گئے ہیں یا نہیں مثلاً انہی لوازمات کے ناکافی ہونے سے رعایا کے انصاف میں خلل واقع

ہوتا ہے۔ جو انکو گورنمنٹ سے شکوہ رکہنے کا موقع دیتا ہے مثلاً ایک معمولی سپاہی کو اسکی عرق ریزی کے کام کے لئے اگر کافی غذا نہ ملے تو وہ خواہ کتنا ہی اخلاقی طاقت کیون نہ رکہتا ہو۔ اپنی جسمانی کمزوریون کے سبب سے اپنے فرض کے ادا کرنے میں کمزور ثابت ہوگا۔ اور اسکی یہ ناقابلیت رعایا کی ناخوشی کا باعث ہوگی۔ ابتک پبلک ان کمزوریون کے لئے اس شخص کی ذات کو قصوروار سمجہتی رہی مگر تعلیم عام سے یہ بات روز بروز ظاہر ہوتی جاتی ہے۔ کہ عموماً انسان اپنے وسائل کا غلام ہوتا ہے۔ اور اگر اسکے حالات مختلف ہوتے تو اسکا کیرکٹر بھی اور ہوتا۔

(۴) ملازمان سرکار کی معقول تنخواہ ہونے کے علاوہ انکی قابلیت پر بھی رعایا کی خوشی کا دارومدار ہے۔ ہندوستان مین اور غالباً دنیا کے ہر حصہ میں زیادہ تر قابل اشخاص اوسط درجہ کے لوگونمین سے پیدا ہوتے ہین۔ ہمارے غربا کو تعلیم و تربیت کا موقع ہی نہین ملتا۔ اور امرا یہان کے ہمیشہ سے عیش و عشرت میں غرق رہے ہے۔ لہٰذا تمام ذمہ داری کے عہدے اگر امتحان مقابلہ سے تصفیہ کئے جائین تو نہ صرف انتظام گورنمنٹ مین سہولیت ہو۔ بلکہ ہر جماعت کے لوگونکی شکایت کسی حدتک جاتی رہے۔ اور ساتہ ہی کم خرچی سے سلطنت کے کاروبار سرانجام دئے جاسکین اور اس سے ہندوستان کے افلاس کا کچہ چارہ ہوسکے۔ دربارہ سرکاری ملازمت ایک پارٹی کی شکایت یہ بھی ہے۔ کہ ہندوستانیونکو ذمہ داری کے کام کے ملنے کے موقع کم ہین۔ دوسرے فریق سے اسکا جواب یہ ملتا ہے کہ ابھی تک انہون نے اس کے لئے قابلیت پیدا نہین کی ہے۔ ہماری سمجہ میں یہ نہین آتا۔ کہ وہ قابلیت کیا ہے اور اسکے اندازہ کرنیکا ذریعہ کیا ہے

انسانی کمزوریاں کم وبیش ہر قوم میں موجود ہیں. لیکن بغیر موقع دینے کے نہ تو کمزوریان رفع ہو سکتی ہیں۔ اور نہ یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس میں کتنی زیادہ ہے اور کس میں کم۔

(۵) متعلق اخراجات فوج جو اس مفلس ملک کے لئے بار گران ہے ہم گورنمنٹ ہندوستان کے سامنے تجویز "ملیشیا" پیش کرتے ہیں کہ جس سے وقت ضرورت ہر ایک ہندو کا جوان لڑنے کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف اخراجات مین بچت ہو گی۔ جو تعلیم عام اور حفظان صحت پر فائدہ کے ساتھہ لگائی جا سکتی ہے بلکہ گورنمنٹ عالیہ کا رعایا پر یہ بھروسہ انکو خیر خواہ سرکار بنائے رکھیگا۔ ہماری گزشتہ تواریخ میں کافی تمثیلیں موجود ہیں کہ ہم اس اعزاز کے مستحق ہیں غیر سلطنت کے ماتحت حسب الحکم ہندوں نے اپنے بھائی بندوں کے مقابلہ مین کٹ مرنے میں بھی دریغ نہ کیا چنانچہ سیواجی کا پکڑنے والا ہندو ہی تہا۔

بہت سے سمجھدار اشخاص کو یہ بھی خطرہ ہے کہ خدانخواستہ کبھی ہماری حالت ویسی نہو جیسی کہ سلطنت روم کے گوشہ عافیت سے نکلکر جزیرہ برطانیہ کی ہوئی تھی۔ اسمیں شک نہین کہ ہر ایک خواندہ ہندوستانی موجودہ سلطنت کو ہماری ہمسایہ سلطنتیں. روس جاپان چین۔ و افغانستان سے بہتر سمجھتے ہین۔

(۶) آخر سب سے مقدم رعایا کی دماغی اور اخلاقی درستی ہے کیونکہ نا تعلیم یافتہ اشخاص باوجود ان شکایتون کے گورنمنٹ کی دقتوں کا نہ تو ٹھیک اندازہ کر سکتے ہین۔ اور نہ انکو گورنمنٹ کے ساتھہ کوئی عاقلانہ ہمدردی ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے جابجا گورنمنٹ اور رعایا کی طرف سے کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن ابھی تک وہ اس جاہل بر اعظم کو خواندہ کرانے کے لئے کافی نہین ہین۔ ہمارے خیال مین نا خوشی کا سب سے بڑا سبب عوام الناس مین اخلاقی ضعف ہے۔ اخلاق درست کرنیکا

ایک بڑا وسیلہ تعلیم ہے۔ مین ہرگز یقین نہیں کرتا ہون کہ مجوزہ ہندو اور مسلمان یونیورسٹیون میں مذہبی تعلیم کے شامل کرنے میں کوئی خاص فائدہ ہوگا۔ میرے ذاتی تجربہ نے مجھے یقین دلایا ہے کہ زیادہ تر بداخلاق اشخاص وہ ہوتے ہین کہ جنکی جنرل کلچر ناکافی ہونے سے اون کے دلونمیں بداعمالی کے بیج آسانی سے نشو و نما پاتے ہین خواہ وہ کتنے ہی مذہب کے معاملہ مین سرگرم ہون۔ یورپ کی جدید تحقیقات نے بھی کچھ اس خیال کو تقویت دی ہے لہذا بجاے مذہبی تعلیم کے اگر اخلاق۔ مثلاً سچائی۔ وفاداری۔ ملکی محبت وغیرہ وغیرہ اخلاقی مضامین پر تعلیم ہر مدرسہ مین خواہ سرکاری ہو یا پرائیویٹ فرض کردیجاوے تو آیندہ نسل کے اخلاق ضرور درست ہونگے۔ بشرطیکہ دیگر وسائل معاشرت فراہم ہون۔ عام تعلیم کا ایک دوسرا اثر اخلاق پر یون پڑتا ہے۔ کہ وہ انسانی دماغ مین بیشمار نو محسوسات کی بنیا وڈالدیتا ہے جس سے اسکے دماغ کو بجائے حیوانی جذبات دیگر دماغی و روحانی چیزون سے مذاق پیدا ہوجاتا ہے۔ اس اعلے شوق سے وہ عشق دنیاوی سے نکل کر راہ حقیقی کا طالب ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازین علم بذات خود ایک دولت ہے اس سے بہت سے مصائب کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔ کم از کم یہ تحصیل معاشرت میں بہت مدد پہونچاتا ہے۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہین کہ عموماً بھوکے سے اخلاق کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ لہذا تعلیم ہر طرح سے عایا کی بہبودی میں مدد دیگی۔ لیکن فی زمانہ کہیں کہیں یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ یہ بے چینی بوجہ تعلیم ہے۔

غالباً اس خیال کے پھیلانے والے چند کوتاہ اندیش اشخاص ہین جنکو عوام الناس کی جہالت سے کچھ ذاتی فائدہ ہے۔ انکو معلوم ہونا چاہئیے

کہ سیاستی اصول پر بھی (ع)

"دشمن دانا بہ از دوست نادان" کا مقولہ راست آتا ہے

میکولے کے زمانہ مین اِس سوال پر خوب بحث ہو چکی ہے اور انکے حیات مین ثابت ہو گیا کہ ہندوستانیون کی تعلیم برٹش راج کے مستحکم ہونے مین مددگار رہتی۔ لیکن افسوس کہ اِن تعلیم یافتہ جماعت کی اولاد جنھون نے برٹش راج کے لئے وقت ضرورت جان و مال کو جوکھو مین ڈالا۔ آج مشکوک نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اور کہیں کہیں اُنسے تحقیر کے ساتھہ سلوک کیا جاتا ہے۔ کیا اِس کے لئے صرف وہی ذمہ دار ہین ؟ کہیں ایک ہاتھہ سے تالی بجتی ہے ؟

اگر بفرض محال یہ بھی مان لیا جائے کہ عام تعلیم کا نتیجہ سردست موجودہ بے چینی کو زیادہ تحریک دے (گو کہ ہم اسکو بشہادت ریاست بڑودہ و میسور ہرگز تسلیم نہین کرتے) تو کیا چند شاکی اشخاص کا خیال گورنمنٹ عالیہ کو اس بات پر آمادہ کر سکتا ہے کہ اسکی اکتیس کروڑ رعایا جس پر اسے فخر ہے۔ جاہل رکھی جائے۔ جبکہ دنیا کی ہر مہذب گورنمنٹ اپنی اپنی رعایا کو برابر تعلیم دے رہی ہے؟ میرے خیال مین جو فخر آج برٹش گورنمنٹ کو ہندوستان کے تسلط سے حاصل ہے چند سال مین مٹ جائیگا۔ جب دنیا کی تاریخ میں ہندوستان ہی ایک ناتعلیم یافتہ قوم مہذب گورنمنٹ کے ساتھہ شامل رہتا ہوا۔ باقی رہیگا۔

"ٹگ"

خیرات

(گذشتہ بقیہ)

کیا ہمکو نہیں معلوم ہے کہ تہواروں اور مقدس رسوم کے ادا کرنے کے موقعوں پر (شادی بیاہ کے اسراف سے قطع نظر کرکے جسکو خیرات کا لقب نہیں دیا جا سکتا) ہم سیکڑوں روپئے ایسے لوگونکو نذر کر دیتے ہیں۔ جن سے زیادہ حقدار امیدوار شاید ہمارے پڑوس میں بلکہ خود ہمارے گھروں اور خاندانوں میں موجود ہیں؟ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ لنگر اور سدا برت کے خطرناک تقدس پر ہم ہزاروں من غلہ تصدق کر دیتے ہیں جو زیادہ تر اُن بیرحم اور سنگدل آسودہ حال پیشہ ور بھک منگوں کے پیٹ میں پہونچتا ہے۔ جو اصلی محتاجوں کو دھکے دیکر ہماری خیرات کے مستحقوں کی اگلی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں؟ ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب دولت مناسب طور پر استعمال ہوتی ہے؟ کیا اِس قومی دولت سے اُن قومی انسٹیٹیوشنوں کے قیام اور استحکام میں مدد ملتی ہے جو قوم کے بیکار اجزا کو باکار اور غیر مفید افراد کو مفید بنانے کے لئے قائم ہیں؟ نہایت افسوس ہے کہ اِس کا جواب صرف دلخراش نفی میں ہو سکتا ہے۔

سچ پوچھئے تو ہندوستان کے لوگ کیا ہندو کیا مسلمان بالطبع نہایت فیاض اور مخیر واقع ہوئے ہیں اور اُنکی فیاضی کے جوش کو حرکت میں لانا نہایت آسان ہے۔ ہر معمولی آدمی اپنی حیثیت کے مطابق اور بسا اوقات اوس سے زیادہ خیرات کرتا ہے مگر افسوس کہ کس قدر بڑا حصہ اِس خیرات کا بالکل غیر واجب طور پر ضایع ہو جاتا ہے۔ قومی خیرات بالکل معدوم نہیں ہے کہیں کہیں

مذہبی جوش نے چھوٹے چھوٹے مذہبی مدارس اور پاٹھ شالے قائم کرنے مین کامیابی حاصل کی ہے اور خدا کا ہزار شکر ہے کہ تھوڑے دنون سے قوم کی فیاضی سے اُن زبردست کالجون اور انسٹیٹیوشنون کو بھی کچھ نہ کچھ امداد ملنے لگی ہے لیکن اگر ان رقوم کا جو اس طور پر مفید استعمال میں آتی ہین۔ اُن رقمون سے مقابلہ کیا جائے جو بیہودگی سے برباد کیجاتی ہین تو نتیجہ یقیناً دل شکن ہوگا۔ قومی کامون میں امداد کرنے سے اکثر اس بنا پر اعراض کیا جاتا ہے کہ ادسکے بیجا مصرف کی گارنٹی نہیں ہے اگر اس احتیاط کے خیال کا اُس بے پروائی سے مقابلہ کیجئے جو مسٹنڈے بھک منگون کو دیئے جانے مین عمل میں آتی ہے تو افسوس کے ساتھ حیرت ہوتی ہے لیکن اسکے اسباب پر غور کیجئے تو کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوتی بہت کچھ تو قومی خیالات سے ہمارا مانوس ہونا اس دستورالعمل کا جواب دہ ہے۔ لیکن ہمارے قومی علمار کی تعلیم جو تمام مذہبی قوت اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے۔ اِن خیالات کے قایم کرنے میں کام کر رہی ہے وہ بھی ایسا نہیں جو نظر انداز ہو سکے۔ اور اگلے فقرے میں جب ہم اس پر بحث کرینگے تو ناظرین کو معلوم ہو جائیگا کہ مثل دیگر قومی امراض کے یہان بھی معلول علت کے لئے اور علت معلول کے لئے ممد اور معاون ہے یعنی سبب سے مرض پیدا ہوا ہے اور مرض سے سبب کو قوت مل رہی ہے۔ مگر قبل اسکے کہ ہم براہ راست اس بحث پر آئیں ہمکو چند الفاظ اُن کے فائدے کے لئے کہنے ضروری ہین جو قومی انسٹیٹیوشنون کے بانی اور قومی خیرات کے بجا مصرف کے ساعی ہیں انکو ہمیشہ لازم ہے کہ اپنے حسابات کو بالکل باقاعدہ اور عوام الناس کی نظرون کے سامنے رکھیں۔ اور اپنے محصوں کی شناخت کے لئے ایسا معقول انتظام کریں کہ کسی خیرات دینے والے کو اِس معاملہ میں شبہ کرنے کی گنجایش نہ ہو۔ کہ یہ روپیہ فی الواقع اُسی فنڈ میں پہونچے گا جسکی وہ امداد کر رہا ہے۔

خیرات کے استحقاق کا مسئلہ تو کسی قدر پیچیدہ بھی ہے اور اکثر اوقات یہ عذر معقول اور قابل پذیرائی ہوتا ہے کہ ہمارے پاس سچے حاجتمند اور جھوٹے بھکاری دریوزہ گر میں امتیاز کرنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ عذر اُسوقت تک زایل نہیں ہو سکتا جب تک وہ طریقہ امداد غربا کا اختیار نہ کیا جائے جو یورپین ممالک مین رائج ہے اور جس کی کسی قدر توضیح اوپر کی گئی ہے۔ لیکن قابل افسوس بات تو یہ ہے کہ بجا خیرات کے دینے مین بھی ہم لوگ پانے والے ہین حمیت اور غیرت کی پسندیدہ صفات کے قائم رکھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے جو بالکل اختیاری بات ہے۔ اور جسمین محتاج خانون کے قیام اور انسداد دریوزہ گری کے قانون کے رائج ہونے کی مانند طول طویل کوشش بھی درکار نہین۔ بہت سے مسلمان خاندانون کو تجربہ ہوا ہو گا کہ اُن کے دروازے پر ایک میلا کچیلا شخص ایک وقت یا دونون وقت آکر صدا لگاتا ہے کہ "طالب علم کی روٹی دے جاؤ" اے ہمدردان قوم اور اے مصلحان ملک! مین آپسے دریافت کرتا ہون کہ کیا یہ ایسی بات نہین جسپر قوم بے انتہا لعنت و ملامت کے شایان ہو؟ کیا اس ذلت کا جواز قوم کے لئے باعث ننگ و موجب شرمندگی نہیں ہے۔؟ جسوقت میں اُن چشمہ علم سے سیراب ہونیوالون کے مرتبے پر خیال کرتا ہون۔ اور پھر اون کے ساتھہ قوم کے اِس برتاؤ کو دیکھتا ہون تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہین اور میں یہ سمجھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ کہ جن نافرمانیون اور بداعمالیون نے ہمکو اس تباہ حالت تک پہونچایا ہے۔ اور ہمکو خدائی غضب میں گرفتار کیا ہے اِسمیں خدا و رسول کے اِس حکم سے کہ "علم کی عزت کرو" روگردانی کا حصہ بہت بڑا ہے۔ اَے قومی غیرت اور اَے ملکی حمیت تیری بے وقت موت پر ہمکو رونا آتا ہے۔ ہائے یہ تیرے ہی اُٹھہ جانے سے آج ہماری یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہم اپنے آیندہ دینی رہنماؤن اور علمی سرداروںکو اسطور پر ابتدائے عمر سے دریوزہ گری کا سبق دیتے

ہین۔ ہم اپنے مذہبی رہنماؤں کو جو کچھ الزام دیتے ہیں وہ سب بیجا ہے ہم کو خود اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھنا چاہیئے جب ہم اونکو ابتدائے عمر سے دریوزہ گری کی مشق کراتے ہیں تو ہمکو یہ امید رکھنا بیجا ہے کہ وہ جوان ہوکر اس عادت کو ترک کر دینگے جو طفلی اور عنفوان شباب مین اُنہون نے ہماری بےتمیزی سے حاصل کی ہے۔ ہمارے اس فعل سے کس قدر امیدون پر پانی پڑجاتا ہے۔ اور کسقدر آرزوئیں جو دینی مقتداؤں کی ذات سے وابستہ ہین خاک مین مل جاتی ہیں۔ کچھ بیجا نہیں اگر وہ اپنے مریدون اور معتقدوں کو یہ تعلیم دیں کہ اپنی تمام کمائی مشائخ نما دریوزہ گرونکی نذر کردو اور کچھ بعید نہیں اگر وہ قلیل ذاتی منفعت کی طمع میں خدا اور رسول کے احکام پر اپنے مطلب کی تاویلیں چڑھائیں اور قوم کو تجبردی پر آمادہ کریں۔ میرے اس قول کو کلیہ سمجھنا غلطی ہے اسمین قابل وقعت استثنا کی بھی مثالیں موجود ہیں لیکن عام حالت یہی ہے اور اسپر ہم کو کوئی موقعہ کسی کی شکایت کا نہین ہے بلکہ یہ خود ہمارے کرمونکا بھوگ اور ہمارے فعلونکا نتیجہ ہے۔ جو اس بلائے عظیم کی صورت مین ہمارے ادبار کو بلا رہا ہے یہ اُس بدسلیقگی کا نتیجہ ہے جو طریقہ خیرات دہی میں ہم برتتے ہین اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمکو قومی کامونکی انجام دہی کی عادت اور مشق بالکل نہین ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ طلبا کی امداد اسطور پر کیجائے کہ اونکو اونکی ضرویات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہ پڑے ؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اونکی ظاہری حالت اسقدر درست رکھی جائے کہ اونمین ذلت اور پستی پیدا نہ ہونے پائے ؟ اگر اس طریقہ کا برتاؤ آپ کو نہیں آتا تو جائیے اور علیگڈھ کے بورڈنگ ہوس کی سیر کیجئے۔ وہ علیگڈہ کالج جو ابتک بہت لوگون کے نزدیک نیچریت کا معدن اور ارتداد کا مامن سمجھا جاتا ہے۔ علم کے تقدس اور عظمت کو خدا رسول کے فرمودے کے بموجب قائم رکھتا ہے۔ جب آپ وہان کے طلبا کو کھیل کود مین لکچر روم میں یا انکے اپنے کمرونمین دیکھینگے تو آپکو یہ امتیاز کرنا مشکل ہوگا کہ انمین کون آسودہ حال ہے اور کون تہیدست

جس کے والدین تنخواہ دو سو روپیہ پاہوار اُسکی تعلیمی ضروریات پر صرف کرتے ہیں لیکن محض فطانت سے پرائیویٹ ٹیوشن پر بسر کرتا ہی۔ ہم کہتے ہیں اور دعوی کرتے ہیں کہ آپکو اسکا امتیاز مشکل ہو گا۔ حالانکہ ہم کو معلوم ہے کہ دونو نظر کے طلبار نصف نصف کی تعداد مین وہان موجود ہیں۔ لیکن غریب طلبار کی ظاہری حالت کا اس درجہ تحفظ کیا جاتا ہے کہ ایک دوسرے کی حالت میں امتیاز ناممکن ہی اسکا نتیجہ سب پر روشن ہی کہ ایک علیگڈھ کالج کا طالب علم اپنی عزت قایم رکھنے مین ضرب المثل ہے اور اپنی عزت قایم رکھنا بلاشبہ اُن حسنات مین سے ہی جن سے نظام تمدن وابستہ ہی میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ وہان کے بعض طلبار ضرورت سے کسی قدر زیادہ مسرف بھی ہوتے ہین۔ لیکن دنیا کے تمام کامونکا مفید یا غیر مفید ہونا مقابلہ سے طے ہوا کرتا ہے۔ اور جب ہم دونون طریقونکا مقابلہ کرتے ہین تو علیگڈھ کالج کا طریقہ زیادہ مفید اور کم مضر ثابت ہوتا ہے بس یہ کافی ہی ورنہ ملکوتی صفات اور معصوم صفت لوگوں کا پیدا کرنا ایک ایسا حوصلہ ہی جسکا وجود صرف ذہنی ہے اور جسکا فائدہ صرف یہ ہی کہ ہم اوسکو بطور معیار پیش نظر رکھکر کام کرین۔

کاش وہ دن جلد آئے کہ ہم اس امر کو سمجھین۔ کاش اپنی قوم کے محتاجون اور مسکینون کی اسطرح کفالت کرنا سیکھیں کہ اُنکی عزت اور حمیت معدوم نہ ہونے پائے اور یہ صرف اُسوقت ممکن ہے۔ جب ہر حاجت مند کو اپنی روزانہ ضروریات کے لئے دریوزہ گری کی ضرورت نہ ہو اور قومی محتاج خانے اور دیگر انسٹیٹوشن اُنکی پرورش اور کفالت کیلئے موجود ہون جن میں اصلی محتاجونکی خبر گیری کی جائے اور مسٹنڈے بھک منگون کو کام کرنے اور مفید بننے پر مجبور کیا جائے۔ کاش اس سبق کو ہم اچھی طرح یاد کرلیں اور کبھی نہ بھولیں کہ صرف ایک یا دو وقت یا چند روز تک کھانا کھلا دینا یا دو چار دفعہ کپڑے بنا دینا محتاج کی اصلی امداد نہیں ہی نہ خیرات کا بجا مصرف ہی بلکہ محتاج کی اصلی مدد اور خیرات کا بجا مصرف یہ ہی کہ ہم قوم کے بیکار اشخاص کو اس قابل بنا دین کہ وہ اپنی ضروریات کا خود انصرام کرنے لگین۔ عبد الغفار اختر الہ آبادی

منتصر باللہ

خلیفہ منتصر باللہ، متوکل باللہ کا بیٹا ہے۔ اِسکا نام محمد تھا، اور کنیت ابو جعفر۔ مگر بعض مورخین نے اِسکی کنیت ابو عبد اللہ لکھی ہے۔ اور یہ ۲۲۲ھ میں پیدا ہوا ہے۔ یہ تو ہم پہلے ہی اپنے کسی مضمون میں لکھ چکے ہین کہ خلفائے بنی عباسیہ زیادہ تر لونڈی کے پیٹ ہی سے ہوئے ہین چنانچہ اِسکی مان بھی ام ولد تھی ملک روم کی رہنے والی اور حبشیہ اوسکا نام تہا۔ قدرت نے حسن نمکین اور گندمی رنگ عطا کیا تہا۔ آنکھیں بڑی بڑی میانہ قد پیٹ بڑا، چہرہ نہایت رعب دار اور یہ خود بہت جسیم تھی۔ اور اسکو عقل و فراست کی دیوی، نیکیون کی مجسمہ سمجھنا چاہیئے۔ بُری باتون سے متنفر اور ظلم سے بیزار علویین کی بڑی محسنہ گویا اون کے لئے باران رحمت تھی۔ یعنی جس قدر تشدد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اولاد پر متوکل باللہ کے عہد میں کیا جاتا تہا حبشیہ نے اپنی سفارش سے اوسے دور کرادیا۔ اور مقام فدک آلِ حسین علیہ السلام کو دلادیا۔ اُسوقت کے لحاظ سے منتصر کی والدہ کی یہ نیکی اور نیک ذہنی نہایت قابل قدر تھی۔ جو کبھی فراموش نہیں ہوسکتی۔ اور جسقدر اِس احسان کا شکریہ ادا کیا جائے وہ کم ہے۔ چنانچہ یزید مہلبی نے جو اُس زمانہ کے مشاہیر شعرا میں گنا جاتا تہا، حبشیہ کے اِس عنایت کا شکریہ حسب ذیل اشعار میں ادا کیا ہے ؎

وَلقد بررت الطالبیہ بعدما ذمّوا زماناً بعدہا و زمانا

اور التبہ نیکی کی تو نے آل ابی طالب کے ساتھ بعد اسکے کہ اونکی مذمت و برائی بہت زمانہ تک کیگئی

و رددت الفتہ ہاشم فرایتہم بعد العداوۃ بینہم اخوانا

اور پھیر دی تو نے ہاشم کی محبت دلیں کی اور ابتو دیکھتی ہے انکو کہ دشمنی کے بعد باہم اون کا بہت سے بھائی چارہ ہے

یہ خلیفہ اپنے والد بزرگوار متوکل باللہ کے بعد تخت نشین خلافت ہوا۔ ماہ شوال ۲۴۷ھ میں بعد قتل متوکل کے اُسکے ہاتھ پر خلافت کی بیعت لیگئی۔ اِس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے دونوں بھائیوں معتز اور مؤید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا۔ جنکو متوکل نے منتصر کے بعد یکے بعد دیگرے ولی عہد سلطنت قرار دیا تھا۔ اور تمام حدود مملکت میں عدل و انصاف کے دریا بہا دئے۔ اِسکی نوشیروان مزاجی اور انصاف پسندی نے رعایا کے دلونکو تسخیر کر لیا۔ چنانچہ تمام مخلوق اسکی دل سے ثناخوان اور طرفدار ہوگئی۔ حالانکہ اِسکا خوف بھی بہت کچھ دلونمیں سمایا ہوا تھا۔ لیکن باوجود اِس ہیبت اور رعب کے منتصر نہایت رحم دل اور بردبار خلیفہ تھا۔ اور اُسکی باتیں حکمت سے مالا مال تھیں ہر لفظ سے دانائی اور فراست ٹپکتی تھی۔ منتصر کا قول ہے کہ "لذت معافی کی لذت تشفی سے زیادہ شیرین ہے" اور "ایک حاکم کا اپنے محکوم سے یا بالفاظ دیگر کسی قدرت رکھنے والے کا زیر دستوں سے بدلہ لینا سب سے برا کام ہے"۔

جب منتصر اپنی مملکت پر متصرف ہوا اور باقاعدہ والی سلطنت قرار پاچکا تو اُسے ترکون سے بہت نفرت اور خصومت ظاہر کی۔ اکثر اِنہیں برا بھلا کہتا اور گالیان دیتا تھا۔ اور اسکا قول تھا کہ یہی شریر النفس اور بدباطن ترک خلفا کے قاتل اور فسادات کے بانی ہیں۔ اِن کی سازشیں نہایت خطرناک اور سلاطین وقت کے لئے مہلک ہین۔ جب ترکون نے منتصر کی یہ بدنیتی اور اپنی طرف سے بدگمانی معلوم کی تو نہایت غمگین اور بیزار ہوکر فی الواقع خلیفہ کی دشمنی پر آمادہ ہوگئے۔ اور اُسکو زک دینے اور ہلاکت میں ڈالنے کی درپردہ سازشیں کرنے لگے کہ جس طرح ممکن ہو خلیفہ کو یا تو معزول کردیں یا زندہ ہی نہ چھوڑین۔ تاکہ ہر وقت کا خدشہ اور خوف جو خلیفہ کی طرف سے ترکون پر طاری رہتا ہے ہمیشہ کے لئے جاتا رہے کیونکہ بادشاہ کے طرز عمل سے ہر قسم کی مایوسی ہوچکی تھی اور انھوں نے سمجھ لیا تھا

کہ ہم لوگ منتصر کے زمانے میں کسی طرح کا عروج حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن بادشاہ کو قابو میں لانے یا بے اختیار کرنے کے لئے کوئی حیلہ نہیں بن پڑتا تھا۔ کیونکہ منتصر کریم اور حلیم ہونے کے ساتھ ہی بڑا قہار مہیب اپنے مخالفون کے خون کا پیاسا خود بذاتہٖ بڑا بہادر، ہوشیار، اور چالاک تھا۔ اور چونکہ ترکون کی طرف سے اسکا حسن ظن زائل ہو چکا تھا۔ اسلئے ہمیشہ ان کے فریب و دغا سے اپنی جان بچانے کی فکر میں رہتا گو ترک اس سے عاجز آ گئے تھے۔ پھر بھی انہون نے اپنے حیلہ جوئی اور کوشش مین کمی نہ کی۔ آخر کار خلیفہ کے طبیب خاص ابن طیفور کی خدمت میں بطور رشوت نذرانہ تیس ہزار دینار چپکے سے بھیجے۔ اس زمانہ میں بادشاہ سخت علیل اور اسی طبیب کے زیر علاج تھا۔ نمک حرام حکیم نے فصد کھلوانے کا مشورہ دیا۔ منتصر باللہ کو کیا خبر تھی کہ یہ حکیم میرے ساتھ دغا کرے گا۔ اس نے اوسکی تشخیص سے اتفاق کیا حکیم طیفور نے گویا منہ مانگی مراد پائی۔ اور خلیفہ کی اجازت پاتے ہی ایسے زہریلے نشتر سے فصد کھول لی کہ اوسکے بعد خلیفہ جانبر ہی نہ ہو سکا۔

کہا جاتا ہے کہ ابن طیفور خود ان دنون کسی مرض میں مبتلا تھا۔ اسنے اپنی بیماری کا عذر کر کے اپنے ایک رازدار غلام کو فصد کے لئے بادشاہ کے حضور میں بھیجا اس نے اوسی زہر میں بجھے ہوئے نشتر سے فصد لی۔ اور منتصر نے اپنی عزیز جان بحق تسلیم کی۔

اور کہا جاتا ہے کہ امرود میں زہر دیا گیا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ پھانسی سے جان بحق تسلیم کی۔ مگر ہم نے جو واقعہ اوپر درج کیا ہے یہ زیادہ واثق ہے۔

نزع کے وقت منتصر کی زبان پر افسوسناک یہ کلمہ جاری تھا۔ "یا اماہ ذہبت من الدنیا والاخرۃ۔ عاجلت ابی فعوجلت" اے والدہ! اے میں تو دنیا اور آخرت دونوں سے گیا۔ میں نے اپنے باپ کے ساتھ قتل کرنے میں، جلدی کی۔ اور میں موت کے ساتھ جلدی

کیا گیا۔

ماہ ربیع الآخرۃ ۲۴۸ھ میں پانچ تاریخ کو منتصر نے وفات پائی۔ اس وقت اسکی عمر تقریباً چھبیس سال کی یا اس سے کچھ کم زیادہ ہوگی۔ مگر اپنے دور حکومت میں کچھ بھی فائدہ یا عیش حاصل نہ کر سکا۔ کیونکہ صرف گنتی کے چند ماہ یعنی چھ مہینے سے بھی کچھ کم تخت خلافت پر رونق افروز ہوئے گزرے تھے کہ بے رحم اجل نے ہمیشہ کے لئے دنیاوی لذائذ سے محروم کر دیا۔ اور منتصر حسرت اور آرزو ان کا ہجوم ساتھ لئے ہوئے قبر کے تیرہ و تاریک گوشے میں گہری نیند کے مزے لینے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ کسی روز خلیفہ نے لہو و لعب کی محفل منعقد کرنا چاہی تھی۔ چنانچہ اپنے باپ متوکل کے خزانوں سے عمدہ عمدہ زرین فرش نکلوائے اور مجلس میں بچھانے کا حکم دیا۔

یہ فرش فروش منتصر کے سامنے ہی بچھائے جا رہے تھے کہ ایک پر تکلف فرش نکلا جس پر ایک بہت خوشنما دائرہ بنا ہوا دکھائی دیا۔ ایک فارسی نژاد خوشرو نوجوان کی تصویر بنی۔ اور اس دائرہ کے اندر فارسی کے ایک مرصع سر پر تاج تھا۔ اور دائرہ کے گرد فارسی زبان میں کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ منتصر نے حکم دیا کہ یہ فارسی تحریر پڑھنے کے لئے کوئی آدمی طلب کیا جائے۔ چنانچہ ایک شخص حاضر کیا گیا۔ ادھر وہ عبارت پڑھ رہا تھا۔ ادھر اسکی پیشانی سے شکن اور ترشروئی ظاہر ہو رہی تھی۔ منتصر نے دریافت کیا کہ آخر یہ کیا بات ہے۔ پڑھنے والے نے سوائے اسکے اور کچھ جواب نہ دیا کہ محض مہمل اور بے معنی الفاظ ہیں۔ لیکن منتصر کب ماننے والا تھا۔ پڑھنے والے سے پھر دوسرے اصرار کے ساتھ پوچھا کہ نہیں! سچ بتاؤ کیا لکھا ہوا ہے۔ آخر پڑھنے والے نے مجبور ہو کر کہا اسمیں لکھا ہے کہ۔ "میں شیرویہ بن کسریٰ بن ہرمز ہوں۔ میں نے اپنے باپ کو قتل کیا۔ مگر حیف ملک اور حکومت

یہ قابض ہو کر چھہ مہینے سے زیادہ عیش اور فائدہ نہیں اوٹھا سکا۔ یہ سنکر منتصر کے چہرہ کا رنگ بدلا۔ اور حکم دیا کہ اسی وقت یہ فرش جلا دیا جائے۔ حالانکہ وہ فرش نہایت قیمتی اور سونے کے تانے بانے سے تیار ہوا تہا۔

ثعالبی کی لطائف المعارف میں ہے کہ تمام خلفاء بنی العباس میں خالص تر خلافت کے معنے کے اعتبار سے منتصر ہے۔ اسلیئے وہ خود خلیفہ ہوا اور اوسکے باپ دادوں میں چار پشت سے خلافت چلی آتی ہے۔ اسی طرح اسکے دونوں بھائی معتز اور معتمد۔ مگر امام سیوطی رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ میری دانست میں منتصر سے بھی بڑہکر اصیل اور خالص تر مستعصم باللہ ہے جو تاتاریوں کے ہاتھ سے قتل کیا گیا اس واسطے کہ اوسکے باپ دادوں میں آٹھ پشتوں سے نسلاً بعد نسل خلافت چلی آتی ہے۔

ثعالبی لطائف المعارف میں دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے سلاطین فارس میں سب سے بڑہکر اصیل اور خالص تر "شیرویہ" ہے جس نے اپنے باپ کو قتل کیا تہا۔ مگر چھہ مہینے سے زیادہ تخت و تاج کا مالک نہ رہ سکا۔ اسی طرح خلفاء میں اصیل اور خالص تر منتصر ہے۔ اس نے بھی اپنے باپ متوکل کو قتل کیا۔ مگر قدرت نے اسے بھی چھہ مہینے سے زیادہ حکومت اور سلطنت کا مستحق نہ سمجھا۔ واللہ اعلم بالصواب

محمد حسین محوی (لکھنوی)

"یادرکھنا" اور "بھول جانا"

اُردو زبان کے یہ دو مخالف ایسے ہیں کہ ہر شخص جسکو اُردو سے کچھ بھی لگاؤ ہو ان کے معنی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ہم ان کی منشا کے خلاف اُن باتوں کو جن کا بھلا دینا بہتر ہوتا یاد رکھتے ہیں۔ اور جن کا یاد رکھنا لازمی تھا۔ بھلا دیتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو درحقیقت یہی دو الفاظ ہیں جو مخالفت کی بناء اور نفاق کا پیش خیمہ بنکر شیشۂ دل کو مکدر کر دیتے ہیں۔ اس وقت جبکہ ان پر ان کی منشاء کے خلاف عمل کیا جائے اور دو دلوں میں الفت و محبت کا بیج بو کر یک جان و دو قالب کا مصداق بناتے ہیں۔ اُس وقت جبکہ انہیں ان کی منشاء کے موافق عمل کیا جائے۔

سو میں مشکل سے شاید ایک دو خاندان ایسے نکلیں جو یکجہتی اور باہمی اتحاد و اتفاق سے زندگی بسر کرتے ہوں۔ ورنہ ننانویں فیصدی ایسے ملیں گے جو اپنے آباد اجداد سے عداوت۔ بغض، حسد کینہ اور کپٹ کی لپٹیں سینہ بسینہ لئے چلے آ رہے ہیں۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہی پوشیدہ نفاق کے گولے اور پھوٹ کے شعلے پھوٹ پھوٹ کر ایک دوسرے کی طرف سے دلوں میں کدورت پیدا کر رہے ہیں کہ بھائی کو بھائی نہیں سوجھتا۔

ہر چند کہ اس مسئلہ پر غور کیا گیا۔ پر اس دلی کدورت کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہ ہوئے کہ انہوں نے ان ہر دو الفاظ "یاد رکھنا" اور "بھول جانا" کو ان کے منشاء کے خلاف لے رکھا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے جُدا کرنے والی

باتوں کو اپنے دماغ میں جگہ دیتے اور دلوں میں رکھتے چلے آئے لیکن اُن باتوں کو جو آپس میں شیر و شکر کرتیں فراموش کرتے رہے۔ وہ ذرا ذرا سے اختلافات۔ جلدی میں زبان سے نکلے ہوئے کلمات۔ چھوٹی چھوٹی شکر رنجیوں فضول جھگڑوں۔ غصہ کی تمام فتنہ پرداز باتوں کو دلوں میں اس طرح رکھتے چلے آئے گویا آج ہی کا واقعہ ہے لیکن تمام خوشگوار محبت کی باتوں اور الفت کے ناتوں کو ایسے بھول گئے گویا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

یہ کیسی بے انصافی ہے کہ باعث نفاق باتوں کو جو فردگزاشت کے قابل تھیں یاد کرتے ہوئے انہیں لوگوں کی اچھی اچھی باتوں اور کاموں کو جو انہوں نے ہمارے حق میں کئے ہوں فردگزاشت کر دیا جاتا ہے۔

یوں تو بعض اوقات ہر انسان غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اپنے آپے سے باہر ہو کر وہ بات کہہ بیٹھتا ہے۔ جو درحقیقت کہنی لازم نہ تھی۔ لیکن اکثر غلط فہمی بھی واقع ہو جایا کرتی ہے۔ مثلاً میں نے ایک بات کہی اور تم نے اوسکا کچھ اور مطلب لیلیا جو درحقیقت میرا مطلب کیا خیال بھی نہ تھا۔ اب میں ہرچند اپنی بات کی تشریح کر کے تمہارا خیال بدلنا چاہتا ہوں۔ پر تمہارا خیال جو خلاف مطلب پر جم گیا ہے۔ ہٹائے نہیں ہٹتا۔ بس تمہارے دل میں میری طرف سے کدورت پیدا ہو گئی۔ اور کسی دوسرے موقعہ پر تم انہیں پرانی خطاؤں اور غلطیوں کو یاد کرتے ہوئے میرے شریک درد و غم یا خوشی بننے سے انکار کر دو تو گویا تم نے اس بات کو یاد رکھا۔ جو بھلا دینے کے قابل تھی۔

اگر تم سے کوئی ناپسندیدہ اور ناملائم فعل سرزد ہو جائے تو تم ہرگز پسند نہ کرو گے۔ کہ کوئی شخص اسکا ذکر بھی تمہارے سامنے کرے۔ تم کیا۔ اسے تو کوئی

بھی پسند نکریگا۔ پھر بھلا جو بات تم خود پسند نہیں کرتے دوسرون کے لئے پسند کرنا کہان! انصاف ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ایسی باتون کو دل سے ایسا بھلا دیا جائے کہ کبھی ان کا خیال تک نہ آئے۔

فرض کرو کہ کسی شخص سے کوئی خطا ہو جائے۔ اب جو خیال غالب تمہارے دل میں پیدا ہوگا۔ وہ یہ ہوگا کہ کسی طرح وہ خطا اوسپر جتا کر اوسے شرمندہ کیا جائے۔ اور یہی نہایت بیجا ہے۔

مناسب یہ ہے کہ اسکی بجائے اِس شخص کی کسی اچھی بات کا دھیان کرکے اگر دل چاہے تو جتا دو۔ تم کیا جانو کہ اِس طرز عمل سے اِس شخص کے دل پر کیا اثر پڑیگا۔ اور وہ خوش ہو کر تمہارا کس قدر شکر گزار بنجائے گا۔ کہ تم نے اس کی اچھی بات کو یاد رکھا۔

سچ یون ہے کہ آپس کے امن و آمان اور خوشی کا راز ان دونون الفاظ کے مفہوم اصلی میں پنہان و پوشیدہ ہے۔ فقط۔

منیر الدین احمد۔ (میرٹھی)

لطیفہ

کسی امیر کے پڑوس میں ایک طرف تو لوہار کی دوکان تھی اور دوسری طرف ٹھٹیرا بیٹھتا تھا۔ دونوں کے ہاں دن رات کھٹ کھٹ ہوتی رہتی تھی جس سے امیر آدمی ہمیشہ پریشان رہتا تھا آخر ایک دن اُسنے لوہار کو بلایا۔ اور سو روپے دیکر کہا۔ تم اپنی دوکان بدل لو۔ لوہار راضی ہوگیا اسی طرح ٹھٹیرے کو بھی سو روپے دیکر راضی کر لیا گیا۔

دوسرے دن لوہار تو ٹھٹیرے کی دوکان میں جا بیٹھا اور ٹھٹیرا۔ لوہار کی دوکان میں اُٹھ گیا اور اپنی روزانہ کی کھٹ کھٹ کرنے لگے شور سنکر امیر وہاں آیا اور لگا لوہار کو بُرا بھلا کہنے۔ لوہار نے کہا جناب ہمنے اپنے اقرار کے موافق دوکان بدل لی ہے۔ امیر لاجواب ہو کر چپ رہا۔

متفرقات

شکایت بیجا آجکل لوگ عدم فرصتی اور وقت کی کمی کی بہت شکایت کرتے ہیں۔ یہ شکایت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمیشہ سے لوگ وقت کم ہونے کی شکایت کرتے رہے ہیں گو ایسے زور سے پکار پکار کر نہیں جیسے اس زمانہ میں ہر ایک بات زور سے طشت از بام کیجاتی ہے۔ اور اگر حقیقت کو معلوم کیا جائے تو کچھہ بھی نہیں اگر کچھہ کام ملتا ہے تو اسکا خاتمہ بُرا بھلا کر کے فی الفور کرنا چاہتے ہیں مدت میعاد مہینے کی ہو تو ہفتہ میں اور ہفتہ کی ہو تو ایک دن میں۔ اگر دن بھر کی ہو تو گھنٹہ بھر میں وعلیٰ ہذا القیاس۔ ایسا کرنے سے سوائے اس بات کے اور کچھہ غرض نہیں ہوتی کہ باقی وقت بالکل تلف کر دیا جائے۔ اور پھر وقت کے نہونے کی شکایت بھی خوب پکار پکار کر کیجائے۔ خالی وقت یعنے جب کوئی خاص کام کرنے کو ہاتھہ میں نہیں ہوتا۔ تو وقت دہکا پیلی کر کے ٹلاتے ہیں۔ اور پھر بھی اگر کوئی کہے کہ صاحب فلاں وقت آپ ہمارے پاس آئیں گے تو جواب ہوتا ہے کہ اس وقت تو نہیں آسکتا۔ چاہے وقت کا خون بیٹھے بیٹھے کر دیں۔ مگر وضعداری اور وقت کے فیشن کی پابندی لازم ہے یعنی وقت یوہنی کھو دینا مگر وقت کے نہ ملنے کی شکایت کئے جانا۔ یہ زمانہ کا پھیر ہے۔ اور آب و ہوا کی خصوصیت ہے کہ جو کام ہو یا جو بات ہو اُسکو اگر ویسے کا ویسا ہی ظاہر کر دیا تو کچھہ بات نہیں۔ اگر آمدنی کافی ہے تو یہی کہا جائے کہ پورا نہیں پڑتا۔ اور اگر مفلس قلاش ہیں تو ساہوکاری اور امیری ظاہر کیجائے۔ فرصت ہو تو عدم فرصتی کی شکایت کیجائے۔

اگر سفید ہے تو سیاہ اور سیاہ ہے تو سفید نہ کہا تو ہوشیاری اور چترائی پر دھبا لگ گیا۔ بھولے اور بھوندے کہلائے۔ زمانہ کی رفتار کو نہ پہچانا اور ہمعصروں کی نظر میں خفیف ہوئے۔ جناب ایڈیسن صاحب نے اپنے مضمون پر تحریر کرتے ہوئے مہاجنون۔ سود خواروں۔ دوست اور آشناؤں کی مثال دیکر یہی جتایا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ انہیں سے ہر شخص وقت کا خواہ مخواہ خون کرنا چاہتا ہے۔ سود خوار کو بھی دُھن لگی رہتی ہے۔ کہ جلدی سے مہینہ گزرے تو سود کا تقاضہ شروع کردن۔ مکاندار دن گنتا رہتا ہے۔ کہ کب دن گزریں جو کرایہ وصول کردن اور اس سود و کرایہ کی دُھن میں بیچ کے انتیس تیس دن کو یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح جلد گزریں بالکل غارت ہو جائیں تو خوب ہو۔ لیکن جب وقت کی بابت کچھ ذکر آجائے تو یہی کہتے ہیں ہائے ہائے وقت نہیں ملتا۔ یہانتک کہ یہی کہتے کہتے سو پچاس برس تمام عمر کے یونہی گزار دیتے ہیں۔ اور آخری دم تک یہی وقت کے نہ ملنے کی شکایت کئے جاتے ہیں۔

اب ناظرین با تمکین غور فرمائیں کہ یہ شکایت کیسی بیجا ہے اور اُس سے بجز کمزوری اور ضعف خصلت کے اور کیا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تو ایک موٹی مثال حقیقت کو جتلانے کی ہے عموماً تمام حرکات و سکنات سے جب یہی کوشش عیاں ہو کہ راستی اور سیدھے پن سے بالکل کام نہ لیا جائے تو خصلت کیا بن سکتی ہے۔ او سکا ٹھیراؤ کس بنا پر ہو سکتا ہے۔ اگر مشرق سے آئے تو مغرب سے بتاتے ہیں۔ گھر کو جاتا ہے تو بازار کا نام لیتے ہیں۔ کام کرتے ہیں کچھ اور بتلاتے ہیں کچھ اور۔ واقفیت محدود بلکہ کالعدم مگر بحث و نکتہ چینی کو طیار غرضکہ جو کچھ ہیں۔ نہیں وہی ظاہر کرنا۔ اور جو کچھ ہیں اوس کو چھپانا یہی عقلمندی اور لیاقت کا معیار ہو تو نیک خصلت نہ خواب و خیال ہو تو کیا ہو۔ خصلت سازی کے

لئے طبیعت کی صفائی فراخ حوصلگی دل کی مضبوطی اور اصلی بے باکی۔ جس کی جڑ راستی پر ہو۔ ان باتوں کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں میں یہ باتیں پائی جائیں اور شروع ہی سے تربیت کی مدد سے پیدا کیجائیں انہیں نیک خصلت کی امید ہوسکتی ہے نہ کہ بیجا شکایتوں سے۔ بیجا شکایت خواہ کتنی اہم تربیت کی ہو۔ شاکی کو ذلیل کرتی ہے۔ اور خصلت پر دھبا لگاتی ہے۔ فقط

رگھبیر دیال۔ بی۔ اے۔

سفید لوگوں کا کال

اس زمانہ میں اول تو ہر شخص اپنے ہی مخمصوں میں ایسا پھنسا ہوا ہے۔ کہ اوس کو آگا پیچھا سوائے اپنے ذاتی مطلب کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ صبح سے شام ہوتی ہے اور یونہی عمر تمام ہوتی ہے۔ پروپکار یا پرمارتھ کرنے کی نہ تو طاقت ہی ہوتی ہے اور نہ جرأت ہی کیجاتی ہے۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی نیک نہاد شخص عوام کے فائدے اور بہتری کا کوئی کام کرنے کی جرأت کر بیٹھتا ہے تو تھوڑے ہی عرصہ میں وہ پچھتانے لگتا ہے۔ اور شکستہ دل ہوکر یا تو اس کار خیر سے ہاتھ اٹھاتا ہے یا بے دلی سے اسکو جاری رکھکر "نیکی کر کنوئیں میں ڈال" پر عمل کرتا ہے۔ لیکن نیکی کو کنوئیں میں ڈالنے اور ڈبو دینے کی بجائے اگر اوسکو مناسب زمین میں بویا جائے۔ تو کیا ہی اچھا ہو۔ مناسب زمین کونسی ہے؟ مستحق اشخاص جو درحقیقت انسان ہیں۔ اور فائدے نقصانکو سمجھتے ہیں۔ اہل تمیز ہیں اشارہ کو سمجھ کر ایسے کاموں کے ممد معاون ہوتے ہیں۔ آپ فائدہ اٹھاتے ہیں اور اوروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ ہر کام کا پھل خواہ وہ کیسا ہی ہو ضرور پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کوئی کام بھی بالکل ضایع نہیں ہوتا۔ نیک کاموں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ پھر بھی جو شخص جس برتاؤ کا حقدار ہو اوسکے ساتھ

ویسا ہی برتاؤ کرنا مین نیکی ہے مگر نیک لوگ تو پھول اور چندن کے مانند ہین جو ہر ایک کو خوشبو پہنچانے سے باز نہین رہ سکتے۔ لیکن خوشبو پانیوالے کا بھی تو یہ فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اُس خوشبو کی قدر کرے اسکی طرف سے بالکل بے اعتنائی اور بے پروائی ظاہر نہ کرے اگرچہ وہ خوشبو پہنچانے بغیر نہین رہینگے کیونکہ یہ انکا خاصہ ہے تاہم اسکی کچھ قدر نہ کرنے سے ہمارے مین تمیز اور زندگی کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ نیک کامونکی قدر دانی کیون نہین کیجاتی؟ کچھ تو شاید عدم فرصتی کیوجہ سے کہ پیٹ کے دہندون مین ایسے غلطان پیچان رہتے ہین کہ کسی بھلی بری بات کو سوچنے اور سمجھنے کی فرصت ہی نہین ملتی اور سوائے اپنے مطلب کی باتکے اور سب باتونکو فضول اور بیکار سمجھتے ہین اور کچھ شاید اس سببسے کہ بہت سے نیک اور مفید کام ایسے ڈھنگ اور پیرایہ سے کیے جاتے ہین جن سے لوگ مانوس اور آشنا نہین ہوتے جب وہ لوگ جنکے فائدے کی غرض سے وہ کام کیے جاتے ہین انسے آگاہ ہی نہین تو انکی ویسی ہی مثال ہے جیسے ناواقف حیوان کے آگے موتی اور جواہرات بکھیر دیتے جب ایک شخص کسی چیز کی قدر ہی نہین جانتا تو وہ اسکی قدر دانی کیا کرسکتا ہے۔ اس موقع پر ایک انگریز سیاح کی پرلطف بات جو اُسکا ذاتی تجربہ تھا یاد آتی ہے کہ اوسکا قافلہ جو ہم وحشیون کے فائدے وہ آرام کی خاطر دنیا میں سفر کررہا تھا۔ ملک روس کے کسی علاقہ مین پہنچا۔ وہان کے باشندونکو انہون نے کپڑے وغیرہ پہنے کو دئے۔ اور ساتھہ اسکے انگریزی صابون کی ٹکیان بھی تقسیم کین۔ آپ جانتے ہین کہ انگریزی ساخت کی چیزمن بالخصوص صابون کیسا خوبصورت اور رنگارنگ کا ہوتا ہے۔ چونکہ صابون ان لوگون نے پہلے نہ دیکھا تھا اور نہ برتا تھا۔ اسلیئے ان خوبصورت ٹکیونکو تو لیتے ہی چٹ کرگئے اور ڈکار نہ لی انکی اس حرکت سے اہل قافلہ بہت محظوظ ہوئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اونکو پچتانا پڑا کہ صابون وکیرہ مفت ضایع کیا اور انکو کچھ فائدہ نہین پہنچا۔

یہی بات اور نیک کاموں پر عاید ہوتی ہے کہ جب تک اُنکی خوبی سے لوگ واقف نہ ہونگے۔ وہ اونکی قدر ہرگز نہ کر سکیں گے مگر واقفیت حاصل ہوتی ہے تعلیم سے اور تعلیم کے لئے وقت اور محنت کی بھی ضرورت ہے لیکن سب سے زیادہ اِس بات کی ضرورت ہے کہ واقفیت حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو۔ اور خواہش ہوگی تو محنت وغیرہ سب کچھ خود بخود ہو جائیگی۔ خواہش واقفیت اور آگاہی کے بیج کے لئے دل کی زمین کو تیار کرتی ہے۔ اور جب زمین تیار ہو جاتی ہے تو بیج ضرور جم جائیگا۔ اور پھل پھول ضرور پیدا ہوگا۔ فقط۔

رگھبر دیال۔ بی۔ اے

تصویر

اِس مرتبہ ہم جناب پادری ایف۔ سی۔ اینڈریوز صاحب کی تصویر نذر ناظرین کرتے ہیں۔ آپ سینٹ سٹیفنز کالج کے ایک معزز پروفیسر ہیں علاوہ تعلیمی کام کے آپ ہندوستان کی بہبودی کے لئے بیشمار طریقوں سے اپنے بیش بہا وقت کو صرف کرتے رہتے ہیں۔ اگر ملک میں چند پادری اور ایسے ہوتے تو ہندوستان بڑا خوش قسمت ہو جاتا۔

اڈیٹر

آفتاب

اے فروغِ روزِ روشن، شعلِ افروزِ جہاں — جلوۂ صبحِ تمنا، اے چراغِ آسمان
رونقِ دنیا ہے تیری گرمیِ بازار سے — نور اک پھیلا ہے تیرے آتشیں رخسار سے
جانبِ مشرق نظر آتا ہے تیرا جامِ جم — سورۂ والشمس لوحِ چرخ پر کرتا رقم
ہے شرابِ ارغوانی سے بھرا ساغر ترا — دورِ چشمِ مست ہے دن بھر کا یہ چکر ترا
کس حسیں کے گوش کا تو گوہرِ نایاب ہے — کون سے عاشق کا تو داغِ دلِ بیتاب ہے
ہے کتابِ حکمتِ خالق کا اک اُجلا ورق — نورِ دانش سے ترے روشن ہیں یہ چودہ طبق
تاسنیں ہیں شعاعوں کی جو یہ پھیلا رہا — حُسن کا اے مہ وش تیرے ہی سر سہرا رہا
تخت ہے چرخِ چہارم اے شہِ خاور ترا — ہے دمِ عیسیٰ سے بیشک معجزہ بڑھ کر ترا
ہے حرارت تیری آبِ زندگی سب کے لئے — تو ہے دن کے واسطے اور چاند ہے شب کے لئے
تیری ہی گرمی سے پھل آتے ہیں گل اشجار میں — لعل ہو جاتے ہیں پتھر دامنِ کہسار میں
تیرے ہی پرتو سے روشن ہیں یہ ذراتِ زمیں — تیری ہی گرمی سے اُٹھتے ہیں بخاراتِ زمیں
ابر بن کر پھر رہے ہیں یہ رحمت کی طرح — زر لٹاتے پھرتے ہیں اہلِ سخاوت کی طرح
باغِ دنیا سے خزاں جاتی ہے آتی ہے بہار — صحنِ گلشن میں ہزاروں گل کھلاتی ہے بہار
جلوۂ قدرت کی نیرنگی تجھی سے ہے عیاں — تیرے ہی باعث اُگلتی ہے زمیں گنجِ نہاں
صحنِ گلشن میں جو ہر گل شاہدِ طناز ہے — پردہ ہی پردہ میں تیرے سوز کا یہ ساز ہے
مشک شب ہو جاتا ہے کافور آتے ہی ترے — اور بن جاتی ہے ظلمت نور آتے ہی ترے
ماند ہے آگے ترے مہتاب و انجم کی چمک — نور ہے تیرا ہی بیشک چشمِ مردم کی چمک
تو نہ ہوتا تو یہ جلوے ہم کہاں سے دیکھتے — رنگ یہ اے نیرِ اعظم کہاں سے دیکھتے
شام کو ہے زرد چہرہ اور سحر کو لال ہے — کھول کر اُڑتا ہے پر تو مرغِ زریں بال ہے

گو ہمارے پاس تو ہے کروڑوں میل دور
پر ہے نزدیک اس قدر آنکھوں میں ہے تیرا ہی نور

موسمِ سرما میں ہے تو مفلسوں کا آسرا
دھوپ سے تیری انہیں سردی میں آتا ہے مزا

مہر ہے تو اک دہانِ روزہ داراں کے لئے
اک وسیلہ آمدِ ابرِ بہاراں کے لئے

جانِ مرغ و مور و ماہی روحِ جملہ کائنات
چشمۂ خورشید سے پاتے ہیں سب آبِ حیات

تیرا جلوہ دیکھنے کی تاب لا سکتا نہیں
رعب ایسا ہے کوئی آنکھیں ملا سکتا نہیں

کس کا جلوہ تجھ میں دیکھا اکبرِ ذیجاہ نے
سر جھکایا سامنے تیرے جو ایسے شاہ نے

پوجنے والے ترے کرتے ہیں تیری بندگی
کچھ تو ہی تجھ میں جو ہے یوں شوقِ سرافگندگی

ماہ داماں سے ترے یہ راز پوچھا چاہیئے
ہے یہ کس کے حسن کا انداز پوچھا چاہیئے

ہو یہاں مہمان اگر یہ نصیب اپنے کہاں
ہیں بروجِ آسماں بس تیرے رہنے کے مکاں

ہے کشش سے تیری قائم ایک مرکز پر زمیں
ورنہ گر پڑتی خدا جانے کہاں جا کر زمیں

ہے یہ آویزاں فقط تیری کشش کے تار پر
لے گئی گردش میں سبقت کوکبِ سیار پر

مثلِ مرکز بیچ میں تو دائرے میں خاص و عام
نام ہے دارالحکومت کا ترے شمسی نظام

کیوں مریضوں کو نہ تسکیں سحر کی دید سے
دل ٹھہر جاتا ہے تیرے کاسۂ تبرید سے

سر پہ سورج آگیا اے مست کچھ ہشیار ہو
خوابِ غفلت کب تلک اے دل اب تو بیدار ہو

ہے بہت کم جس قدر تعریف اسکی ہو رقم
دیکھ لے واصف اسے جس کا ہے یہ نقشِ قدم

واصف اکبرآبادی

"سیتا"

وہ نازوں کی پالی بڑے محلوں والی
وہ ماں باپ کی لاڈلی بھولی بھالی

وہ صورت کہ قدرت کے سانچے میں ڈھالی
حسینانِ عالم میں سج دھج نرالی

طبیعت کی سادی۔ نہ عادی ریا کی
مصیبت میں ہر وقت ساتھی پیا کی
وہ دانا مجسم۔ وفا کی وہ پتلی سراسر وہ تصویر فہم و ذکا کی
وسیرت میں بہتر وہ صورت میں اچھی وہی رام پیاری جنک[1] کی دلاری
وہی پاک طینت وہی صاف باطن
وہی جس کو کل تھی نہ پل بھر پیا بن
وہی جسکا سوئمبر[2] جنک نے رچایا وہی جسکے کارن ہر اک شاہ آیا
وہی رام نے جسکو لاکھوں میں پایا دھنش توڑ کر سب کو نیچا دکھایا
دیا تیری پرماتما رام پر تھی
ملی استری باوفا جس کو ایسی
وہ راون نے جنگل سے جسکو اڑایا وہ لنکا میں لیجا کے جسکو ستایا
وہ جسکو عتاب و غضب سے ڈرایا وہ جسکو پئے وصل راضی نہ پایا
وہ دھبہ سے دامن بچا لینے والی
وہ عصمت کی دیوی لقب پانیوالی
کہوں کیسے افسر کہ کیا چیز تھی وہ فرشتہ تھی یا تھی کوئی آدمی وہ
غرض پارسائی میں سچی رہی وہ پکارے گلے ہم سے یوں کہہ گئی وہ
کہ از جور گردوں بدل غم نیاری
اگر پاک ہستی چہ اندیشہ داری

حامد اللہ افسر (میرٹھی)

[1] سیتا کے پتا کا نام ہے۔
[2] سوئمبر یہ ایک رسم ہوتی تھی جسمیں شہزادوں کی مقررہ شرط کے پورا کرنیکے لئے لوگ جمع ہوتے تھے۔

نوٹس

اشیائے نشی حال ہی میں نواب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر نے اپنی دوران تقریر میں یہ فرمایا تھا کہ کچھ عرصہ سے پنجاب میں اور خاصکر اضلاع فیروزپور اور امرتسر میں مے نوشی کی عادت بہت بڑھتی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ اس عادت بد کی زیادتی کیوجہ سے جرائم اور دنگا فساد کی تعداد بھی اندیشہ ناک ترقی کرتی جاتی ہے۔ اور کہ اس خرابی کا باعث زیادہ تر شراب کی ناجائز کشید ہے۔

ہم نواب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر کے تہ دل سے مشکور ہیں کہ انہوں نے اس خرابی کی طرف توجہ دلائی اور ہمیں امید ہے کہ اسکے رفع کرنیکا خاطر خواہ انتظام کیا جاویگا۔ ایک ظاہر علاج تو یہ نظر آتا ہے۔ کہ افسران پولیس شراب کی ناجائز کشید کے انسداد کی پوری پوری نگرانی کریں۔ بہتر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں جب کہ شراب کھینچی جاتی ہے اوسیوقت اوس کے روکنے کی کوشش کیجائے۔ نہ کہ اوسوقت جبکہ وہ بالکل تیار ہو جائے اور دیہات کے جاہل اوسیوقت لوگ اوسکو پیکر طرح طرح کے جرائم کے مرتکب ہوں۔ دوسری تدبیر جسکو انگریزی میں Local option کہتے ہیں یہ ہوسکتی ہے کہ حاکم ضلع کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ اپنے علاقہ میں شراب کی دوکان بالکل نہ کھلنے دے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ پبلک مے نوشی کے سخت خلاف ہے پس ایسی حالت میں مناسب اور دور اندیشی یہی ہے کہ عادت مے نوشی کو روکنے کے لئے اس عام مخالفت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن بہترین تدبیر یہ ہے کہ ہر ایک مذہب کے سربرآوردہ لوگ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور ان لوگوں کا جو اپنے مذہب کے قواعد کے خلاف مے نوشی کریں قرار واقعی انتظام کریں۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں شراب پینا

ممنوع نہین ہے۔ ہر فرقہ مذہب کو لازم ہے کہ وہ اپنی نفرت مے نوشی کا اظہار اعلانیہ اس طور پر کرے کہ جو شخص دیدہ و دانستہ اس معاملہ مین اپنے مذہب کے قواعد کے خلاف ہے۔ اور اصلاح پر نہ آئے اس سے قطعی طور پر ملنا جلنا ترک کر دے۔ مگر سب سے مقدم تو یہ ہے کہ اسکول اور کالجون مین نوجوانونکو اس عام خرابی کے برے نتایج سے آگاہ کیا جائے۔ اور بتلایا جائے کہ اگر اس عادت منحوس کو روکا نہ گیا تو پنجاب کی کیسی ردی حالت ہو جائے گی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ گزشتہ چند سال سے مدراس پریسیڈنسی مین مے نوشی کی عادت بہت کم ہو گئی ہے۔ اور کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی کہ پنجاب مدراس سے اس امر مین کیون پیچھے رہے ہم سب کو بلکہ اس خرابی کے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ہمارے صوبہ کے لوگون مین پیدا ہو رہی ہے۔ ابھی تو اسکا آغاز ہے۔ اور آسانی سے اسکا تدارک ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اسوقت ڈھیل ڈالی گئی تو بعد مین یہ خرابی روکے نہ رکیگی ؎

چشم باید گرفتن بہ سیل
چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

یہ قابل غور ہے۔ کہ مدراس پریسیڈنسی کی آبادی گذشتہ دس سالہ (۱۹۰۱ء) مردم شماری کے مقابلہ مین بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ برعکس اسکے پنجاب کی آبادی باوجودیکہ Canal Colonies. مین لوگ جا کر رہنے لگے ہیں کم ہو گئی ہے۔ کیا یہ ممکن نہین ہے کہ پنجاب مین پلیگ اور ملیریا بخار کیوجہ سے جو اموات مین زیادتی ہونے لگی ہے اوسکی ایک وجہ کثرت مے نوشی بھی ہے۔ بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنی بے اعتدالیون کیوجہ سے کمزور ہو گئے ہین مرض کا ایسا مقابلہ نہین کر سکتے جیسا کہ ایک اعتدال پسند شخص کر سکتا ہے

گذشتہ دس سال میں جو کمی اشیائے منشی کے استعمال سے انگلستان میں ہوئی ہے وہ بہت تعجب خیز ہے۔ یہ کمی زیادہ تر سرگرم ٹمپرنس ریفارمرز کی کامیابی اور عوام میں تعلیم کے پھیلنے کا نتیجہ ہے۔ وہاں اشیائے منشی کے فروخت میں کمی ہونے کی وجہ سے ساٹھ کروڑ روپیہ کی بچت ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ کی نسبت سنہ ۱۹۱۰ء میں ۴۶۵۰۰۰۰۰ پونڈ کم خرچ ہوئے۔ اسکے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ یہ رقم کثیر جو اب خوراک اور کار آمد اشیاء پر صرف ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے اور بہت سے فائدے پہنچے ہیں مثلاً جرائم کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے۔ لوگ زیادہ فارغ البال ہیں۔ بچے پہلے کی نسبت اچھا کھاتے ہیں۔ اچھا پہنتے ہیں اور ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی نظر آتی ہے۔

کیا پنجاب انگلستان کی اور مدراس کی پیروی نہیں کریگا؟ کیا پنجاب کے حامیان ٹمپرنس زیادہ جوش زیادہ سرگرمی زیادہ ہمت سے کام نہیں کرسکتے؟ کام تو بیشک کرنیکے قابل ہے۔ ہمکو پرائمری تعلیم کے پھیلانے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ تعلیم ہی ایک ایسی قوت ہے جو ان خراب عادات پر جو کسی قوم میں پیدا ہو رہی ہوں غالب آسکتی ہے۔

مردم شماری

کمشنر صاحب مردم شماری نے اپنے تخمینۂ آبادی کو نہایت ہی قلیل عرصہ میں ختم کرلیا ہے۔ ہم اُسے امر تحقیق شدہ خیال کرسکتے ہیں کہ ہندوستان کی آبادی ۳۱½ کروڑ سے کم نہیں ہے۔ کیا کیا اور کتنے بیشمار خیالات یہ ہندسے ہمیں بتاتے ہیں؟ ذرا انہیں سے چند پر غور کریں۔ سب سے پہلے اسکے یہ معنی ہیں کہ ہر پانچ آدمیوں میں سے جو روئے زمین پر جنم لیتے ہیں۔ تقریباً ایک آدمی ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے لہذا انسانی ترقی کے لحاظ سے ہندوستان نوع انسان کا پانچواں حصہ ہے۔ اگر ہندوستان ترقی کریگا تو بنی آدم اسیقدر خوشحال ہونگے اور اگر ہندوستان تنزل کریگا تو بنی آدم اسیقدر خستہ حال ہونگے

پھر ذرا اہل ہند کی جہالت کی طرف نظر ڈالو۔ غالباً یہ کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا کہ ۳۰ کروڑ آدمی کو توکھنا پڑھنا بالکل نہیں آتا۔ گویا وہ تو ایسے ہیں جیسے کسی آدمی کو عمر بھر کے لئے قید خانہ میں بند کر دیا اور اوسکا کوئی چھڑانیوالا نہیں۔ ذرا ان توہمات کا، ان مصیبتوں کا اور ان تکالیف کا اور ان خرابیوں کا خیال تو کرو جو جہالت اور محض جہالت کی وجہ سے دکھائی دیتی ہیں! اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہندوستان میں اسوقت کسی چیز کی اشد ضرورت ہے تو وہ چیز تعلیم ہے۔

آخر میں ذرا اناث ہند کی مصیبت زدہ حالت کو بھی دیکھو۔ اسوقت انکی تعداد کو پندرہ کروڑ سے زیادہ ہے مگر انمیں سے ایک فیصدی بھی تو آپکو ایسی نہیں ملیں گی جو لکھ پڑھ سکیں۔ اونکی جہالت مردوں کی جہالت سے کہیں زیادہ ہے۔ انکی حالت مردوں کی حالت سے کہیں بدتر ہے۔ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں پلیگ اور ملیریا کے زمانہ میں عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت بہت زیادہ گھٹی ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ وہ بوجہ شادی صغیر سنی بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ علاوہ ازیں ہمیشہ پردہ میں محبوس رہنے کے باعث وہ تندرست اور مضبوط نہیں رہ سکتیں اور چنانچہ اونمیں سے بہت سی دائم المریض رہتی ہیں۔ کیا ہم اپنے آس پاس کے لوگوں اور خاص اپنے خاندان میں ان خرابیوں کا کچھ علاج نہیں کر سکتے؟

ہند کے صوبہ جات جہانکہ آبادی بڑھی ہے۔ صوبہ جات متوسطہ اور شرقی بنگال اور مدراس اور بمبئی میں بنگال تین فیصدی بڑھا ہے۔ صوبہ جات متحدہ ایک فیصدی گھٹے ہیں لیکن پنجاب میں سب سے زیادہ کمی ہوئی ہے۔ یعنی ڈیڑھ فیصدی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے صوبہ میں حفظ صحت اور تعلیم کی کس قدر ضرورت ہے اگر یہ دونوں باتیں یعنی حفظ صحت اور تعلیم ہمارے صوبہ میں اس حد تک مہیا ہوں جس حد تک وہ انگلستان میں ہیں تو بہت ممکن ہے کہ ہمارے صوبہ کا اندازہ اموات Death-rate جتنا اب ہے اسکا نصف رہجائے جالیں سی ہنڈرد فیز

چوہوں کا دفعیہ چوہوں کے دفعیہ کے لئے مدت سے بہت سے طریقے نکالے گئے چنانچہ بلی کا پالنا۔ بیشمار قسم کے چوہے دان مختلف قسم کے سمیات وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایک جدید طریقہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جو کہ غالباً ابتک چوہوں کے لئے آزمایا نہیں گیا ہے مگر ایک اور اسی قسم کے جانوروں کے دفعیہ کے لئے اسٹریلیا میں عمل میں آچکا ہے۔ اور بہت کارگر ثابت ہوا ہے۔

شاید ناظرین کو معلوم ہے کہ اسٹریلیا میں خرگوش انسانی بہبودی کے لئے ایک وبال ہیں جو کھیتوں اور باغات کو نہایت ہی نقصان پہونچاتے ہیں۔ چونکہ اسطرح انکی پیدائش بھی اس قدر کثرت سے ہوتی ہے۔ کہ باوجود مختلف طریقۂ دفعیہ انکی تعداد میں کوئی خاص کمی واقع نہ ہوئی۔ آخر ایک تدبیر یہ نکالی گئی کہ باغات کے اردگرد تار کے جال باندہ دئے گئے۔ لیکن ایک عجیب قدرت کا کھیل تبدیل حالات کے ساتھ ایک نرالا نوع خرگوشوں کا ایسا پیدا ہوا کہ جکے پنجے میں ایک بڑا انکس کی طرح مڑا ہوا ناخن نکل آیا جکو وہ جالی میں اٹکاکر تار کے گھیرن پہسے نکل بھاگنے کے قابل ہوئے۔

طلباء ڈارون ازم کو اس عجیب واقع کے حل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے یہ کوئی غیر معمولی کراماتی بات نہ تھی جیسے کہ بعض بعض مذہبی اشخاص ظاہر کرتے ہیں۔ جو کچھ ہوا وہ یہ ہے کہ ناخنوں کے انسیں ہیں ہونے سے جن جانوروں میں تار میں پنجہ اٹکاکر پھلانگ جانے کی قوت تھی وہی بچ گئے باقی سب انسان کا شکار ہوئے۔ لہذا اُن کی نسل بھی جنکے ناخن انکس دار تھے۔ اُن ہی کو زیادہ بچنے کا موقع ملا۔ حتی کہ ایک جدید نوع قائم ہوگیا۔

لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی حضرت انسان نے بھی ایک ایسا طریقہ نکالا کہ جس کا تجربہ زمانہ سلف میں کسی اور طریقہ پر انکو خود ہو چکا تھا۔ لیکن بیچارے خرگوش پر وہ عمل ایسے سند سے کیا جارہا ہے کہ خیال ہے کہ اب بیچارہ بالکل ہی معدوم ہو جائیگا۔ وہ کیا ہے ؟ خرگوشوں کو پکڑکر مادہ ضایع کردی جاتی ہیں اور نر چھوڑ دئے جاتے ہیں جس سے

اس قدر ہل چل مچتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے لڑ کر نسل کو برباد کر دیتے ہین۔
کیا چوہوں کے لئے یہ طریقہ آزمایا نہین جاسکتا۔

واہ رے مسلیتھس

خیر خرگوش اور چوہوں کے ذبیحہ کا تو طریقہ نکل آئیگا لیکن یہ ادنی پیدائش انسان کا علاج تجھہ ہی کو سوجھا۔ مگر افسوس کہ بعضوں نے تجھکو بھی بات کیا ہین خیال پڑتا ہے کہ تو نے یہ تجویز کی تھی کہ غربا جو اپنی اولاد کی معقول طرح سے پرورش نہین کر سکتے قانوناً شادی سے محروم کر دیے جائیں۔ اگر آج تو اس جراحی زمانہ میں پیدا ہوتا تو شاید تجھے ایک اور بھی عمدہ طریقہ پیدائش مدد کرنے کا سوجھتا۔ لیکن جیسے تیرے مجوزہ طریقے کو اُس زمانہ کی گورنمنٹ نے نہ پسند کیا تو اس زمانہ کی گورنمنٹ شاید جراحی طریقہ کو بھی پسند نہین کرتی لیکن ہمیں افسوس یہ ہے کہ تجھے خادم الدین ہو کر بھی خدائی طریقوں کا خیال نہین آیا۔ ہمنے سنا ہے کہ چند نوبیون نے طاعون و دیگر متعدی امراض حتیٰ کہ جنگ و جدل کو خدائی طریقہ مردم کُشی بتایا ہے۔ جو انسانی بہبودی کے لئے بالکل ضروری ہے۔ جب دھرتی ماتا پر بہت بوجھ ہو جاتا ہے تو وہ انہیں طریقوں سے اپنا بھار ہلکا کرتی ہے۔ نبیوں کے سامنے معمولی انسان کیا کہہ سکتا ہے۔ لیکن کیون جی اگر طاعون و جنگ و جدل خدائی طریقے ہوئے تو پھر کیون نہ انسان انکی مدد کرے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پیدا کنندہ کی یہ ہرگز منشا نہیں ہے کہ اس طرح سے بنی انسان ہلاک ہون۔ لیکن پھر اس سوال کا فیصلہ نہیں ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش اسکی معاشرت کے وسائل کے مقابلہ میں تیز رفتاری سے بڑھتی ہے۔ پھر آخر یہی ہوگا کہ کثرت آبادی سے ایکدن لوگ بھوکے مرنے لگیں گے۔ آج نہیں کچھ دن بعد۔ اسلئے نوبیون کا طریقہ ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کہ تھوڑا تھوڑا کرکے خدا کی دہائی دیکر مردم کُشی جاری رکھی جائے۔ اور جو طریقے امریکہ و اسٹریلیا کے قدیم باشندگان پر عمل میں لائے گئے ہین۔ وہی اگر قرینہ سے افریقہ و دیگر ممالک پہ جہان بن سکے اختیار کئے جائیں تو کیا حرج ہے۔ علاوہ دقتوں کے اسمیں ایک حرج ہے۔ آخر یہ جانوروں سے

تو بہت ہین۔ اگر سدہائے جائیں تو گاڑی کھینچنے بوجھ اٹھانے اور کھیت جوتنے مین بیلون سے تو اچھے ہی رہیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنے جانورون کے لئے چارہ کہان سے آئیگا۔ کہین سُنا ہے کہ جون جون انسانکی تمدنی ترقی ہوتی جائے گی اُسیقدر اس کی پیدایش کی قوت گھٹتی جائے گی۔ اسپر حضرت ہربرٹ سپنسر نے نباتی وحیوانی عالمونکی چھان بین کرکر بہت دلائل پیش کئے ہین۔ کہ جن نوع میں کسی قسم کی اپنی حفاظت کرنے کی خاص خوبی نہیں ہوتی ہے تو وہ تولید کی زیادتی سے اس کی کو رفع کرلیتے ہین۔ لیکن جون جون ارتقاع کی سیڑہیون پر چڑہتے جاتے ہین۔ اسیقدر پیدائش میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ بہت خوب۔ اسیطرح انسان میں بھی وحشی قومون میں جنکے پاس وسائل حفاظت کم ہین۔ اولاد کی زیادتی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان بھی ایک ایسا ہی وحشی ملک ہے۔ اسلیئے یہ نوع انسان بھی زیادتی پیدائش کے وبال میں مبتلا ہے۔ تمدن وشائستگی کے ساتھ یہ کم ہوجائیگا۔ پھر سوال چارہ کا بھی جاتا رہیگا۔ لیکن میں اس دلیل کو نہیں سمجھ سکا۔ میرے خیال مین تعلیم و تربیت سے انسانی تولید مین اسقدر فرق نہیں آسکتا جیسے کہ یورپ ودیگر ممالک کی اونچی ذاتون کی تمثیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ابھی تک کسی نے ثابت نہیں کیا کہ کھاتے پیتے لوگون کی اولاد کی کمی محض اُن کی اعلےٰ تعلیم وتربیت کا طبعی نتیجہ ہے ہم اپنے ملک پرست ہوسے اور نیز یورپ کی بابت معلومات جو کچھ ہمیں ہوئی ہیں اُن سے کہہ سکتے ہین کہ اس کمی تولید کی وجہ عیاشی ہے۔ نہ کہ اعلیٰ تعلیم۔

کہیں کہیں شائستہ دنیا مین اسی کی خاطر چند طبعی ومصنوعی کیمیائی وسائل کا سہارا ڈہونڈا گیا ہے۔[۱] ہمیں جہان تک معلوم ہوا ہے کہ یورپ میں بھی اعلیٰ تعلیم وتربیت کے نیک چلن اشخاص (مثلاً جماعت پادری) کی اولاد ہندوستانیون سے کم نہیں ہوتی۔ بلکہ ہندوستان میں افلاس اور دیگر قحط ووبائی امراض انسانی پیدائش کو گھٹا رہا ہے۔ لہذا محض تمدن وشائستگی سے اولاد کی کمی نہیں ہوسکتی۔

---

[۱] یہ میان مبلغس کے نام سے نامزد ہین!

البتہ تعلیم و تربیت سے اشیاء خوردنی و وسائل معاشرت لاانتہا بڑھائے جا سکتے ہیں اس لئے نوانبیاء سے التجا ہے کہ وہ بجائے طاعون کو خدائی ذریعہ انسانی بہبودی سمجھنے کے جہالت و افلاس کے دور کرنے پر بھروسہ رکھیں۔

نقل مکان ایک طریقہ سوال کثرت پیدایش کے حل کرنیکا یہ ہوسکتا ہے کہ کم آباد جگہوں مثلاً افریقہ و اسٹریلیا کے بعض حصوں میں ہندوستان کے لوگوں کو آباد کر دیا جائے سننے میں آیا ہے کہ ان ممالک کے بعض حصے ایسے گرم ہیں کہ سفید قومیں بہ آسانی زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ مشرقی افریقہ کے بعض حصے صرف ہندوستانی محنت و تجارت سے شائستہ زندگی کے قابل بنائے گئے ہیں لیکن وہاں بھی بیچارے ہندوستانیوں کو مساوی حقوق دینے میں کوتاہی کیجاتی ہے جنوبی افریقہ کے حالات سے تو ناظرین واقف ہونگے ہندوستانیوں کو سلطنت برطانیہ کے زیر سایہ سفید قوموں کے ساتھ اور ممالک میں آباد کرنے میں علاوہ فیصل سوال کثرت آبادی ایک اور فائدہ یہ ہے۔ کہ ہندوستانی سفید قوموں کو خاصکر جو ایک سلطنت کے باشندے ہیں اپنا بھائی سمجھیں گے۔ بشرطیکہ اُن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جائے۔ برعکس اسکے ہندوستانی جہاں جاتا ہے۔ وہاں ہی حقیر بنایا جاتا ہے بلکہ یہ سنتے ہیں کہ جاپان اور امریکہ کا سلوک اِن کے ساتھ مملکت کینیڈا۔ اسٹریلیا اور جنوبی افریقہ سے بمقابلہ بہتر ہے۔ تو اس سے کیا امید کیجا سکتی ہے۔ کہ ہندوستانی سلطنت برطانیہ کو پیدا ہ عزت دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ اونکو چاہئیے۔ ابھی موقع ہاتھ سے نہیں گیا ہے کہ ہندوستانی ہمیشہ کے لئے سلطنت برطانیہ میں یک جان کر لئے جائیں۔ لیکن وہ باہم حقوق کے تسلیم کرنے پر اور انسانیت کے برتاؤ سے ہو سکتا ہے صرف دباؤ سے ہرگز نہیں۔

عنقریب خوشخبری ملی کہ جنوبی افریقہ کی دقتیں کسیقدر رفع ہوئی ہیں گو کہ اب بھی بیاشندہ سلطنت برطانیہ کے سب بچوں کے حقوق مساوی نہیں رکھے گئے ہیں۔ "گمس"

اوم

رپورٹ وَیش وِدھوا سہایک سبھا پٹیالہ

(جسکا دفتر پریم دھام واقع کٹرہ مشروع دریبہ کلاں دہلی میں ہی)

سبھا کا آغاز

یہ سبھا ۴ فروری ۱۹۰۷ء کو بموقعہ وَیش کانفرنس انبالہ قائم ہوئی۔ اِس کا صدر مقام اُس وقت پٹیالہ قرار پایا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُن ایام میں اِس کے دو بڑے بانی و حامی اور ممتاز و لائق کارکن رائے بہادر لالہ گنگا رام صاحب و رائے جوالا پرشاد صاحب وہاں قیام فرما تھے لیکن راقم کی رائے میں آئندہ دہلی صدر مقام قرار دیا جائے تو مناسب ہے۔ اِس جلسہ میں رائے بہادر لالہ گنگا رام صاحب جو اُس وقت ریاست پٹیالہ میں چیف انجنیر تھے۔ پریسیڈنٹ اور رائے جوالا پرشاد صاحب جو وہاں اسسٹنٹ انجنیر تھے۔ سیکرٹری سبھا ہذا مقرر ہوئے۔ یہ تمام کارروائی مفصل وَیش ودھوا ہتکاری نمبر ۱ بابت ماہ اپریل میں شایع ہو چکی ہے۔ کچھ عرصہ بعد حسب فیصلہ جلسہ ہذا سبھا کے اغراض وقواعد وغیرہ بھی مرتب ہو گئے۔ جو کہ ماہ مئی کے ہتکاری نمبر ۲ میں شایع ہو چکے ہیں۔ لیکن مختلف وجوہات سے اکتوبر ۱۹۰۸ء تک کوئی عملی کارروائی نہیں ہوئی۔

(نوٹ) باجازت جناب لالہ امیر چند صاحب سکریٹری سبھا ہذا۔ ایڈیٹر۔

موجودہ سیکرٹری کا تقرر

ستمبر ۱۹۰۹ء میں صاحبان موصوف نے پٹیالہ میں سبھا ہٰذا کی کارکن کمیٹی کے ایک جلسہ میں راقم کو سیکرٹری مقرر کیا اور پٹیالہ یاد فرمایا۔ ۷ اکتوبر کو یہ احقر پٹیالہ گیا اور ایک رسالہ ماہواری جاری کرنے اور دھوا آشرم کے کھولنے وغیرہ کا فیصلہ ہوا۔ یہ سب کارروائی مفصل مئی کے رسالہ نمبر ۲ میں صفحہ ۵ و ۶ پر شائع ہو چکی ہے۔

اپریل ۱۹۰۹ء تک کام نہ ہونے کی وجہ

ناظرین رپورٹ ہٰذا اس موقعہ پر کسی قدر ذاتی ذکر کو معاف فرمائیں گے۔ اس اہم کام کو اپنے ذمہ لینے کی جرأت کی وجہ محض یہ ہوئی تھی کہ راقم ان ایام میں قیود ملازمت صیغہ تعلیم سے آزاد تھا۔ اور اس وقت پھر پابند ہونے کا کوئی وہم و گمان نہ تھا لیکن ادھر تو ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو پٹیالہ میں رائے جوالا پرشاد سے کاغذات سیکرٹری سنبھالے اور ادھر ۵۔ نومبر کو قریب دو ہفتہ کے بعد ہی ایک سخت محنت طلب اور ذمہ داری کا کام یعنی لوکل سنسکرت ہائی سکول کی ہیڈ ماسٹری کی خدمت سپرد ہوئی جسمیں ۲½ سال تک متواتر سخت مصروف رہنا پڑا اور ساتھ ہی ساتھ سوامی رام تیرتھ جی کے لیکچر انگریزی کی دو جلد بھی شائع کی گئیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ اپریل ۱۹۰۹ء تک سبھا کی کوئی خدمت بجا نہ لا سکا۔

رسالہ ونش و دھوا ہتکاری

اپریل ۱۹۰۹ء سے رسالہ ونش ودھوا ہتکاری دہلی جاری کیا گیا اور لالہ

چندولال صاحب چاول والہ نے راقم کی درخواست پر بطور جوآنٹ اعزیری ایڈیٹر مدد دینی منظور فرمائی چنانچہ نمبر ۱ کا ابتدائی مضمون انکا لکھا ہوا ہے۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء تک یہ رسالہ جاری رہا۔ ڈھائی سو کاپی اس پرچہ کی چھپتی اور شائع ہوتی ہیں خریداران و ہمدردان رسالہ کی تعداد بہت محدود رہی جیسا کہ حساب سے معلوم ہوگا مگر ۱۵-۲۰ اصحاب نے نہایت قدردانی ظاہر فرمائی اور جرأت و حوصلہ افزائی کی چنانچہ رائے بہادر لالہ نانک چند صاحب سی۔ آئی۔ ای دیوان ریاست اندور نے اسکی دو کاپیاں لینی منظور فرمائیں۔ مضامین نگاروں میں سے لالہ چاندنرائن صاحب نے حالانکہ وہ وَیش نہیں ہیں کئی مضامین بعنوان .. .. زندہ درگور۔ زندہ جاوید۔ زندہ بدست مردہ لکھے اور یہ مضامین نہایت پسند آئے اور انکی بڑی تعریف و قدر ہوئی لالہ کنج بہاری لال صاحب وَیش سکریٹری بدھواڑہ اشتہار ایک سبھا دہلی نے بھی ہر پرچہ میں خبروں وغیرہ سے مدد دی۔ لیکن ہمارے لائق دوست و مہربان لالہ چندولال صاحب چاول والہ جن سے راقم کو بہت امید مدد تھی۔ مختلف وجوہات سے بجز ایک مختصر مضمون کے کسی قسم کی مدد نہ دے سکے۔ اور دیگر اصحاب سب کمیٹی وغیرہ میں سے بھی کسی نے کسی قسم کی امداد نہ دی۔ اور اگر دی تو بہت کم۔ مضامین کی کمی۔ سیکریٹری سبھا یا ایڈیٹر رسالہ کی سخت عدیم الفرصتی۔ اور جس مطبع میں یہ چھپتا تھا اسکا بند ہوجانا۔ اور نئے جدید پریس ایکٹ کا اجرا۔ بڑی وجوہات اس رسالہ کے بند ہونے اور دوبارہ جاری نہ ہونے کی ہوئیں۔

اپدیشک کی کوشش

دوسرا بڑا کام جو سوچا گیا اور جسکی متواتر نہایت کوشش کیگئی ہے اور کیجارہی ہے کسی اپدیشک کا تجویز کرنا ہے جو سبھا کے اغراض و مقاصد کا پرچار کرے اور اگر ممکن ہو

تو بھجن منڈلی کے ہمراہ بالخصوص ودّش جاتی کی توجہ اسطرف دلائے اس غرض سے ایدیشک کیلئے پنجابی۔ ٹریبیون۔ لیڈر۔ آریہ پترکا۔ ایڈوکیٹ وغیرہ اخبارات میں وقتاً فوقتاً نوٹس دیا گیا۔ اور ۲-۳ اشخاص یا درخواست کنندوں سے خط و کتابت بھی کی گئی حتےٰ کہ ماہ اگست سنہ ۱۹۰۹ء کے ہتکاری میں یہ نوٹس دیدیا گیا تھا کہ اس سبھا کو اب ایدیشک کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پنڈت کشن لال صاحب ناگر کو بالفعل سبھا نے ایدیشک مقرر کیا ہے اور وہ عنقریب کام شروع کرنیوالے ہیں بھجن منڈلی کا بھی انتظام کیا گیا۔ مگر پنڈت صاحب سخت بیمار ہو گئے اور کام شروع نہ کر سکے اور کوئی مناسب۔ لائق شخص مشاہرہ منظور شدہ بجٹ یا اس سے کسی قدر زیادہ رقم پر بھی دستیاب نہ ہوا۔ لالہ کنج بہاری لال و رتی شنکر لال جی وغیرہ کئی اصحاب نے اس بارہ میں کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ راقم کی رائے میں سبھا کے کام میں بغیر کم از کم ایک ایدیشک کے کامیابی بہت مشکل ہے اور اس لئے اس موقعہ پر تمام حامیان و ہمدردان ودھوا وواہ و سرپرستان سبھا سے التماس ہے کہ وہ کوئی ایدیشک تلاش و تجویز کرنے میں جلد مدد دیکر ممنون فرمائیں۔ اُپدیشک کا سنسکرت داں اور شاستروں سے واقف اور نیک چلن ہونا ضروری ہے ساتھ ہی متواتر سفر کی شقت کے قابل۔ مستعد۔ سچا ہمدرد۔ اچھا سپیکر اور دیانت دار ہونا بھی لازمی ہے۔

ودھوا آشرم

اگست سنہ ۱۹۰۹ء میں دہلی میں ایک ودھوا آشرم کھولنے کی تجویز ہوئی اور اس میں قریب کامیابی ہوتی نظر آتی تھی۔ مگر پھر مختلف وجوہات سے یہ تجویز رہ گئی اور اسمیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ گو یہ کوشش ودھوا سہائک سبھا دہلی کیطرف سے تھی مگر اسکی ناکامیابی دہلی میں بالفعل ایسے کام میں مدد اور سہایتا کی کمی کا کافی ثبوت ہے۔ یہ تجویز سبھا ہذا کے پہلے سالانہ جلسہ میں ہوئی تھی جو ۲۹-۳۰-۳۱ اگست سنہ ۱۹۰۹ء کو ہوا۔ اس جلسہ کی مفصل روداد گزشتہ ماہ اکتوبر کے ودّش ودھوا ہتکاری پرچہ نمبر ۷ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس موقعہ پر شہر دہلی

میں ۳ روز تک برابر ودھوا پرچار ہوتا رہا اور فخر پنجاب لالہ لاجپت رائے صاحب اور دیگر کئی لائق پنڈتوں اور اپدیشکوں نے بہت اچھے اچھے اپدیش اور ویاکھیان دئے اور جلسے بڑی رونق اور کامیابی سے ہوئے۔

جلسہ

اسکے علاوہ ایک اور جلسہ بھی اس سبھا کی طرف سے دہلی میں ماہ ستمبر ۱۹۱۱ء ہوا۔ چونکہ سیکرٹری دہلی میں موجود نہ تھا اسکا کل انتظام لالہ بیج ناتھ پرشاد صاحب سکرٹری ودھوا سہایک سبھا کی معرفت ہوا۔ اور ۳ روز تک متواتر جلسے ہوئے۔

ودھوا دواہ

۱۹۰۹ء و ۱۹۱۰ء میں خاص دہلی میں ودھوا سہایک سبھا کی کوششوں سے کئی دواہ ہوئے اور دکش جاتی میں بھی ایک دواہ کامیابی سے ہوا۔ چونکہ راقم اس سبھا میں عموماً شریک ہوتا رہا اور کچھ نہ کچھ حصہ لیتا رہا ہے اور دونوں سبھاؤں کے کئی عہدہ دار یا ممبر مشترک ہیں اسلئے اس سبھا کی کارروائی کا بھی موقعہ بموقعہ ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان دواہوں کو مصلحتاً اور دانستہ زیادہ شہرت نہیں دی گئی۔

ایک معزز ویش کا ودھوا سے دواہ

فروری ۱۹۱۲ء میں دہلی کے ایک معزز ویش اگروال بھائی کی شادی بمقام آریلی ایک ودھوا سے ہوئی اور دہلی سے کئی صاحب ویش اسمیں شامل ہوئے اور خود دولہا کے تایا چچا وغیرہ برات میں شریک ہوئے۔ راقم بھی اسمیں خاص طور پر شریک ہوکر صلاح مشورہ دیتا رہا اور جو کچھ خدمت ہو سکی بجا لایا۔ خیال تھا کہ دہلی میں اس شادی کے بعد کچھ مخالفت یا کوئی جھگڑا ہو مگر نہیں ہوا

عام رائے کا اندازہ

اب یہ امر صاف ظاہر ہو گیا کہ گو ابھی تک شادیوں کی تعداد زیادہ تر بوجہ کمی جرأت بہت کم ہے لیکن جو کرتے ہیں انکی چنداں مخالفت نہیں ہوتی بلکہ ودھوا دواہ کی تحریک کے ہمدرد اور پسند کرنیوالوں کا شمار رفتہ رفتہ زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ بھی ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی تعداد جو ودھواؤں سے شادی کرنیکے لئے تیار ہیں زیادہ ہوتی ہے لیکن ودھوائیں نہیں ملتیں۔ اسکی بڑی وجہ پردہ کا رواج اور عورتوں کا تعلیم یافتہ نہ ہونا بھی ہے۔ موجودہ حالت میں جب تک کہ کسی ودھوا کے قریبی رشتہ دار ہی ہمدرد نہ ہوں خود کوئی ودھوا کچھ

نہیں کر سکتی نہ اُن تک کسی سبھا کا کوئی عہدہ دار یا اُس کا لٹریچر پہنچ سکتا ہے۔

نئے وواہ کی امید

دہلی میں اسوقت ایک معزز و شریف دَش اگروال خاندان کی ۱۴ سالہ بیوہ جسکا گونہ بھی نہیں ہوا اور جو شادی کے صرف ۶ ماہ بعد بیوہ ہو گئیں اُنکے پتا اُسکے وواہ کیلئے تیار ہیں لیکن ہیں کسی دَش سے شادی کرنا چاہتے ہیں امید ہے کہ عنقریب مناسب تجویز ہو کر کامیابی ہو۔ فقہ مرد تیار ہیں اور انکے لئے بدھواؤں کی تلاش ہے

نمائشگاہ الہ آباد کے موقعہ پر پرچار کا انتظام

سال گذشتہ اکتوبر میں سوتی شنکر لال جی کیساتھ یہ انتظام کیا گیا کہ جو ٹریکٹ بدھواؤں کے متعلق نمائشگاہ کے موقع پر شائع کرنے کے لئے چھپوائے گئے تھے اُنکی ۵۰۰۰ کاپیاں اس سبھا کی طرف سے بھی شائع کر کے تقسیم کر دیجائیں لیکن مختلف دقتوں کے سبب سوتی جی اس رسالہ کے شائع کرانیکا انتظام نہ کر سکے۔

رسالہ زبان دہلی کے ساتھ انتظام

ڈاکٹر بی کے مترا صاحب مالک و منیجر رسالہ زبان دہلی بھی ودھواؤں کے سچے ہمدرد ہیں اور وہ ہماری سبھا کی کارروائیوں میں بہت دلچسپی اور نمایاں حصہ لیتے رہتے ہیں آپنے پریسیڈنٹ صاحب رائے بہادر لالہ گنگا رام صاحب سے سنہ ۱۹۱۰ء میں خط و کتابت کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۱۱ء سے سبھا ہذا کی طرف سے رسالہ کے ۲ صفحوں میں مضامین متعلق حمایت و ہمدردی بیوگان و نوٹس وغیرہ چھپکر ممبران سبھا میں شائع ہونیکا انتظام علی شرائط پر ہوا اور جنوری فروری و مارچ کے پرچوں میں کچھ مضامین چھپے بھی مگر یہ انتظام بھی بالفعل عمدہ ثابت نہیں ہوا اور جو مضامین طبع ہوئے وہ سبھا کے اغراض و مقاصد کے مطابق نہ تھے

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء سے جہانتک کثرت مشاغل اور گرد و پیش کے حالات نے اس کام کی وقتوں نے اجازت دی کم و بیش کوشش اور کام ہوتا رہا ہے اور اسوقت بھی ہو رہا ہے گو ودھواؤں اور ودھواؤں کی عام حالت کی بہتری کے کاموں میں بالفعل اکثر مدت تک بہت آہستہ رفتار لازمی ہے جبتک عورتیں قیود پردہ سے آزاد اور تعلیم یافتہ ہو کر مردوں کی طرح خود مختار نہ ہو جائیں اور انکی تمام ترقی کا دارومدار مردوں ہی پر رہیگا یہ سست رفتار لازمی ہے کیونکہ مردوں کے خیالات میں بھی گو تبدیلی ہو رہی ہے مگر بہت آہستہ تعلیم کی ترقی کی رفتار پر خیالات کی تبدیلی منحصر ہے ابھی تک تعلیم یافتہ جماعت کے دائرہ میں بھی خیالات کی تبدیلی اور اُس

جرأت اخلاقی کی بہت کمی ہے۔ جو تمام اصلاحوں میں عملی کارروائیوں کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

آئندہ کام راقم کو اب پہلے کی بہ نسبت زیادہ فرصت ہوتی ہے اور امید ہے کہ اب زیادہ وقت توجہ سبھا اور اس کے کام کی طرف دیا جائیگا اور ہر سال باقاعدہ رپورٹ مع حساب کتاب شائع ہوا کریگی نیز دیگر ذرائع کامیابی بھی استعمال کئے جائینگے۔

حساب کتاب سبھا کا حساب کتاب شروع سے اب تک شائع کیا جاتا ہے۔ سبھا رائے بہادر لالہ گنگا رام صاحب سپرنٹنڈنٹ انجینئر و پریسیڈنٹ سبھا کی کمال مشکور و ممنون ہے کہ وہ برابر ۲۵ روپیہ ماہوار کی امداد فرما رہے ہیں اور اسی فیاضانہ امداد کا نتیجہ ہے کہ یہ سبھا اسوقت کم از کم ایکسال کے لئے ایک اپدیشک اور بھجن منڈلی نوکر رکھنے کیلئے بالکل تیار ہے۔ جن دیگر اصحاب نے کم و بیش امداد اور حوصلہ افزائی کی ہے سبھا انکی بھی مشکور ہے اور دیگر اصحاب سے امداد کی ملتمس ہے۔ جو رقم سیکرٹری کی تحویل میں ہے وہ فی الحال ایک اپدیشک اور بھجن منڈلی کے ایکسال کے خرچ کیلئے کافی ہے اور چونکہ اپدیشک تجویز کرنے کی کوشش برابر جاری ہے اور رسالہ دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے اسلئے کسی بنک میں جمع نہیں کی گئی ہے۔

اظہار رنج سبھا کی طرف سے اس رپورٹ میں اس دلی رنج و ملال کا احاطہ تحریر میں لانا بھی میرا فرض ہے جو کل دوسر برادری کے معزز لائق و مشہور ممبر لالہ چندولال صاحب رئیس حصار کے بے وقت گذر جانے پر تمام برادری کو ہوا ہے۔ آپ بھی اس سبھا کے مربی اور سرپرست و محسن تھے اور سبھا کو ان سے مدد کی قوی امید تھی۔ آپکی جرأت اخلاقی۔ ہمدردی عملی نمونہ اصلاح اور تمام رفاہ عام کے کاموں میں دلچسپی کسکو معلوم نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپکے پسماندگان بالخصوص لالہ ہری لال صاحب ولد چندولال صاحب کی طرح اس سبھا سے ہمدردی رکھیں گے۔

جو اصحاب دوسر ودھوا ہتکاری دہلی کے پچھلے پرچے منگوانا چاہیں وہ مہربانی فرما کر راقم کو لکھیں اور تمام خط و کتابت وغیرہ راقم کے نام سے بہ پتہ ذیل ہونی چاہیئے۔

امیر چند

آنریری سیکرٹری دوسر ودھوا ودواہ سہایک سبھا پٹیالہ پریم و دھام
کترہ مشرو ع۔ دریبہ کلاں دہلی۔ ۲۳ مئی سنہ ۱۹۱۱ء

تفصیل حساب آمد و خرچ دنش ودھواودھاہ سہایک سبھا پٹیالہ
جس کا دفتر پریم دھام دہلی میں ہے

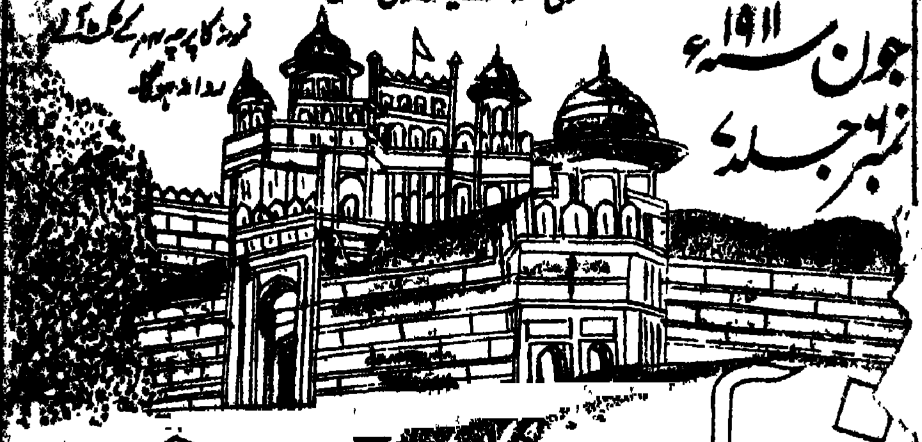
رقم	خرچ	رقم	آمد
[illegible]	(۱) رسالہ دنش ودھوا ہتکاری از اپریل لغایت اکتوبر ۱۹۱۰ء بہ تفصیل ذیل اپریل مئی جون جولائی چھپائی اسٹامپ چھپائی اسٹامپ چھپائی اسٹامپ چھپائی اسٹامپ اگست ستمبر اکتوبر چھپائی اسٹامپ چھپائی اسٹامپ چھپائی اسٹامپ	[illegible]	چندہ ماہواری رائے بہادر لالہ گنگارام صاحب سی۔ آئی۔ ای پریسیڈنٹ سبھا از ماہ اکتوبر ۱۹۱۰ء لغایت مئی ۱۹۱۱ء بحساب ۲۵ روپیہ ماہوار
[illegible]	بابت مضامین شائع شدہ رسالہ ہذا زندہ در گور، زندہ جاوید و زندہ بدست مردہ	۲۵	عطیہ از لالہ رام رتن صاحب شملہ برائے ایڈیتیک فنڈ
[illegible]	(۲) اشتہارات برائے ایڈیتیک فنڈ وغیرہ ۱۹۱۰ء اخبار پنجابی لاہور، اخبار آکاش دہلی	[illegible]	عطیہ از لالہ سیوک رام صاحب لائل پور
[illegible]	(۳) کوئی رسالہ جو مختلف وجوہات سے چھپا ہیں۔	[illegible]	عطیہ از لالہ بیجناتھ صاحب سیر منشی انبالہ
[illegible]	(۴) جلسہ ماہ ستمبر معرفت لالہ بیجناتھ پرشاد صاحب سیکرٹری ودھوا سہایک سبھا دہلی مع سفرخرچ و خرچ قیام ایڈیتیک	[illegible]	عطیہ از لالہ موتی لال صاحب جینی دہلی
[illegible]	(۵) خرید سوانح عمری بیدات ایشور چندر ودیا ساگر جلتی مانا دیے دیکھ رسالجات متعلق ودھوا ودھاہ	[illegible]	عطیہ از سیٹھ کرپا شنکر صاحب دہلی
[illegible]	(۶) چندہ ایک سال انڈین سوشیل ریفارمر بمبئی	[illegible]	عطیہ از لالہ جوتی پرشاد صاحب دنش اگروال بموقعہ شادی بمقام ملسے بریلی
[illegible]	(۷) کرایہ ریل سفر خرچ سیکرٹری بمقام پٹیالہ ماہ اکتوبر ۱۹۱۰ء	[illegible]	آمدنی از چندہ و فروخت دنش ہتکاری
[illegible]	(۸) رسیدی ٹکٹ بابت چندہ ماہواری پریسیڈنٹ صاحب	[illegible]	میزان
[illegible]	(۹) اسٹامپ خط و کتابت		
[illegible]	(۱۰) سٹیشنری		
[illegible]	(۱۱) اشتہارات برائے ایڈیتیک وغیرہ اخبار پنجابی لاہور، ٹریبیون۔ آریہ پتریکا ۱۹۱۱ء		
[illegible]	(۱۲) اشتہارات برائے ایڈیتیک و لیکچرار وغیرہ اخبار ٹریبیون لاہور و لیڈر الہ آباد ۱۹۱۱ء		
[illegible]	(۱۳) بابت مضامین بعنوان حمایت بیوگان و اشتہار متعلق سبھا و ایک شادی کے متعلق رسالہ زبان ماہ جنوری فروری ۱۹۱۱ء		
[illegible]	(۱۴) متفرق		
[illegible]	کل میزان		
[illegible]	بقایا در تحویل سیکرٹری و خزانچی		

رجسٹرڈ ایل نمبر ۹۲۳

دلی قلعہ معلےٰ یا اردو کی ٹکسال

جون سنہ ۱۹۱۱ء
نمبر ۶ جلد ۷

نمونہ کا پرچہ ۳ کے ٹکٹ آنے پر روانہ ہوگا



زبان
دہلی

ایڈیٹر نازک رقم اکبرآبادی

فہرست مضامین

زبان پریس دہلی میں چھپا

THE "ZABAN" DELHI.



Hon Pt Madan Mohan Malavya.

زبان
آپ بیتی

سال رواں ختم ہونے سے پہلے ناظرین رسالہ زبان اور دیگر شائقین اُردو علم ادب کو اپنے دُکھ کی کہانی سُنانے کا صرف یہ مُدعا ہے کہ ہم عنقریب اِس رسالہ میں ایک اہم تبدیلی کرنے والے ہیں یا اس سے گویا اسکی کا یا پلٹ ہو جائیگی۔ اسلئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکی وجہ بالتفصیل آپ صاحبان کے سامنے پیش کیجائے۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں اس رسالہ کو میرے ایک عزیز دوست لالہ چندو لال صاحب چاولہ نے محض زبان اُردو کی خدمت اور ملک میں جدید علم کا چرچا پھیلانے کے لئے جاری کیا چند ہی دن میں اس نے بہت شہرت حاصل کی۔ اور ہندوستان کے مشہور مشہور نامہ نگاروں نے اپنے بیش بہا خیالات کلام سے اسکو ممتاز کیا لیکن آمدنی کے لحاظ سے اسکو بڑی ناکامیابی ہوئی جیسے کہ نئے کام میں ہوا کرتی ہے لہذا سنہ ۱۹۰۵ء میں تین اور اشخاص نے جن میں سے ایک خاکسار بھی تھا اِسکے بار نقصان کو اُٹھانے کی ذمہ داری لی۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ علاوہ علم ادب اِس میں سائنس اور سوشیل مضامین بھی شامل کئے جائیں۔ زبان کے لحاظ سے ایک جدت پیدا کرنے کی کوشش کیگئی کہ اُردو کو حتی الامکان تاہم لغات سے بری کرکے دلّی کی روزمرہ گفتگو کے زبان کی پوشاک پہنائی جائے۔ لیکن بدقسمتی سے اسی سال مائل صاحب ایڈیٹر زبان کے خانگی مصائب کیوجہ سے رسالہ بد انتظامی رہی کہ سنہ ۱۹۰۶ء کے اختتام تک اسکے تمام خریدار اس سے دست بردار ہوگئے حتی کہ اسکے سرپرستوں میں سے بھی دو صاحب نے اسکو خیرباد

لکھ دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا سنہ ۱۹۱۲ء میں رسالہ کو جاری رکھا جائے یا نہیں۔ ظاہر تھا کہ اسکے جاری رکھنے میں کوئی مالی فائدہ کی اُمید نہ تھی۔ لہذا صرف انہی دو وجوہات کو نظر رکھکر کہ یہ زبان اُردو میں اپنے رنگ کا ایک ہی رسالہ ہے اور دوئم اسکا مدعا قومی خدمت ہے اسلیئے اِسکو ایک سال اسی اُمید پر چلایا گیا کہ پبلک رسالہ نویسی کے اِس جدید آئیڈیل کی یعنی زبان عام فہم اور مضامین مفید مطلب ہونے چاہئیں رفتہ رفتہ داد دیگی۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہوا شائقین اُردو رسائل زیادہ تر رنگین مضامین ہی کو پسند کرتے ہیں مگر ان کی خاطر ہم اپنی پالیسی تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔ ہم اب بھی یہی دعوے کرتے ہیں کہ جو رسالہ اتنا عام فہم ہو کہ ہر صنف میں اُردو جاننے والے اسکا لطف اُٹھا سکیں وہی اُردو کا سچا خادم ہے اور مضامین کے لحاظ سے اگر رسالہ پر اپنے گل و بلبل کی فضولیات کی بجائے کوئی کار آمد بات نہ پیش کرے تو وہ پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ ہم انہی دونوں اُصول پر اب تک کاربند رہے۔ لیکن آئندہ زبان کی سادگی پر اور بھی زیادہ زور دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ اور بھی وسیع کیا جاسکے۔ حتیٰ کہ خواندہ مستورات و طلباء بھی اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ دریں وجہ یہ لازمی ہوا کہ پولیٹیکل مضامین اسمیں سے بالکل نکال دیئے جائیں۔ لہذا آئندہ اِس رسالہ میں زیادہ تر سائنس و دیگر متفرق مضامین علاوہ پولیٹکس نہایت سلیس زبان میں شائع ہوں گے۔ اور چونکہ سرکار کا بھی آجکل یہی منشا ہے۔ کہ طلباء کو بجائے پولیٹکس کے کسی اور قسم کی تفریح بخش دماغی غذا ملے۔ اس لیئے امیدوار ہیں کہ صیغۂ تعلیم کے معزز ممبران اِس کار خیر میں امداد دیکر اس رسالہ کے ذریعہ سے گورنمنٹ کی مرضی کے موافق دلچسپ لٹریچر پیدا کرنے میں کوشاں رہیں گے۔

بی۔ کے۔ متھرا۔ منیجر۔

قانونِ کرم کی تشریح

کرم کا مسئلہ ہندوستان میں پُرانے زمانے سے چلا آتا ہے اور اسقدر عام ہے کہ ان پڑھ سے ان پڑھ بھی اسکی سچائی پر یقین کرتے ہیں۔ گو اکثر لوگ اِسکے اصلی معنوں سے بالکل بے بہرہ ہیں۔

ہندو شاستروں میں یہ مسئلہ ہر پیرائے میں نہایت خوبی کے ساتھ حل کیا گیا ہے لیکن اور مذاہب بھی اِسکے ایک حد تک قایل معلوم ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہاں یہ اعتقاد ہے کہ ہر ایک شخص اپنی قسمت لیکر پیدا ہوتا ہے۔ اور عیسائی مذہب والے بھی ایک حد تک اِس کے پیرو ہیں۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ سورگ کی بادشاہت ہمکو اِس جنم کے نیک کرموں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ اس بات کے قایل نہیں کہ اسی طرح ہمارا یہ جنم بھی پچھلے کرموں کا نتیجہ ہے۔

سائنس میں کرم کے قانون کا نام **کازیشن** ہے۔ اس قانون کے مطابق ہر ایک نتیجہ اپنے سبب میں سے ڈھلتا ہوا چلا آتا ہے۔ اور کوئی چیز بغیر سبب کے وقوع نہیں ہو سکتی، یہ کرم کا قانون جمادات۔ نباتات۔ حیوانات۔ اور انسان کے تمام جسمانی دماغی و اخلاقی طبقوں میں یکساں کام کرتا ہے۔ سائنس والوں نے اِسکو مختلف مقامات پر مختلف ناموں سے پکارا ہے۔ اور چونکہ یہ قانون قدرت ہے۔ اسلیئے اِسکو کوئی توڑ بھی نہیں سکتا ہے اسی قانون سے تمام دنیا پیدا ہوئی۔ اور تمام تفرقات کا باعث بھی قانونِ کرم ہے اس وقت ہم اس مسئلہ کو صرف انسانی پہلو سے حل کرنے کی کوشش کرینگے۔ کیونکہ ہر پہلو سے اسکا حل کرنا اس چھوٹے سے مضمون میں بالکل ناممکن ہے۔

ہندو شاستروں کے بموجب نجات اور بندش انسان کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے

بودھ بھگوان فرماتے ہیں۔ کہ انسان آزاد ہے وہ اپنے کرموں کے مطابق اپنی مصیبت کا بانی اور اپنے ہی کرموں سے نجات کا حاصل کرنے والا ہوتا ہے۔ انسانکو نجات حاصل کرنیکے لیئے کسی خاص شخص کی جھنڈے برداری کی ضرورت نہیں۔ اور نہ اسکو کسی خاص چیز یا شخص پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ وہ اس قانون کو پہچانے تاکہ وہ اسکی رہبری کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کے یہاں مذہب کے لئے جس معنی میں کہ ہم آج کل اسے استعمال کرتے ہیں۔ کوئی خاص لفظ نہیں ہے۔

ہندو لفظ دھرم استعمال کرتے ہیں۔ اور چونکہ دھرم ہمیشہ کرم کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اور ہر ایک انسان کا اپنا کرم اپنے ساتھ ہے۔ اسلیئے ہر ایک شخص کا کرم اسکا اپنا دھرم ہوا۔ ہندوؤں کی سوسائٹی اور انکے رسم و رواج اسی قانون قدرت کے مطابق قایم کئے گئے ہیں جنمیں سے ہر ایک کا آگے چلکر کچھ ذکر کیا جائیگا۔

کرم کے اصل معنی کام یا فعل کے ہیں لیکن کوئی فعل اپنے نتیجہ سے جدا نہیں ہوا کرتا ہے۔ یعنی ہر ایک چیز یا سبب کا نتیجہ اس چیز یا سبب کے اندر ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لیئے کرم اور پھل ایک ہی معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو کوئی آرام یا تکلیف پہنچتی ہے تو بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اسکا کرم ہے۔ لیکن کرم کوئی ایسا قانون نہیں جو ہم کو یہ حکم دیتا ہے کہ یہ کرو یا وہ کرو بلکہ اگر ایسا کروگے تو ایسا ہوگا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اپنی زندگی کا سدھارنا یا بگاڑنا انسان کے اپنے ہی قابو میں ہے۔ ہر ایک شخص کا موجودہ کیرکٹر بھی اسکے پچھلے افعال کی بدولت ہے اور آیندہ کا موجودہ کوششوں کے مطابق سمجھنا چاہیئے۔ موجودہ نتائج پرانے کرموں کا نتیجہ ہیں اور موجودہ کرم آنے والی تقدیر کو بنا رہے ہیں۔ اسی قانون کا نام سائنس میں کازلٹی (Causality) ہے یعنی کہ کوئی قدرت میں چیز یکایک واقع نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا کوئی سبب پیشتر سے نہ ہو۔ یہ قانون تمام دنیا پر حاوی ہوتا ہے

اس لئے اس قانون کے مطابق انسان کے موجودہ کرم بھی اس کے پچھلے کرموں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ایسا کہنے سے تو گویا ہماری آزادی بالکل غارت ہو جاتی ہے یہاں پہ **فری وِل** کا بہت ہی پیچیدہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہماری قوت ارادی کسی کام کرنے کے لئے آزاد ہے یا نہیں یہ مسئلہ یورپ میں ابتک حل نہیں ہو سکا ہے۔ دقت یہ ہے کہ اگر یہ مانا جائے کہ ہم ہر وقت ہر کام کرنے کے لئے آزاد ہیں تو قانون میں کوئی روکنے کی قوت نہیں رہتی اور اگر ہماری وِل فری نہ ہو تو کوئی شخص بھی اپنے فعل کا ذمہ دار نہیں ٹھیرتا۔ اصلیت میں ہماری وِل بالکل فری ہے کیونکہ آتما خود فری ہے۔ لیکن ہمنے اپنے آپ کرم کے تانے بانے سے اپنے کو جال میں پھنسا لیا ہے۔ جسمیں سے نکلنا بہت دشوار ہے۔ ہماری وِل اپنے تئیں آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے میں ہر وقت کوشاں ہے۔ لیکن ہمارا کوئی بھی کرم کسی خاص موقع پہ خاص حالتوں کے درمیان ویسا ہی ہوگا جیسا کہ اس خاص وقت کے کیرکٹر کے بموجب ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے کرم ہماری قوت ارادی کو ڈھک لیتے ہیں۔ اور اسکے ظاہر ہونے میں مانع ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ کیرکٹر بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ اسلئے ہماری ذمہ داری برحق ہے۔ اور قانون کی قوت بھی قائم رہتی ہیں درمیانی **پوزیشن** کے اختیار کرنے سے فری وِل کا سوال بہت آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم اگر اپنے خاص کرموں کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنا کیرکٹر ہی اس فعل کے موجب جیسا کہ ہم ہونا چاہتے ہیں تبدیل کر دینا چاہیئے یہ ہم بہت آسانی سے کر سکتے ہیں کیونکہ کوشش کرنے کے لئے ہم ہر وقت آزاد ہیں کوشش کرنے سے خاص موقع پہ کامیابی حاصل ہوگی یا نہیں یہ ہماری کوشش یا پچھلے کرموں پہ مبنی ہے۔ اور جتنی جتنی ہم ترقی کرتے جاتے ہیں۔ اتنی اتنی ہی ہماری قوت ارادی اپنے تئیں زیادہ آزاد ظاہر کرتی ہے۔ اور انتہائی درجے میں یہانتک

کہ ہمارا کوئی فعل بھی قدرت کے خلاف نہیں جاتا۔ کیونکہ ہماری دل قانون قدرت کے ساتھ ایک ہو جاتی ہے۔

قدرت کے قانون ہر چہار طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک قانون دوسرے قانون کو مدد بھی دے سکتا ہے۔ اور رکاوٹ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن کاٹ ہرگز نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک پتھر جو ہم پہاڑ کے اوپر سے لڑھکاتے ہیں نیچے پھسلتا ہوا چلا آتا ہے۔ لیکن وہ فوراً رک جاتا ہے جبکہ دوسرا پتھر اوسکو آڑ کر دیتا ہے۔ اسیطرح انسان میں نفرت کا خیال محبت کے خیال سے رد کیا جا سکتا ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قانون دوسرے قانون کو کس طرح سے نرم گرم کر سکتا ہے اور ہم اُن کے جاننے سے کس قدر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ علم ہی طاقت ہے۔

اسیطور پر ہم اپنے پچھلے کرموں میں اپنی نئی کوششوں سے وہ نئی طاقت کے بموجب تبدیلیاں واقع کر سکتے ہیں۔ پس لوگوں کا یہ عذر کہ کرم کا مسئلہ ہم کو سست و کاہل وجود بناتا ہے محض لچر و پوچ ہے۔ برعکس اسکے یہ قانون ہمکو سکھلاتا ہے کہ کس طرح ہم اپنے آپ کو کام کرنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔ تاریخ بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ کرم کے ماننے والے کسی طرح بھی کاہل وجود نہیں ہوتے شری شنکر اچاریہ و گوتم بدھ جیسے بزرگوں نے اس قانون کی روشنی پھیلاتے ہوئے یہ دکھلا دیا کہ کسطرح سے اسکا جاننے والا ایک سچا کرم یوگی بن سکتا ہے۔ کرم کا قانون قدرت کا قانون ہے۔ اس لئے اسکے خلاف گفتگو کرنا گویا قانون قدرت سے منکر ہونا ہے۔

کوئی فعل بغیر خیال کے وقوع میں نہیں آسکتا۔ خیال کی ظاہری شکل کا نام فعل ہے جو خیال کے نزدیک زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ وہی کارگر ہو جاتا ہے۔ اور ہر ایک خیال

بعد اپنے گزرنے کے کچھ نشانات دماغ کی نرم سطح پر ڈال جاتا ہے۔ جسکے ذریعہ سے ہم اُس خیال کو پھر اپنے روبرو پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن کوئی خیال کبھی غارت نہیں ہو سکتا ہے۔ پلیٹو نے بھی خیال کو ایک این ٹی ٹی (Entity.) مانا ہے۔ ہندو شاستروں کے مطابق چت آکاش میں حرکت کا نام خیال ہے۔ جسم کے فوت ہونے کے بعد چت آکاش ہماری آتما کے سنگ ہی رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے کرم بھی غارت نہیں ہوتے اور ہم اپنے کرموں کے مطابق مرتے یا جیتے ہیں پس ہم کو اپنے خیالات کی نسبت بہت زیادہ ہوشیار ہونا چاہیئے کیونکہ من بھاونا روپ ہے جیسا ہم سوچتے ہیں اُسی روپ ہم ہو جاتے ہیں۔

حالانکہ کوئی خیال کبھی مٹ نہیں سکتا لیکن ہم اُسکی ہیئت اور بہتر خیال کے ذریعے سے تبدیل کر سکتے ہیں مگر جیسا کچھ کہ کرم کیا ہے اُسکا پھل ضرور ہی بھوگنا پڑیگا۔ کرم اپنی قوت کے مطابق اپنا اثر ضرور ڈالیگا۔ گو ہم دوسرے قسم کے کرم سے اُس کے مطابق دوسرا اثر پیدا کرنے کے لئے ہر وقت طاقت رکھتے ہیں۔

کرم دو قسم کا ہوا کرتا ہے۔ ایک ذاتی دوسرا مجموعی۔ دوسرے قسم کا کرم قومی ملکی کرموں وغیرہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور پہلی قسم کا کرم جسمانی دماغی اخلاقی وغیرہ میں۔ پہلے قسم کے کرم میں تو ہماری ہی کوشش سے کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ لیکن دوسرے قسم کی گھٹ بڑھ میں اور لوگ بھی اُس قدر حصہ لیتے ہیں جس قدر کہ ہمارا اُن سے تعلق ہے۔

ذاتی کرم کے بوجھ کو کوئی دوسرا شخص نہیں ہٹا سکتا۔ کیونکہ اسکے اچھے یا بُرے نتیجہ سے ہم کو اپنا تجربہ حاصل کرنا ہے۔ بغیر تجربہ حاصل کئے ترقی ناممکن ہے۔ اور تجربہ بغیر خود بھوگے ہو نہیں سکتا۔ اسلئے ہر شخص کو ترقی کرنے کے لئے اپنا اپنا کرم بھوگ

لازمی و درست ہے پس کرم ہم کو سکھلاتا ہے کہ ہمیں ہر ایک مصیبت سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اسی لئے تو بہتا تما لوگ مصیبت پڑنے میں زیادہ خوشی کرتے ہیں کیونکہ یہی ترقی کا راز ہے۔

اس مقام پر اکثر لوگ یہ عذر کرتے ہیں کہ اگر ہم دوسروں کو اُن کی تکلیف میں مدد پہونچاتے ہیں تو ایسا کرنے سے ہم اُن کے کرم میں بیجا دخل دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ تکلیف اُن کے اپنے ہی کرم کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس قانون کے مطابق ایک شخص کو دوسرے کی مدد کرنا بالکل بے واجب ہے۔ میرے خیال میں یہ عذر ہی بالکل غیر واجب ہے۔ ہم کو کرم کے قانون سمجھنے کے لئے زیادہ غور کرم کے نتیجوں پر دینی چاہیئے۔ کیونکہ ہم کو قانون سے ابتک پوری پوری واقفیت نہیں ہوئی ہے اُن کو یہ فرض کر لینے کا کیا اختیار حاصل ہے کہ جب ہم مدد کرتے ہیں تب ہم قانون کو توڑتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ جب ہم مدد نہیں کرتے تب ہم قانون کو توڑتے ہیں۔ کسی کی مدد کرنا یہ ہمارا اخلاقی کرم ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دوسروں کی مدد کریں۔ ایسا کرنے سے کرم ہمکو ہرگز نہیں روکتا۔ یہ اگر گردہ الا عذر کہ اگر ہم مدد کریں یا اگر ہم نہ کریں؛ کرم پر عاید نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ کرم تو جب ہی بنیگا کہ جب آپ ایسے کریں گے۔ ہمارا مدد کرنا ہی کرم کے تعلق کو ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے مدد کا کرنا ناممکن ہے۔ مدد کی کمی یا بیشی زیادہ تر پچھلے اور موجودہ کرموں کی طاقت پر مبنی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تمام رکاوٹوں کو دُور کریں اور فرض انسانی میں کوتاہی نہ کریں۔ کرم اپنی نگہبانی آپ کرتا ہے۔ کوئی شخص اس قانون قدرت کے توڑنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اگر ہم دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ یہ کافی ثبوت ہے کہ اُسکا کرم خاتمہ پر ہے۔ علاوہ اس کے یہ عذر کرنے والے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہر ایک شخص اوروں کے کرموں کا ایجنٹ ہوا کرتے ہیں

اور ساتھ ہی اسکے اپنے کرموں کا بھوگنے والا ہوتا ہے یہ کرم کا اصلی اُصول ہے اور اس غلط فہمی کو آسانی سے دُور کرسکتا ہے۔

اِن تمام دلائل سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالنا چاہیئے کہ ہم دوسرے کو اُس کے بوجھ سے قطعی طور سے ہلکا کرسکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان کی ترقی کا میعار گرجاتا اور کرم کے نہ ماننے سے انسان اپنی طاقت کو بھول جاتا۔ لیکن ہم ایک دوسرے کی کس طرح سے مدد کرسکتے ہیں۔ اسکے لئے ایک مثال فرض کرلیجئے۔ کہ کوئی شخص اپنے سر پر لکڑیوں کا بوجھ لئے چلا جاتا ہے۔ ہم اس بوجھ سے اُسکو بالکل توبری نہیں کرسکتے کیونکہ ایسا کرنے میں ہمارا جو دھرم ہے وہ کون کریگا۔ لیکن ہم اتنا ضرور کرسکتے ہیں کہ ہم تمام راستے اُس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلے جاویں۔ تاکہ راستہ اُس کو آسانی سے کٹ جائے۔

پس اِن تمام نتائج سے یہ ثابت ہوا۔ کہ دنیا میں ہر ایک شخص کو ترقی کرنی ہے اور اصل معراج کو حاصل کرنا ہے۔ یہ کرم کے قانون کا اعلےٰ اُپدیش ہے اسلئے ہم کو اپنے چھوٹوں سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم بھی اسی درجے پر تھے۔ اور ایک زمانہ وہ آئیگا کہ یہ بھی پوری ترقی کو حاصل کرینگے۔ کیونکہ یہ قانونِ کرم ہے۔ اسلئے ہم کو ہمیشہ پرشارتھ سے کام لینا چاہیئے۔ اور یہی ہم کو کرم بھی سکھلاتا ہے۔

بہت سے لوگ یہ عذر بھی پیش کرتے ہیں کہ جب سب کچھ کرم ہی سے ہے تو پرارتھنا و دعا وغیرہ سب فضول ہیں۔ لیکن دعا تو ایک اچھا کرم ہے۔ جسکا نتیجہ آپ اچھا ہے۔ دعا کا بڑا بھاری فایدہ یہ ہے کہ ہم شخصیت کی بندش کو توڑ کر آتما کی غیبی قوت کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ کرم یوگی یہ نہیں مانتا کہ پرماتما کہیں علیحدہ بیٹھا ہوا ہمکے گناہوں کو بخشتا یا سزا دیتا ہے۔ سُورج نہ کسی کو روشنی دیتا ہے اور نہ کہیں سے ہٹاتا ہے

اُس کی شکتی تمام میں یکساں کام کر رہی ہے۔ جو اس چشمۂ فیض کے قریب پہونچتے ہیں اپنے آپ کو سیراب کرتے ہیں۔ پرماتما کے لئے سب یکساں ہیں کیونکہ وہ سب سے بلند ہے پرماتما نے کوئی چیز ہم سے پوشیدہ نہیں رکھ چھوڑی ہے کہ جس کو وہ ہمیں دیتا ہے۔ اس نے سب کچھ ہم کو بخشدیا ہے جسطرح ہم چاہیں استعمال کریں اور ویسا ہی نتیجہ پاویں۔ پرماتما ہم سے اپنے لئے دعا کی خواہش نہیں رکھتا جب ہم دعا کے ذریعے اپنی آتما کے قریب پہونچتے ہیں تو دوئی کا پردہ ہٹتا جاتا ہے اور ہم کو اپنی قوت کا خزانہ ملجاتا ہے جس سے کہ ہم اپنی مدد کرتے ہیں۔

ہر ایک کرم کا پھل لازمی ہوتا ہے۔ کوئی کرم اپنے آپ ناش نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح دعا کے ذریعے سے بھی ہم اونچی بلندی پر پونچہ جاتے ہیں۔ اور پچھلے کرموں کے آیندہ نتائج میں لگاتار کوششوں سے تبدیلی واقع کرسکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کے آیندہ کرم بھی درست ہوتے جاتے ہیں۔

بہت سی دعائیں ہماری اپنی غرض کے لئے ہوتی ہیں۔ ان نام کی دعاؤں سے یہ کہنا چاہیئے کہ ہم پرماتما کو نہیں بلکہ اپنی ضروریات اور خواہشات کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن قانونِ کرم کا جاننے والا پرماتما کو پوجتا ہے اور پھل کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ پرارتھنا کرتا ہے۔ کہ سخت سے سخت مصیبت پڑنے پر بھی وہ پرماتما کو نہ بھولے۔ ایسا شخص ہر ایک تکلیف و مصیبت کو واجب قرار دیتا ہوا شانتی سے برداشت کرتا ہے۔ ایسی دعائیں ہم پرماتما کی شکتی کا پورے طور سے یقین کرتے ہیں۔

اور جانتے ہیں کہ ہم اُسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اُن خودغرضانہ دعاؤں کا بھی اتنا پھل ملجاتا ہے جتنا کہ ہماری دعا کا ہمنتانہ ملنا چاہیئے۔ کیونکہ ان میں بھی بڑی قوت کا اثر لیا ہوا ہے۔ یہ دعائیں بھی ایک حد تک ہمارے خیال کو بلندی پر پہنچاتی ہیں۔

لیکن چونکہ ہمارے خیال ہی میں سب طاقت ہے۔ اسلئے یہ کہنا کہ دعا میں طاقت نہیں بالکل غلط ہے۔ اس واسطے کرم اور دعا میں کوئی تفاوت نہیں۔

تجربہ اس بات کو بتلاتا ہے کہ مجموعی کرم بھی ہوا کرتا ہے۔ اور ذاتی کرم اس سے علیحدہ ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص باہر گیا ہوا تھا۔ اور اوسکے گھر میں پیچھے ایک حادثہ ہو گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اُسنے سُنا کہ اُسکا لڑکا چھت پر سے گر پڑا تھا۔ اور اب اچھا بھی ہو گیا ہے۔ اِس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص تمام فیملی کے کسی خاص کرم میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اِس غم سے بھی بچا۔ بہت سے اشخاص ہمیں ایسے ملتے ہیں جن سے قدرتی طور سے ہمیں اُنس ہوتا ہے اور اکثر لوگوں سے خواہ مخواہ نفرت معلوم ہوتی ہے۔ جس کی کوئی بھی وجہ نہیں انگریزی زبان میں انسان کے اِس خاصہ کا نام اُسکی Idiosincracy ہے۔ لیکن اِسکی کوئی وجہ نہیں تبلائی گئی۔ کہ یہ کیوں ہے۔ ہر ایک کرم کے قانون ماننے والے کو دوسرا جنم لازمی طور سے ماننا پڑے گا۔ مرنے کے بعد کرم واسنا رُوپ ہوکر ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ اس Idiosincracy کو ہم پچھلے جنم کے کرموں کے مطابق آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔

ایک اور بات قابل غور یہ بھی ہے۔ کہ ہم کو پرانی کمزوریوں کو اُسی وقت تک سوچنا چاہیئے۔ جب تک کہ ہم اُن سے کوئی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اُن کا ہر وقت کا خیال میں رکھنا بہت خطرناک ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ہم اُن خیالات کو تقویت پہونچاتے ہیں۔ اسلئے بجائے اسکے کہ ہم اپنی کمزوریوں کو بار بار دُہرائیں۔ ہمکو اپنی قوتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ بجائے اِس کے کہ یہ خیال مدنظر رکھا جائے کہ میں گنہگار ہوں وغیرہ وغیرہ یہ خیال ہونا چاہیئے کہ میں بالکل پوتر و شدھ ہوں۔ کسی قسم کا عیب مجھ میں نہیں ہے اور جو کچھ عیب

ہم اپنے جسم میں پاویں۔ اُسکے برخلاف نیکی کے خیال کو غالب رکھیں تاکہ برائی کمزوری ہم میں سے دُور ہو جائے۔

سارے کرم کے قانون کا لُب لباب یہ ہے کہ جو شخص کسی کے لیے جیسا سوچتا ہے ویسا اُس کے ہی لئے پہلے آن موجود ہوتا ہے۔ اسلئے جیسا برتاؤ ہم اپنے لئے ہونا چاہتے ہیں ویسا ہمکو اوروں کے لئے بھی کرنا چاہئیے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کرم کی بندش سے نجات کیونکر حاصل ہو۔ اچھا کرم کرنے کا نتیجہ اچھا اور بُرے کرم کا بُرا۔ اچھے کرم سے آرام اور بُرے سے مصیبت حاصل ہوئی۔ لیکن بندھن تو نہیں چھٹا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی انسان کرم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِسلئے کرم کی زنجیروں کو ہم کرم کرنے ہی سے کاٹ سکتے ہیں یعنی کرم کرتا ہوا بھی اپنے لئے نہ کرے۔ کیونکہ جو کرتا ہے وہ بھوگتا ضرور ہوگا۔ اِس لئے تمام کرم پرماتما کے ارپن کردے۔ تاکہ اسکا پھل اُسکو نہ باندھ لے۔ ایسا کرنے سے ہم کرم کی قیود سے نکلکر کرم کرتے ہوئے اپنی آزادی کو حاصل کرتے ہیں۔ کرشن بھگوان گیتا جی میں فرماتے ہیں۔

جو کرے سو میری خاطر جو دھرے میرے لیئے
سادگی میں میرا عاشق کیا غضب ہوشیار ہے

ہمارا آتما کچھ نہیں کرتا ہے۔ کرنا کرانا جیو کے تعلق بدھی تک ہے۔ آتما تو گیان روپ ہے اسلئے جو کچھ کرم بھی انسان کرے سبکو کرشنا ارپن کردے۔ اور اُس کا آسرا لیوے۔ مہاراج پھر فرماتے ہیں۔

ترک کر سب ملتیں لے مجھ اکیلے کی پناہ
یہ میرا ذمہ ہے ارجن تیرا بیڑا پار ہے

جس وقت تک انانیت قائم ہے اسوقت تک آزادی لازمی ساتھی پڑے گی اِس لیئے

ذمہ واری بھی بڑتی ہے۔ لیکن جس وقت پندار کا پردہ ہٹ گیا تو صاف دیدار ہے وہاں نہ کوئی کرتا ہے اور نہ کرم ہے۔ اور نہ کریا ہے۔ کیونکہ وہاں دوئی کا تو نام و نشان ہی نہیں ہے۔

کرم کا قانون اپنا کام ہمیشہ کئے جاتا ہے۔ خواہ ہمکو اس سے واقفیت ہو یا نہ ہو لیکن ہمکو اس قانون کو جاننا چاہئیے تاکہ ہم اس سے پورا فائدہ اٹھا سکیں ہندو شاستروں میں انسان کے کرموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) سنچت

(۲) پراربدھ

(۳) پرشارتھ

سنچت کرم وہ پچھلے منضبط کرم ہیں جو بغیر بھوگے رہ نہیں جاسکتے ہماری غلس جنکی پیدائش وغیرہ کو یہی کرم مقرر کرتے ہیں۔ پراربدھ کرم وہ کرم ہے جسکو کہ ہم اب بھوگ رہے ہیں۔ بعض دفعہ سنچت اور پراربدھ ایک ہی معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ سنچت پراربدھ کا وہ حصہ ہے جسمیں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ لیکن پراربدھ میں ہم ایک حد تک تبدیلی واقع کرسکتے ہیں پرشارتھ وہ کرم ہے جو ہم اب کر رہے ہیں جسکا نتیجہ ہمکو آگے جاکر ملیگا۔ جسکی بدولت ہم اور کرموں میں تبدیلی واقع کرسکتے ہیں۔ اس تقسیم سے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ یہ تینوں علیحدہ علیحدہ کرم ہیں بلکہ کرم تو ایک ہی ہے۔ جو لگاتار کام کر رہا ہے۔ صرف یہ اسکے مختلف پہلو دکھلائے گئے ہیں۔

اگر کوئی شخص باوجود بہت کوشش کرنے کے بھی کسی بات میں کامیابی حاصل نہ کرسکے تو بجائے اسکے کہ ہم اُس کو حقیر سمجھیں ہم کو اوسکی مدد کرنی چاہئیے تاکہ وہ دگنی کوشش سے ان کرموں کو جو اسکی ترقی میں مانع ہیں دُور کرکے

جلدی ترقی حاصل کرے۔ جتنی زیادہ بار ہم ایک کام کے حاصل کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ اتنی ہی ہم ترقی حاصل کرتے جاتے ہیں گو ایک موقع پر ہم ترقی حاصل بھی کر سکیں تب بھی ہمنے موجودہ کوششوں سے آیندہ کے لئے ترقی کا دروازہ کھولدیا ہے۔ افسوس کے لائق صرف وہ شخص ہے جو ہر طرح کے موقع پاتا ہوا بھی کوشش نہیں کرتا۔

تقدیر و تدبیر دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ تقدیر و تدبیر کی نسبت رتھ کے دو پہیوں کی مثال دی گئی ہے۔ اس لئے کرم ہم کو تقدیر کے یہ معنی نہیں بتلاتا کہ ہم تدبیر نہ کریں۔ بلکہ کرم ماضی حال مستقبل تینوں زمانوں کے کرموں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ وہی انسان ترقی نہیں کر سکتا جو پچھلی ناکامیابیوں پر ہمیشہ کف افسوس ملتا رہتا ہے۔ اور ہاتھ پیر کچھ نہیں ہلاتا۔ اس لئے مبارک وہ انسان ہیں جو پچھلی ناکامیابیوں کو بھول کر ہمیشہ شانتی کے ساتھ پُر جوش کرم کرتے ہیں۔ پس کرم کا قانون ہمارے اندر ایک قوت کا خزانہ کھولدیتا ہے جسکے ملجانے سے ہم مالا مال ہو جاتے ہیں۔

جسطرح سے کہ نجت کرم ہماری پیدائش کو مقرر کرتے ہیں۔ اسیطرح پر ہمارے پچھلے کرم موت کے وقت کو بھی مقرر کر دیتے ہیں۔ گو ہم اپنے موجودہ کرموں سے ایک حد تک اُس اصلی وقت میں تبدیلی واقع کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس جنم میں بُرے کرموں سے اپنی عمر کو کم کر دے تو اُسکو پچھلے کرم بھوگنے کے لئے اور جنم لینا لازمی امر معلوم ہوتا ہے۔ خودکشی کر لینے سے انسان کرموں سے نجات نہیں حاصل کر سکتا ہے۔

اکثر لوگ یہ عذر کرتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو ہمیں مجرم کو سزا ہرگز نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ اُسنے بھی تو کسی کرم ہی سے قتل کیا ہوگا۔ شاید یہ

لوگ یہ بھول جاتے ہیں۔کہ کرم کا نیا سلسلہ قائم کرنے کے لئے انسان ہر وقت قوت رکھتا ہے۔ یہ عذر بھی پہلے عذر سے ملتا جلتا ہے اسلئے اسکے جواب میں بھی ہم وُہی دلیلیں پیش کر سکتے ہیں۔

کرم کا قانون بروئے سائنس و عقلی دلایل و اخلاقی رو ہر طور پر درست ثابت ہوتا ہے (۱) بروئے سائنس۔ بہت سی مثالیں ایسی موجود ہیں جنکو یورپ کے ایوولوشن دان (Evolutionists) ابھی تک نہیں سمجھا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک پاگل کے یہاں ایک عقلمند جیو کا پیدا ہونا یا بالکل معمولی لوگوں میں ایک بڑے Genius کا پیدا ہونا جیسے کیٹس وغیرہ۔ یا ایک جینٹس کے یہاں Ge-nius. کا پیدا ہونا۔ جیسے مِل کے یہاں مِل جیسا لڑکا پیدا ہونا۔ سائنس کی رو سے بھی Genius باپ سے بیٹے کو نہیں گزر سکتی ہے علاوہ اسکے خود Ge-nius کا پیدا ہونا ہی اُسکی ماضی ترقیوں کی دلالت ہے بغیر پچھلے جنم کے ایسا ہونا بالکل ناممکن تھا۔ بعض لوگ اسکے جواب میں Heredity. کے مسئلہ کو پیش کرتے ہیں لیکن *Heridity* خود قانونِ کرم ہے۔ اِس کا صرف اتنا کام ہے کہ یہ جیو کے لئے اُسکی قوتوں و پچھلی ترقیوں کے مطابق ویسا جسم و دماغ تیار کر دیتی ہے۔ اور کسی شخص کے یہاں خاص جیو کا پیدا ہونا ہی کرم کی بندش سے ہے اسلیئے یہ مسئلہ کسی طرح بھی کرم کے قانون میں رکاوٹ نہیں ڈالتا اور برعکس اسکے اس قانون کی مدد کرتا ہے۔

ہندوؤں کے یہاں ذات کا اصول بھی کرم کے قانون پر مبنی ہے۔ براہمن کرم سے ہوتا ہے۔ نہ کہ جنم سے۔ لیکن اگر ہر ایک ذات کا آدمی اپنے ذات کے مطابق کرم کرے۔ اور اُسی دھرم کا پالن کرے۔ تو کسی خاص گھرانے میں ویسے ہی کرم کرنے کی قابلیت رکھتا ہوا جیو پیدا ہوگا۔ جیسا کہ اُس خاندان میں ہونا چاہیئے۔

اِس اصول کے مطابق براہمن کے یہاں ہمیشہ وُہی جیو پیدا ہوگا جو اپنے کرموں سے اِس زندگی میں براہمن بن سکتا ہے۔ آج کل جو براہمن کے یہاں ایک ایسا جیو پیدا ہوتا ہے جسکے کرم شودر کے ہیں تو زیادہ مثالوں میں اسکی وجہ یہ ہے کہ اُس براہمن فیملی کے کرم شودر کے ہیں۔ اسی طرح اور ذاتوں میں سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اِس ذات کے اصول کے یہ معنی ہرگز نہ سمجھے جائیں کہ ایک ذات دوسری ذات سے اونچی ہے۔ تمام اعضا بلکہ ہمارے جسم کو بناتے ہیں اور ایک کی بہبودی دوسرے کی درستی پر مبنی ہے اِس لئے نفرت کا خیال کرم کے خلاف ہے کیونکہ وہ جیو جو آج شودر ہے ایک زمانہ میں ضرور براہمن بن سکتا ہے۔ ذات انسان کے مختلف ترقی کے درجوں کو دکھلاتی ہے۔ ذات کا اصُول محض سہولیت کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ تاکہ ہر ایک شخص نہایت آسانی سے ترقی حاصل کرے اور ایک دوسرے کی ترقی میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ اِس اصول کے مطابق کرم کے قانون کو پہچاننے کے لئے اور اپنی اور دوسروں کی بہبودی کے لئے تعلیم یافتہ و ترقی کی ہوئی جماعت کا یہ لازمی فرض ہے کہ وہ جاہل اور گری ہوئی جماعتوں کو تعلیم دیں اور اپنے درجہ تک پہونچائیں۔

پس کرم کے قانون کے مطابق ہندوستانیوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اُن جاتیوں کو جو غلطی سے اچھوت شمار کیجاتی ہیں تعلیم و تربیت کے ذریعے اونچے درجے پر پہونچائیں۔ اونمیں بھی اُن کی ترقی کے درجے کے مطابق بہت سے برہمن اور کھتری جیو ہونگے جنکی ترقی میں ہم نے ابتک رکاوٹ ڈالی اور جسکی ذمہ داری ہماری گردن پر ہے۔ کوئی انسان اپنے آپ ترقی نہیں کرسکتا کیونکہ کوئی شخص شروع ہی سے بالکل علیحدگی اختیار نہیں کرسکتا۔ اِس کرم کا ذکر ذاتی اور مجموعی کرم کا تعلق دکھلاتے ہوئے بھی بیان کیا گیا ہے۔ کرم کا قانون اپنا کام ہر جگہ کرتا ہے ہم نے اپنے بھائیوں کی اپنے ملک میں حقارت کی اسلئے ہماری غیر ملکوں میں بے عزتی ہوئی

ہندوؤں کے تمام کرم کانڈ فلاسفی کرم ہی کے اصول پر قائم ہے۔ زندہ جیووں کو اپنی کوششوں سے گزرے ہوئے جیو ونکو ہوتن بشرادہ۔ ترپن وغیرہ کے ذریعے اپنے خیال۔ وآن یا قوت ارادی سے ہم مدد کر سکتے ہیں۔

۲۰ عقلی دلائل بھی کرم کے قانون کی شہادت دیتے ہیں۔ دنیا میں جو یہ تمام تفرقات ہیں اسکا کیا باعث ہے تفرقات کہاں سے پیدا ہوئے یہ سب کرم ہی کے اختلاف کا تو باعث ہے۔

۲۱ اگر ہم اخلاقی رُو سے نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہم کو کرم کے کارنامے صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک فقیر ہے اور ایک امیر۔ ایک اندھا ہے اور ایک کوڑھی۔ ایک اچھے کرم کرتا ہوا بھی اسوقت مصیبت میں ہے اور دوسرا عیب کرتا ہوا بھی اسوقت آرام کر رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے بچے پیدا ہوتی ہی مرجاتے ہیں۔ یہ مثالیں ہماری سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک کہ ہم قانون کرم کی ہستی پر پورا بھروسہ نہ رکھیں۔

بعض لوگ ان باتوں کی طرف توجہ دینا بھی گناہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ لیکن یہ اُن لوگوں کی سخت غلطی و کمزوری ہے خدا نے ہم کو عقل سلیم بخشی ہے۔ کہ ہم اُسکو پہچانیں۔ ایسا نہ ماننے میں ہم خدا کی طاقت کو محدود کرتے ہیں۔ اور علم کی ہستی سے منکر ہوتے ہیں جو درحقیقت سخت گناہ ہے۔

کرم کا قانون ٹھیک بہت وسیع قانون ہے۔ اسمیں بہت سی باریکیاں ایسی ہیں جو سردست ہماری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ جو غلطیاں ہم اس قانون کے سمجھنے میں کرتے ہیں وہ غلطیاں اس قانون میں نہیں ہیں بلکہ ہماری ادھوری واقفیت کی وجہ سے ہے۔

اس مضمون کو چاہے جس حد تک طول دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم اس وقت

اِس کے فوائد دکھلا کر اِس مضمون کو بند کرتے ہیں۔

(۱) یہ قانون ہمکو صبر عطا کرتا ہے۔ جو کچھ سزا یا جزا ہے۔ ہمکو ملتی ہے ہمارے ہی کرم کا نتیجہ ہے۔ اسلئے واجب اور درست ہے۔ اصلیت میں سزا یا جزا کوئی چیز نہیں یہ تو ہمارے ہی بنائے ہوئے نام ہیں کیونکہ کرم اور پھل یکساں و برابر کام کر رہے ہیں۔ ایسا جاننے سے ہماری کام کرنے کی قوت ہمیشہ بحال رہتی ہے اور ہم ہمیشہ ترقی کرتے جاتے ہیں۔

(۲) اِس قانون کے منصفانہ برتاؤ پر جب ہم بھروسہ کرتے ہیں تو ہماری کمر ہمت کبھی نہیں ٹوٹتی اور ہم میں ہمیشہ شانتی کی لہریں موجیں مارتی رہتی ہیں۔

(۳) اِس قانون کی بدولت ہم اپنی قوت پر بھروسہ رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قسمت کا بنانا یا بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہے اور اپنے اندر قوت محسوس کرکے دوسروں کا سہارا چھوڑ کر خود کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

(۴) اِس قانون کے سمجھنے سے ہم ہر ایک کرم نہایت سوچ وچار کے کرتے ہیں اور من زبان و فعل تینوں میں یکساں برتاؤ رکھتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اِس قانون کے مطابق جیسا آدرش ہم اپنے سامنے رکھیں گے ویسا ہی نتیجہ ہمکو فوراً ملیگا۔

(۵) اِس قانون کی وجہ سے۔ ہر ایک شخص اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ میرا اپنے لئے و تمام دنیا کے لئے کیا فرض ہے۔ جسکے پورا کرنے میں وہ کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتا۔

(۶) اِس قانون کے سمجھنے سے ہمکو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ کس قسم کا کرم کرنے سے ہمکو نجات حاصل ہوتی ہے۔ اور بیج بوتے وقت ہم یہ خواہش نہیں رکھتے کہ اِس کے پھل سے ہم کو ذاتی فائدہ حاصل ہو۔ بلکہ اِس کا پھل تمام دنیا کے لئے مفید ثابت ہو ایسی ہماری عادت ہی بن جاتی ہے۔

پس کرم ہم کو سکھلاتا ہے۔ کہ ہم پرشارتھ کریں۔ دیوی بھاگوت میں لکھا ہے کہ کرم ہی سے اندر اور کرم ہی سے گنیش کی پدوی ملتی ہے اور کرم ہی سے تمام دیوتا ہیں کرم ہم کو سکھلاتا ہے کہ ہم پرماتما کی سچی محبت کریں۔ اور اپنی خود غرضی کے خیالات ترک کریں۔ سینٹ پال نے کہا ہے کہ خدا کو کوئی شخص دھوکا نہیں دے سکتا کیونکہ جو شخص جیسا بوئیگا ویسا کاٹیگا۔ اسلئے ہم کو ہمیشہ نشکام کرم کرنا چاہیئے اور آپس میں ہمدردی و محبت اختیار کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں ہم اپنے آپ اور دوسروں کو سدھارتے ہیں۔ کرم کوئی ایسا قانون نہیں جو باہر سے آکر ہم پر زور ڈالتا ہے۔ چونکہ کرم انسان کا اپنا ہی بنایا ہوا ہوتا ہے۔ اور سب کی آتما بھی ایک ہی ہے۔ اسلئے راگ اور دویش کو چھوڑ کر سب سے سچی ہمدردی و محبت کے ساتھ کام کرنا چاہیئے۔ تاکہ ہم کو سچا آنند پراپت ہو۔ کرم سے نجات پانے کا ذریعہ ہی یہ ہے کہ ہم مضبوطی کے ساتھ ہمیشہ ست کرم کرتے جائیں۔ اور تمام کرموں کو پرماتما کے ارپن کر دیں۔ جو ایسا کرتا ہے وہی سچا کرم یوگی ہے۔ اور وہی پرم پد کو پراپت ہوتا ہے۔

اوم۔ شانتی۔ شانتی۔ شانتی۔

ایک ودیارتھی ہے

لطیفہ

وکیل صاحب نے جرح کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا کہ اُس دن تم کچھ پیئے ہوئے تھے۔

گواہ۔ جی ہاں میں ٹھنڈائی پیکر گیا تھا۔

وکیل۔ ٹھنڈائی میں کوئی اور چیز بھی ڈالی تھی یا نہیں۔

گواہ۔ جی ہاں بُورا ڈالی تھی۔

وکیل۔ حاکم کیطرف مخاطب ہوکر حضور ایسے شخص کا اظہار و بیان ہرگز قابل اطمینان نہیں ہوسکتا

بوسۂ خنجر

باب نمبر ۲

رنگپور سے شمال مشرق کیطرف. پہاڑی کی چوٹی پر، نگاہ کے سامنے قلعہ سورجگڈھ کی اونچی اونچی فصیلیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں. قلعہ سورجگڈھ راجپوتانہ کے ان مشہور قلعوں میں سے ہے جو صدیوں سے ایک ہی خاندان کی راجدھانی چلے آتے ہیں. جنکے فرمانرواؤں کا سلسلۂ خاندان فاضل اجل رشی بالمیک اور بھگتی اوتار گوسائیں تلسی داس کی رامائن کے ہیرو۔ ہندوؤں کے مریادا پرشوتم[1] راجہ رامچندر جی سے ملتا تھا. سورجگڈھ کی خاک سے بڑے بڑے جودھا اور ستونتی دیویاں پیدا ہوئی ہیں. اسکی گلیوں میں بڑے بڑے جانباز بچپن میں گھٹنیوں چلے ہیں۔ سورجگڈھ کی ایک اینٹ کی بھی بپتا لکھی جائے تو کتاب بنجائے. سورجگڈھ کی قومی دیوی کو خوش کرنے کے لئے بڑے بڑے بلدان ہوئے ہیں. سادری حق کے لئے سورجگڈھ میں خون پانی کیطرح بہے ہیں. اور انہوں نے ایسی ایسی خونریز لڑائیاں لڑی ہیں ایسے ایسے معرکے رن پڑے ہیں. اتنے ساکھے ہوئے ہیں کہ اُنکا ذکر سننے سے آجکل کے سننے والوں کے کلیجے دہلنے لگیں. لیکن آپس کی ناچاقی جھوٹا چھوٹا بڑاپن. جھوٹی دنیا کا صحیح معلوم ہونا جاہلوں کی پیروی کرنے نے بنی بنائی بات بگاڑ دی. قصہ مختصر اسکا نتیجہ یہ ہوا یعنی جیسا کیا ویسا پایا۔
سورجگڈھ نے وہ دن دیکھ لیا جسے اسکی خواب میں بھی امید نہ تھی. ہونے کو بھی جسکا گمان نہ تھا. چشم فلک کو بھی نہ سوجھی تھی. سورجگڈھ کی تاریخ میں وہ سانحہ لکھا گیا جس سے اُن کے ورق ابتک ناآشنا تھے. سورجگڈھ کے بازار. سورجگڈھ کی وہ گلیاں جن میں کل تک بانکے راجپوت. ترچھی پگڑیوں والے تن تنکر چل رہے تھے. آج خونم خون ہو رہی ہیں سورجگڈھ کے جودھا میدان جنگ میں کٹے پڑے ہیں. دن بھر گدھ اور چیل کو ملنے

[1] نیک زندگی کا نمونہ۔

بے بسوں کا گوشت نوچا ہے۔ اور رات کو گیدڑوں نے ٹانگ پکڑ پکڑ کر۔ لاشوں کی مٹی خراب کی ہے۔ سورجگڈہ کے دھرم شیل راجہ۔ ہونہار کنور۔ سلطنت کے کمم سیناپتی کی لاشیں دشمن کے کیمپ میں ایسی کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہیں اور کسی کو اتنا بھی ترس نہیں آتا۔ جو ان کے منہ پر ذرا کپڑا تو ڈالدے تاکہ سونے والونکو مکھیاں تو نہ ستائیں۔ سورجگڈہ کی ستونتی۔ اور تپسیا پرتا دیوی رانی نیل دیوی۔ خدا جانے اسوقت کہیں جنگلوں میں ماری ماری پھر رہی ہے یا خاوند کی طرح خود بھی شہید ہو گئی سورجگڈہ کا ہاتھی پول دروازہ کھلا پڑا ہے۔ ہتھیاروں کی جگہ جا بجا دیواروں پر خون کے چھینٹے نظر آتے ہیں۔ پہرہ داروں کی ٹہلنے کی جگہ لاشیں اور ٹوٹے ہوئے ہتھیار پڑے ہیں غرضیکہ جہاں دیکھو جس طرف نگاہ ڈالو۔ سوائے بربادی کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں سورجگڈہ کے فاتحہ کا ستارا اس وقت عروج پر ہے۔ اسکا نصیب سامنے ہے۔ بان ندی کے کنارے سرسبز میدان میں۔ ڈیرونکا ایک عظیم الشان شہر بس رہا ہے فتح کی خوشی میں جشن کی طیاریاں ہو رہی ہیں تمام کیمپ جنگل کے پھول پتوں سے سجایا گیا ہے محرابیں بنی ہیں۔ روشنی ہو رہی ہے خیمے خیمے میں ناچ اور ٹولی ٹولی میں طبلہ کھڑک رہا ہے جسے دیکھو لڑکھڑاتا ہوا چلا آتا ہے۔ کہیں ایک سامیں نشہ میں پڑا ہے۔ کہیں خاک و بحیاں بھر بھر کر پی رہے ہیں۔ کہیں ایک منٹے بہک رہے ہیں۔ پہرہ دار بجائے تلوار کے شراب کی بوتل لئے کھڑے ہیں۔ جہاں کوئی اُدھر سے گزرا اور انہوں نے بجائے حکم در (who comes there) کے۔ تہیں میری قسم تھوڑی سی ہمارے ہاتھ سے بھی سکی آواز لگائی۔ اور حاکم لشکر کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ تمام ڈیرے میں ایرانی قالین کا فرش ہو رہا ہے۔ صدر میں رئیس لشکر۔ ایک کارچوبی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہے۔ اِدھر۔ اُدھر چند منہ چڑھے خوشامدی بیٹھے ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ بجا ارشاد ہوا۔ سچ فرمایا۔ ایسا ہی ہے حضور کے دور دورے ہیں طرح بطرح

کے میوے۔ شراب کی صراحیاں کشتیوں میں لگی ہوئی ہیں۔ دَور پر دَور چل رہا ہے قہقہے اُڑ رہے ہیں پھبتیاں ہو رہی ہیں چیناؤں جلوں سے آدمی سامنے کھڑے مختلف باجے بجا رہے ہیں۔ اور کیسریا لباس پہنے ایک گانیوالی کچھ گا رہی ہے۔ گانیوالی کا گلا اتنا پیارا اور آواز اتنی دلکش ہے کہ سب طرف سے واہ۔ واہ کی آواز آرہی ہے تعریفوں کے پل بندھ رہے ہیں۔

سُننے والوں میں سے ایک۔ واللہ کیا کہنا ہے۔ جان نکال لی جان۔

دوسرا۔ میں تو کہیں کا نہیں رہا۔ عمر بھر کے لئے غلام کر لیا۔

تیسرا۔ اجی مجھے اور کچھ نہیں تو چلیں ہی بھرنے پر نوکر رکھ لو۔

چوتھا۔ میں کوچہ رقیب میں بھی گھر گھر کے بل گیا۔

رئیس لشکر۔ اجی انہیں بھی تو پلاؤ۔

کئی آوازیں۔ ضرور پلاؤ۔ ہمارے سامنے پلاؤ۔ ہمارے حکم سے پلاؤ۔ ہمارے ارشاد سے پلاؤ۔ ایک شخص نے کشتی سے صُراحی اُٹھائی مگر ہاتھ کپکپا گیا اور صراحی قالین پر گر پڑی۔

رئیس لشکر۔ اجی شراب نہ پیو۔ لیکن سامنے بیٹھ کر کوئی عمدہ سی ٹھمری تو سُناؤ۔

اسپر گانے والی وقت کے سُروں میں یہ ٹھمری شروع کر گانے لگی۔

موکو نہ ستاؤ جی سنّیاں پردیس — اجی موکو نہ ستاؤ جی سنّیاں پردیس

موکو نہ ستاؤ جی سنّیاں پردیس — اجی مورا پیا پردیس

موکو نہ ستاؤ جی۔ موکو نہ ستاؤ۔ ہاں موکو نہ ستاؤ جی۔ ای۔ ای سنّیاں پردیس

گانے والی کے پھرتے ہوئے گلے گونجتی ہوئی آواز نے وہ ستم ڈھایا۔ دارو پر کی نیچی چتونوں نے ایسی خونریزیاں کیں۔ اتنے چرکے دئے۔ کہ سُننے والے تڑپ اُٹھے

گانیوالی۔ اپنے سنّیاں کو میں ڈھونڈن نکسی۔ اجی اپنے سنّیاں کو میں ڈھونڈن نکسی کہ جوگن کا بھیس۔ پیا پردیس۔ موکو نہ ستاؤ جی سنّیاں پردیس سنّیاں پردیس

موراپیا پردیس

پیتم پتیاں تورے لکھوں جو کچھ انتر ہوئے ہم تم جیوا ایک ہیں پر دیکھت ہیں دو دئے
پیتم پتیاں جب لکھوں جب ہوئے بدیس تن میں من میں نین میں اکلکھا سندیس

سئیاں پردیس۔ اے جی موکو دستائو جی سئیاں پردیس

یہ بول کچھ ایسے سوز سے ادا ہوئے کہ رئیس لشکر بھی بے تابو ہو گیا۔ لحاظ شرم جاتی رہی۔ کرونی ناکردنی میں تمیز نہ رہی۔ گانے والی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا لاؤ۔ اے۔ ایک بوسہ تو دے۔ دو۔ ابھی رئیس لشکر کا ہاتھ اچھی طرح پھیلا بھی نہ تھا کہ گانے والی نے کپڑوں میں سے خنجر نکال جھپٹ کر رئیس لشکر کے حلق میں بھونک دیا اور ٹھیک اُسیوقت سازندوں نے ساز پھینک تلواریں کھینچ رئیس لشکر کی لاش اور اُسکی چھاتی پر گھٹنا ٹیکے بیٹھی ہوئی گانے والی کے چاروں طرف حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے باہر سے بھی کچھ آدمی۔ کناروں سے خیمہ پھاڑ پھاڑ کر اندر آ گھسے۔ اور لگی تلوار چلنے۔ ادھر گانے والی بھی مقتول کی کمر سے تلوار گھسیٹ۔ اُسکا سر کاٹ۔ ایک ہاتھ میں سر اور دوسرے میں ننگی تلوار لئے کھڑی ہو گئی۔ اور خیمے کے دروازے کا رُخ کیا۔

لشکر میں اُسوقت ایک عجیب ہڑبونگ مچ رہی تھی۔ کسی کو کچھ خبر ہی نہ تھی کہ رئیس لشکر پر کیا گزری۔ ہر ایک اپنے خیال میں مست تھا۔ فاتحہ اپنی لوٹ کو لئے لڑتے بھڑتے۔ سامنے پڑتوں کو کاٹتے چھانٹتے تیز قدموں چلے جا رہے تھے مگر اب تعاقب کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی تھی۔ اور فاتحوں کا نمبر بھی کم ہوتا جاتا مگر جوں جوں اُنکی تعداد کم ہوتی تھی اُن کا جوش بڑھتا جاتا تھا۔ راجہ کی لاش جگراج کے پاس تھی۔ سپہ سالار کی لاش کو نوجوان گوکا نے پیٹھ پر لاد رکھا تھا۔ اور کشور کوڈیڈھ ٹھاکر نے سنبھال رکھا تھا۔ باقی آدمی تعاقب کرنے والوں کے وار

روکتے مشرق کی طرف بڑھے چلے جاتے تھے۔ چلتے چلتے جب وہ جگہ آئی۔ جہاں بان ندی کے کنارے پہلے سے تین چتائیں طیار تھیں فوراً لاشیں چتاؤں پر رکھدی گئیں۔ دشمن کا سر خاوند کے قدموں میں ڈال رانی خود بھی چتا میں بیٹھ گئی۔ اُن چتاؤ کو آگ دیدی گئی۔ روکنے والوں نے اسوقت تک کسی کو پاس تک نہیں آنے دیا جب تک چتاؤں میں سے اچھی طرح شعلے نہ نکلنے لگے۔ آخر چھہ سات بچے کچھے جانباز ہنستے ہنستے جب اسقدر دبے کہ چتاؤں کے شعلوں سے اِن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تو وہ بھی کود کر جلتی ہوئی چتاؤں پر چڑھ گئے اور گئے وہیں سے بھالے مارنے۔ آخر آگ نے اُنکو بھی اپنی گود میں سُلا لیا۔ اور وہ بھی وہیں راکھ ہو گئے۔

بہت دن بعد شہیدوں کی راکھ پر اِن کے جانشینوں نے ایک چھتری اور چبوترا بنوا دیا۔ اور اسجگہ چند پیپل کے پیڑ بھی لگوا دئے۔ جب کوئی مسافر ادھر سے گزرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے پیپل کی چھاؤں میں اِس چبوترے پر ٹھہر ستا لیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی واقف انگریزی داں بھی ادھر سے گزرا ہے۔ کیونکہ چھتری کی دیوار پر کوئلے سے حسب حال یہ دو سطریں لکھی ہوئی ہیں۔

The Kiss she gave him was hisfirst and last drager driven to heart and past.

ترجمہ

بوسہ جو اُس عورت نے اُسکو دیا وہ اُسکا آخری اور اِس قسم کا سب سے اوّل بوسہ تھا۔ وہ بوسہ جو اُسے ملا ایسے خنجر کا بوسہ تھا جو اسکے دل و جگر کو چیرتا ہوا چلا گیا

ایک واقع نگار۔

برشگال

پیاری برسات۔ تیری تعریف کس زبان سے کیجائے۔

تیرے اوصاف کس طرح بیان کئے جائیں۔ تو قیامت کی گرمی کے بعد دل اور دماغ کو ٹھنڈک پہونچاتی ہے۔ تو جلتی ہوئی زمین اور تپتے ہوئے آسمان کا رنگ ہی اور کردیتی ہے۔ تمام جہان کی ہیئت میں آن کی آن میں بلا کا فرق ڈالدیتی ہے۔ کھیتوں کو سرسبز اور گلشنوں کو شاداب کردیتی ہے۔ شش جہت عالم میں ایک عجیب لطف پیدا ہوجاتا ہے۔ غرضیکہ کہانتک کہا جائے تیرے لاانتہا کرشموں سے کون بشر واقف نہیں۔

ابھی کل رات کا ذکر ہے کہ تیرے قدیم نظام فطرت کے مطابق ایک سال بعد دنیا میں پھر آگئے۔ تیری تشریف آوری کا ڈنکا رعد نے بجایا۔ ہاں ہاں۔ ہمنے تجھے آتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پہروں چشم بانتظار رہے۔ ہم سچ کہتے ہیں کہ تو گوشۂ شمال و مغرب سے آئی۔ بڑی دھوم دھام سے آئی۔ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ ہم یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ تو کس طرح آئی اور کیونکر آئی۔

اوّل کچھ سیاہی اوسی گوشہ میں نمودار ہوئی چشم زدن میں وہی سیاہی ایک کالے پہاڑ کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام آسمان پر دوڑ گئی۔ تارے چھپ گئے۔ چہار طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہاں کبھی کبھی بجلی کے چمک جانے سے ضرور کچھ کچھ دکھیہ پڑتا تھا۔ پھر کیا تھا۔ یہ ابر سیاہ کسی ہجر ان نصیب عاشق کے دیدۂ تر کی طرح خوب رویا۔ یہاں تک کہ نالے ندیاں بہ چلیں۔ اُس وقت کا لطف کچھ ہمارا ہی جی خوب جانتا ہے۔

ایک طرف دیکھئے محفل احباب جمی ہے۔ بادۂ ناب کا دور ہے۔ رقص و سرود کا بازار گرم ہے۔ دوسری طرف ماتم کدہ ہیں اوداسی چھائی ہے۔ ہر شخص کا سینہ کوبی اور آہ وزاری سے سروکار ہے۔ اودھر دیکھئے زاہد شب بیدار گوشۂ خلوت میں بیٹھا اپنے پیدا کرنے والے سے باتیں کر رہا ہے اودھر دیکھئے چور کسی کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کو موقعہ کا منتظر کھڑا ہے۔ کہیں کوئی حرمان نصیب نالہ و شیون میں مشغول ہے۔ بستر پر اُٹھا بیٹھا ہے۔ کسی پہلو چین نہیں آتا۔ صاحب مقدرت اپنے خوشنما آسمان سے باتیں کرنے والے دو منزلے سہ منزلے مکانوں میں مزے کی نیندیں سو رہے ہیں۔ بیچارے غریب اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں اپنے بال بچوں کو سینے سے لگائے ایک گوشے میں سمٹے بیٹھے ہیں۔ کوئی گھر بیٹھا اسوقت کا لُطف اُٹھا رہا ہے کوئی دُور از وطن دشتِ غربت میں اسوقت کی مصیبتیں جھیل رہا ہے۔ میرا مطلب اِن باتوں کا سین کھینچنے سے یہ ہے کہ اسوقت جبکہ بارش سے دنیا میں ایک عجیب سماں پیدا ہو جاتا ہے اور ایک عجیب قسم کی خاموشی ہر سو طاری ہو جاتی ہے اگر ہمیں مختلف مجلسوں اور سوسائیٹیوں کا رنگ دیکھنے کا موقعہ ہاتھ آئے تو ایک بہت اچھا سبق حاصل ہو۔ اور یقین ہے کہ وہ بہت دلنشین ہو۔

باسط بسوانی
(سیتاپور)

امیر دوست محمد خان

احمد شاہ دُرانی کی سرکار میں منجملہ اور سرداران قبائل افاغنہ کے ایک سردار پایندہ خان بھی تھا۔ اور جب احمد شاہ فوت ہو گیا اور اُس کا بیٹا تیمور شاہ سر بر آرائے سلطنت ہوا تو اُس کے عہد میں ایک دُرانی مسمی عبدالخالق نے دعوائے سلطنت کر کے فتنہ و فساد مچایا، مگر لڑائی میں اُسکو زک حاصل ہوئی اور گرفتار ہو کر تیمور شاہ کے حکم سے نابینا کیا گیا۔ اس ہنگامہ میں سردار پایندہ خان بارک زئی نے تیمور شاہ کی جانب سے نمایاں خدمات انجام دیں اور اس کے صلہ میں اُسکو "سرفراز خان" کا خطاب دیا گیا۔ تیمور شاہ کی وفات کے بعد اُسکا بیٹا شاہ زمان باعانت سردار پایندہ خان تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں پایندہ خان مختار کل ہوا۔ اور جب شاہ زمان کے بھائیوں میں نااتفاقی زیادہ ہوئی تو اسی پایندہ خان کے مشورہ سے کئی دُرانی سردار شاہ محمود کے ساتھ سازش رکھنے کے الزام میں قتل کئے گئے۔ اسکا نتیجہ ہوا کہ دُرانی سردار اور ارکان سلطنت پایندہ خان سے برہم ہو گئے۔ اور بادشاہ کے کان بھرنے شروع کئے کہ پایندہ خان شجاع الملک سے سازش کر کے آپ کو معزول کرنا چاہتا ہے۔ شاہ زمان اس خبر کے سنتے ہی سردار پایندہ خان کے قتل پر آمادہ ہو گیا۔ سردار پایندہ خان کو شاہ زمان کے ارادہ سے اطلاع ہو گئی تھی اور اُس کے بیٹوں نے مشورہ بھی دیا تھا کہ اپنے وطن گرشیک کی طرف بھاگ جائیں، مگر اس بہادر اور دلیر سردار نے روپوش ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ اور فرار ہونے سے انکار کیا۔ آخر شاہ زمان نے

کئی اور سرداروں کے ساتھ پائندہ خان کو قتل کرا دیا۔ اِس دغابازی اور ظلم و ستم کا یہ نتیجہ ہوا کہ کل افغانستان میں شور و غوغا بلند ہو گیا۔ پائندہ خان کے بڑے بیٹے **فتح خان** نے شاہ زماں کے بھائی شاہ محمود سے اپنے باپ کا انتقام لینے کی غرض سے اتفاق کیا اور کثرت سے فوج جمع کر لی۔ اور شاہ محمود نے اُس کے سایہ میں ہو کر **قندھار** اور **غزنی** کو فتح کر لیا اور **کابل** پر حملہ کیا۔ اِس زمانہ میں شاہ زمان پشاور میں مُقیم تھا۔ جب اوسکو یہ خبر پہونچی تو فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔ لیکن جب اوس نے سپہ سالار فتح خان سے جنگ کی تو اپنی ہی فوج کی نمک حرامی سے مغلوب ہو کر گرفتار کیا گیا۔ اور شاہ محمود کے روبرو پیش ہوا۔ شاہ محمود نے اُسکو تخت سے اُتار کر اندھا کر دیا[1]۔ اور جس سردار نے پائندہ خان کو قتل کرایا تھا۔ اوسکو قلعۂ بالاحصار میں قتل کیا۔ اب شاہ محمود بتجویز سردار فتح خان بارک زئی تخت پر بیٹھا اور بادشاہ نے فتح خان کو میر اعظم کیا اور **شاہ دوست** کا خطاب دیا۔ یہی فتح خان تھا۔ جس نے اپنے بھائی سردار **دوست محمد خان**[2] کو امورِ ریاست کی تعلیم دی اور اسلحہ حرب کے اصول و قواعد بتائے ❊

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو شجاع الملک (برادر شاہ زمان) کو دوسرے قبائل کے سرداروں نے بھڑکا کر آمادہ کیا کہ شاہ محمود پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے حملہ کر کے شاہ محمود کو قید کر لیا۔ اِسی شاہ شجاع الملک کے زمانے میں **فتح علی شاہ** بادشاہ ایران نے ہرات پر فوج کشی کی۔ جب اِسکو اس کی خبر لگی تو اُس نے اپنے وزیر فتح خان کو معہ دوست محمد خان کے ہرات کیجانب روانہ کیا۔

---

[1] آخر شاہ زمان سرکار انگریزی کے ضلع لودیانہ میں پناہ گزین ہوا۔ جہان سرکار مذکور نے پنشن مقرر کر دی تھی۔ اِسی جگہ شاہ زمان نے داعی اجل کو لبیک کہا ❊ ❊ ❊

[2] امیر دوست محمد خان کی تاریخ پیدایش ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہے بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ امیر موصوف ۱۷۸۹ء اور ۱۷۹۳ء کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے تھے ❊ ❊ ❊ ❊

دوست محمد خان جو اُس زمانہ میں بھی اپنی منصوبہ بازی میں مشہور تھا۔ اوسکو ہرات میں چھوڑ کر خود فتح خان اور حاجی خان ایرانیوں کے مقابلہ کو روانہ ہوئے۔ اور جنگ کرکے ایرانیوں کو پسپا کردیا۔ اودھر یہ کیفیت تھی ادھر دوست محمد خان نے ہرات کو فتح کرلیا۔ اور فتح خان کے مشورہ سے حاجی فیروزالدین کو بدینوجہ مقید کرلیا کہ اُس نے شاہ محمود کے وقت میں اسکی مدد نہیں کی تھی۔ دوست محمد خان نے ہرات میں اور بھی عنوانیاں کیں اور جب فتح خان نے اوسکو ملامت وتہدید کی تو اُس کے خوف سے بھاگ کر محمد عظیم خان کے پاس کشمیر کو چلا گیا۔ شاہزادہ **کامران** پہلے ہی سے فتح خان کے جاہ واقبال کا حاسد تھا۔ اور جب اُس کے حرم سرا میں دوست محمد خان سے بدعنوانیاں ہوئیں تو اُس نے خیال کیا کہ دوست محمد خان کی ان حرکات میں فتح خان کا ہاتھ ضرور ہے پس اُس نے فتح خان کو ہرات میں نابینا کردیا۔ جب فتح خان اس ہیئت کذائی کے ساتھ قندھار پہنچا تو شاہ محمود نے اُسکو اِس حال میں دیکھکر نہایت افسوس کیا۔ اور قوم بارک زئی نے جبکا وہ سردار تھا اور بالخصوص پایندہ خان کے دوسرے لڑکوں نے (جنکی تعداد معہ فتح خان ستترہ تھی) یہ حالت مشاہدہ کی تو اُن میں یہ برہمی پھیلی کہ شاہ شجاع الملک اور دیگر درانی شاہزادوںکو نیست ونابود کردیں، اور خاندان درانی سے کسی بادشاہ کو افغانستان کا حاکم نہونے دیں۔ پس اونہوں نے باتفاق ایک سید مسمی میر واعظ کو افغانستان کا بادشاہ بنایا۔ اور قبیلۂ بارک زئی اُس کا مطیع ہوا۔

اِسوقت شاہ شجاع الملک پشاور میں تھا۔ مگر یہ خبر سُنتے ہی فوراً کابل پہنچا اور اُس سید کو قتل کرادیا۔ اُسکا قتل ہونا تھا کہ شہر کابل اور اُس کے قرب وجوار میں جس قدر قبایل افاغنہ اُس سید کے معتقد تھے وہ سب کے سب شاہ شجاع الملک کے

برگشتہ ہو گئے اور افغانستان میں ایک عظیم شورش برپا ہوئی۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ بارک زئیوں کے خوف سے شاہ شجاع الملک ۱۸۰۹ء میں افغانستان کا تخت چھوڑ کر پنجاب کو بھاگ آیا۔ اُدھر شاہزادہ **کامران** نے یہ کیا کہ غزنی کے قریب مقام **حیدر خیل** میں اُسی فتح خان کو جسکو ہرات میں نابینا کیا بڑے ظلم و ستم کے ساتھ قتل کرا دیا۔ اوس کے قتل ہونے سے اور نیز دیگر واقعات سے افغانوں نے یہ خیال کیا کہ دُرانی خاندان ہم سب کا دشمن ہے۔ لہذا سب نے باتفاق علم بغاوت بلند کیا۔ شاہ محمود اور **کامران** اُن سے عہدہ برآ نہو سکے بلکہ شکست کھا کر اُلٹے پاؤں ہرات کو بھاگنا پڑا۔ وہاں پہنچکر کچھ عرصہ بعد شاہ محمود فوت ہو گیا اور شاہزادہ **کامران** اپنے جیتے جی وہاں کا حاکم رہا۔

یہ اُس پولیٹیکل نشوونما کی کیفیت ہے جو قبیلۂ بارک زئی نے حاصل کی جب دُرانی خاندان برباد ہو گیا تو سردار پائندہ خان کے بیٹوں نے کابل۔ غزنی۔ اور پشاور کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ کابل اور غزنی امیر دوست محمد خان کے حصے میں آیا جو قبیلۂ بارک زئی کا اور اپنے سب بھائیوں کا سرگردہ تھا۔

تیمور شاہ کے انتقال کے بعد جب **شاہ زمان** سریر آرائے سلطنت ہوا تھا تو اُسوقت سلطنتِ افغانستان میں ہرات سے کشمیر تک اور بلخ سے سندھ تک کے علاقہ جات شامل تھے۔ مگر ان پے درپے انقلابات و فسادات میں بلخ کو شاہ بخارا نے اور ڈیرہ جات کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دبا لیا۔ اور صوبہ سندھ خود سر اور آزاد ہو گیا تھا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ شاہ شجاع الملک بارک زئیوں کے خوف سے پنجاب کی طرف بھاگ آیا تھا۔ وہ کئی سال تک ادھر اُدھر پریشان حال پھرا کیا۔ اور جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس امداد کی اُمید سے آیا تو اُس نے اِسکو اُلٹا قید کر لیا

اور بہ نہایت سنگدلی کے ساتھ بے آب و دانہ رکھکر مشہور کوہ نور ہیرا اُس سے لیلیا۔ بالآخر اسکو بھی اپنے بڑے بھائی شاہ زمان کی طرح سرکار انگریزی سے پنشن اور رہنے کو لودیانہ میں جگہ ملی۔

شاہ شجاع الملک بڑا اولوالعزم اور صاحب داعیہ شخص تھا۔ اور اُسکے رفقا بھی کابل میں بہت تھے۔ اِسلئے اُس نے ایک دفعہ پھر قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔ اور بارہ مارچ ۱۸۳۳ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ عہد و پیمان کر کے کابل پر چڑھائی کی اور سندھ کے میروں کو شکست دیتا ہوا قندھار جا پہنچا۔ اور اُسکو فتح کر لیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد دوست محمد خان نے شکست دیکر وہاں سے نکال دیا۔ اور اُسکو اُلٹے پاؤں لودیانہ آنا پڑا۔ ادھر موقعہ پاکر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔ ہر چند دوست محمد خان نے اُس کے واپس لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

یہ حالات دیکھکر روسیوں کو بھی اِن اطراف میں اپنے پنجے پھیلانے کی ہوس ہوئی اور اُنہوں نے محمد شاہ والیٔ ایران کو اُبھار کر ہرات کی جانب فوج روانہ کرادی۔ گورنمنٹ ہند مدت سے چاہتی تھی کہ ایران اور ہندوستان کے مابین کوئی سد راہ قائم کیجائے۔ تاکہ مغرب کی طرف سے فرانس اور روس کے حملہ کا جو اُسوقت اندیشہ تھا۔ روک ہو جائے۔ پس اب جو ایرانی فوج نے ہرات کو آگھیر لیا تو کپتان الگزنڈر برنس نے ظاہر کیا کہ دوست محمد خان روسیوں کے ساتھ بالکل ہم صلاح ہے اور اُنہوں نے اِس سے پختہ وعدہ کیا ہے کہ ہم تمکو پشاور واپس دلادینگے اِس سے گورنمنٹ کو زیادہ کھٹکا ہو گیا اور اِس کے دفعیہ کے لئے یہ تجویز کی گئی کہ شاہ شجاع الملک کو لیجاکر پھر تخت کابل پر بٹھا دیا جائے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بھی اِس منصوبہ میں شامل کر لیا گیا۔ اور سرکار انگریزی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع الملک

کے مابین ایک عہدنامہ لکھا گیا۔ اِس عہدنامہ کی بڑی شرائط یہ تھیں۔

(۱) شاہ شجاع الملک یا اُن کا کوئی جانشین اُن علاقوں پر دعویٰ نہ کریگا۔ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دبائے ہیں۔

(۲) شاہزادہ کامران حاکم ہرات پر جو اُسکا بھتیجا ہے حملہ نہ کیا جائے گا۔ اور نہ اُسکے مقبوضہ ملک سے کچھ تعرض ہوگا۔

(۳) تینوں سرکار کے دوست اور دشمن ایک دوسریکے دوست اور دشمن ہونگے۔

(۴) ملک سندھ ہمیشہ میران سندھ کے قبضہ میں رہے گا۔ سرکار افغانستان کو اُس سے کچھ علاقہ نہوگا۔

(۵) سندھ کے میروں سے یہ عہد ہوگا کہ وہ انگریزی فوج کو اپنے علاقہ سے افغانستان کی طرف جانے دیں۔

جب یہ تجویز پختہ ہوگئی اور عہد پیماں بھی ہوچکا۔ تو سر ولیم میگناٹن۔ الگزنڈر برنس اور سر جان کین نے ساڑھے سات ہزار فوج اور ایک سو دس توپوں کے ساتھ درہ بولان کی راہ سے شاہ شجاع الملک کو قندھار لیجاکر ۸۔ مئی ۱۸۳۹ء کو تخت پر بٹھا دیا۔ ۲۳۔ جولائی سنہ مذکور کو غزنی اور ۷۔ اگست کو کابل بھی فتح ہوگیا۔ ۳۔ ستمبر کو شاہ ممدوح کا بڑا شاہزادہ تیمور بھی جس کے ساتھ پانچ ہزار اپنی اور چھ ہزار مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج تھی درہ خیبر کی راہ سے کابل میں پہنچ گیا۔ اور اگلے سال ۴۔ نومبر کو دوست محمد خان بھی مایوس اور خراب و تباہ ہو کر از خود حاضر ہوگیا۔ جو قید کرکے ہندوستان کو بھیجا گیا۔ اور گورنمنٹ ہند سے دو لاکھ روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہوئی۔ اور لودیانہ میں رہنے کا حکم ہوا۔

اِسی طرح جب سب انتظام درست ہوگیا اور شاہ شجاع الملک کی حکومت بھی جم گئی۔ تو سر ولیم میگناٹن کا ارادہ ہوا کہ الگزنڈر برنس کو اپنی جگہ چھوڑ کر خود ہندوستان

چلے آئیں۔ اسی اثنا میں ایک روز امین اللہ خان اور عبدالسلام وغیرہ چند افغان سرداروں نے شاہ شجاع الملک سے انگریزی افسروں کی سخت شکایت کی۔ مشہور ہے کہ شاہ شجاع الملک کے منہ سے دربار میں یہ نکل گیا کہ "از شما ہیچ نمے آید" (تم لوگوں سے کچھ بن نہیں پڑتا)۔ انکا یہ کہنا تھا کہ یکایک ۲۔ نومبر ۱۸۴۱ء کو دن نکلتے ہی افغانوں نے بلوہ کر دیا۔ اور برنس صاحب و دیگر کئی انگریزوں کو جو شہر میں رہتے تھے قتل کر دیا اور برنس صاحب کا سر چار چھتہ بازار میں آویزاں کر دیا۔ اب اگر چھاؤنی سے فوج فوراً شہر میں چلی آتی تو انتظام کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر فوج کے سرداروں سے ایسی سوء تدبیری ہوئی کہ وہ بجائے اسکے کہ شہر میں آکر انتظام کریں سپاہیوں کو ادھر ادھر بھیجنے، بلانے اور بیفائدہ جوڑ توڑ کرنے میں وقت ضایع کرنے لگے۔ جنرل الفنسٹن اور بریگیڈیر شیلٹن نے میکناٹن صاحب کو یہ صلاح دی کہ اب یہاں رہنا مناسب نہیں ہے جسطرح ہو جلال آباد چلئے اور وہاں سے ہندوستان کا راستہ لیجئے یہ دیکھکر کابل تمام پہاڑی افغانوں سے بھر گیا۔ اور ۲۲۔ نومبر کو دوست محمد خان کا مشہور اور نامور بیٹا محمد اکبر خان بھی والئے بخارا کے قید خانہ سے بھاگ کر ان میں آشامل ہوا۔ اسمیں اور میکناٹن صاحب میں صلح کی بابت سلام و پیام ہونے لگے۔ مگر ۲۳۔ دسمبر کو جب چھاؤنی کے باہر محمد اکبر خان اور سر ولیم میکناٹن کی ملاقات ہوئی تو محمد اکبر خان نے کسی بات پر دفعتہ بگڑ کر میکناٹن صاحب کو تمنچہ مار کر مار ڈالا اور ان کے سات آٹھ انگریز ہمراہیوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ دیکھکر انگریزی فوج کے سرداروں کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ اور چونکہ دوست محمد خان سرکار انگریزی کی قید میں تھا تمام خزانہ اور توپخانہ اور بہت سے انگریزوں کو اس کے عوض محمد اکبر خان کو اول میں دیکر ۶۔ جنوری ۱۸۴۲ء کو صرف چھ توپوں کے ساتھ جلال آباد کی طرف چل پڑے

مقام بت خاک میں اگرچہ بہت سے لوگ بلوائیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ لیکن جب ۸۔ جنوری کو درہ خورد کابل میں پہنچے تو اگلی منزل تک پہنچتے پہنچتے تین ہزار سے زیادہ آدمی ضائع ہو گئے۔ اور چونکہ یہی آفت اگلی منزلوں میں بھی تھی میدان تک پہنچتے پہنچتے ایک ہفتہ میں سولہ ہزار پانسو میں سے صرف دو سو ستر سپاہی اور چار ہزار سیٹر کے آدمی باقی رہ گئے جن کو محمد اکبر خان نے لوٹ کھسوٹ کر ہندوستان کی طرف رخصت کیا۔ انگریزوں میں صرف ڈاکٹر برئیڈن کسی طرح زندہ بچکر نکل آئے جنکی زبانی اس ہولناک واقعہ کی خبر جلال آباد میں پہنچی۔ مگر بہادر جنرل سیل صاحب جلال آباد کو اور جنرل ناٹ صاحب قندھار کو بڑی دلیری سے روکے رہے۔

اس حادثہ کی خبر پہنچنے پر سرکار انگریزی نے اپنے نام اور عزت کے واسطے دوبارہ فوجکشی کی۔ یہ فوج درہ خیبر سے کابل کو گئی۔ اور جنرل پالک ۱۶۔ اپریل کو جلال آباد میں اور ۱۵ ستمبر کو محمد اکبر خان کو شکست دیتے ہوئے کابل جا داخل ہوئے اور یادگار انتظام کے طور پر مشہور بازار چارچھتہ کو بارود سے اڑا دیا۔ ادہر جنرل ناٹ صاحب بھی غزنی کو فتح کرتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔ چونکہ ان کے پہنچنے سے پیشتر ہی (یکم مارچ) دوست محمد خاں کے ایک رشتہ دار شاہ شجاع الملک کو رات کیوقت قلعہ بالا حصار کو جاتے ہوئے مار ڈالا تھا۔ اسلئے جنرل پالک صاحب کو بجز اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے (جنمیں مردوں کے علاوہ ۱۲ لیڈیاں اور ۱۶ بچے تھے اور جن کو محمد اکبر خاں نے بامیان کی طرف بھیجدیا تھا۔ تاکہ تورانی سرداروں کے پاس غلامی کے واسطے تحفتہً بھیجے جائیں) اور کچھ کام باقی نہ تھا۔

غریب قیدیوں کی تقدیر اچھی تھی کہ ان کے محافظ صالح محمد خان نے بیس ہزار روپیہ نقد اور ایک ہزار روپیہ ماہوار کے پنشن کے وعدہ پر ان کو صحیح وسالم انگریزی

فوج میں پہنچا دیا۔ جنرل پالک صاحب اُن قیدیوں اور سُلطان محمود غزنوی کے مقبرہ کے صندل کے دروازوں کو جن کو وہ سومناتھ کے مشہور مندر سے سنہ ۱۰۲۴ء میں اتار کر لے گیا تھا، نشانِ فتح کے طور پر ساتھ لیکر ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے اور ۱۶- نومبر سنہ ۱۸۴۲ء کو پشاور پہنچے۔ اِس کے بعد امیر دوست محمد خاں کو وطن جانے کی اجازت ہوگئی۔

جب امیر دوست محمد خاں رہا ہوکر کابل پہنچا تو اُس نے اپنے خلف الرشید محمد اکبر خان کو بلاکر دیدہ بوسی کی اور بڑی تعریف کرکے "وزیر کابل" کا خطاب دیا۔ اور سردار افضل خان کو جس نے قید میں بھی اپنے باپ کا ساتھ نہ چھوڑا تھا بلخ کا حاکم مقرر کرکے بھیجا جس پر وہ امیر دوست محمد خان کی وفات تک قابض رہا۔ اِسوقت سلطنتِ افغانستان بلحاظ وسعت پہلے سے زیادہ تھی۔ قندھار پر امیر دوست محمد خاں کے بھائیوں اور ہرات پر کامران کا تسلط تھا۔ افغانی ترکستان۔ اور بدخشان کا علاقہ قریب قریب افغانستان سے آزاد تھا۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں سندھ کو انگریزوں نے فتح کرلیا۔ دوست محمد خان چاہتا تھا کہ انگریز اِس کو اپنی سلطنت میں ملحق کرنے نہ پائیں لیکن اِسکو اپنی اِس کوشش میں کامیابی نہوئی۔ دوست محمد خان نے انگریزوں کے اقتدار کے رَوکو روکنے کے خیال سے گجرات کی لڑائی میں سکھوں کی کمک کے لئے افغانی سواروں کا ایک زبردست دستہ بھیجا۔ مگر انگریزوں نے سکھوں کی فوج پر دو روز تک اِس غضب کا گولا برسایا کہ اُنکا مارکر کھلیان کردیا۔ آخر یہ ہوا کہ سکھوں کی ساری فوج سپاہ انگریزی کے مقابلے سے بھاگ گئی اور پنجاب میں جابجا انگریزوں کے آگے ہتھیار ڈال دئے۔ شیر سنگھ جو سکھوں کا بڑا سردار تھا اُسنے بھی اپنے تئیں انگریزوں کے حوالے کردیا۔ اور جنرل گلبرٹ نے دوست محمد خاں کے سواروں کا

تعاقب کرکے اُن کو دریائے سندھ کے پار درۂ خیبر تک بھگا دیا۔ دوست محمد خان کے دل سے انگریزوں کی بدسلوکی کی یاد نہ گئی تھی۔ وہ سرحدی قبائل کو ہر وقت مشتعل کرتا رہتا تھا۔ کہ انگریزوں کو تنگ کرتی رہیں۔

رفتہ رفتہ امیر دوست محمد خان کی طاقت بڑھتی گئی اور اس نے کوہ ہندوکش سے گزر کر دریائے جیحوں کے جنوبی علاقہ میں افغانی علاقہ پر از سرِ نو تسلط جمانا شروع کیا۔ اس مہم میں اسکو کامل کامیابی ہوئی اور افغانی ترکستان اور بدخشان پر اپنا تسلط بٹھایا۔ کہ یہ افغانستان کے ایک جزو قرار پا گئے۔ مگر ہرات اور قندھار کی طرف سے ہنوز کھٹکا دور نہ ہوا تھا۔ فارس کا ہر وقت ہرات پر دانت رہتا تھا۔ یار محمد خان کامران کو قتل کرکے ہرات کا حاکم بن گیا تھا اور آخر خود بھی قتل ہوا۔ اسکا بیٹا تھوڑے دنوں بعد دیوانہ ہو گیا۔ پھر محمد یوسف حاکم ہوا لیکن وہ بھی معزول کیا گیا۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ۱۸۵۵ء میں ایک عہدنامہ امیر دوست محمد خان اور سرکار انگریزی کے درمیان ہوا۔ اس مصالحت کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے رحمت خان اورک زئی نے پشاور سے سردار محمد اعظم خان (پسر امیر دوست محمد خان) کے نام ایک مراسلہ بھیجا کہ میں نے میجر ایڈورڈس صاحب کمشنر پشاور سے ملاقات کی ہے اور اثنائے گفتگو میں افغانستان اور برٹش گورنمنٹ کی باہمی مصالحت کے فوائد منافع کو بیان کیا۔ میجر صاحب موصوف نے جواب دیا کہ انگریزی سلطنت امیر کی طرف سے بدگمان نہیں ہے اور ہمہ جہت مدارات کی خواہاں ہے۔ مگر چونکہ بنائے مخاصمت امیر کی طرف سے پڑی ہے۔ لہٰذا اب اگر امیر کو تمنائے مصالحت ہے تو پیغام صلح بھی اوّل ان ہی کی جانب سے آنا چاہیئے۔ میں نے تم کو اسلئے لکھا ہے کہ تم امیر صاحب

کو اس امر پر راغب کرو۔" اس کے جواب میں سردار محمد اعظم خان کو آگاہ کیا گیا کہ "امیر صاحب انعقادِ صلح پر رضامند ہیں، مگر جب تک رحمت خان اس امر میں پیروی نہیں کریگا۔ اُسوقت تک طریقۂ صلح مستحکم نہیں ہو سکتا" المختصر عرصہ تک عہدنامہ کے متعلق ہر دو جانب سے خط و کتابت (براہ راست) ہوتی رہی اور تین برس بعد یعنی ۳۰۔ مارچ ۱۸۵۵ء کو عہدنامہ کی تکمیل ہوئی۔ اُس عہدنامہ میں مندرجہ ذیل تین شرائط تھیں :-

(شرط اول) فیمابین آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی اور امیر دوست محمد خان والئی کابل و دیگر مقامات مقبوضۂ افغانستان اور اون کے ورثار کے صلح و دوستی ہمیشہ رہے گی ؛

(شرط دویم) آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی وعدہ کرتی ہے کہ وہ اُن علاقہ جاتِ افغانستان کا لحاظ رکھیگی جو اب امیر صاحب کے قبضہ میں ہیں۔ اور ہرگز اسمیں دست اندازی نکرے گی ؛

(شرط سویم) امیر دوست محمد خان والئی کابل وغیرہ ملک مقبوضۂ افغانستان اپنی طرف سے اور اپنے ورثار کی جانب سے وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ممالک سرکار کمپنی کا لحاظ رکھیں گے۔ اور ہرگز اُن میں دست اندازی نہ کرینگے۔ اور آنریبل کمپنی کے دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن رہیگا ؛

عہدنامے کی تکمیل کے اگلے سال یعنی ۱۸۵۶ء میں ایرانی فوج صوبہ ہرات کے حدود میں نقل و حرکت کرنے لگی۔ جسکا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں ایران و برٹش گورنمنٹ میں ہرات پر جنگ و جدل شروع ہو گیا اور جب موخر الذکر نے خلیج فارس میں بوشہر پر قبضہ بھی کر لیا تو اُسوقت گورنمنٹ انگریزی نے امیر دوست محمد خان کو اس جنگ میں اپنا دوست بنانا اور اُسکو مالی فوجی

امداد دینا ضروری خیال کیا۔ فروری ۱۸۵۶ء میں دوست محمد خان نے پشاور میں سر جان لارنس چیف کمشنر سے ملاقات کی اور آٹھ ولایتی گھوڑے سر جان کو ہدیتہً نذر کئے۔ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے بھی امیر صاحب کو اسی ہزار روپیہ کا خلعت اور فوجی تیاری کے لئے آٹھ لاکھ روپیہ نقد دیا گیا۔ لیکن ہنوز یہ روپیہ خرچ ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایران و برٹش گورنمنٹ میں مصالحت ہو گئی اور امیر صاحب کو کسی قسم کا تردد نہ کرنا پڑا۔

جب ایران کے ساتھ سرکار انگریزی کی لڑائی شروع ہوئی تو ہرات کے حالات و واقعات کیوجہ سے امیر دوست محمد خان کے دل میں اندیشہ پیدا ہوا۔ لہذا اس نے سرکار انگریزی سے مشورہ کیا۔ آخر ۲۶۔ جنوری ۱۸۵۷ء کو ایک اور عہدنامہ مکمل ہوا۔ جسکی رو سے علاقۂ ہرات امیر دوست محمد خان کے سپرد کیا گیا۔

ان عہدنامہ جات سے انگلستان نے اپنی اس پالیسی کو درجۂ تکمیل پر پہنچا دیا۔ جو اس نے اسوقت سے تیار کر رکھی تھی۔ جبکہ روس اور ایران کے درمیان اختلاف ہو گیا تھا۔ ان عہدناموں سے پایا جاتا ہے کہ انگلستان ایران کا دوست نہ رہا۔ بلکہ امیر کابل کا دوست بن گیا۔ اور جو مراعات ایران سے کیجاتی تھیں وہ سب امیر دوست محمد خان پر منتقل ہو گئیں۔

امیر دوست محمد خان شجاعت و بہادری میں اپنی نظیر آپ تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ کابل میں انگریزی فوج سے تاب مقاومت نہ لاکر آوارہ وطن ہوا تھا۔ لیکن اگر اسکو مقابلہ کی طاقت و قوت ہوتی تو ممکن ہے کہ وہ جنگ سے باز نہ آتا۔ وہ اپنی قوم، اپنے قبیلہ اور اپنے ملک کا ہمدرد تھا۔ اسکی وطن پرستی اور قومی تائید میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ فی الحقیقت

امیر دوست محمد خان نے افغانستان میں قبیلۂ بارک زئی کی حکومت کو قائم کیا اور اِسکو اپنے اور اپنی اولاد کے لئے یادگار چھوڑا ❊

اپنی وفات سے پانچ سال پیشتر امیر دوست محمد خان نے تمام ملک کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور شیر علی خان کو اپنا ولیعہد ووارث نامزد کیا تھا۔ آخر ۱۹۔ جون سنہ ۱۸۶۳ء کو امیر دوست محمد خان نے بمقام ہرات انتقال کیا۔ جنازہ قبر میں اُتارا ہی گیا تھا کہ افغانستان میں باہمی لڑائیوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ مگر باوجود اِس کے سلطنت جوں کی توں قبیلۂ بارک زئی کے ہاتھ میں رہی ❊

شاکر میرٹھی،

تاریخی واقعات

حضرت محمد صاحب کی وفات کے بعد یہ بات بحث طلب تھی کہ اب خلافت کِسکو دیجائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ اِس کارِ اہم کو انجام دیں۔ انہوں نے نہایت دانشمندی سے اپنی خلافت کے زمانہ میں کل مومنین میں اتحاد قائم رکھا۔ اُن کے بعد خلافت حضرت عمرؓ کو دیگئی اُنکے زمانہ میں اہل عرب نے متواتر فتوحات سے اِس گمنام ملک کی تاریخ کو ہمیشہ کے لئے روشن کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں نااتفاقی اور خانہ جنگی کے بیج بوئے گئے گو کہ یہ دونوں خلیفہ بھی نہایت قابل اشخاص تھے پھر بھی اِنکی خلافت میں وہ کامیابیاں نہوئیں جو پہلے ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ایک سرکش سردار نے حضرت علیؓ سے گستاخانہ طریقہ پر سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ اور آپ کی خلافت میں اِسقدر بے انتظامی ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ حضرات ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ میں حضرت عثمانؓ اور بندہ کی طرح کے اشخاص اُن کے خادم رہے اور اب ہماری مدد کے لئے تمہارے جیسے سردار باقی رہ گئے ہیں۔ "شمس"

حسنِ طبیعت

تماشاگاہِ عالم میں قدم رکھتے ہی اِنسان اُن کرشموں میں محو ہو جاتا ہے جنکو اِسکی فطرت کا ایکٹر تخیلات کے ذریعہ سے دکھا رہا ہے۔ اوّل اوّل اِسکو ماں کی محبت۔ پھر باپ کی شفقت اور دوسرے دُودھ شریک یا خون شریک عزیزوں اور قریبوں کے تعلقات کا تماشا نظر آتا ہے۔ جو اپنے اپنے منصب اور وقت پر بارہ ہوئے جاتے ہیں مگر جب وقت اِنسانی حواس زیادہ حِس اور قوت مدرکہ میں کچھ زیادہ ادراک پیدا ہو جاتا ہے تو اِس تھیٹر کا سٹیج منیجر اور بہت سے تماشے بھی دکھاتا ہے۔ اِن مختلف تماشوں میں بعض صرف آنکھوں کو اپنا لطف دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ بعض آنکھوں سے اُتر کر دل میں پہنچتے پہنچتے کچھ اور رنگ بدل لیتے ہیں اور بعض دل میں پہنچکر مدت تک قائم رہتے ہیں۔ ؀

شباب زندگی اِنسان کے لئے ایک پرکیف باغ ہے۔ مستی و مدہوشی کی ہوائیں چلتی ہیں۔ جو پھول نظر آتا ہے آنکھیں اُسکے چننے کی مشتاق ہو جاتی ہیں اور جو کلی دکھائی دیتی ہے دِل اُسکو کلیجے میں رکھ لینے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اِس خوشش آیند چمن میں وہ کانٹے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو دِل میں چبھ کر ہمیشہ کھٹکا ہی کرتے ہیں۔ بہارِ عمر کا یہ کانٹا محبت ہے اور اسکی خلش۔ محبت کی تاثیر۔

محبت کے تمام سین اِس تھیٹر دنیا میں جس خوشش ترکیبی اور دلکش ترتیب کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں اُن کی کیفیت کچھ وہی دل اچھی طرح جانتے ہیں جنہیں اُن کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یا یوں کہنا چاہئیے

کہ جن کے خمیر میں محبت کی چاشنی بھی دیگئی ہے۔ کیونکہ اس سٹیج پر ہر انسان کو اپنے فطری مذاق کے موافق تماشے نظر آتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ محبت کے سین سب کے سب ایک ہی قسم اور ایک ہی درجہ کے نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ ان میں سے اکثر کا تعلق روح کے ساتھ ہے اور اکثر جسم سے متعلق ہیں۔ باقی تمام خاص خاص مدت تک نظر آکر غائب ہو جاتے ہیں۔

اس محبت کے سوا جو انسان ماں کے پیٹ سے لیکر آیا ہے۔ اور قبر میں لیجائیگا۔ اور تمام قسم کی محبت بالکل غرض مندوں سے بھری ہوئی اور زندگی کے خاص خاص مرحلوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ زندگی کے کل مرحلوں میں (یعنی لڑکپن۔ شباب اور شیب) وسط کا مرحلہ سب سے زیادہ سخت اور دشوار گزار ہے۔ کیونکہ نمو کا زمانہ ہوتا ہے۔ تمام طاقتیں کمال پر ہوتی ہیں۔ ہر ایک عضو اور ہر ایک مادہ کی پوری پوری تکمیل ہو چکتی ہے۔ گویا قانونِ قدرت آئین دنیا۔ بلکہ شرعاً بھی خود مختاری کا سرٹیفکٹ مل جاتا ہے۔ اور انسان اس زمانہ پر پہنچکر اپنے ہر فعل کا مختار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ مختاری محض انسانی نگاہوں میں خود مختاری معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ زیادہ تر مجبوری ہوتی ہے اسلئے کہ جذبات کا جوش اس کو زبردستی ہر ایک فعل پر مجبور کرتا ہے۔ ہاں دنیا ایسے جوان مردوں اور بہادروں سے بھی خالی نہیں ہے جنہوں نے اپنی روحانی طاقت سے اس مجبوری کو خود مختاری بناکر یعنی اپنے جذبات پر قبضہ کرکے دوسروں کے لئے نظیر قائم کر دی ہے یا کر رہے ہیں۔

جب لڑکپن کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور شباب کے سین نظر آنے لگتے ہیں تو انسان کے دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ روح جو تمام قویٰ پر فرمانروا ہے۔ حسن کے ساتھ باطنی اور ازلی تعلق رکھتی ہے۔ اور دل روح کی

تخت گاہ ہے۔ یہ باطنی تعلق ایک قسم کی ایسی کشش رکھتا ہے کہ کبھی نہ کبھی آنکھوں کے سامنے وہ شے (ذی روح یا غیر ذی روح) آہی جاتی ہے۔ جسکا حُسن مذاق روح کو پسند ہوتا ہے۔ اور پھر انسان اِس سین سے ایسا بیخود اور بے چین ہوجاتا ہے کہ بعض اوقات اُسکو انسانیت کے درجہ سے بھی خارج سمجھا جانے لگتا ہے۔ اِسی کا نام محبت ہے۔ اور جب یہی محبت اعتدال سے بڑھ جاتی ہے۔ تو لوگ عشق کہنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ تمام باتیں زیادہ تر شباب ہی تک محدود رہتی ہیں۔

روح کو جس سے تعلق ہوتا ہے وہ جنسیت اور فطرت کے لحاظ سے بھی معاشرت کا ساتھی ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وضعدار محبت کچھ مدت کے بعد دوستی بنجاتی ہے۔ اور پھر یہ محبت و دوستی مِل جُلکر وہ لطف دکھاتی ہیں کہ زندگی کو خوشی اور انبساط کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ محب اور محبوب یا وہ دونوں دوست جنکی محبت نے دوستی کا رنگ بدل تعلقات کو چوکھے سے زیادہ چوکھا اور گہرے سے زیادہ گہرا بنا لیا ہو۔ راستی۔ صداقت۔ نیک شعاری اور خلوص کے سچے نمونے ہوں۔

غور کرنے سے محب دو قسم کے نظر آئینگے۔ ایک تو وہ جنکو درحقیقت اپنے محبوب کی کسی خاص وضع۔ یا ادا۔ یا صورت۔ یا سیرت سے محبت ہوگی اور وہ سچے دل کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اُسکو اپنا محبوب سمجھیں گے خواہ ذات محبوب میں وہ بات رہے یا نہ رہے۔ یا خود اُن میں اُس محبوب سے لطف اٹھانے کا مادہ رہے یا نہ رہے۔ (اِس محبت کو وضعداری کہتے ہیں) دوسرے وہ لوگ جو اپنے محبوب کی شے محبوب تک محب ہیں یا اُنکی محبت کا ایک خاص وقت یا خاص مدت ہوتی ہے۔ جسکے گزر جانے کے بعد تمام تعلقات بھی ٹوٹ جاتے ہیں

گویا شہد کی مکھی ہیں کہ پھول کے رس تک "رسیا" ہیں رس چوس لیا اور اڑ گئے (اس محبت کو بوالہوسی کہتے ہیں)

جس طرح خصائل انسانی نے محب کی دو قسمیں دکھائی ہیں۔ اسی طرح طبعی خصوصیات کے لحاظ سے محبوب کی بھی تفریق کر کے اسے چند اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ جن میں سے دو فریق بڑے ہیں۔ ایک تو وہ جو اپنے محب کو ایسا ہی محبوب سمجھتے ہیں جیسے خود اس محب کے محبوب ہیں یہ اپنے حسن کے ان ہتھیاروں سے جو قدرت نے انکو محبوب بنانے کے لئے عطا کئے ہیں اور جنکو عشاق کی اصطلاح میں ناز۔ ادا۔ غمزہ۔ و عشوہ وغیرہ وغیرہ کہتے ہیں۔ وہی کام لیتے ہیں جنکا اثر محب کی ذات کے لئے حال و استقلال میں اچھا ہی ہوا کرتا ہے۔ دوسرے وہ محبوب ہیں جو محبت کے فوق البھڑک پردہ کی آڑ میں اپنا مطلب نکالا کرتے ہیں۔ انکا ناز۔ فریب۔ انکی ادا۔ دغا۔ ان کی دوستی دشمنی ہوا کرتی ہیں۔ یہ اپنے عاشق فریب برتاؤ سے محب کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے وہ وہ جال پھیلاتے ہیں کہ انسان بغیر برباد و تباہ ہوئے رہتا ہی نہیں۔ یہ اسیوقت تک اپنے ناعاقبت اندیش محب کے محبوب ہیں جب تک ان کے محب میں وہ چیزیں موجود ہیں جنکی غرض نے ان کو بناوٹی طور پر محبوب بنا رکھا ہے۔

ان خود غرضی محبوبوں میں یا معشوقوں میں جو اپنے آپ کو اپنے محب کا فدائی و شیدائی معشوق نما عاشق ظاہر کیا کرتے ہیں۔ در اصل کوئی تو اسکے روپے کا کوئی اسکی حکومت و ریاست کا اور کوئی اسکی کسی ایسی ہی دوسری ناپائدار چیز کا عاشق ہوتا ہے۔ گویا محبت ایک دھوکے کی ٹٹی ہے جسکی آڑ میں یہ شکار کھیلا کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب یہ دغاباز اور پرفن لوگ اچھی طرح جانچ لیتے ہیں کہ ہمارا

محب۔ عاشق یا دوسرے لفظوں میں چاہنے والا ہم پر فدا ہے۔ تو اُسکو پھسلانے اور اُسکو دام فریب میں لانے کے لئے طرح طرح کے سوانگ کرتے ہیں۔ جن میں سے سب سے زود اثر اور عاشقوں کو پھانسنے والا داؤں یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنی ساختہ محبت کا اظہار نہایت خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا چلتا ہوا جادو ہوتا ہے کہ بیچارہ عاشق بال باندھا غلام بنجاتا ہے۔

یہ رویہ اور اس قسم کی محبت بالخصوص اُس بازاری اور عزت باختہ فرقہ میں جاتی ہے جس نے شرم وحیا کا برقعہ اتار کر عصمت فروشی پیشہ مقرر کر رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انکا بڑا مقصد دولت پیدا کرنا اور دنیاوی عیش وعشرت کے ساتھ عمر کے دن کاٹ دینا ہے۔ لیکن یہ بُری اور بھونڈی خصلت جو اِس فرقہ میں پیدا ہو گئی ان کی جبلی خصلت نہیں ہے بلکہ کچھ تو اکتساب زر کی ضرورت نے۔ کچھ عشرت پسندی نے۔ اور بہت زیادہ عیش طلب اور بھولے بھالے نئے تماش بینوں نے پیدا کر دی ہے۔ اِن لوگوں میں بہت کم ایسے دکھائی دینگے جو درحقیقت محبت پرور اور مئے عشق سے بھرا ہوا دل اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہیں۔ ورنہ مشاہدہ بتلاتا ہے کہ اِن میں ایسے بہت لوگ ہیں جنکو عاشق بننے کا اور عشق پیشہ مشہور ہونے کا شوق ہے۔ اِن کے دل میں محبت پیدا کرنے کی حس تو ضرور موجود ہے مگر اِن کے نقص شوق نے اِسکو برے رستہ پر ڈالدیا ہے۔ اور اسطرح انہوں نے خود دھوکے دے دیکر اِس فرقہ کو بھی دھوکہ دہی اور فریب نمائی کا سبق دیدیا ہے۔

ایک تو عورت میں مرد کشش کرنے کا قدرتی مادہ موجود ہے اور حسین ہونا اُس پر طرہ ہوا۔ پھر جو اس سے ناز و ادا کا محبت کے رنگ میں اظہار ہوگا تو انسان تو انسان فرشتہ بھی پھسل ہی پڑے گا۔ ایک سلیم العقل

اور روشن دل کا پہلا حکم یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے محبوب کے رنگ۔ انگ اور ڈھنگ کو بناوٹ کی کسوٹی پر اچھی طرح کس کر دیکھ لے کہ آیا یہ سونا جو ہم کو دکھایا جارہا ہے خالص کندن ہے یا کھوٹ ملا ہوا ہے۔ لیکن اس جانچ پرتال کے لئے یہ ضرور ہے کہ اندھی محبت نہو۔ ورنہ جہاں زمانہ نے آنکھ دکھائی اور مال دولت نے ساتھ چھوڑا یہ تمام ناز و ادا۔ نخوت اور بدمزاجی سے بدل جاتے ہیں۔

اِس فاحشہ فرقہ میں بھی سب کے سب ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے ہیں بلکہ کبھی کبھی بعض بعض اس قدر باوفا اور وضعدار بھی نکل آتی ہیں کہ عاشقی و معشوقی کا پورا پورا حق ادا کر دیتی ہیں۔ لیکن چونکہ خود غرض آشنا بھی اوّل اوّل وفاداری اور جان نثاری کا دم بھرا کرتے ہیں۔ اسلئے نقل و اصل میں تمیز مشکل ہو گئی ہے۔ کیونکہ سچے معشوق سے زیادہ بناوٹی معشوق اطاعت و فرماں برداری کیا کرتے ہیں۔ اور جہاں تک اُن سے ہو سکتا ہے مطلب برآری تک اپنے فریب عشق کو چھپانے کے لئے مالی اور جسمانی تکالیف بھی برداشت کرتے ہیں۔ اور ضرورت و بے ضرورت۔ وقت اور بے وقت اپنی وفاداری اور اطاعت شعاری کا بہت زیادہ اظہار کرتے ہیں۔ تاہم اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہی اُن کی بناوٹ کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ بے ضرورت اور فضول اطاعت و وفاداری کرتے ہیں۔

وفاداری اور اطاعت۔ بادی النظر میں مترادف اور ہم معنی الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اِن کے معنی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اِن دونوں کے معنی میں ایک دم میں فرق معلوم ہوگا۔ کیونکہ وفاداری کے لئے تو اطاعت لازمی نہیں ہے اور اطاعت کے لئے وفاداری لازمی ہے اسلئے کہ وفادار کا لفظ در اصل اسکے لئے بنایا گیا ہے جس سے بواسطہ محبت ہو۔

اور اطاعت کے لئے محبت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور چونکہ محبت کو دل سے واسطہ ہے۔ اسلئے جب دلوں میں تعلق پیدا ہوگیا۔ تو وفاداری لازمی ہوگئی۔ برخلاف اِسکے اطاعت اُسی شخص کی کیجاتی ہے۔ جس سے کوئی غرض ہو۔ یا اُسکا کسی قسم کا دباؤ اور زور ہو علاوہ اِن تمام باتوں کے معشوق کی صفت ناز آفریں اور وفادار ہے۔ نہ کہ اطاعت شعار اور فرماں بردار۔ ہاں اطاعت شعاری اور ناز برداری وغیرہ عاشق کے لئے زیبا ہے اور یہی عاشق کا جوہر ہے۔ ایک معشوق سے اطاعت اور ناز برداری یعنی فرائض عاشق چاہنا ہی حماقت اور غلط خیالی ہے۔ بلکہ مصنوعی معشوق اور غرضمند محبوب میں اور بے غرض اور سچے معشوق میں فرق ہی صرف اسقدر ہے کہ ایک اطاعت کو وفا کے رنگ میں دکھاتا ہے۔ اور دوسرا وفا کو ناز آفرینی کے پیرایہ میں۔ معشوق سے یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ کسی دباؤ یا کسی لحاظ سے اپنی طبعی خاصیت کو چھوڑ کر اطاعت کے تلخ پھل کا ذائقہ اٹھائے۔ کیونکہ سوا اِن بدیہی باتوں کے اطاعت سے شانِ معشوقیت میں بھی تو فرق پڑتا ہے۔

ایڈیٹر

قصیدہ مبارکباد تاجپوشی

شہنشاہ معظم جارج پنجم - دام ملکہ و سلطنتہ

(جسے دوار کا پرشاد گوہر لکھنوی نے ایک عام جلسہ اظہار خوشی میں جو بتاریخ ۲۲-
جون بریلی میں منعقد ہوا، پڑھکر ایک نقل بحضور وائسرائے روانہ کی)

خدا کی شان کس شوکت کا ہے دربار لندن میں
نشاط و تہنیت سے ہیں رنگے اخبار لندن میں

ہے بجتا چار دانگ عالم میں ڈنکا تاجپوشی کا
مبارکبادیوں کے جا رہے ہیں تار لندن میں

مبارک تاجپوشی آج پیارے جارج پنجم کو
کوین میری کی گردن کا خوشی ہے ہار لندن میں

جھلکتی ہیں مسرت کی شعاعیں آج ہر شے میں
دلی عشرت کا کرتی ہے خوشی اظہار لندن میں

خوشا قسمت ہوا ہے جلوہ آرا تخت شاہی پر
ہمارا قیصر ہندوستان دربار لندن میں

وہ دن ہے آج گھر گھر ہند میں عشرت کے ساماں ہیں
یہاں بھی ہیں وہی عشرت کے جو آثار لندن میں

مناتے ہیں خوشی سب ہند کے راجے مہاراجے
وہ ستنے ہیں جو ہوتے ہیں دوچار لندن میں

فسانہ ہو گئے ہیں جشن اگلے بادشاہوں کے
نرالا ہو جسے وہ دیکھ لے دربار لندن میں

سلاطین زمانہ آستاں بوس ادب ہو کر
شریک جشن عشرت آج ہیں دربار لندن میں

کچھ ایسی شان و شوکت کا عظیم الشان جلسہ ہے
ہوا ایسا نہ ہو شاید کبھی دربار لندن میں

نگارستان چینی کیوں نہ گر جائے نگاہوں سے
مرصع ہیں جواہر سے در و دیوار لندن میں

خطاب آتے ہیں چھوٹے بڑے میں ہو گا ساتھ ادھر دیکھو
ادھر ہے موتیوں کی ہر طرف بوچھار لندن میں

ہمارے خسرو والا گہر کی تاجپوشی کا
ہے جلسہ گرم عشرت آج ہے بازار لندن میں

بریلی ایسے چھوٹے شہر میں جب ایسی رونق ہے
نجانے آج ہوگی شان کیا دربار لندن میں

یقین ہے ہند میں دربار دہلی اس سے بڑھکر ہو — بڑی جاتی ہیں اب شرطیں سر بازار لندن میں
تلک چھوٹیں چھٹیں پولیٹیکل شامت کے مارے سب — نہ پہنچے بیڑیوں کی پاؤں کے جھنکار لندن میں
خوشی کے شادیانے ہر طرف بجتے نظر آئیں — مسرت اور آزادی کے ہوں اظہار لندن میں
ملے شربت شکر کا۔ کالا پانی پینے والوں کو — بھٹائی جائے ایسی پو سر بازار لندن میں
صدا آتی ہے ہر سو سے مبارک ہو مبارک ہے — شہنشاہ کو ہمارے تاج ہند دربار لندن میں
یہ جلسہ آج اظہار خوشی کا ہے بریلی میں — رزولیوشن ہوا ہے پاس پہنچے تار لندن میں
رعایا ہند کی سب شاہ کے حق میں دعا گو ہے — مبارک۔ شاہ کو یہ جشن عشرت بار لندن میں
ہے ہوتی مندو نہیں آتی جوش عقیدت سے — کہ ہوا فزونی اقبال ہر ہر بار لندن میں
رہے دائم سلامت شاہ کی پیاری کوئن میری — خوشی جسکی کہ اک ادنے ہے خدمتگار لندن میں
یہیں سے مند کرتے ہیں ہم اظہار مسرت کو — ہماری تاب کیا پہنچیں جو ہم سرکار لندن میں

یقیں ہے پائینگے درشن کبھی ہم شہ کے دہلی میں
ہے کیا پروا نہیں پہنچے اگر دربار لندن میں

راقم
خیر خواہ سرکار
دوارکا پرشاد گوہر لکھنوی
کلرک آؤٹ آفس بریلی۔

اسیرانِ عدم

اے طلسمِ روزگار اے ہستیٔ ناپائدار
اب وہ راتیں ہیں نہ باتیں ہیں نہ وہ لیل و نہار

وہ جوانی اب کہاں، وہ شانِ برنائی کہاں
لطفِ صحبت وہ کہاں، وہ محفل آرائی کہاں

جوشِ وحشت کی نہ پوچھو آہ! کچھ سرتابیاں
دن کو ہیں بیتابیاں شب کو پریشاں خوابیاں

دیدۂ تر سے رواں شام و سحر ہے جوئے خون
آ رہی ہے حسرتِ خونِ گذشتہ اب یہی خون

بیکسی یا بیکلی کے غم میں نالہ کش اب دل میں ہے
اپنی لیلیٰ آہ! اب ماتم نشیں محمل میں ہے

کیا لگائیں تجھ سے اے دنیائے فانی! دل کو ہم
اک خرابہ اب سمجھتے ہیں تری محفل کو ہم

آہ! دنیائے دنی! تو سخت ہے ناپائدار
تیری بزمِ عیش ہے ہنگامۂ رقصِ شرار

وہ دلِ زندہ کہاں، وہ عیشِ دنیا اب کہاں
چشمِ نظارہ کہاں، ذوقِ تماشا اب کہاں

کس کو گل گشتِ چمن کا اے صبا! ہے اب دماغ
دیدِ گل کا ہم اسیروں کے لئے ہے کب دماغ

ہم ہیں پابندِ قفس اٹکھیلیاں ہم سے نہ کر
اے نسیمِ صبحگاہی! شوخیاں ہم سے نہ کر

سیرِ گل تم کو مبارک! ہم صفیرانِ چمن
گیت آزادی کے گاؤ مل کے مرغانِ چمن

ہوگیا جب آہ! اپنی آرزوؤں کا فشار
ہم کو کیا اے گلستاں میں ہو خزاں یا بہار

آہ! اے عیشِ زمانہ ہوگیا دل تجھ سے سرد
شہر میں رہ کر کریں کیا ہائے! ہم صحرا نورد

صحبتِ احباب کا وہ مشغلہ جاتا رہا
ہائے وہ زندہ دلی کا سلسلہ جاتا رہا

محفلِ ویراں ہے اب شہرِ خموشاں ہائے ہائے
مجمعِ احباب ہے گنجِ شہیداں ہائے ہائے

بالک رام پرشاد بجواڑیہ از پٹیالہ۔

تازہ کلام

حضرت وصف اکبرآبادی

میں نے اپنے ایک معزز اور لائق دوست کی خواہش سے یہ غزل مرزا غالب مرحوم کی طرح میں لکھی ہے۔ اس غرض سے نہیں کہ اونکی غزل کا جواب لکھوں بلکہ صرف فرمایش پوری کرنے کے لئے۔ مرزا صاحب مرحوم ایک طرز خاص کے موجد تھے اپنے رنگ میں لکھنا مفت خون جگر پینا ہے اور اون کے ہمقدم چلنے میں سو ٹھوکریں کھانے کے اور کیا ہاتھ آسکتا ہے جب بڑے بڑے نامی شعراء سے اون کے کوچہ میں قدم دھرا نہ گیا تو میں نالائق ہیچمدان جسکو اون کے ادنے سے ادنے شاگرد کے خاکپا ہونے کا بھی رتبہ نہیں کب کچھ دعویٰ کر سکتا ہوں۔ میں مرحوم کی روح پاک سے اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں ہاں اتنا ضرور کہونگا کہ اگر آج کو مرزا صاحب مرحوم زندہ ہوتے تو اپنے چند شعروں کے اولٹ پھیر کو دیکھکر ایکدفعہ مسکرا تو ضرور دیتے۔ فقط

غزل

سبکے اشک آنکھوں سے ٹپکیں کچھ نمایاں ہوگئیں — دلمیں کیا کیا حسرتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں
رعب سے ظالم کے آہیں دلمیں پنہاں ہوگئیں — اسقدر سمٹیں کہ بس تار رگ جاں ہوگئیں
سبکے بلیں زینت چاک گریباں ہوگئیں — ضعف پیری میں رگیں تن پر نمایاں ہوگئیں
بخت برگشتہ کی تاثیریں نمایاں ہوگئیں — جو دعائیں ہمنے کیں وہ وعدہ پنہاں ہوگئیں
مصحف رخسار پر سطروں کی صورت جب عیاں — انکی زلفیں کیا ہوئیں آیات قرآں ہوگئیں
اونکا آنا تھا کہ سب درد و الم جاتا رہا — نزع کی دشواریاں ہمدم بس آساں ہوگئیں

ہاتھ اوٹھائے جب لحد پر فاتحہ کیواسطے
انگلیاں اودہر شوخ کی شمشیرِ عریاں ہوگئیں

ہوں وہ بلبل عشق کا ایل نے دکھایا جب اثر
دل کی پھانسیں رنگِ گل سے قبائیں چاک ہوگئیں

مرکے جب اوترے لحد میں انکو بخشی تھی ظاہر ہوا
ایک یہ منزل کڑی تھی اب سب آسان ہوگئیں

چھپکے وہ پردہ میں جب اپنی جھلک دکھلا گئے
شوخیاں انکی چراغ زیرِ داماں ہوگئیں

موت اسکی ہے حیات اسکی تھی جنت اسکی ہے
جسکے ہاتھ میں تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

حشر میں بھی دیکھنے پائے نہ عاشق انکی شکل
حیرتیں بڑھ بڑھ کے جلوہ کی نگہباں ہوگئیں

میں وہ مجرم تھا کہ سطریں نامۂ اعمال کی
حشر کے دن دامنِ رحمت کی کلیاں ہوگئیں

عقدۂ دشوار کھولا ناخنِ تدبیر نے
ہائے مشکل مشکلیں بھی اب تو آساں ہوگئیں

ذبح کرنا اب تو مومن کا سمجھتے ہیں حرام
ہائے وہ کافر ادائیں جو مسلماں ہوگئیں

زینتِ شب ہائے عشرت تھیں وہ شمعیں اب کہاں
بجھ بجھا کر سب چراغِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

روئے روشن پر ہوا جمنا نگاہوں کا محال
انکی زلفیں دیکھکر نظریں پریشاں ہوگئیں

اب کہاں آنکھوں کے آگے صورتیں احباب کی
دیکھتے ہی دیکھتے خوابِ پریشاں ہوگئیں

ظلمتیں شبہائے غم گیسو کی غضب تھیں دلنشیں
نور بھی بنکر دلِ مومن میں پنہاں ہوگئیں

مرتے دم اک رشکِ یوسف کا جو تھا دل میں خیال
پتلیاں پھر کر سوادِ شہرِ کنعاں ہوگئیں

سوزشِ دل سے جو نکلیں آہ کی چنگاریاں
زینتِ تاریکیِ شبہائے ہجراں ہوگئیں

عینِ غفلت میں جو آیا انکی زلفوں کا خیال
نزع میں سانسیں رگِ خوابِ پریشاں ہوگئیں

ظلمتِ روزِ فراق ایسی بلا انگیز تھی
صبح سے آنکھیں چراغِ شامِ ہجراں ہوگئیں

تھی دلِ مایوس میں کچھ کچھ امیدوں کی جھلک
اب وہ سب چشمِ چراغِ داغِ حرماں ہوگئیں

فتنۂ رفتہ گرم آہیں فرقتِ احباب میں
سرد ہوکر مرہمِ داغِ عزیزاں ہوگئیں

دستِ رنگیں کو اٹھاکر جو دعائیں اسنے دیں
پھول بنکر رونقِ گورِ غریباں ہوگئیں

شانک آخر کی استعداد علمیں ہم نہ پاس نے
دل کی سب خوشیاں غبارِ دامنِ پنہاں ہوگئیں

حلقۂ ماتم میں میرے آئے جب اُس کے قدم
رنج و غم کی ساعتیں شادی کی گھڑیاں ہو گئیں

میں وہاں پہنچا تو کیا میری دعاؤں کا جواب
گالیاں تھیں یا دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

بر سرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید بگذرد
مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آساں ہو گئیں

باغ میں پہنچے قدم تیرے جو اے رنگیں خرام
کھل کھلا کر ساری کلیاں گل بداماں ہو گئیں

شوخیِ حُسنِ بتاں کی وہ سبق آموزیاں
عشق کی بیتابیاں آخر نمایاں ہو گئیں

دیکھ کر تجھکو چمن میں ہو گیا ہر گل سفید
بن کے خوشبو نکہتیں پھولوں میں پنہاں ہو گئیں

اب کہاں پیری میں اے وحشت جوانی کے مزے
دل کی سب جمعیتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

جناب سید شاہ نظام الدین صاحب دلگیر اکبر آبادی

جھوٹے وعدوں کو بھی اُس شوخ کے سچا جانا
سچ تو یہ ہے کہ بُرا ہوتا ہے دل آجانا

ہوں وہ ناچیز کہ ہر چیز کو اعلیٰ جانا
کوئی قطرہ بھی نظر آیا تو دریا جانا

ناوکِ یار مرے دل سے نہ تنہا جانا
لیکے ہمراہ مرا جوشِ تمنا جانا

زلفِ شبگوں کا تصور دلِ روشن میں رہا
گو اندھیرا تھا مگر گھر کا اُجالا جانا

کیا غضب ڈھائے ہیں ظالم تری لچکی نے
دل کو دل اور نہ کلیجے کو کلیجا جانا

پڑھ لیا میں نے جو ہونا تھا مقدر میں مرے
نامۂ یار کو تقدیر کا لکھا جانا

ہر طرف جاتی ہیں نظریں تری ترچھی ہو کر
کبھی سیکھے ہی نہیں تیر یہ سیدھا جانا

دیکھوں کیسے ملک الموت کی ضد ہوتی ہے
میری بالیں پہ دمِ نزع [illegible] جانا

ہے بہت آپکو اپنی ہمہ دانی پہ غرور
معنیِ وصل تو اک دن مجھے سمجھا جانا

تیر و نشتر سے بہت تیز ہوا اے دامن
دل میں کچھ آگ دبی ہے اسے بھڑکا جانا

جب تحیر کی نظر سے تمہیں دیکھے کوئی ۔۔۔ دل کے آئینہ میں تمہارا صاف نظر آجانا
گیسوئے ہوں تو پُرشکن جب یہ سماں آئے نظر ۔۔۔ کالی کالی یہ گھٹا۔ ابر کا یوں چھا جانا

کیا قیامت ہیں قیامت میں ادائیں اُن کی ۔۔۔ دیکھکر مجھکو کن انکھیوں سے وہ شرما جانا
روز اُٹھتے ہیں تیری چال سے ایسے فتنے ۔۔۔ دیکھکر شورشِ محشر کو نہ گھبرا جانا
ترا پیسے دوڑ کے پہنچے کبھی کعبہ کو گئے ۔۔۔ صبح تک ہم نے ترے گھر کا نہ رستا جانا
بیوفا شوخ ستمگار جفاجو۔ عیار ۔۔۔ بدگمانی کا بُرا ہو تجھے کیا کیا جانا
تم شبِ ماہ میں سایہ سے نہ ڈر جاؤ کہیں ۔۔۔ یہیں رہ جاؤ مناسب نہیں تنہا جانا
دمِ آخر ہی ٹھہر جاؤ میری بالیں پر ۔۔۔ ابھی آئے ہو ابھی جاؤ گے۔ جانا جانا
وہ تو آنے کی خوشی ہے نہ گئے کا غم ہے ۔۔۔ بیخودی میں کسے معلوم ہے آنا جانا؟
قابلِ قدر ہے وہ غم جو شریکِ غم ہو ۔۔۔ وقت پہ کام جو آیا اُسے اپنا جانا
وہ سمجھتے ہیں کچھ بھی یہ سمجھ ہے اُن کی ۔۔۔ کہ مجھے غیر کہا غیر کو اپنا جانا

پہنچے دلگیر وہاں سُنکے حسینوں کا ہجوم
عرصۂ حشر کو بھی کیا کوئی میلا جانا

جنابِ باسط علی صاحب باسط ماسٹر ہائی سکول سدھولی ضلع سیتاپور

بگڑا نہ شمگر مجھے مستانہ سمجھکر ۔۔۔ بوسہ جو لیا چشم کا پیمانہ سمجھکر
آنے نہ دیا بزم میں بیگانہ سمجھکر ۔۔۔ ظالم نے نکلوا دیا دیوانہ سمجھکر
اللہ نگہباں کہ بُرا آج پھنسا ہوں ۔۔۔ مسجد میں نکل آیا ہوں بتخانہ سمجھکر
کوچہ میں پڑا تھا دلِ صد چاک ہمارا ۔۔۔ دھوکے سے اٹھا لیگیا شانہ سمجھکر
تھا گیسوؤں کے دام میں خالِ رُخِ روشن ۔۔۔ یہ طائرِ دل ٹوٹ پڑا دانہ سمجھکر

میں شمع ادسے جان سے قربان ہوا ہوں / اوس نے جو جلایا ہے مجھے پروانہ سمجھکر
سمجھے ہے کبھی دیوانہ کو سمجھاتا نہ ناصح / سمجھتا ہوں تجھکو تجھے فرزانہ سمجھکر
بوسہ نہ دیا تھا یہ تیری چشم کو ساقی / بس چوم لیا تھا اوسے پیمانہ سمجھکر
غیروں سے ہوا کرتے ہیں چپ چپکے اشارے / کھنچتے ہو غضب مجھسے ہی بیگانہ سمجھکر
سوز غم فرقت نے ترے شمع کے مانند / دن رات جلایا ہے مجھے پروانہ سمجھکر

باسط تھا مرا شیشۂ دل ہاتھ میں اسکے
توڑا ہے جسے یار نے پیمانہ سمجھکر

رباعیات افسر

توحید

اے بود کو نابود بنانے والے / اے نیست کو ہست کر دکھانے والے
پا ہی نہ سکے بھید تری قدرت کا / ڈھونڈھا ہی کئے ہر اک زمانے والے

توحید

گلشن میں جو ہے لہک لہک تیری ہے / اور گل میں جو ہے مہک مہک تیری ہے
ہر ذرے سے جلوہ گر ہے جلوہ تیرا / عالم میں ہر اک سمت چمک تیری ہے

اپنے کلام کی تعریف

ہے میرا کلام ہی نشانی میری / اقلیم سخن ہے راج دھانی میری
لندن کی مسوں کے لب پہ ہے میرا کلام / ہے ملک سخن میں حکمرانی میری

ناپائیداری دنیا

جو گلشن عالم میں قدم لائے گا / آرام بھلا اس میں کہاں پائے گا
دو دن میں ہوائے موت کے جو جھونکے / شمشاد سا قد جڑ سے اکھڑ جائیگا

ہندو کالج کی قابل توجہ حالت

از کنہیا لال خستہ

درسگاہ ایک جو تھی آپکی اے اہلِ ہنود — جس سے تھی قوم کی منظور فلاح و بہبود
دھرم کا راستہ جس سے تھا دکھانا مقصود — دیکھئے جسکو یہی کہتی تھی محفل محدود

بخت ہوگا جو موافق تو اسی کے دم سے
دلی پھر جاگ اٹھیگی تو اسی کے دم سے

حیف صد حیف کہ امید وہ بر آئی — جو شگفتہ نہ ہوئی تھی وہ کلی کملائی
ابرِ رحمت کی جگہ یاس کی بدلی چھائی — نہ تھا جس دن کا گماں دن وہ دیا دکھلائی

دوستو معرضِ پستی میں ہے دار العلوم
ہاں مگر ہاتھ میں ہے آپکے اسکا مقسوم

بھلا معلوم بھی ہے آیا ہے کیوں اسکو زوال — چھوڑ بیٹھی ہے تڑپ اسکی جو برقِ اقبال
جسطرح سے کہ ہوا کرتے ہیں بے زر بدحال — بے زری سے ہی ہوا حال ہے اسکا بیحال

گل بے زر کبھی گلشن میں بھی رہتے دیکھا
زور بے زر کا کسی نے کبھی چلتے دیکھا

دلی میں گو کہ بہت بستے ہیں دولت والے — ہائے افسوس نہیں پر ذرا ہمت والے
بخدا ہوتے اگر یہ جو مروت والے — روتے پھر کس لئے کالج کی ضرورت والے

ایک کالج کی جگہ چار کھڑے کر دیتے
کالج اسکول کے انبار کھڑے کر دیتے

حیف تعلیم پہ مائل یہاں زردار نہیں — دھرم کے کاموں سے بھی ان کو سروکار نہیں

انہیں تعلیم سے الفت نہیں کچھ پیار نہیں   راستی کا رہا یہاں کوئی خریدار نہیں
انکو مطلب ہے تو بس ایک سے دینار سے ہے
اور کچھ بھی نہ سروکار کسی کار سے ہے

فانی لذات میں دلکو نہ پھنساؤ بخدا   دل سے تعلیم نہ دیدونکی بھلاؤ بخدا
گیان کی شمع اگر دل میں جلاؤ بخدا   کشتی قوم کو بس پار لگاؤ بخدا
علم کی راہ میں بس کردو زر و مال نثار
کہدو کہدو ذرا بڑھ بڑھکے کہ ہم ہیں تیار

اب تلک ٹھیک طریقہ پہ نہیں اسکا انتظام   اسی باعث سے ہوا اسکا برا ہے انجام
کارکن اسکے اگر کرتے توجہ دل سے کام   رہتا سرسبز شجر اپنا نہ کیونکر مدام
سچ ہے جس گھر میں نہ ہو صاحب خانہ دانا
اسکا جلدی سے بکھر جاتا ہے تانا بانا

انتظام اسکا کریں آن کے عالم فاضل   جانب علم ہو جنکی کہ طبیعت مائل
نہ رہیں چشم زدن کے لئے اس سے غافل   گرچہ زردار نہ ہوں پر ہوں وہ ایسے عاقل
نخل پژمردہ سر نو وہ ہرا کر دیویں
کھوٹے سونے کو وہ پگھلا کے کھرا کر دیویں

اسکے استادوں کا دل سے وہ کریں عز و وقار   اپنے دل سے نہ کریں گاہے کسیکو بیزار
رو رعایت ہو کسی کی نہ کسی سے تکرار   انکی دلجوئی پہ ہر دم وہ رہیں دل سے نثار
اور استاد بھی ایسا کہ ہو کالج پہ فدا
یہ نہ ہو اس سے جدا وہ نہ ہو پھر اس سے جدا

جسکو کالج کے لئے بھیک میں بھی عار نہ ہو   اور تنخواہ کی کمی جس کے لئے بار نہ ہو
وہ محب قوم کا ہو اور کوئی عیار نہ ہو   بیڑا ہم بھی تو ذرا دیکھیں کہ پھر پار نہ ہو

ہندو کالج کی وہ دن رات ہی پھیرے بالا
کس طرح یوں نہ ہوا اسکا جہاں میں بالا

اسمیں اُستاد بہت آئے اچھے اچھے — نہ بنی کارکنوں سے تو وہ بس چل بسے
ان کی اَن بَن سے بہت سے نئے بانم تھے — لڑکے اب تک ہیں انہیں یاد بہت کرتے

قدرداں انکو ہے افسوس کہ کوئی نہ ملا
کریں کس کس کا یاں شکوہ کریں کسکا گلہ

درسگاہ جتنی بھی ہیں دستو سوئے پنجاب — کوئی لاسکتی نہیں ڈی اے وی کالج کی تاب
یہ نتیجہ ہی مگر ہمت مرداں کا جناب — اس گلستاں کو کیا ہے دل و جاں سے سیراب

اک ہمارے امرا ہیں کہ جو جیتے لیکے فٹن
کرتے ہیں عالم مستی میں یہ گلگشت چمن

ہندو قوم کو بس اپنی سنبھالو جلدی — اسے اب چاہ ذلالت سے نکالو جلدی
فاقہ کش بچوں کو چھاتی سے لگالو جلدی — ردو کد باہمی جو ہے وہ مٹالو جلدی

اپنے ان بچوں کی تعلیم کی کچھ پہ فکر کرو
رات دن جو بھی ملے اس سے یہی ذکر کرو

تختۂ قسمت کالج جو الٹ جائے گا — یہ ہے اپنا جو نصیبا سو پلٹ جائیگا
رشتۂ امید ترقی کا جو کٹ جائے گا — یہ چمن دست خزاں سے یونہی لٹ جائیگا

اعلیٰ تعلیم کو جب بچے پھر نکلیں گے نہ سارے
بھلا پھر قوم کے کیونکر ہونگے موافق تارے

بھیجو دیکھو تو ذرا جانب قوم عیسے — پادری ایک ہیں انکے یہ عالم کیتا
حب قومی کا نشہ انکو ہے جبدم کہ چڑھا — رہ حق میں ہے کیا مال و زر و جان کو فدا

عیش دنیا پہ جو ماری ہے جوان مردوں نے لات
ہم بھی دیکھیں انہیں کیونکر تو بنے انکی بات

بھلا جس قوم میں جانباز ہوں ایسے ایسے — حب قومی کے بھی انداز ہوں ایسے ایسے
یک شمے وہ محبت تیری وہ ناز ہوں ایسے ایسے — رہنما جسکے ہوں ہم ساز ہوں ایسے ایسے

چرخ پر حضرتِ عیسیٰ بھی نہ کیوں ناز کریں
طائر قوم فلک پر نہ کیوں پرواز کریں

رام لچھمن تری اولاد ہوئی غافل کیسی — کرشن بھگوان تری نسل ہوئی جاہل کیسی
ارجن و بھیم تری قوم ہے کاہل کیسی — حرص دنیا پہ طبیعت ہوئی مائل کیسی

ذرا آکر وہ منوہر اے کنہیا بانی
وہ سنا آکے کہ اب نہیں آنا کانی

رن سے گھبرا کے جو شش در ہوا ارجن سا جوان — اپنے شانے سے دیا پھینک تھا تیر و کمان
روح لافانی کا عقدہ تھا کیا اس پہ عیاں — ایکدم سے تن مردہ میں جو پھر پڑ گئی جان

جا تا جس صف میں گرجتا ہوا وہ شیر عریں
خونچکاں اسکا تھا پیکاں تو رنگین تھی زمیں

یاں بھی اے جان جہاں آج دکھا دیجے بہن — قلب میں آپ سدا رہتے ہیں جلوہ افگن
باطن اہل وطن آپ ذرا کر دو روشن — بزدلی دور کرو اپنا دکھا کر درشن

آکے زردالوں کے گھٹ میں بس اجالا کیجے
ہم پہ اب بارش رحمت کا نشہ ڈالا کیجے

گیان کے نور سے اب ہمکو منور کر دو — پار بیڑا دل خستہ کا اے دلبر کر دو
شمع عرفاں سے اجالا ذرا گھر گھر کر دو — دور جلدی سے یہ رنج دل ابتر کر دو

قوم پر اپنے ذرا فضل کرو اے محبوب
یہی خواہش ہے میری یہی ہے مجھکو مطلوب

گنیش لال خستہ

قصیدہ در تہنیت جشن تاجپوشی شہنشاہ معظم کیوان کلاہ جارج پنجم شاہ انگلستان جنت نشان

تاجپوشی کا ہی جلسہ آج انگلستان میں
ہر طرف ہوتی ہیں خوشیاں ملک ہندوستان میں

سکہ شاہی چلیگا آج ہندوستان میں
اسپرس چیری بنے گی آج انگلستان میں

شہنشاہ ہند پنجم جارج عالی مرتبہ
تاجپوشی کا کرینگے جشن انگلستان میں

ہو ترقی دولت و اقبال و عمر شاہ میں
یہ دعا کرتے ہیں اہل ہند ہندوستان میں

آج ہی رسم مبارک تاجپوشی کی خوشی
اسلیئے تعطیل ہی کل ملک ہندوستان میں

چھا رہی ہی ہر طرف گلزار عالم پر خوشی
کرتا ہی خوشیاں ہر اک جھکے ہی جو مکان میں

عندلیب خوشنوا ہی شاخ گل پر نغمہ زن
دہ فشاں ہوا ہی فرحت باغ ہندوستان میں

جیلخانوں سے رہا ہوتے ہیں قیدی جابجا
ہیں دعا گو دل سے آئی جان انکی جان میں

نخلہائے پُر ثمر استادہ ہیں گلزار میں
رقص طاؤسی ہوا ہی آج چمنستان میں

کرتی ہی اٹھکھیلیاں باد صبا گلزار میں
ذکر جشن تاجپوشی ہی گل و ریحان میں

جابجا لندن میں ہیں طیاریاں اس جشن کی
منعقد دربار ہوگا قصر عالیشان میں

بیگم بھوپال اور دو چار راجہ ہند کے
شرکت دربار کو پہونچے ہیں انگلستان میں

بن گیا ہی آج لندن غیرت باغ جناں
جشن ہی یہ وسعت منظر لبے ایوان میں

ہیں وہی یہ جارج پنجم شاہ شاہان جہان
آئینگے دہلی کے جو دربار عالی شان میں

آج وہ دن ہی کہ ہوگا تاج شاہی زیب سر
جسکی خوشیاں ہوتی ہیں انگلینڈ ہندوستان میں

روشنی اتنی ہوئی ہی جگمگاتا ہے شہر
جھاڑ ہر کمرے پہ ہیں قندیل ہر دوکان میں

ملکوں ملکوں تاجپوشی کا ہے چرچہ دہر میں
جرمنی میں روس میں جاپان میں یونان میں

کھانا کھلوائینگے غربا کو اسی تقریب میں
اہل دہلی باغ ملکہ کے بڑے میدان میں

دہر میں ہیں مہربان ملائک نام پر ظل ہما
ہیں جمیع امرا و رؤسا قصر عالی شان میں

خاطے تہہ ادب بھی [illegible] کوئی مطلع کہو
بیٹھے بیٹھے کہہ لیے تھے قصیدہ آن میں

شان [illegible] جو چاہے کردے وہ ملک میں
مدح خوان دہلی میں ہے [illegible] صبح انگلستان میں

رکنا تہہ سنہ [illegible] اختر دہلوی

نوٹس

مہاپرش کسی نے ایک حکیم سے دریافت کیا۔ انسان کیا ہے جواب ملا۔ جو وہ بننا چاہے یا جیسا اُس نے اپنے کو بنا لیا ہے۔ انسان کی ہستی یا زندگی کے متعلق اوپر کا جواب کتنا صحیح اور بامعنی جواب ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض انسانوں کو۔ روپیہ۔ صحت۔ وقت غرضیکہ ہر ایک مفید اور کار آمد چیز عطا ہوئی ہے لیکن وہ ان نعمتوں کو بے جا خواہشوں اور نفس کی غلامی میں صرف کر دیتے ہیں انکا وقت نکمے کاموں اور فضول جھگڑوں میں گزرتا ہے۔ دیکھنے والے خیال کرتے ہیں انکو کسی چیز کی کمی ہے۔ لیکن کوئی ان کے دل سے پوچھے کہ انکا دل کسطرح بے شمار خواہشوں سے بے چین ہو رہا ہے۔ اس ظاہر عزت کے لئے ان کو کس کس کی خوشامد کرنی پڑتی ہے ہم اس زندگی کو کامیاب زندگی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس سے نہ تو ان کو ہی اطمینان میسر ہوتا ہے اور نہ اوروں ہی کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے کامیاب زندگی دراصل وہی زندگی ہے جس سے کسی کو فائدہ پہنچے۔ جو نسل انسان کے لئے کچھ کر گزریں ایسے لوگ خواہ کسی غریب گھرانے میں پیدا ہوں۔ پرورش تنگی سے ہوئی ہو۔ تعلیم کے لئے دقتیں اٹھانی پڑی ہوں۔ لیکن انکا بلند ارادہ۔ نیک نیت ایک دن انہیں بزرگی اور عظمت کے تخت پر بٹھا دیتا ہے۔ ان لوگوں کے ارادے ہمیشہ پورے ہو کر رہتے ہیں۔ اور انکا وقت ہمیشہ کار خیر اور نیک ارادہ میں گزرتا ہے۔ مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی (جنکی شبیہ مبارک رسالہ زبان کے اس نمبر کو زینت دے رہی ہے) ہی کو۔ وہ جی (جہانتک ہم کو معلوم ہے) نہ تو رئیس اعظم ہی ہیں اور نہ کوئی ولی یا دیوتا جنکے معجزوں نے دلوں کو تسخیر کر لیا ہو۔ نہ بیچارے کے پاس توپ تفنگ ہے کہ لوگ مجبوراً آپ کی تعریفیں کریں بلکہ ایک معمولی۔ لیکن معزز برہمن کے گھر میں پیدا ہوئے۔ شوق اور محنت سے علم پڑھا۔ جوں توں کر کے تعلیم ختم کی لیکن موقع ملتے ہی اپنا وقت۔ اپنا علم خدمت عام کے لئے وقف کر دیا۔ اگر ان کاموں کو بالکل چھوڑ بھی دیا جائے۔ جو انہوں نے بحیثیت ایک ہندو۔ ہندو قوم کے لئے کئے ہیں صرف

ان ہی کاموں کو لیا جائے جو انہوں نے ایک ہندوستانی کی حیثیت سے ہندوستانیوں کے لئے کئے ہیں اُن مدبرانہ اور سنجیدہ سپیچیز کو پڑھا جائے جو مالوی جی نے کانگرس پلیٹ فورم سے دی ہیں یا اس لٹریچر کو دیکھا جائے جو پنڈت جی نے قوم کے سامنے پیش کی ہے۔ اور سب سے بڑھکر ان کی کوششوں کا خیال کیا جائے۔ انہوں نے نسل انسان کے جانی اور مہلک دشمن نشوں کے خلاف کی ہیں تو معلوم ہو گا کہ پنڈت مدن موہن مالوی کی زندگی ایک کامیاب اور شاندار زندگی ہے۔ وہ - وہ کام کر رہے ہیں جس سے ہندوستانی بھی مدتوں تک انہیں دعا دیتے رہیں گے۔ اور انہی بھی ایک پرامن اور مسرور زندگی کا حظ آئے گا۔

ان کی جدید خدمات میں سے ہندو یونیورسٹی کا خیال قابل تحریر ہے۔ لفظ ہندو یونیورسٹی سے ہمارے بعضے باریک بیں نکتہ چین ناظرین جھجکیں گے کہ اس زمانہ قومی بیداری میں ایک خاص فریق کی یونیورسٹی سے کیا فائدہ ہے۔ ہم ان اصحاب سے دست بستہ یہ عرض کرتے ہیں کہ وہ ایک دفعہ بغور دیکھیں کہ اس فریق کی کیا وسعت ہے۔ اور بلحاظ ہندوستان کی کل آبادی کے اسکا کیا درجہ ہے۔ پھر اگر ایک قلیل حصہ آبادی اپنی ضروریات کے بموجب اپنی طریقہ تعلیم کو علیحدہ کرکے اس سے فائدہ اٹھائیں تو کیا ہم صرف نیشنیلیٹی کی دھائی دیکر کروڑوں ہندوؤں کو قومی تعلیم سے محروم رکھیں جب تک تعلیم عام کو ہم اپنا مذہبی فرض نہ کرلیں تب تک کوئی قومی بہبودی کی اُمید دیکھنی چاہیئے۔ ہم نیشنیلیٹی کے بڑے شدت سے حامی ہیں۔ پھر بھی زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے مالوی جی کے اعلیٰ خیال کو آیندہ نیشنیلیٹی کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ امید کہ ہر ہندو اس کارخیر میں تن من دھن سے مدد کریگا ۔

اس جگہ تو اتنی گنجائش نہیں۔ لیکن ہم ناظرین سے التجا کرتے ہیں کہ وہ مالوی جی کی بڑی لائف لیکر مطالعہ فرمائیں۔ اور اپنی زندگی کو مفید بہتر اور کارآمد بنانے کی کوشش

کریں۔ کیونکہ نیک ارادہ۔ نیک عمل۔ دوسروں کی خدمت کرنے والی زندگی ہی میں ایک یہ خوبی ہے کہ اس سے عامل کو بھی فائدہ ہوتا اور اوروں کا بھی بھلا ہوتا۔ خدا آپکو نیک زندگی عطا کرے ؛

کھلی نالیاں آجکل کھلی نالیوں کا گویا فیشن ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں اور شہروں کا حال تو معلوم نہیں لیکن اپنے شہر دہلی کی کھلی نالیوں کی بابت مشاہدہ کرنے کے بہت موقع ملے ہیں۔ لہذا اپنا خیال پبلک کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں اور امید وار ہوں کہ وہ اور نیز اُنکے وکلا یعنی میونسپل کمشنر صاحبان اسپر غور فرمائینگے ؛

کھلی موری کا طریقہ طبی اصول پر صرف باراتی پانی کے لیجانے کے لئے جائز ہے۔ لیکن جہاں مکانوں کی بدررو سڑک کی کھلی نالیوں میں شامل ہوتی ہیں وہاں یہ محض غلاظت اور اجرام امراض پھیلانے کا ذریعہ ہیں مکانوں کے غلیظ پانی کو بند نالیوں کے ذریعہ سے (مثلاً چینی مٹی کے نلوے) آبادی سے دور لیجانا چاہئیے اور وہاں اسکو باقاعدہ صاف کرکے زیادتی پانی کو کھیتوں یا دریا میں ڈال دینا چاہئیے۔ لیکن دلّی میں برعکس اسکے مکانات کی گندی بدررو لب سڑک کھلی نالیوں میں گرتی ہیں اور پھر اسپر طرّہ یہ کہ عموماً یہ نالیاں رُکی رہتی ہیں۔ صبح کو جس وقت سرکاری ملازمان محض اپنے فرض کو ادا کرنے کی خاطر موریوں کے قریب دیوار و نکو تر کرکے تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم دے کہ بہت پانی بہایا گیا ہے) موری کی غلاظت کو جھاڑ دیا دیگر اوزاروں سے ہٹاتے ہیں۔ تب اس جگہ سے گذرنا محال ہو جاتا ہے۔ پھر صرف بدبو ہی نہیں کیونکہ محض بدبو کے لئے میں ہرگز شکایت نکرتا۔ لیکن تمام موریوں کی خالص غلاظت جمع کرکے تنگ راستوں کے دونوں طرف ڈھیری لگادی جاتی ہیں۔ پھر یہ غلاظت رستہ کے اوپر پڑے پڑے

سو کہہ کر زبان تر لوگوں کے پیروں ہی سے تمام راستہ پر پھیل جاتی ہے۔ کرانچی دالو کے اٹھانے کی نوبت بھی ہنیں آتی - اور اگر کہیں قریب کسی مکان یا سڑک کی مرمت ہو رہی ہو تو پھر کیا کہنے ہیں۔ نہ تو سقہ میاں کو دیواروں پر پانی چھڑکنے کی تکلیف گوارہ کرنی پڑتی ہے اور نہ مہتر سنگھ کو اس کے صفا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

نالی کے ذریعہ سے کتنے ہی قسم کے کرہائے امراض خاصکر ٹائیفائڈ - تپ دق۔ کالیرا۔ اور نیز پلیگ کے اجرام لوگوں کے مکانات سے نکلکر سڑک کی دھول میں ملجاتے ہیں۔ اور ہوا کے ذریعے اڑکر دوکان اور خوانچہ والوں کے کھانے پینے کے سامان میں شامل ہو کر اوروں میں سرایت کرتے ہیں۔ میرے ایک معزز دوست ڈاکٹر ہیم چندر سین مرحوم نے فرمایا تھا کہ دلی میں انکے تجربہ میں ٹائیفائڈ یعنی اکیس دن کے میعادی بخار کے مریض بہت ہی کم آتے - لیکن آجکل یا سقدر عام ہو گیا ہے کہ ہر کس و ناکس اس سے واقف ہے (جو موتی جھیرا کے نام سے مشہور ہو گیا ہے) پرانے اطبا کا بھی یہی تجربہ ہو گا۔ اسکی کیا وجہ ہے۔ میں جہانتک سمجھ سکا ہوں کہ یہ صرف کھلی نالیوں کے کرشمے ہیں۔ پلیگ کی بابت بھی میرا خیال ایسا ہے کہ کھلی نالیوں نے اسکے پھیلانے میں ضرور مدد دی ہو گی۔ جب سے شہر میں نل کا پانی جاری ہوا ہے۔ خدا کے فضل سے ہیضہ کم ہو گیا۔ ورنہ کھلی نالیاں ہیضہ کے پھیلانے میں بھی بڑی مدد دیتیں ؛

اب اس کا کیا تدارک کیا جائے۔ کھلی نالیوں کے بجائے ہی میں شہر میں ایک نیا نکس جاری ہوا۔ اور انکو بدلا جائے تو دوسرا نکس جاری ہونا چاہیئے۔ لیکن قبل اسکے ایک آسان طریقہ آزمائش کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ جن حیثیت والے

مکانداروں کو پانی کا نل لینا فرض کر دیا جائے تاکہ بدرو میں سے پانی کی افراط نالیوں کو ہر وقت صاف کرتی رہے۔ لیکن شہر میں پانی کی اسقدر قلت ہے کہ درخواست پر بھی پانی نہیں ملتا۔ کم از کم گلی اور کوچوں کے آخری اونچے حصے میں ایک سرکاری نل لگوا دیا جائے۔ جس سے ہر وقت نالیوں کے اندر پانی جاری رہے۔ ایک دوسری تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ مہتروں کو ہدایت کیجائے کہ نالیوں کی کیچڑ سمیٹ کر بجائے راستہ پر ڈھیر لگانے کے خاص خاص جگہوں پر بطور ڈپو جمع کیا کریں جہاں سے کرانچی والے لیجایا کریں۔ اس مسئلہ میں ہم یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ہر مکان میں ایک ٹین کا کنستر کوڑا ڈالنے کے لئے رکھا جائے عموماً بہت دفعہ یہ کوڑا نالیوں میں ڈالدیا جاتا ہے۔ جس سے کہ موریاں رکی رہتی ہیں اور پاخانوں کی بابت بالٹی وغیرہ رکھو اگر کوئی ایسا انتظام ہونا چاہیئے۔ کہ اسکی گندگی سڑک کی نالیوں میں نہ جانے پائے۔ اور اگر پاخانوں کی صفائی کا انتظام پرانا طریقہ پر رہے۔ تو یہ بات لازمی ہے کہ پاخانہ میں آبدست کا پانی ہرگز شامل نہ ہو بلکہ ہر دفعہ استعمال کے بعد کچھ مقدار راکھ کی ڈالدینا چاہیئے ؛

اعلان

خریداران و نامہ نگاران سے اطلاعاً عرض ہے کہ رسالہ زبان کو آئندہ ایک اور رنگ دینا مطلوب ہے تاکہ یہ زیادہ تر نوعمر اشخاص طلبا۔ نیز مستورات کے مفید مطلب ہو سکے لہذا آئندہ اسمیں بجائے پولٹیکل اور دیگر رنگین مضامین کے۔ سائنس اور علمی مضامین کا تذکرہ ہوا کریگا۔ اور یہ بھی تصفیہ ہوا ہے کہ یہ رسالہ ایس۔ پی۔ ایس۔ کے لاہور کا آرگن قرار دیا جائے ؛

مینیجر

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۳۳
دلی قلعہ معلے یا اردو کی ٹکسال
جولائی ۱۹۱۱ء
نمبر جلد
نمونہ کا پرچہ بہر کے ٹکٹ آنے پر
روانہ ہوگا



زبان

دہلی

اردو زبان ... باش یہاں ...

ایڈیٹر نازک رقم اکبرآبادی

ڈاکٹر مترا و وزیری ایڈیٹر

سائنس اور لٹریچر کا ماہواری رسالہ

فہرست مضامین

زبان پریس دہلی میں چھپا

زبان

مطالعۂ قدرت

نمبر ۳

ماسٹر جی۔ پچھلی دفعہ ہمنے جانور اور درختوں کا مقابلہ کرکے درختونکی خصوصیت کو معلوم کیا آج ہم خاص طرح سے درختونکی ساخت و فعل پر غور کرینگے۔ اچھا لڑکوں تم ایک ایک درخت جو تمہاری سمجھ میں آئے اُس کیاری سے اکھیڑ لاؤ۔ لیکن اکھیڑنے میں حتی اللامکان اِسکی جڑ نہ ٹوٹے اور مٹی سے اکھیڑنے کے بعد اِسکی جڑ پانی سے دہو کرلے آؤ تاکہ جڑ کے متعلق معلومات بخوبی کیجا سکے

(لڑکے درخت لے کر آئے)

رام۔ جناب میں گل عباس کا درخت لایا ہوں۔ دیکھئے جڑ کہیں سے نہیں ٹوٹی۔

شام۔ جناب میں ایک گل تسبیح کا پودہ لایا ہوں دیکھئے جڑ بالکل ثابت ہے

محمود۔ جناب میں گلاب کا دبہ اکھیڑ کر لایا ہوں لیکن اسکی جڑیں بہت کم نکلی ہیں

سعید۔ جناب میں پیاز لایا ہوں (سب ہنس پڑے۔ بلکہ کسی نے چپکے سے کہا کہ یہ بیسویں صدی کے مُلا دو پیازے معلوم ہوتے ہیں)

ماسٹر جی۔ اسمیں ہنسی کی کیا بات ہے۔ پیاز بھی ایک پودہ ہے۔ بلکہ میں خوش ہوا کہ اِسوقت یہ لایا گیا ہے۔ کیونکہ اسکی ساخت میں ایک خصوصیت ہے

جو ابھی بغور دیکھنے سے معلوم ہو جائیگا۔ (لیکن مسکراہٹ کا دور جاری رہا)
(ٹکر ماسٹر جی) اور نہ ملا دو پیازے میں کوئی تمسخر کی بات معلوم ہوتی ہے
وہ اپنے زمانہ کا نہایت قابل و عالم شخص تھا۔ اکبر شاہ دانشمند شخص اس لیے
دلی محبت کرتا تھا۔ اور وہ بھی مذاق ہی مذاق میں بادشاہ کو بہت سی نصیحت آمیز
باتیں بتایا کرتا تھا۔ شاید تمہیں خیال ہوگا کہ چاند بی بی کے ساتھ لڑائی میں اسی
کی دانشمندی نے شاہنشاہ ہند کو ایک نہایت خطرناک لڑائی اور پرشرم
ناکامیابی کے دھبہ سے بچایا۔ اور مصاحبوں کی طرح بادشاہ کو اشتعال دیکر
صرف اسکا دل خوش کرنا ملا دو پیازے کا کام نہ تھا۔ اس شاہی خودسری
کے زمانہ میں بھی آفریں ہے ان شخصوں پر جنہوں نے اپنی ضمیر کو نہیں بیچا۔

خیر یہ تو رہی تواریخی باتیں۔ تم یہ بتاؤ کہ یہ درخت سب مختلف قسم ساخت
کے ہیں پھر بھی ان میں چند باتیں یکساں ہیں۔ اچھا رام تم انکو دیکھکر یہ بتاؤ
کہ درختوں کے کیا کیا اعضا ہوتے ہیں۔

رام۔ درختوں کے دو بڑے بڑے اعضا ہوتے ہیں۔ ایک جڑ دوسرا تنہ
جڑ زمین کے اندر نیچے کو جاتی ہے۔ اور تنہ باہر ہوا میں اوپر کو اٹھتا ہے۔

شام۔ عام قاعدہ تو یہی ہے لیکن کتنے ہی درختوں کے تنے قد سے
زمین کے اندر ہی پرورش پاتے ہیں۔ چنانچہ میرے لائے ہوئے گل تسبیح
کے پودے کے نیچے کا حصہ جو زمین سے اکھیڑا گیا ہے۔ کلیۃً جڑ نہیں ہے
بلکہ زمین دوز تنہ ہے۔ صرف یہ سُتلی کی طرح چیزیں جڑ سمجھی جائیں گی۔

سعید۔ پھر جڑ اور تنہ میں کیا پہچان رہی۔

محمود۔ گو کہ جڑ عموماً زمین دوز ہوتی ہے پھر بھی درخت کی ہر ایک زمین دوز
ساخت جڑ نہیں ہے۔ اور نہ یہ ضروری ہے۔ کہ جڑ زمین کے اندر ہی ہو۔

مثلاً برہ کی ڈاڑہی کو ہم جڑ کہیں گے۔ لیکن انہیں بہت سی ہوائیں لٹکتی رہتی ہیں۔ جڑ اور تنے کا اصلی فرق یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جڑمیں علاوہ شاخوں کے مثل تنے کے کوئی دوسری قسم کی ساخت مثلاً پتہ یا کلی نہیں نکلتی۔ اس گل تسبیح کے پودے کے نیچے کے حصہ میں جو ساخت بالکل جڑ موجود ہے اسمیں ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے چھلکے (یعنی پتے) اور ان کے گرنے کے نشانات موجود ہیں۔ علاوہ اسکے اسمیں کہیں کہیں سے کونپل نکل رہی ہیں۔ لہذا یہ جڑ نہیں ہوسکتی۔ تنہ ہے۔

سعید۔ جناب پیاز جڑ ہے یا تنہ۔

ماسٹر جی۔ پیاز کی ساخت کو تم بغیر کاٹے ٹھیک نہیں سمجھ سکو گے۔ (یہ کہکر وہ پیاز کو چیر کر دو حصے کر دیتے ہیں) دیکھو پیاز کا وہ ٹھوس حصہ جسکو ہم پکانے کے وقت کاٹ کر پھینک دیتے ہیں اس کا تنہ ہے اور اسکی گانٹھ جسکو ہم کھاتے ہیں وہ اسکے زمین دوز پتے ہیں۔ گویا کہ اسکا تنہ بونا ہوگیا ہے اس لئے اس کے پتے سب ایک جا جمع ہوکر گانٹھ سے بن گئے ہیں۔ تنے کا ایک حصہ کبھی کبھی گانٹھ سے باہر نکل جاتا ہے جسمیں تمنے پھول اور بیج لگتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اسکی جڑمیں برخلاف گل عباس کے تنہ کی پینیدی سے بہت سے ریشے کی شکل میں الگ الگ نکلے ہیں۔ لیکن بہت سے درختوں میں جڑ گویا کہ تنہ ہی کا نیچے کی طرف بڑہاؤ ہے۔ مثلاً گل عباسی۔ چولائی۔ نیمبو۔ نگٹ رے وغیرہ وغیرہ۔

ان درختوں میں ایک ہی مقدم جڑ نیچے کو اترتی جاتی ہے۔ اور باقی اسکی باریک باریک شاخیں ہوتی ہیں۔ گل عباس کی بھی کیفیت وہی ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اسکی جڑ کے اندر درخت کی نشو ونما کے لئے بہت سامادہ

جمع ہونے کی وجہ سے یہ تنے سے بھی زیادہ موٹی ہو گئی ہے۔ اس قسم کی اور بہت سی جڑیں موجود ہیں۔ رام دو چار کا نام بتاؤ۔

رام۔ مولی۔ گاجر۔ شلجم۔ چقندر۔ شتاور۔ ایس پی رے گس، وغیرہ وغیرہ۔

سعید۔ کیوں جناب بھر اروی۔ آلو۔ کچالو۔ زمین قند وغیرہ بھی اسی قسم کی جڑیں ہیں۔

محمود۔ ہرگز نہیں۔ وہ زمیں دوز تنے ہیں۔ کیونکہ اُن پر اکثر چھلکے کی طرح پتے اور کونپلیں ہوتی ہیں۔ جو جڑوں میں بالکل نہیں ہوتی ہیں۔

شام۔ درختوں کے اسی قسم کے موٹے زمیں دوز حصوں کو پرانے رشیوں نے بھی اسکند یعنی زمین دوز تنے اور مول یعنی جڑ کے نام سے علیحدہ رکھا تھا کیونکہ اِن کی غذائیں اکثر اسکند مول اور پھل ہی تھے۔

محمود۔ درختوں کے ایسے موٹے زمین دوز حصوں کو چونکہ قدرت نے درخت کی نشو ونما کے لئے بنایا ہے۔ اِس لئے حضرت انسان نے جہاں موقع بنا۔ اِنکو کھود کھود کر کھانا شروع کیا۔ چنانچہ اب بھی بھیل اور پہاڑی لوگوں کو ایسے قند اور موصلیاں معلوم ہیں کہ جنکو کھا کر بغیر روٹی یا چاول کے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ در اصل اِن کے اندر بھی گیہوں اور چاول کی طرح زیادہ تر نشاستہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔

رام۔ کیوں جناب ائرلینڈ کے کسان بھی آلو ہی پر زندگی بسر کرتے ہیں۔

شام۔ ہاں کسی زمانہ میں کرتے تھے۔ اب وہ بھی تم سے بہت اچھی غذا کھاتے ہیں۔ وہاں غریب سے غریب آدمی کو بھی علاوہ روٹی بکثرت مکھن و پنیر ملجاتا ہے۔ جو ہمارے یہاں کے امرا کے دسترخوان پر کبھی نظر آتا ہے۔

ماسٹر جی۔ خیر اس بات کو تو جانے دو۔ اب مقدم جڑ کو چھوڑ کر دوسری قسم کی جڑوں کی بابت غور کرنا چاہیئے۔ جو کہ درخت کے تنے کے بڑھاؤ سے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ انکی ایک مثال ہمارے سامنے پیاز ہے جسمیں بہت سے سوت کیطرح ریشے پیاز کے تنے کی پینڈی سے نکلے ہیں۔

شام۔ کیوں جناب میری گل تسبیح کی جڑ بھی ایسی ہی ہے کیونکہ یہ تنے کا بڑھاؤ نہیں ہے بلکہ زمین دوز تنے کے پہلو سے نکلی ہیں۔

محمود۔ کیوں جناب میرے گلاب کے دبہ کی جڑ بھی اسی قسم کی ہے جو ٹہنی کے پہلو سے نکلی ہے۔ لہٰذا مقدم جڑ نہیں ہو سکتی۔

سعید۔ جناب میں نے ایک درخت کے پتوں میں جڑ دیکھی ہے اسکو معلوم نہیں یہاں پتھر چٹا یا عجوبہ کہتے ہیں۔ اس کے پتے دلدار اور کنگورے دار ہوتے ہیں۔ اور پکے پتوں کے کنگوروں پر سے اوپر کونپلیں اور نیچے جڑیں نکلتی ہیں۔ پھر یہ بھی اسی قسم کی جڑیں ہیں۔

راقم۔ اکثر اناج گیہوں۔ جو۔ کنگنی وغیرہ۔ گھاس۔ فرنز کی جڑ بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جنمیں کوئی مقدم جڑ نہیں ہے۔

شام۔ اور پھر مقدم جڑ کی شاخونکو بھی اسی زمرہ میں رکھنا چاہیئے۔

ماسٹر جی۔ ہاں سب ٹھیک ہے۔ صرف ایک بات قابل غور ہے کہ بعضے درختوں کی مقدم جڑ تنے کے اتنے قریب ہی شاخیں دینے لگی ہیں کہ بعض دفعہ یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ کہ ان میں کونسی مقدم جڑ اور کون سی غیر مقدم ہیں۔

دوئم بعضے درختونکی غیر مقدم جڑیں بھی پھیل کر موصلیوں کی طرح بہت موٹی ہو سکتی ہیں

چنانچہ کسی درخت کی ایسی جڑ انسانی پنجے کی طرح نظر آتی ہے۔ ہر دو قسم کی جڑیں بعض دفعہ گنڈے دار طریقہ سے پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسکی شکل گنٹھے کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک قسم کے شتاوریں والیس پیرے رے گس جسکی شاخیں نیچے کو جھکی ہوئی ہونے کی وجہ سے لوگ خوبصورتی کے لئے گملوں میں لٹکا کر رکھتے ہیں۔ اسکی جڑیں اسی طرح گنٹھے نما ہوتی ہیں۔ علاوہ اِن کے جڑ کی اور بھی مختلف شکلیں پیدا ہوجاتی ہیں جو ہم رفتہ رفتہ معلوم کرینگے۔ لیکن تمام جڑوں کے سروں پر خاص ٹوپی نما غلاف ہوتا ہے۔ جس سے اسکا بڑھنے والا حصہ محفوظ رہتا ہے۔ جڑوں میں کبھی وہ سبز رنگ جو کہ پتے اور دیگر تنوں میں ہوا کرتا ہے۔ دیکھنے میں نہیں آتا۔ تم پہلے ہی دیکھ چکے ہو کہ اِن میں پتے یا کونپلیں نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن اِن پر روئیں ہوسکتے ہیں۔ فعل کے لحاظ سے جڑ درخت کو زمین میں قائم کرتی ہے۔ اور اسمیں سے کسی قدر رطوبت و غذائی اشیاء جذب کرتی ہے۔ بعضے درختوں کی جڑیں زمین تک نہیں پہنچتی ہیں۔ وہ صرف ہوا یا پانی میں معلق رہتی ہیں۔ اور بعضوں کی جڑیں کسی اور درخت کے بغل میں اُتر جاتی ہیں۔ اِن کے ذریعہ یہ اپنے پرورش کنندہ درخت سے بعض دفعہ غذائی مادہ اخذ کرتے ہیں۔ اور بعض دفعہ صرف کانٹے کی طرح اٹکا کر اوپر روشنی اور ہوا کے لئے چڑھتے ہیں۔ اور بعض دفعہ یہ دونوں فعل ایک ساتھ ہوتے ہیں۔ اِس قسم کے بعض درختوں میں کچھ جڑیں زمین میں اُتر کر اُسمیں سے بھی غذائی مادہ حاصل کرتی ہیں اور بعضے پتوں کے ذریعہ سے بھی مانند اور درخت پاتے ہیں۔ لیکن بعضے صرف اپنے پرورش کنندہ درخت پر ہی رہتے ہیں۔ مثلاً امر بیل ۔

بی۔ کے۔ مترا۔

تصویر صبح

سورج کی زریں شعاعیں باغ کے لہلہاتے پودوں پر منعکس ہو کر انکو آبِ طلا میں غسل دے رہی ہیں۔ رات کی اوس کے قطرے گھاس پر دھوپ کی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ ہوا کے خوشگوار جھونکے مردہ دلوں کو فرحت کے گھونٹ پلا رہے ہیں درختوں پر پرندے چہچہا رہے ہیں۔ سامنے گھاس کے تختے پر چڑیوں کا ایک جھرمٹ چوں چوں کر رہا ہے۔ حوض شفاف پانی سے لبریز ہے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ پانی گرنے کی آواز مرغانِ چمن کے غلغلے میں ملکر کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے اور قدرت کی بے سُری تانوں کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ گھنے دار درخت زمین پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ ان کے تنوں پر بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ کیاریوں میں پھول کھل رہے ہیں بعض کلیاں ابھی آدھی کھلی ہیں اور آفتاب کی تپش سے آدھی مرجھا گئی ہیں۔ گلاب کے غنچے دم بخود ہیں۔ سرو نے سر اٹھا کر طرزِ رعنائی اختیار کیا ہے نرگس کی آنکھ میں دھوپ کی چمک سے چکاچوندی پیدا ہوتی ہے بہتیری کوشش کرتا ہے کہ آنکھیں کھلی رکھے۔ تاکہ قدرت کے اس طراوت بخش سین کو جی بھر کر دیکھ سکے۔ لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ بادِ صبا نے سویرے ہی سویرے ہوکا دیکر کچی نیند میں جگا دیا تھا اور کچھ آفتاب کی تیزی کے سبب مندی جاتی ہیں۔ نسترن اپنی درازیٔ زلف سے پریشان ہے چہرے پر وحشت برستی معلوم ہوتی ہے چنبیلی کی نزاکت بھلا کب ہوا کی گستاخیاں سہار سکتی ہے اس لئے جب ایک طرف سے جھٹکا لگتا ہے تو جز بز ہو کر اپنا رخ دوسری جانب کر لیتی ہے گل لالہ کی بادِ بہاری سے ہمیشہ اَن بَن چلی آئی ہے اور یہ تیجے کے بہن بھائیوں کی طرح شب و روز آپس میں تنا رہتا ہے اسکی مزاج کی شوخی نہیں جاتی۔ اور جب موقع ملتا ہے لالے کے معشوق کو پریشان کر دیتی ہے۔ لالہ کو ہر وقت کی

اٹکھیلیاں پسند نہیں مگر صرصر کو اس کے جلانے میں مزا آتا ہے۔ چنانچہ یہ جلا تن دل ہی دل میں داغ کھاتا ہے اور چپکا کھڑا افلاک سے فریاد کیا کرتا ہے۔ فلک اگرچہ خود دل جلوں کو اور کچوکے دینے میں مشتاق ہے۔ مگر لالہ کے حال پر بہت مہربان ہے۔ اس لیئے اسکا دل ٹھنڈا کرنے کو شبنم کے دو ایک قطرے علی الصباح منہ میں ڈالدیتا ہے۔ گیندے کا سنہری پن آنکھوں میں کھبا جاتا ہے۔ جوہی کا عشوہ دل میں چٹکیاں لے رہا ہے گل مہندی اپنے دانوں پر گن گن کر جناب باری میں وظیفہ پڑھ رہی ہے۔ گل شبو کی سفیدی عصمت کی بے داغی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ نیم کے سبز پتے ہوا کے دل پہ آرے چلا رہے ہیں۔ غرض ہر طرف۔ مصرعہ: وحدت کے ہیں یہ جلوے منقش نگار کثرت۔ اگر ایک طرف طاؤس زریں لباس رقص کناں ہے تو دوسری طرف کوے کائیں کائیں کر کے مغز کھائے جاتے ہیں۔ اسی جانب کیاریں میں نازک نازک پودے اوسکی صناعی کی شہادت دیتے ہیں۔ تو دوسری جانب ناگ پھنی اور جھاڑ جھنکاڑ میں اہل نظر کے لئے اوسکی ہستی کا ثبوت موجود ہے۔ اگر یہاں بھنورا خوشبودار پھولوں کے صدقے ہو رہا ہے۔ تو دوسری جگہ خوبصورت سے خوبصورت پھولونکو کیڑوں نے کھا کھا کر گھن لگا دیا ہے۔ اگر ہرن مرغزاروں میں آزادی اور جودت طبع کے سبب قلانچیں مارتے پھرتے ہیں تو جنگلوں میں بھیڑیئے انکے ہم جنسوں کو پھاڑ کھا رہے ہیں۔ جس طرف نظر کرو آنکھوں کے سامنے وہ سماں پیش ہوتا ہے جسکا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہے۔ قدرت کی مرضی فقط آرائش ہی نہیں بلکہ ادائے فرض ہے۔ اسلیئے اگر چمن میں سرو خاموشی کی انگلی اٹھائے ہوئے خود چپکا کھڑا ہے تو وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے اور پرندے جو شور مچا رہے ہیں تو وہ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔

رؤف۔ از لندن"

تپ دق کیا ہے اور کیونکر ہوتا ہے

تپ دق یا پرانا بخار یا چھی روگ ایک پھیپھڑوں کی بیماری ہے جو کم و بیش دنیا کے سب حصوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایک نہایت مہلک مرض اور انسان کی جان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دنیا کی کل موتوں کا ایک ساتواں حصہ تپ دق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ مرض ہندوستان میں ترقی پکڑ رہا ہے اور اسکی وجہ سے ہمارے ملک میں ہزار ہا بیش قیمت جانیں ہر سال ضائع ہوتی ہیں۔ مگر خوش قسمتی سے یہ بات کلی طور سے ثابت ہو گئی ہے کہ اگر ہم ٹھیک وقت پر اور ٹھیک طور سے کوشش کریں تو مزور اس کمبخت بیماری سے بچ سکتے ہیں۔ اور اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔

تپ دق کی بیماری پھیپھڑوں میں ایک جاندار زہر یا جرم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ بیماری عموماً لڑکپن یا جوانی میں آتی ہے مگر ہر عمر کے شخصوں کو ہونا ممکن ہے۔ اسکے اجرام تپ دق کے مریض کے تھوک یا بلغم میں پائے جاتے ہیں۔ بیماری کے آغاز میں انکی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے مگر جوں جوں بیماری بڑھتی ہے انکی تعداد بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب بیماری آخری درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ تو مریض کے بلغم میں لاکھوں اجرام ہر روز خارج ہوتے ہیں۔ جب تھوک یا بلغم سوکھ جاتا ہے۔ تو یہ اجرام گرد میں مل کر ہوا میں اڑتے ہیں اور سانس کے ذریعہ سے تندرست آدمیوں کے پھیپھڑوں میں پہونچکر بیماری کی جڑ ڈالتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک تندرست آدمی کا جسم ان اجرام کو بڑھنے سے روک سکتا ہے اور فعل پاک اکھاڑ بھی سکتا ہے حتیٰ کہ اکثر لوگوں کے جسم میں یہ اجرام موجود ہوتے ہیں مگر اس وجہ سے کہ انکی صحت اور معمولی طاقت قائم ہے یہ جڑ نہیں پکڑنے پاتے اور بیماری کے آثار نمایاں نہیں ہوتے۔ البتہ ایک کمزور جسم میں اور مناسب احتیاط نہ کرنے سے یہ اجرام اپنی پیدائش بڑھاتے ہیں۔ اور پھیپھڑوں کو سڑا کر مریض کی جان کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔

اس کمبخت بیماری کی یہ عادت ہے کہ عموماً یہ ایسے نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتی ہے

اور یہ رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ بڑھتی ہے کہ ایک عرصہ تک مریض محسوس نہیں کرتا کہ وہ اس بیماری کا شکار ہو گیا لہذا ہر شخص کو چاہیے کہ ان علامات کو خوب یاد رکھے جو آغاز بیماری میں ظاہر ہوتی ہیں۔ خفیف سی کھانسی جو مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے ہو اور معمولی علاج سے نہ گئی ہو۔ شام کے وقت سستی یا خفیف حرارت۔ بھوک میں کمی۔ دبلا پن۔ بدن میں کمزوری۔ رات کے وقت پسینہ آنا۔ پھیپھڑوں سے منہ کے ذریعہ خون آنا۔ متعلق اشخاص کو چاہیے جو دیرینہ کھانسی یا زکام میں مبتلا ہوں یا اپنے وزن یا جسمانی طاقت میں کمی ہوتی دیکھیں یا مندرجہ بالا علامات میں سے اور کوئی علامت اپنے میں دیکھیں تو چاہیے کہ فوراً کسی لائق ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنا امتحان کرائیں۔

تپ دق سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

اسباب کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے کہ جب تک انسان کی معمولی صحت عام تندرستی قائم رہتی ہے اسوقت تک اس کے جسم کی قدرتی طاقت تپ دق و دیگر بیماریوں کے اجرام کے زہریلے اثر سے جسم کو محفوظ رکھتی ہے۔ وہ اسباب جو عام صحت کو خراب کرتے ہیں اور جسم کی قدرتی طاقت کو گھٹا کر تپ دق کے اجرام کے لئے زمین تیار کرتے ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اندھیرے۔ نم و غلیظ مکانات میں رہنا جہاں دھوپ ہوا کا گذر نہ ہو یا ایسے مقامات پر رہنا جہاں گرد و غبار زیادہ ہو۔

۲۔ ناکافی یا ایسی خوراک جس سے جسم کی پرورش اچھی طرح نہ ہو۔ کھانے پینے میں بے اعتدالیاں۔

۳۔ شراب نوشی و دیگر منشیات کا کثرت استعمال۔ ۴۔ عیاشی و دیگر بری عادات بچپن کی شادی۔

۵۔ دماغی و جسمانی محنت جس سے تھکاوٹ پیدا ہو۔ ۶۔ تشویش۔ فکر و رنج کی زیادتی۔

جو شخص تپ دق سے بچنا چاہیں اور خاص کر وہ شخص جن کے پھیپھڑے ڈاکٹر نے کمزور بتلائے ہوں۔ انکو لازم ہے کہ مندرجہ بالا بے احتیاطیوں سے پرہیز کریں اور مندرجہ ذیل اصولوں اور ہدایتوں کو ہمیشہ مدنظر رکھیں۔

تازہ ہوا اور روشنی صحت کے لئے ویسی ہی ضروری ہیں جیسی کہ صاف عمدہ غذا اور با فراط تازہ ہوا۔ تپ دق کو روکتی ہے۔ اور سورج کی روشنی سے تپ دق کے اجرام مر جاتے ہیں۔ گرد و غبار کثیف ہوا۔ نمی غلاظت و روشنی کی کمی تپ دق کے تخم بکولی ہیں۔ لہذا۔

۱۔ بہت سے آدمیوں کو ایک ہی کمرہ میں نہیں سونا چاہیئے۔

۲۔ سونے کے کمرے کے دروازے و کھڑکیاں ہرگز نہ بند کرنا چاہئیں۔ خواہ گرمی کا موسم ہو یا جاڑے کا۔

۳۔ رہنے کے مکان۔ دوکانیں و کارخانے صاف ستھرے ہونے چاہئیں۔ اور انہیں ہوا اور دھوپ کا بخوبی گذر ہونا چاہیئے۔

۴۔ جہاں تک ممکن ہو ایسے پیشہ سے گریز کرنا چاہیئے جس میں گرد و غبار سے کام پڑتا ہے یا جس میں بند کمروں یا دفتروں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ کمزور پھیپھڑے والوں کے لئے ایسے پیشے مفید ہیں جن میں کھلی ہوا میں چلنا پھرنا پڑے۔ مثلاً کھیتی باڑی وغیرہ۔

۵۔ سانس ناک کے ذریعہ سے لینا چاہیئے نہ کہ منہ کے۔ سانس لمبے گہرے و چھاتی بھر کر لینے چاہئیں تاکہ تازہ ہوا پھیپھڑوں کے ہر گوشہ میں پہنچ جائے۔ رات کو منہ ڈھک کر ہرگز نہ سونا چاہیئے۔

۶۔ کسی شخص کو تپ دق کے مریض کے ساتھ ہرگز نہ سونا چاہیئے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو اس کے کمرہ میں بھی نہ سونا چاہیئے۔ جس کمرہ میں تپ دق کا بیمار رہ چکا ہو۔ اس میں بود و باش اختیار کرنے سے پہلے کمرہ کے فرش و دیوار و کل اسباب کو کسی اجرام کو مار ڈالنے والی دوا (ڈس انفکٹنٹ) وغیرہ سے بخوبی دھلوا لینا چاہیئے۔

۷۔ تپ دق کے مریض کے جھوٹے برتنوں میں ہرگز نہ کھانا پینا چاہیئے۔ ایسے برتنوں کو کھولتے ہوئے پانی میں دھو لینا چاہیئے۔

۸۔ جا بجا تھوکنے کی عادت چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ نہایت خراب عادت ہے۔ اس کی وجہ سے بیماری پھیلتی ہے۔ والدین کو چاہیئے کہ کمزور بچوں کا وقتاً فوقتاً کسی ڈاکٹر سے معائنہ کراتے رہیں۔ اور ان پر تعلیم کا زیادہ بوجھ نہ پڑنے دیں۔


سورج کی روشنی اور بافراط تازہ ہوا
چاول



آپ کو اس بیماری سے بچا سکتے ہو !

تپ دق کے مریض کو کیا کرنا چاہئے

ڈاکٹر سے مشورہ۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہیں تپ دق کا آغاز ہے تو فوراً کسی لائق ڈاکٹر سے بغرض اپنے علاج کی بابت مشورہ لو جسقدر جلد آپ بیماری کی تشخیص ہو جائے اسیقدر اسکے علاج میں زیادہ کامیابی کی امید ہوتی ہے۔ بڑھکر یہ بیماری لاعلاج ہو جاتی ہے اسلئے علاج میں دیر یا کاہلی کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

اگر تمہارے پھیپھڑے کمزور ہیں یا بیماری شروع ہوگئی ہے تو اشتہاری ادویات پر روپیہ مت ضائع کرو۔ کیونکہ ایسی دوائیوں کے استعمال سے اکثر بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔ اگر کسی لائق ڈاکٹر کے زیر علاج رہنا ممکن نہیں تو دل لگا کر مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرو۔ اور یقین مانو کہ اگر تم مذہبی عقیدہ سے ان ہدایات کی پابندی کرو گے تو ضرور تمہیں فائدہ ہوگا۔

بافراط تازہ ہوا۔ دن رات یعنی چوبیس گھنٹوں کسی کھلی جگہ میں رہو جہاں صاف و تازہ ہوا بکثرت ملسکے۔ سب سے اچھا تو یہ ہے کہ کسی گاؤں کو چلے جاؤ اور وہاں درختوں کے سایہ میں چھپر ڈالکر اسمیں رہو۔ اگر یہ ممکن نہیں تو شہر کے قریب کسی باغ میں جا کر رہو۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں تو اپنے مکان کی چھت پر سائباں کے نیچے یا برآمدہ میں رہو۔ صرف بارش و دھوپ کی تیزی کا بچاؤ چاہئے۔ سردی سے مت ڈرو۔ سردی بذات خود کبھی نقصان نہیں دیتی۔ اگر سردی زیادہ ہو۔ تو گرم کپڑے پہنو اور اوڑھنا بچھونا بھاری رکھو۔ مگر کھلی ہوا میں ضرور سوؤ۔ بند کمرہ میں سونا تپ دق کے مریض کے لئے زہر کا اثر رکھتا ہے

مقوی خوراک۔ سادی۔ زود ہضم و مقوی خوراک پر رہو اور جہانتک ممکن ہو اپنی غذا بڑھاؤ۔ تاکہ جسم کے وزن میں جو کمی ہوگئی ہے وہ پوری ہو جائے مگر شروع میں بھوک کم ہو تو آہستہ آہستہ اپنے کھانے کی مقدار بڑھاتے رہو۔ وزن بڑھانے کے لئے روغنی چیزیں نہایت مفید ہیں مثلاً دودھ مکھن گھی بالائی وغیرہ یہ خیال دل سے نکال دو کہ روغنی اشیاء کا

استعمال کھانسی یا بخار کے لئے مضر ہے تپ دق کے مریض کے لئے دودھ سے بڑھکر کوئی غذا نہیں ہے۔ بالا و بالائی ہتے انڈے بھی نہایت زود ہضم و مقوی غذا ہیں اور آسانی سے دودھ میں ملائے جا سکتے ہیں۔ سوائے ان اشیاء کے جو مرغن ثقیل یا نقصان منہ ہیں تپدق کا مریض اعتدال کیساتھ سب چیز کھا پی سکتا ہے۔

جسمانی صفائی — اپنے جسم کو نہایت صاف و ستھرا رکھو ہر ہفتہ غسل کرو۔ اگر ٹھنڈا پانی برداشت نہیں کر سکتے تو نیم گرم پانی سے نہاؤ اور نہانے کے بعد تولیہ سے رگڑ کر جسم کو خشک کرو تاکہ دوران خون میں ترقی ہو۔ دانت روزمرہ منجن سے صاف کیا کرو۔ کپڑوں کے نیچے ہمیشہ اونی بنیائن یا پتلی فلالین کی کرتی پہنے رہو۔ اور اسکو اکثر تبدیل کرتے رہا کرو۔ کپڑے صرف اسقدر پہنو کہ سردی نہ معلوم ہو نہ بہت سے کپڑے لادنا مضر ہے۔

آرام — کسی قسم کی محنت جسمانی یا دماغی مت کرو بلکہ جسقدر آرام لے سکتے ہو لو۔ جس وقت حرارت ہو ہرگز مت چلو پھرو بلکہ بستر پر چپ چاپ لیٹے رہو۔ حرارت میں چلنے پھرنے سے بیماری بڑھتی ہے۔ کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ پہلے اور بعد آرام کرنا چاہئے۔ رات کو جلد سونا اور صبح کو دیر سے اٹھنا چاہئے۔

ہمت و حوصلہ — تشویش و تفکرات سے بچو اور ایسا کوئی کام مت کرو جو حد سے زیادہ جوش خوشی یا رنج کا باعث ہو۔ تپ دق کے مریض کے لئے ہر قسم کی بے اعتدالی مضر ہے۔ ہمت ہرگز مت ہارو سا اپنا حوصلہ قائم رکھو۔ ہر ہفتہ یا ہر مہینے اپنا وزن کراتے رہو۔ حرارت صبح و شام تھرما میٹر منھ میں لگا کر دیکھ لیا کرو۔ حرارت کا گھٹنا وزن کا بڑھنا اسباب کی نشانیاں ہیں کہ تمہیں شفا ہو رہی ہے۔

دوسروں کی حفاظت — تمہارا فرض ہے کہ جہاں تم اپنی شفایابی کی کوشش کر رہے ہو وہاں اس بات کا بھی خیال رکھو کہ تمہاری بیماری کی وجہ سے اوروں کی صحت کو کچھ نقصان نہ پہونچے۔ اسلئے تمہیں چاہئے کہ ادھر ادھر ہرگز تھوکو نہ گھر میں

ہمیشہ ایک علیحدہ برتن میں تھوکو جس میں راکھ بھری ہو۔ اور روزانہ تھوک کو لکڑی سمیت برادہ میں ملا کر جلا دیا کرو۔ چلتے پھرتے وقت اپنی جیب میں تھوکنے کے لئے روغنی لفافہ رکھو اور روزانہ استعمال کے بعد اُسکو جلا دیا کرو۔ کھانستے اور چھینکتے وقت ہمیشہ اپنے منہ کے سامنے رومال رکھو۔

تبدیل آب ہوا اگر تمہیں مقدور ہے تو گرمیوں کے موسم میں کسی ایسے پہاڑ پر چلے جاؤ جہاں بارش زیادہ نہ ہوتی ہو۔ اور جہاں نمی کم ہو مثلاً المورہ۔ دھرم پور وغیرہ۔ پہاڑ کی ہوا نہایت صاف و تازہ ہوتی ہے۔ اور تپ دق کے مریض کے لئے مفید پڑتی ہے۔ مگر پہاڑ پر رہنے کا انتظام معقول و آسایش دہ ہونا چاہیئے تاکہ مریض کو بیجا تو آرام کے تکلیف نہ پہونچے۔ علاوہ ازیں ایسے مریضوں کو جن کو ہر وقت بخار رہتا ہو یا جن کی بیماری بہت بڑھ گئی ہے کسی حالت میں گھر نہ چھوڑنا چاہیئے بہر حال ہر مریض کو چاہیئے کہ اگر تبدیل آب ہوا کا قصد ہے تو کسی ڈاکٹر سے ضرور مشورہ لیلے۔ ولایت میں تپ دق کے مریضوں کے لئے ایسے مقامات پر جہاں کی آب ہوا اچھی ہے خاص ہسپتال یا علاج گاہ بنائے گئے ہیں۔ ہندوستان میں اب تک اس قسم کا صرف ایک علاج گاہ دھرم پور میں ہے۔ ایسے علاج گاہ میں رہنے سے شفا یابی کی امید بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ مریض کی نگہداشت ہر دم ہوتی ہے اور اُس کی رہائیش و خورد و نوش کا معقول انتظام زیر نگرانی ایک لائق و تجربہ کار ڈاکٹر کے رہتا ہے۔

یاد رکھو کہ تازہ ہوا۔ مقوی خوراک و جسمانی آرام

تپ دق کے اجزام کو مارنے کے لئے سب سے زبردست ہتھیار ہیں۔

از جناب ڈاکٹر راجکشور کیسر صاحب ایل۔ ایم۔ ایس

بہ اجازت جناب سکریٹری۔ ایس۔ پی۔ ایس۔ کے ہو لاہور۔

بیاس اور ہومر

مندرجہ ذیل مضمون میں بیاسا نند جی نے مہابھارت اور الیڈ کا مقابلہ کیا ہے لہٰذا یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قصے اختصار کے ساتھ ناظرین کے سامنے پیش کئے جائیں۔

مہابھارت

کورو خاندان میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ وارث تخت دہرت راشٹر اندھا تھا۔ لہٰذا اسکا چھوٹا بھائی پانڈو بڑے بھائی کی جگہ ملکی نظام کرتا رہا۔ پانڈو جوانی کی عمر میں مر گیا اور پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اب سلطنت دہرتراشٹر کی اولاد دریودہن کو یا پانڈو کی اولاد یدہشٹر کو ملے۔ لیکن رعایا پانڈو کی حکومت سے خوش تھی۔ اسلئے دہرتراشٹر کی اولاد نے ترکیبوں سے اپنے چچا زاد بھائی پانڈوؤں کو مروا ڈالنے کی کوشش کی چنانچہ ایک موقعہ پر انکو سیر کے بہانہ سے دارالسلطنت سے دور لیجاکر مکان میں آگ لگوا دینے کا قصد کیا۔ لیکن پانڈوؤں کو اس بات کی اطلاع ہو گئی تھی۔ اور وہ مکان میں خود آگ لگا کر جنگلوں میں بھاگ گئے۔ کیونکہ انکو معلوم ہو چکا تھا کہ دریودہن کی پارٹی اسقدر زبردست ہے کہ ان کا بے سروپا دارالسلطنت میں پہنچنا بہت خطرناک تھا۔ لہٰذا مدتوں جنگلوں میں چھپتے پھرے اسی زمانہ میں ان کی دروپد راجہ کی لڑکی دروپدی کے ساتھ شادی ہوئی اور سری کرشن کی دوستی سے تقویت حاصل کرکے انہوں نے اپنے رہنے کے لئے ایک اور شہر آباد کیا جو کہتے ہیں کہ موجودہ دلی کے قرب و جوار ہی میں ہستناپور کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن دریودہن کب چاہتا تھا کہ غنیم زندہ رہے۔ اسنے دوستی کے بہانہ ان کو سلطنت میں بلوا کر جوئے میں نہ صرف ان کا مال و متاع بلکہ ان کی خوبصورت بیوی دروپدی اور نیز انکی ذات خود کو دھوکے سے جیت لیا اور سب کی بڑی بے عزتی کی

لیکن ایسے ہر دل عزیز اور زبردست غنیم کو دکیونکہ اب سری کرشن اور راجہ درو پد ان کے مددگار تھے) بجائے علانیہ محبوس رکھنے کے جنگل میں بھیجدینا مصلحت سمجھا گیا۔ اور شرائط اسکی ایسی سخت رکھی تھیں کہ اس سے واپس آنا امر محال تھا۔ ادہر تو پانچ بھائی پانڈو معہ زوجہ نے بن باس اختیار کیا اور اودھر راجہ دریودھن نے رعایا اور نیز ماتحت راجگان کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کی کیونکہ وہ خوب جانتا تہا کہ حکومت محض قوت بازو سے نہیں ہو سکتی بلکہ اسمیں رعایا کی خواہش اور ہر دل عزیزی کی ضرورت ہے ورنہ اپنے غنیم کو بے قابو پاکر مرواڈالنا کوئی بڑی بات تھی۔ اُدھر یدہشٹر بھی سمجھ گیا سا ایک دفعہ ملک غنیم کے قبضہ میں آنے سے بن باس کی شرائط پوری کرنے سے ہی دوبارہ ہاتھ آنا تقریباً ناممکن ہے لہذا وہ بھی جنگ کی تیاریاں کرتے رہے۔ لیکن دریودھن علاوہ ہوس سلطنت دروپدی کی خوبصورتی کا بھی خواہاں تھا۔ چنانچہ اس نے ایک موقعہ پر کسی سردار کو (جیدرتھ) اس نیت سے بہیجا کہ وہ دروپدی کو جبر لائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ ان بے عزتیوں کے لئے جو اس دفعہ اور پہلے جوئے میں ہارنے کے موقعہ پر ہوئی تہی دروپدی نے بالکل فیصلہ کر لیا تہا کہ اسکا بدلہ صرف تلوار سے ہو سکتا ہے۔

جب بن باس کی میعاد ختم ہوئی تو پانڈوں نے اپنے حقوق حسب شرائط مانگے۔ لیکن دریودہن اب کب دینے والا تہا۔ اِسکی پارٹی زبردست ہو چکی تھی دروپدی ہمیشہ لڑائی کے لئے اپنے شوہروں کو ورغلاتی تہی۔ لیکن سری کرشن اِس کا فیصلہ خوش اسلوبی سے چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ اوہنوں نے پانچ بہائی پانڈو کے لئے پانچ گاؤں مانگے۔ اِس پر دریودھن نے یہ جواب دیا کہ سوئی کے نوک پر جتنی زمین آتی ہے وہ بھی میں نہ دونگا۔ لہذا جب جان پر بن آئی تب لڑائی سے فیصلہ کرنا ضروری ہوا۔ پانڈوں کے بھی بہت سے حامی تھے۔ چنانچہ طرفین میں بڑے بڑے راجگان شریک ہوئے اور کروچھتر کے میدان میں جو موجودہ پانی پت کے قریب ہے۔ ایک

جنگ عظیم واقع ہوئی جسمیں بہت سے اُتار چڑھاؤ کے بعد دیودھن مارا گیا اور پانڈو کامیاب ہوئے لیکن وہ اس خونریزی سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ سلطنت اپنے پوتے راجہ پرکشت کو دیکر ہمالیہ کو چلے گئے ؛

ایلیڈ | ٹرائے کا شہزادہ پیرس یونان کی کسی شہزادی ہیلن کو جو خوبصورتی میں یکتا تھی بہکا لایا تھا۔ جسپر یونانیوں نے ٹرائے کو برباد کرنے اور اُس کے ننگ و ناموس کو پامال کرنے کا قصد کیا۔ چنانچہ یونانیوں نے سمندر پار ہو کر ٹرائے کا محاصرہ کیا۔ اسمیں شروع میں یونانیوں کا پلڑا زبردست رہا۔ منجملہ اور لوٹ کے دو نہایت خوبصورت عورتیں بھی تھیں۔ جو ایک اکیلس نامور بہادر کے اور ایک اون کے سردار کے حصہ میں آئی۔

(ایلیڈ کا قصہ اس جگہ سے شروع ہوتا ہے اس میں مہابھارت کی طرح بیشمار کراماتی باتیں اور دیوتاؤں کے کرشمے ہیں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ کوئی بھی حرکت ایسی خلاف فطرت نہیں کرتے کہ پڑھنے والوں کے دلمیں کوئی غیر معمولی صدمہ پہنچے یا وہ قصہ میں عجائب المخلوق کا منظر دیکھیں) یونانی فوج میں طاعون پھیلا جس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ یہ سردار کی مقبوضہ حرم کی وجہ سے کیونکہ اسکا باپ دیوتاؤں کا پجاری تھا۔ لہٰذا کونسل میں اکیلس نے اس بات پر زور دیا کہ سردار کی عورت اسکے باپ کے یہاں بھیجدی جائے جسپر بادشاہ نے غصہ میں آکر اکیلس کی عورت کو چھین لیا۔ اکیلس اس سے نہایت غصہ میں بھرا اور لڑائی سے کنارہ کشی اختیار کی کیونکہ اس کے خیال میں یہ فتحیابیاں اس کی قوت سے ہوئی تھیں اور جسکی عوض وہ اپنے حصہ سے محروم ہوا۔)

اکیلس کی علیحدگی کے بعد زیادہ تر ٹرائے والوں کا پلڑا زبردست رہا تھی کہ ایک بہادر بنام ہیکٹر نے یونانیوں کو بیحد تنگ پریشان کیا کہ یونانیوں کے سردار نے محاصرہ چھوڑ کر بھاگ جانے کی صلاح کی۔ لیکن دیگر اشخاص اس بات پر اتفاق نہ کر سکے آخر یہ تصفیہ ہوا کہ اکیلس کو منا کر لڑائی پر آمادہ کیا جائے سردار نے بہت سا انعام و اکرام مع وہ عورت جو نا اتفاقی کا باعث تھی چند معتبر اشخاص کے ساتھ اکیلس کے خیمہ میں بھجوا دیا اور ساتھ ہی چند وعدے ایسے کئے جو اکیلس کے لئے باعث فخر تھے

لیکن سنگدل اکیلس نے نہ مانا اس نے وہ تمام چیزیں واپس کر دیں اور اپنے دل میں اس دن کا منتظر رہا کہ جب وہ اپنی بہادری سے سردار کو شرمسار کر سکے۔

یونانی بغیر اکیلس کے ٹرائے والوں کے ساتھ خوب لڑتے رہے۔ لیکن ہیکٹر کی بہادری کے سامنے (جسکو دیوتا مدد دے رہے تھے) کوئی ٹھیر نہ سکا آخر وہ دن آیا کہ ٹرائے والوں نے یونانیوں کے بیڑے کو جا پکڑا اور اسمیں آگ لگا دینی چاہئے۔ یہ خبر اکیلس کو ملتی ہے لیکن خودغرض اکیلس قوم اور ملک کی آبرو کو اپنے ذاتی بغض کے آگے کچھ نہ سمجھ سکا۔ اسکا ایک قوت نام پٹیروکلس جسپر یہ فدا تھا رہ نہ سکا وہ اکیلس کا زرہ بکتر پہنکر غنیم کے مقابلہ کو گیا لیکن اکیلس نے اس سے کہدیا تھا کہ تو ہیکٹر سے نہ لڑیو کیونکہ اسکو مارنا صرف میرا ہی حق ہے لیکن یہ جوان جوش جنگ میں آگے بڑھتا گیا حتی کہ ہیکٹر کا شکار ہو گیا۔ یونانیوں نے بڑی بہادری سے اسکی لاش کو ہیکٹر کے ہاتھ سے بچایا اور جب اسکی لاش اکیلس کے خیمہ میں پہنچی گئی تو وہ رنج و غم سے بے خود ہو گیا۔ اسکی سنگدلی جو اپنے سردار اور قوم کی منت سے موثر نہ ہوئی تھی اب اپنے دوست کی موت سے اسکا دل بالکل ہی پگھل گیا۔ اسنے خودبخود اپنے سردار سے معافی مانگی اور لڑائی کے لئے تیار ہوا۔ اکیلس کے جوش وخروش کے سامنے ٹرائے والا کوئی بھی نہ ٹھیر سکا۔ حتی کہ ہیکٹر بھی بہت جلد مارا گیا۔ ہیکٹر کی لاش کو اکیلس نہایت بے عزتی سے اپنے رتھ میں باندھکر گھسیٹتا پھرا۔

لیکن ہیکٹر کا بڈھا باپ ٹرائے کے بادشاہ نے خود آکر اکیلس کی بڑی منت کی اور بہت سے تحائف و نذرانے دیکر لاش کو واپس لیا۔ ہیکٹر کی لاش کو ٹرائے والوں نے نہایت سنجیدگی و عزت سے داغ دیا جو کہ اُس زمانہ میں یونانیوں کی بھی رسم تھی (یہاں ایلیڈ کی نظم ختم ہوتی ہے)

دونوں کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایلیڈ محض ایک مذہبیہ نظم اور مہابھارت ایک جہانکاوید ہے۔ لہذا دونوں کا مقابلہ کرنا کسی حد تک جائز نہیں اگر ہومر بھی کوئی

مہا کا دیہ لکھتا تو ایلیڈ کی اندرونی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مہابھارت سے کبھی کم نہ ہوتا ۔
"گمس"

مہابھارت اور ایلیڈ

کہتے ہیں کہ بیاس جی نے مہابھارت تصنیف کی ہے۔ لیکن یہ بیاس جی کون تھے اور کس زمانہ میں پیدا ہوئے اور موجودہ مہابھارت میں انکا بنایا ہوا حصہ کتنا ہے اس بات پر مشرقی و مغربی محققین دونوں اتفاق نہیں کر سکتے۔ لیکن چند باتیں بالکل پایہ ثبوت کو پہونچ گئی ہیں کہ ایک ہی بیاس جنہوں نے چاروں ویدوں کو مرتب کیا۔ اٹھارہ پران بنائے۔ اسی نے پھر مہابھارت کی طرح ضخیم منظوم کو لکھا یہ بالکل ناممکن ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاستروں کی ترتیب دینے والوں اور مصنفوں کو لوگ بیاس کے خطاب سے نامزد کرتے تھے۔ چنانچہ کسی بیاس نے مہابھارت کو بھی لکھا لیکن موجودہ مہابھارت کے تمام اشلوک ایک ہی بیاس کے لکھے ہوئے نہیں ہیں یہ جو نہ صرف ان کے طرز کلام سے معلوم ہوتا ہے بلکہ مختلف زمانوں کے واقعات کے درج ہونے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ محققین مہابھارت کی تصنیف کے تین مختلف زمانے مانتے ہیں جس میں سے آخری زمانہ میں مصنف کو یونانیوں کی ہندوستان میں آنے کی بابت واقفیت تھی جس پر کسی سرگرم مشرقی محقق نے تمام مہابھارت کی بنا ہومر کی منظوم سے اخذ کیا ہوا تصور کیا۔ کیونکہ دونوں قصوں میں جنگ کی وجہ ننگ و ناموس کی حرمت ہے۔ اس قسم کی جنگ و جدل زمانہ سلف میں اکثر ہوتی رہتی تھی۔ کچھ یونان و ہندوستان ہی اس کے لئے مخصوص نہ تھے۔ چونکہ مہابھارت دنیا کی لٹریچر میں ایک لاثانی کتاب ہے۔ اسلئے شاید کسی مشرقی کو یہ لازم ہوا کہ ہندوستان کی ہر ایک خوبی کو اگر ہو سکے تو یورپ سے اخذ کیا ہوا بتایا جائے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مہابھارت کا اصلی حصہ ہومر کی منظوم سے

پیشتر لکھا گیا ہوگا۔ ہمنے کسی اور موقع پر ہمارے ہموطن بابو بنکم چندر چیٹرجی کا خیال ظاہر کیا تھا کہ نیز مہابھارت ہندوستان کے ایک اور پرانے قصہ یعنی رامائن سے اخذ کی ہوئی ہے جس کے لئے دوبارہ دلائل کا پیش کرنا نامناسب سمجھتا ہوں۔ ہمیں اس موقع پر صرف ناظرین کے سامنے بیاس کی مہابھارت اور ہومر کی ایلیڈ کے صفحے اُلٹ پلٹ کر ایک نظر دکھانا ہے تاکہ ناظرین ان کا خود مقابلہ کر سکیں ؎

اس میں شک نہیں کہ دونوں منظوم رزمیہ ہیں لیکن مہابھارت محض رزمیہ نہیں ہے۔ اس کے اندر انسانی زندگی کے تمام اُتار چڑھاؤ دکھائے گئے ہیں۔ مختلف کیریکٹرز ان کی عظمت و کمزوریاں ان کے انسانی و حیوانی جذبات لغرض انسانی جسمانی۔ دماغی و روحانی زندگی کی تمام ضروریات اسمیں موجود ہیں۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ دونوں قصوں کی بنا ننگ و ناموس کی آن ہے لیکن مہابھارت کی لڑائی انتقام کے لئے نہیں ہے خاصکر وہ شرمناک انتقام جس سے یونانی ٹرائے والوں کی بے حرمتی کرنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ گو دروپدی انتقام چاہتی تھی۔ پھر بھی سری کرشن صلح کے لئے آخر تک کوشاں رہے۔ اور لڑائی ایک انتہائی درجہ ظلم اور انسانی حقوق کے تسلیم نہ کرنے سے واقع ہوئی۔ برخلاف اس کے ہومر کی منظوم میں لڑائی محض وحشیانہ انتقام اور خونریزی کے شوق سے واقع ہوئی اور ہیلن اپنے نئے شوہر کے یہاں نہایت اطمینان سے رہنے سہنے لگی۔ اور اس پہلی لڑائی میں جسمیں اسکے دونوں خاوند فرداً فرداً لڑتے ہیں اُن ناظرین میں سے ایک تھی جسکی ہمدردی نئے خاوند کے ساتھ تھی! مہابھارت کے واقعات سے مثلاً بھیشم پتامہ سویمبر کی سبھا سے تین لڑکیوں کا چھین لیجانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ قدیم ہند میں عورتوں کا پایہ موجودہ

زمانہ سے کم تھا پھر بھی ہومر کی کتاب میں عورتوں کی حالت اس سے بھی بدتر ظاہر کیگئی ہے۔ یہاں تک کے وہ مثل مال و متاع ایک مالک سے دوسرے کو منتقل کیجاتی تھیں۔ چنانچہ یونانیوں پر لڑائے والوں کی فتحیابی کا باعث زیادہ تر اکیلیس کا لڑائی میں ساتھ نہ دینا تھا جو اپنے بادشاہ سے اس بات پر ناراض تھا کہ اُس نے نہایت خودسری سے اسکی مفتوحہ کو چھین لیا تھا۔ میرے خیال میں ہندوستان ہی ایک ملک تھا جس نے مفتوح کے ننگ و ناموس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا اور یہیں کی عورتوں نے آن کے آگے جان کی کچھ پرواہ نہ کی جس کی مثالیں ہمیں اس امن کے زمانہ میں بھی وقتاً فوقتاً ملتی رہتی ہیں۔ اسکی کیا وجہ ہے ؟ یہاں معیار ازدواج اور ملکوں سے بالکل مختلف رہا۔ ناظرین کو سیتا دمینتی۔ ساوتری وغیرہ کے افسانے یاد ہوں گے۔ جن کے مقابلہ میں ہیلن کو پیش کرنا صرف پاکدامنی کو بٹہ لگانا ہے۔ لیکن ہومر کو صرف رزمیہ نظم لکھنی تھی لہذا پاکدامنی سے اُسکو کوئی تعلق نہ تھا۔ دونوں کتابوں میں ہمیں دوستی کے عجیب و غریب مثالیں ملتی ہیں۔ اِدھر ارجن کا کرشن کے اور اُدھر اکیلیس کا پٹیر وکلس کے ساتھ گہری اور سچی دوستی۔ ایسی رنگامیزی سے منقش کی گئی ہے کہ ہمیں متقدمین کی دوستی کی بندش ازدواج سے زیادہ مضبوط اور متبرک معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سری کرشن اور ارجن کے تعلقات میں اُنکو بلحاظ رشتہ دار دوست اور اُستاد و شاگرد بنانے میں بیاس جی نے چند نزاکتیں ایسی ظاہر کی ہیں جو کہ صرف اُستاد کامل کا حق ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ رزمیہ حصہ ہومر کا مہابھارت سے بہتر ہے۔ کیونکہ ہومر کی نظم محض رزمیہ ہی ہے۔ ہومر کے بہادر ہماری آنکھوں کے سامنے بائیسکوپ کیطرح آکھڑے ہوتے ہیں اور ایک ہی دو ہاتھ میں ایک دوسرے کا کام تمام کر دیتے ہیں برعکس اسکے مہابھارت کے جودہا اپنے بیشمار ہتھیاروں کو لیکر جبکہ اسوقت

تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔ نکلتے اور ایسے عجیب و غریب کرامانی کرتب دکھاتے ہیں جس سے اُن کی لڑائی کا ایک چھوٹا خیال معلوم ہوتا ہے چنانچہ بھیشم پتامہ روز ہزاروں کا کھیت کر دیتے تھے۔ پھر کوئی یون بان۔ اگن بان اور کوئی جل بان وغیرہ چلاتے تھے کہ جسکا کچھ پتہ ہی نہیں لگتا۔ ہومر کے غازی مرد یا تو اپنی چھوٹی تلواروں سے یا نیزوں سے آپکی آنکھوں کے سامنے ایسے لڑتے ہیں گویا کہ آپ ان کی تلواروں کی چمک اور ڈھال پر گرتے ہوئے جھنکار کو دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔ پھر ہومر کے علم تشریح کو شاید ہی کوئی پہونچ سکتا ہے ہتھیاروں کے بیان میں وہ لاثانی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسنے کبھی لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ ادھر بیاس جی جو ہمیشہ جنگلوں میں پوجا پاٹ میں مصروف تھے۔ میدان جنگ کے بیان میں کہیں کہیں کراماتی ناممکنات بھی شامل کر گئے ورنہ مہابھارت کا میدان جنگ کا منظر کچھ بھی کم نہیں ہے۔

یہاں بھی صرف اتنا فرق ہے کہ ہومر کسی قدر ریالسٹک یعنی حقیقت پسند ہے۔ بیاس جی زیادہ آئیڈیالیسٹک یعنی معیار کے متلاشی ہیں۔ ہومر کا جوان گرتے ہی اس کا فاتح اسکا کام تمام کر کے اسکی زرہ بکتر اتار لینے کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ اور اسکی لاش کی بے عزتی کرتا ہے۔ مہابھارت کے جودھا غنیم کو بے قابو پاکر اور طرف مخاطب ہوتے ہیں۔ الغرض دونوں کتابیں اپنے اپنے رنگ میں یکتا ہیں۔ پھر بھی ہماری مہابھارت باوجود مختلف اشخاص کی بیجا مداخلت اب بھی دنیا کے پردے میں سب سے بڑی منظوم معلوم ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ رامائن سے بھی سبقت لیگئی جس کی بنا پر یہ پہلی نظم تیار کیگئی ٭٭٭

پریاشنکر دویارتھی

گئورکھشا پر چند اعتراضات۔ اور ان کے جواب

منسجہ ذیل اعتراضات ایک لائق انگریز نے جو پارلیمنٹ انگلستان کے ممبر ہیں۔ میرے ایک لایق دوست سے کئے تھے جو ایک دیسی ریاست میں اعلےٰ درجہ کے عہدہ پر مامور ہیں اور جنکا نام میں پبلک میں بغیر انکی اجازت کے ظاہر کرنا نہیں چاہتا ۔

نمبر (۱) اگر گئورکھشا ہندوستان میں کی گئی تو مویشیوں کی کثرت سے چارہ کی قلت ہو جاوے گی اور گائیں بھوک سے مرینگی ۔

مندرجہ ذیل جوابات میرے دوست نے اسوقت سرسری طور پر اس سوال اہم کے متعلق تحریر کئے ہیں تاکہ دیگر گئورکھشا کے حامی بھی ان پر غور کر سکیں اور اپنے خیالات کو ظاہر کریں ۔

نمبر (۱) اگر تعصب اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر بنظر انصاف دیکھا جاوے اور گئورکھشا کی اصلیت سمجھکر غور کیا جاوے تو ظاہر ہوگا کہ گئورکھشا سے ہندوستان کو بے شمار فواید حاصل ہو سکتے ہیں ۔

(نوٹ نمبر۱) ہمارا ارادہ ہے کہ ان تمام جوابات کو مرتب کر کے بشکل کتاب مفت شایع کریں جن صاحبان کے جوابات نہایت اچھے اور مدلل ہونگے۔ انکی خدمت میں چند جلد ان کتابونکی نہایت شکریہ کے ساتھ ارسال کی جاوینگی۔ یہ جوابات براہ مہربانی یکم اکتوبر سے پہلے آجانے چاہئیں ۔

(نوٹ نمبر (۲) ہندوستان کے تمام اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان کی خدمت میں عرض ہے کہ براہ مہربانی اس مضمون کو ضرور اپنے پرچہ میں درج فرمادیں مجھکو ان لائق ایڈیٹر صاحبان سے یہ بھی امید ہے کہ جن اخباروں میں یہ سوالات اور ان کے جوابات درج ہونگے وہ براہ مہربانی میرے پاس اس پتہ سے بھیجکر مجھکو ممنون و مشکور فرماوینگے ۔

میں ہوں گئو پریمیوں کا - - - - - - - - داس

پنڈت گنیشی لال ویدمالک گئورکھشنی اوشدھالیہ لشکر گوالیار بازار دولت گنج

پہلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ گئو رکھشا سے مویشیوں کی کبھی کثرت نہیں ہوگی۔ بلکہ دودھ گھی و غلے و چارہ کی افراط سے لوگ مالا مال اور خوشحال ہو جاوینگے چارہ کی قلت سے گائیں ہرگز ہرگز بھوک سے نہیں مرینگی۔ بلکہ وہ تمام بھارت باسیوں کو بھوک سے بچا دینگی اور اگر آپ اُن کی رکھشا کرو گے۔ وہ ہر طرح سے آپ کے جان و مال کی رکھشا کرینگی اور ہمیشہ کے لئے بھارت کو دعائے خیر دینگی۔ گائے اور بیلوں کی بدولت غلہ و چارہ اس افراط سے پیدا ہوگا کہ آپ لوگ اپنی ضروریات کے موافق خرچ کرتے ہوئے خواہ کتنا ہی غلہ غیر ملکوں میں بھیجیں۔ مگر پھر بھی غلہ اندازاں ہی اندازاں نظر آویگا۔ جب پیداوار زیادہ ہوگی تو نرخ میں ارزانی لازمی ہے علاوہ ازیں دودھ و گھی کی قدرتی غذا اس مقدار سے نصیب ہونے لگ جاویگی کہ جسے کھا کر ہم پھر اپنی وہی جسمانی و روحانی ترقی پیدا کر سکیں گے اور پلیگ و ہیضہ وغیرہ وبائی امراض کا دفعیہ بڑی آسانی سے کر سکیں گے۔ ہمارے دل و دماغ دودھ گھی کھا کر طاقتور ہو جاوینگے۔ اولاد زبردست پیدا ہوگی۔ ہم پوری عمر حاصل کرینگے۔ محض گئو ماتا کے پرتاپ سے پھر ہم اُسی دنیاوی بہشت میں قدم رکھیں گے جس کی بابت اکثر ہم مہابھارت و رامائن وغیرہ پرانی کتابوں میں پڑھتے اور سُنتے رہے ہیں آجکل ایک معمولی آدمی کا خرچ شہر میں آٹھ روپے ماہوار سے کم نہیں ہوتا ہے۔ مگر گئو رکھشا سے تھوڑے ہی دنوں میں ظاہر ہو جاویگا کہ چار پانچ روپیہ ماہوار میں ہر ایک انسان بڑے آرام سے زندگی بسر کر سکیگا ؎

نمبر (۳) اگر زمین گورنمنٹ چراگاہ کے لئے چھوڑ دے تو گورنمنٹ کو سرکاری عین المال میں بڑا نقصان رہیگا۔ جس کو گورنمنٹ کبھی منظور نہیں کریگی

نمبر (۲) دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ اگر گورنمنٹ گایوں کی چراگاہ کیلئے ہر ایک گاؤں میں تھوڑی تھوڑی زمین چھوڑ دے تو اس سے تھوڑے ہی عرصہ میں ظاہر ہو جائیگا کہ بجائے ایک روپیہ کے سینکڑوں روپیہ کے فوائد گورنمنٹ اور ملک کو حاصل ہوں گے۔ کیونکہ گئو پرورش کے لئے جو زمین چھوڑی جاویگی۔ اُس زمین کی پیداوار سے گایوں کی پرورش ہو کر دودھ گھی کی افراط اور گائے بیلوں

کی زیادتی اور گوبر کی کھاد کے بکثرت دستیاب ہونے سے جو غلہ کی زراعت میں ترقی ہوگی وہ اس قدر باعث ہوگی کہ ملک اور گورنمنٹ دونوں مالا مال ہو جاوینگے اور ایک پیسہ خرچ کرکے کئی روپیہ حاصل کرینگے۔ گورنمنٹ اپنی اور ملک کی بہبودی کے لئے اسکو ضرور منظور کریگی۔ کیونکہ گورنمنٹ کی مالی ترقی کا حصر صرف مزروعہ آراضی کی بیشی پر نہیں ہے بلکہ زمینداری کی خوشحالی مالی ترقی کی پوری دلیل ہے اور مویشیوں کی افراط پر زمینداری کی خوشحالی کا انحصار ہے۔ راجپوتانہ و ہندوستان کے کثیر حصہ میں ہر سال بہت سی بنجر زمین محض بیلوں کے نہ ہونے کی وجہ سے کاشت نہیں کیجاتی۔ جب بیلوں کی کثرت سے یہ زمین بھی کاشت ہوسکے گی تو گورنمنٹ کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوگا۔ اور اُسی زمین کے چارہ سے مویشی اپنے لئے خود خوراک کا سامان مہیا کریں گے۔ گورنمنٹ اور ملک کو سوائے فایدہ کے نقصان کبھی نہیں ہوسکتا۔ کافی غور کرنے سے معمولی عقل کا آدمی بھی اس مسئلہ کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے ؂

نمبر (۳) سرکاری عین المال کی کسر نکالنے کے لئے اگر زاید محصول لگایا جاویگا۔ تو عام زمینداروں کی حالت پہلے ہی نہایت خستہ خراب ہو رہی ہے۔ اور وہ موجودہ محصول کو ادا کرتے ہوئے بھی مر رہے ہیں۔ ایزاد محصول وہ کبھی دینا گوارا نہیں کرینگے ؂

نمبر (۳) نمبر ۱ و نمبر ۲ کے سوالات کے جوابات پر کافی غور کرنے سے یہ تو ظاہر ہو چکا ہے کہ مویشیوں کی خوراک کے انتظام کے لئے گورنمنٹ اور ملک کو کوئی دقت پیش نہیں آویگی۔ لیکن شروع میں اگر سرکاری عین المال کی کمی پورا کرنے کے لئے کوئی اور ٹیکس ملک پر لگا دیا جاوے۔ تو ملک بڑی خوشی سے اسکو ادا کرنے کے لئے طیار ہے۔ کیونکہ موجودہ حالت میں جہاں روپیوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ وہاں بجائے روپیوں کے ٹیکس کے لئے دو چار پیسے دیدینے کسی زمیندار کو گراں گزرینگے۔ کیونکہ اسوقت زمینداروں کی یہ موجودہ افلاس کی حالت نہیں رہیگی۔ بلکہ آپ زمینداروں کو مالا مال اور نہایت خوشحال دیکھیں گے

کیونکہ جہاں آپ دو سَو روپیوں میں کھیتی کے لئے ایک بیل ملتا ہے وہاں محض تھوڑے سے روپیہ میں بیل مل کرینگے۔ جہاں آپ گوبر کا کھاد باوجود روپیہ خرچ کرنے کے بڑی مشکل سے ملتا ہے وہاں بکثرت اور نہایت کفایت سے مل کریگا۔ اب جس ایک بیگہ میں میں ایک دو من غلہ پیدا ہوتا ہے۔ وہاں بیلوں کی زیادتی اور گوبر کی کھاد کی مدد سے بیسیوں من غلہ پیدا ہوا کرے گا۔ علاوہ ازیں جس گھی اور دودھ کے لئے آج کل زمیندار لوگ ترستے ہیں۔ وہی دودھ اور گھی خوب پیٹ بھر کر کھایا کرینگے۔ جس سے اُن کے قویٰ نہایت مضبوط اور محنت کے قابل ہونگے۔ پوری عمر کو پہنچیں گے۔ پلیگ و ہیضہ وغیرہ کسی وبائی مرض کا اُن پر اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ حکمت اور سائنس سے پوری طرح سے ثابت ہو چکا ہے کہ گھی اور دودھ کے برابر اور کوئی چیز (اینٹی پوائزن) اسے زہر کے دُور کرنے والی نہیں ہے۔ سانپ کاٹ کھائے۔ کالی مرچ اور گھی پلائیے زہر کا اثر کم ہو جاویگا۔ پلیگ ہو گھی اور اور کالی مرچ پلائیے۔ پلیگ کا زہر کچھ اثر نہ کر سکے گا۔ اگر روزانہ بھی پلیگ کے دنوں میں گھی زیادتی کے ساتھ کھایا جاوے تو پلیگ کے زہر کا بہت کم اثر ہوتا ہے۔ زیادہ تر وبائی مرض ہندوستان پر یونہی حملہ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اب گھی اور دودھ کی افراط نہیں رہی۔ انسانی جسم میں زہر بڑھتا جاتا ہے۔ اگر غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ پلیگ میں بھی زیادہ تعداد اُن بیچارے غریب آدمیوں کی ہے جنکو گھی اور دودھ کبھی نصیب نہیں ہوتا امیر جنکو کچھ دودھ گھی نصیب ہوتا ہے۔ اس موذی مرض سے بچے رہتے ہیں۔ پس ان تمام فایدوں پر نظر کرتے ہوئے کوئی زمیندار ٹیکس کے چند پیسے ایزاد دینے بڑی خوشی سے منظور کریگا۔ کیونکہ جب بجائے پیسہ کے روپیوں کا فایدہ اُسکو ہو رہا ہے ؛

نمبر (۱۳) گئو رکھشا ہونے سے گوبر کا کھاد کثرت سے ہوگا۔ اور اُس سے پیداوار میں ترقی ہوگی یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ گوبر کی کھاد میں

نمبر (۱۴) تمام ڈاکٹر اس بات پر متفق ہیں کہ جس کھیت میں گوبر کی کھاد ڈالی جاوے گی اُسجگہ بیسیوں گنا زیادہ پیداوار ہو سکتی ہے

زراعت کی ترقی کے لئے بہ نسبت اور کھادوں کے ایک خاص طاقت ضرور موجود ہے لیکن ضرورت سے زاید گوبر فضول خراب جاویگا اور اُس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور زیادہ کھاد ڈالنے سے پیداوار زیادہ ہوسکتی ہے ؛

موجودہ زمانہ میں گائے بیلوں کی کمی سے گوبر کا نام بھی عنقا ہوا جاتا ہے اور بجائے گوبر کے اور کھاد استعمال کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں پیداوار بھی نہایت کم ہوتی ہے بلا کھاد اور بیلوں کے قحط کا ہونا ضروری ہے جس سے ملک بھر میں زمینداروں میں افلاس چھا رہا ہے۔ اگر گئو رکشا سے گوبر مقدار سے زاید ہم کو نصیب ہو گیا تو اسکے فواید کا کیا ٹھکانہ ہے ہم اِس سے کھاد کے علاوہ ایندھن کا کام بھی اسی سے خوب لے لینگے۔ جس سے ہماری صحت پر بھی بہت اچھا اثر پڑے گا اور وبائی جراثیم اِس گوبر کے دھوئیں سے نیست و نابود ہو جاوینگے۔ پہلے گوبر اس افراط سے پیدا ہو جانے دیجئے۔ کہ اسکی ہمیں ضرورت ہی نہ رہے۔ پھر یہ سوال ہوسکتا تھا کہ فضول گوبر کیا کیا جاویگا۔ خیر اِسکے استعمال کے لئے بہت سے طریقے ہیں جو بیان کئے جاتے ہیں انڈین امپایر و کیپٹل اخبار میں آپنے بھی پڑھا ہوگا کہ (کیمیکل طور پر گوبر کا ایگزیمیشن کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اُس میں اِس قدر کھاد کا مادہ موجود ہے۔ کہ اگر ولایت وغیرہ کو جن ملکوں میں کھاد کم ہوتا ہے بھیجا جاوے تو ۱۱ر فی من اِس کی قیمت بہت اچھی طرح سے مل سکتی ہے آجکل قلت ہونے پر بھی ہندوستان میں آٹھ من فی روپیہ کے قریب گوبر ملتا ہے اور چونکہ وہ ہندوستان کی بھی زمین کے لئے کافی نہیں ہے۔ اسلئے ولایت نہیں بھیجا جاسکتا۔ اگر مویشیوں کی زیادتی ہوگی اور گوبر ضرورت سے زیادہ ملنے لگے گا تو آسانی کے ساتھ ولایت بھیجا جا سکتا ہے۔ جس سے تاجروں کو بہت فائدہ حاصل ہوگا۔ دوسرے اگر اسی جگہ رکھا جاوے تو بھی ہندوستان کو بہت فایدہ ہے۔ وجہ آجکل آپ دیکھتے ہیں کہ لکڑی اور کوئلوں کا نرخ اِس قدر گراں ہو رہا ہے کہ ہر ایک معمولی آدمی اسکو برداشت نہیں کرسکتا۔ بلکہ دو وقت کی جگہ ایک ہی وقت روٹی کر کے

متّی کے تیل سے لکڑی کا کام لیا جاتا ہے۔ گوبر کی بھی افراط اس وقت کو رفع کر سکتی ہے۔ ایک عام فہم آدمی بھی اس سے نتیجہ نکال سکتا ہے۔ کہ گاؤکشی بند ہونے سے اور گوبر کی زیادتی سے ہندوستان کو کس قدر فایدہ ہوگا۔

نمبر (۵) بالفرض اگر پیداوار کھاد اور بیلوں کی امداد سے زیادہ ہو بھی گئی تو بھی ہندوستان کو اس سے کچھ فایدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم آجکل دیکھتے ہیں کہ اگر کسی سال غلّہ زیادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ تو بھی نرخ میں کوئی کافی بیشی نہیں ہوتی۔ یا اسکی وجہ یہ ہے کہ جس قدر زیادہ پیداوار ہوتی ہے۔ اُسی قدر غیر ملک والے زیادہ مقدار سے غلّہ ہندوستان سے باہر لیجاتے ہیں جس سے ہندوستان میں کبھی نرخ غلّہ میں ارزانی نظر نہیں آتی۔ میرے خیال میں یہی ایک سبب آج کل گرانی غلّہ کا ہے ورنہ گئو رکھشا نہ ہونے سے اتنا نقصان ہندوستان کو نہیں ہے۔

لیکن اگر ہندوستان کے فایدے پر نظر کر کے تجارت برآمد غلّہ کو بند کر دیں۔ تو اسمیں شک نہیں کہ ہندوستان میں غلّہ بھی ضرور سستا ہو جاویگا۔ مگر ساتھ ہی وہ تمام فواید جو تجارت برآمد سے تجار لوگ اٹھاتے ہیں اور وہ تمام لوگ جو اسی روپیہ سے باہر کی عمدہ عمدہ چیزیں منگوا کر استعمال کر رہے ہیں۔ تمام

نمبر (۵) پہلے سوال کے جواب پر کافی غور کرنے سے اصلیت ظاہر ہو جاویگی کہ جب پیداوار غلّہ کافی مقدار سے ہوگی تو خواہ کتنا ہی غلّہ باہر غیر ملکوں میں بھیجا جاوے۔ نرخ میں ضرور ارزانی ہوگی اور اس سے تجارت کو تنزل نہیں بلکہ ترقی ہوگی اور ہم موجودہ زمانہ کی حالت سے کچھ عرصہ کے بعد اپنے آپ کو بدرجہا اچھی حالت میں پاوینگے۔ سمت ۵۶ و سمت ۶۲ کے قحط کے نرخ سے سمت ۵۷ و سمت ۶۶ و سمت ۶۷ کے سمت کے نرخ سے مقابلہ کرنے سے صاف ظاہر ہے۔ کہ پیداوار زیادہ ہونے سے نرخ میں ضرور ارزانی ہوتی رہی ہے۔ جب غلّہ کثرت سے پیدا ہوگا۔ تو یہی نہیں کہ ہندوستان کو ہی فایدہ پہونچے۔ تجارت پیشہ بھی اس سے فایدہ نہ اٹھاوینگے۔ بلکہ وہ دُور دُور کے ملک جہاں یہ غلّہ ہندوستان سے ہر سال جاتا ہے۔ ارزانی کی وجہ سے فایدہ اُٹھا سکیں گے۔ اول یہ کہ زیادہ مقدار میں غلّہ ملنے کی وجہ سے وہ اس قدرتی خوراک کو زیادہ وارزاں حاصل کر کے بجائے حیوانی خوراک کے

باتوں سے بھارت باشیوں کو محروم رہنا پڑیگا اور ملک میں پھر افلاس چھا جاویگا - کیونکہ تجارت کو بڑا بھاری ضعف پہونچیگا - ایسی حالت میں کوئی عقلمند آدمی اس بات کو کبھی گوارا نہیں کریگا ؛

کام میں لاسکتے ہیں جیسے کہ ان کے دل و دماغ کو بہت زیادہ فایدہ ہوگا - کیونکہ آجکل کل ڈاکٹر اس بات کے متفق ہیں کہ انسان کی اصلی خوراک اناج ہے - گوشت انسان کو ہر قسم کی امراض میں مبتلا کرتا ہے اور خواہشات حیوانی دل و دماغ میں جوش زن رہتی ہیں - کل دنیا کو انسان بنانے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ گئو رکھشا کیجاوے - جس سے اناج اس قدر کثرت کے ساتھ پیدا ہو کہ بنی نوع انسان اناج و میوہ جات ہی کھا کر بسر کریں - اور اس حیوانی خوراک سے انسان کا ہمیشہ کے لئے پیچھا چھوٹ جاوے ؛

نمبر ۴ اکبر بادشاہ کے زمانہ کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ خراب نہیں - بلکہ بہت اچھا ہے - اُسوقت کی نسبت پیداوار بھی اب بھی اچھی ہے ہندوستان مالدار بھی زیادہ ہوگیا ہے ریل و تار و دیگر برقی آلات سے ہندوستان بہت فائدہ اٹھا رہا ہے جس سے بیلوں کی آجکل قدرتاً کوئی ضرورت بھی نہیں رہی دوسرے ملکوں کی نظیر ہم کو صاف بتلا رہی ہے کہ بغیر بیلوں کے کام بنہایت عمدہ اور آسانی سے چل سکتا ہے - بلکہ اب پنجاب میں بھی اکثر جگہ تجربہ ہو چکا ہے کہ جو کام بہت سے بیل اور آدمی ملکر زراعت کے متعلق کیا کرتے تھے - وہ اب آہنی کلوں سے بہت کم خرچ میں بنہایت آسانی سے ہو رہا ہے پس اگر بیلوں کی کمی ہو جاوے تو کوئی پرواہ

نمبر ۴ اکبر بادشاہ کے زمانہ کے مقابلہ میں آجکل کا زمانہ گو بہت سی باتوں میں بیشک ترقی پر ہے مگر جو سوالات گئو رکھشا سے تعلق رکھتے ہیں اگر ان کی بابت غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ اُن میں کیا کیا کمی ہے - جو گئو رکھشا کرنے سے بھی پوری ہو سکتی ہے اور اگر ہماری مہربان گورنمنٹ نے گئو رکھشا کا بیڑا اٹھا لیا تو آپ دیکھینگے کہ بہت سے سوالات جو آج کل بڑے زور کے ساتھ معرض بحث میں لائے جاتے ہیں - بالکل معدوم ہو جاوینگے مثلاً ہندوستان پہلے کی نسبت غریب ہے یا امیر - اس کا کچھ اُن ہی لوگوں کو زیادہ تجربہ ہے - جو ہندوستان کی غریب رعایا سے پورے طور پر واقف ہے

کی بات نہیں ہے۔ ہم آہنی کلوں سے بہت اچھا اور آسانی کے ساتھ کام چلا سکتے ہیں گئو رکھشا کی ایسی ضرورت نہیں ہے ۔	اور جن کی رائے ہے کہ ہندوستان پہلے کی نسبت زیادہ امیر نہیں۔ اگر گئو رکھشا کیجاویگی تو ہندوستان اسقدر مالا مال ہوجاوے گا۔

کہ اس سوال کے پیش ہونے کی ضرورت بھی نہ پڑیگی۔ آجکل ہندوستان افلاس سے سخت پریشان ہو رہا ہے۔ پیداوار میں اب بہت کمی ہوگئی ہے۔ معدودے چند مالدار تاجروں کو چھوڑ کر ہندوستان کی عام رعایا زمینداروں اور مزدوروں کی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے۔ اسکے افلاس کی کافی تصدیق ہوتی ہے۔ ریل تار و دیگر برقی آلات کے ہونے کے باوجود بیلوں کی آجکل اشد ضرورت ہے۔ دوسرے ملکوں کی نظیر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ بغیر بیلوں کے وہ کس مصیبت سے اپنی گزران کر رہے ہیں پنجاب میں بھی تجربہ سے ظاہر ہو چکا ہے کہ جو معمولی کسان ایک معمولی بیل اور معمولی دیسی آلات کشاورزی و گوبر کی کھاد سے زراعت کی پیداوار میں ترقی کر سکتا ہے وہ باوجود ہزاروں روپیوں کی کلوں کے موجود ہونے کے اب اُس قدر پیداوار حاصل نہیں ہوتی۔ تھوڑے سے روپیہ سے بیل کی گزران ہو سکتی ہے۔ ان آہنی کلوں کی محض درستی میں ہر سال سینکڑوں روپیہ فضول برباد جاتے ہیں اگر اُن کی قیمت اور سود کا لحاظ کیا جاوے تو بالکل نقصان ہی نقصان نظر آتا ہے۔ مگر کیا کیا جاوے۔ اگر یہی حالت رہی تو مجبوراً ایسا ہی کرنا پڑیگا کل وغیرہ عام طور سے زراعت کے لئے مفید نہیں ہو سکتیں۔ عام فایدہ تو بیلوں سے ہی ہو سکتا ہے۔ جسکو ہر ایک زمیندار رکھ سکتا ہے۔ علاوہ اسکے آہنی کلیں صرف انسان کے لئے زمین ہی جوت سکتی ہیں۔ نہ اُسکو گوبر کرکے ایندھن کا کام دے سکتی ہیں۔ نہ کھیت جوتنے کے بعد گاڑی میں جُت کر غریب کا کرایہ وصول کرکے گزارہ کر سکتی ہیں۔ باوجود ریل ہونے کے بھی گاڑیوں کے بوجھ لادنے کی اس قدر ضرورت ہے کہ دو روپیہ روز کو بھی گاڑی میسر نہیں آتی کیا کل

اِس کمی کو پورا کرسکتی ہے - نہیں ہرگز نہیں ❖

بیل مرنے کے بعد اپنے آقا کو اپنی اصلی قیمت آپ نذر کرجاتا ہے - چمڑہ و ہڈی سینگ وغیرہ سب ملاکر پندرہ بیس روپیہ کی مالیت ہوتی ہے - کل ٹوٹنے کے بعد سوائے مالک کے وبال ہوجانے کے اور کیا کرسکتی ہے ❖

جو صاحب فرماتے ہیں کہ کل سے ہندوستان میں زراعت ہوسکتی ہے اُنکو شاید ریتیلے میدانوں کا تجربہ ہوگا - پہاڑی زمین سے اُنکا کام نہ پڑا ہوگا - جہاں یہ کلیں بالکل بیکار ثابت ہوچکی ہیں - اور وہاں ہمارا غریب بیل بھی غریب کسان کی ناؤ کو پار لگاتا ہے ❖

نمبر (۷) گئو رکھشا سے چمڑے کی تجارت کو بہت بڑا نقصان پہونچیگا - اور وہ تمام فواید جو چمڑے سے ہمکو حاصل ہیں اُن سے ہمکو محروم رہنا پڑیگا

نمبر (۷) جب مویشی زیادہ پیدا ہونگے تو قدرتاً زیادہ مرینگے - جس سے بجائے کمی کے چمڑا زیادہ مقدار سے پیدا ہوگا اور تمام فایدے جو چمڑے سے ہم کو حاصل ہیں بدستور ہم حاصل کرسکیں گے کیونکہ محض ذبح کرنے سے ہی چمڑا زیادہ پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ بیل زیادہ ہونے سے ضرور چمڑے کی زیادتی ہوگی - جو تجارت کو بجائے نقصان کے زیادہ بڑھاویگی - اور چمڑہ بھی اصلی حالت میں اُتریگا - جو ذبح کرنے کی حالت میں ہرگز دستیاب نہیں ہوسکتا - ایک گائے کو جو مار ڈالی جاوے تو ایک ہی چمڑہ مل سکتا ہے - اگر زندہ رہے تو اسکی ہر ایک اولاد اور پھر اُنکی بھی اولاد ہر ایک آپ کو ایک ایک چمڑہ دیکر پھر اس دنیا سے جاویگی - کیں چمڑے کے لئے آپ ہرگز ہرگز نہ گھبراویں ایک چمڑے کی بجائے ہزاروں چمڑے آپکو اِس گئو رکھشا کی بدولت مل سکیں گے ❖

نمبر (۸) جو گائیں کہ اب گورہ فوج کی خوراک کے لئے ہلاک کیجاتی ہیں - اگر اسکو بند کردیا - تو گورہ فوج کیا کھاویگی - بغیر غذا کے گورہ فوج لڑائی میں اچھی طرح سے کام نہ دے سکے گی ❖

نمبر (۸) جب یہ بات ظاہر ہوچکی ہے کہ دودھ و گھی کے برابر مقوی غذا دنیا بھر میں کوئی نہیں ہے تو بجائے گائے کے گوشت کے گورہ سپاہیوں کو قدرتی غذا دودھ و گھی کھلاکر

اگر بجائے گائے کے دوسرے جانور بھیڑ بکری وغیرہ استعمال کئے جاویں۔ یا بقول آپکے امریکہ اور آسٹریلیا سے رین ڈیر وبڑی مچھلیوں وغیرہ کا نمکین گوشت جو ٹینوں میں بند ہو کر آتا ہے۔ استعمال کیا جاوے۔ گو اس میں تو شک نہیں کہ گائے کی نسبت ان جانوروں کا گوشت نہایت ستا اور کھانے میں عمدہ ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی ایک قسم کی سخت بیرحمی میں داخل ہے۔ بجائے گائے کے دوسرے جانور ہلاک کئے جاوینگے۔ پس اگر غور کیا جاوے تو گئو رکھشا سے ہندوستان میں بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ ہوگا ❊

شائستہ اور مہذب کیوں نہ بنایا جاوے۔ ورنہ دوسری حالت میں امریکہ اور آسٹریلیا سے رین ڈیر وبڑی مچھلیوں وغیرہ کا نمکین گوشت جو ٹینوں میں بند ہو کر آتا ہے اور جسکو آپ خود تسلیم کر رہے ہیں کہ گائے کے گوشت سے نہایت سستا اور عمدہ ہوتا ہے منگا کر استعمال کیا جاوے۔ بیشک یہ بھی ایک بیرحمی ہے مگر گایوں کے مارنے میں بیرحمی کے علاوہ ملکی نقصان بھی شامل ہے۔ اور اسمیں محض بیرحمی ہے۔ اگر آپ واقعی سچے دل سے بیرحمی کو برا سمجھتے ہیں۔ تو بڑی خوشی کی بات ہے آپ اسکو بھی ترک کر دیجئے اور دودھ دگھی پر گورہ فوج کا گزارہ کیا جاوے۔ اِس سے بڑھکر قدرتی غذا اور کوئی مقوی ثابت نہیں ہوئی ہے۔ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جاپانی جو محض نباتات پر گزارہ کرتے تھے کاسکس کے مقابلہ میں جو گوشت خور تھے۔ کس طرح سے فتحیاب رہے۔ دنیا کی تاریخ میں دوسری کوئی ایسی مثال اس جنگ کے برابر نہ ملیگی ❊

پروفیسر رام مورتی کرتبوں نے آج تمام دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ اور لاکھوں انگریزوں کو ویجیٹیرین بنا دیا ہے۔ پس رحمدلی کا لحاظ کرتے ہوئے ہر ایک گورہ سپاہی کو پروفیسر رام مورتی کا نمونہ بنا کر جاپانیوں کی طرح جنگ میں فتحیاب ہونے کا طریقہ بتا دیں اور قدرتی غذا دودھ وگھی انکو خوب کھلا کر مہذب اور شائستہ بنا دیں ❊

نمبر (۹) دولتمند کے لحاظ سے ہندوستان   نمبر (۹) دولتمند کے لحاظ سے بھی ہندوستان

اب بہت مالدار ہے بجز چند برہمنوں کے جو کچھ کام کرنا نہیں جانتے۔ مفت بلا محنت گھر بیٹھے ہوئے کھانے کے عادی ہو گئے ہیں اور سب لوگ نہایت خوش اور آسودہ حال ہیں۔ پس گورنمنٹ کو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ محض برہمنوں کے لئے تجار و دوسری قوموں کے فایدوں کو نظر انداز کرکے خواہ مخواہ گئو رکھشا کا حکم دیدے۔ شاید کوئی ہندو رئیس ایسا کر سکتا ہے۔ مگر ولایت کی پارلیمنٹ میں بڑے بڑے لائق انگریز موجود ہیں۔ وہ کبھی ایسے مہمل اور لچر سوال کو پیش تک کرنے کی اجازت نہیں دیںگے۔ گئو رکھشا کا سوال ایسا کمزور ہے کہ تعصب کو چھوڑ کر تو کیا تعصب کو ساتھ لیتے ہوئے بھی مندرجہ بالا باتوں کا کافی و شافی جواب نہ دے سکیں گے۔ بارہا میں بڑے بڑے لایق آدمیوں سے گفتگو ہوئی ہے۔ وہ بھی ان سوالات کا جواب تشفی آمیز دے سکے۔

مالدار نہیں۔ بلکہ افلاس کا شکار ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے لایق محقق انگریزوں کی رائے ہے کہ معدودے چند تاجروں کو چھوڑ کر عام رعایا اور زمیندار افلاس کے ہاتھوں نہایت تنگ ہو رہے ہیں۔ بلکہ ہزارہا مزدور سڑکوں پر فاقہ کشی سے جانیں ضایع کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ برہمن قوم کی حالت ہندوستان میں مالی حیثیت سے نہایت گری ہوئی ہے مگر برہمنوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی خوش اور آسودہ حال نہیں ہیں۔ بلکہ افلاس سے اُن کا قافیہ بھی سخت تنگ ہو رہا ہے تجار لوگ بھی گئو رکھشا کے نہ ہونے سے سخت تنگ حال ہو رہے ہیں۔ پس جب ہندوستان کی عام حالت ایسی ردی اور خراب ہے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ ہماری پیاری گورنمنٹ تمام ہندوستان کی اور اپنی بہبودی پر غور فرما کر انصاف اور معدلت کو کام میں لا کر گئو رکھشا کا حکم دیدے۔

ہندو اور مسلمان رعیتوں کے علاوہ تمام رحمدل غیر متعصب منصف مزاج لایق انگریزوں نے انسانی زندگی کا اعلیٰ فرض سمجھ کر اس نیک کام میں دل و جان سے کوشش اور امداد فرمائی ہے۔ ولایت کی پارلیمنٹ میں بھی بڑے بڑے لایق انگریز موجود ہیں۔

وہ گئو رکھشا کی اصلیت پر غور کر کے انصاف کو کام میں لا کر اسکے مخالفوں کے مہمل اور بیہودہ اعتراضات کو رد کرتے ہوئے ضرور گئو رکھشا کے لئے سفارش فرما دینگے۔ اور بموقعہ کورونیشن دربار دہلی میں ہمارے ہر دلعزیز منصف مزاج رحمدل مہاراجہ ادھیراج جارج پنجم شہنشاہ و قیصر ہند تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہی سب سے پہلا مبارک حکم یہی دیں گے۔

"کہ آیندہ کے لئے گائے کی نسل محفوظ کی گئی"

پس اس حکم کو سنتے ہی بیچاری غریب مظلوم بے زبان گائے زبان حال سے ہمارے پیارے بادشاہ کو دعا خیر دیگی۔

دعا

سنتے ہی اس حکم کے مشکور ہو کے بولی | بلہاری جاؤں قیصر میں شرن تیری ہو لی
مسکین غریب اور میں جو بے زباں ہوں گیا | پنڈت دعا یہ دو ہوں مقبول کراے دئیا

چمکیں یہ چاند سورج جبتک رہیں ستارے
قیصر کا باجے ڈنکا ہو راج جگ میں سارے

اور ہندوستان کی تیس کروڑ رعایا تہ دل سے شکریہ ادا کرے گی اور اپنی جان و مال پیارے قیصر پر نچھاور کرنے کے لئے تیار رہے گی۔ یہ ایک مبارک پیشگوئی ہے۔ اس سین کو ضرور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

اوپر کے جوابات پڑھنے سے صاف ظاہر ہو سکتا ہے کہ یہ سوالات کیسے لچر اور پوچ تھے کہ جن کا جواب ایک معمولی آدمی بھی وضاحت کے ساتھ دیسکتا ہے۔ اے بھائیو جذبہ حیوانی کے زیر اثر انسانیت سے دور نہ بھاگو۔ بیرحمی جبکا آپ خود اقرار کر رہے ہیں۔ ذرا اُس سے پرہیز کیجئے۔ پھر دیکھئے کہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہی آپکو اصلیت نظر آنے لگیگی۔ اور ایسے پوچ اور لچر اعتراضات آپکے دماغ میں آکر آپکو دھوکا نہ دینگے۔ الراقم بندہ پنڈت گنیشی لال دید مالک گئو رکھشنی اوشدھالیہ لشکر گوالیار بازار دولت گنج۔

پوتر ہردوار کے پوتر تیرتھ پر ایک معمر بزرگ سادھو مہاتما کے عطیہ اور میرے ۴۱ سالہ مجرب دو نسخے برفی و لڈو کے برائے دفعیہ جریان و احتلام و کمزوری ہر قسم مقوی دل و دماغ و جسم۔

معزز ایڈیٹر رسالہ زبان نمستے۔ اگر آپ ناظران دو مجرب نسخوں کو

نسخہ اول برفی

جو کہ میرے ۴۱ سالہ تجربہ شدہ ہیں برائے فوائد ناظرین زبان ہو بہو رسالہ فرما کر مشکور فرماویں۔ کرپا ہوگی۔ بھمیری گوند جسکو کہ سنویاں گوند کہتے ہیں۔ ۳۲ تولہ لیکر خوب صاف کر کے ۳۲ تولہ خالص گھی گائے میں خوب تل کر سرخ کر لو۔ اس گوند کے تلتے وقت جس قدر زیادہ گھی صرف کروگے اُس قدر زیادہ یہ پھولیگی۔ اسقدر پھولتی ہے کہ کڑاہی بھر جاتی ہے ۳۲ تولہ گوند کے لئے زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ تولہ گھی کافی ہے مگر ۳۲ تولہ سے کم بھی نہ ہو بلکہ اسی تولہ تک لو۔ گوند کو خوب سرخ کر کے باریک پیس لو اسکے بعد مغز بادام مقشر ۳۲ تولہ خوب باریک پیس کر ۱۶ تولہ گھی میں ۱۰ منٹ تک خوب بھون لو۔ بعد ازاں کھویا دودھ گائے کا وزنی ۶۴ تولہ جو کہ گھر کی گائے کا ہو یا خالص دودھ گائے کا ہو۔ ۱۶ تولہ گھی گائے میں خوب بھون کر سرخ کر لو۔ اس کے بعد ۱۲۸ تولہ مصری دیسی کی چاشنی کر دو جبکہ خوب گاڑھی ہو جاوے یعنی پکنے کو جاوے تو اسمیں سب سے اول مغز بادام ڈالکر خوب ہلاؤ اور بعد ازاں کھویا و گوند اور پانچ تولہ پسا ہوا الائچی دانہ ڈال کر خوب ہی رلا ملا دو۔ گوند وغیرہ ملاتے وقت ساتھ ہی اسمیں ۵ بوند تیل سونف یا پودینہ بھی ڈال دو۔ اسکے بعد یہ سب کچھ ملا ہوا ایک چوڑے تھال یا پرات میں ڈال دو۔ مگر اس تھال یا پرات کو گھی سے خوب چپڑ لو۔ بعد ازاں ڈالکر چاروں طرف پھیلا کر ایک سطح کر کے جما کر اوپر سے ورق نقرہ چسپاں کر دو اور ۲ گھنٹے کے بعد ٹکڑیاں بنا لو اور ایکسال تک مرتبان میں رکھ دو یہ لذیذ برفی ۵ تولہ روزانہ علی الصباح ۸ بجے کھا کر اوپر سے

تازہ بتازہ دودھ گائے مصری ڈالکر نوش کرد۔ اور اسی طرح سے شام کو ۵ بجے کھاؤ اس کے استعمال سے تمام جسمانی کمزوری دور ہوگی دماغ کو خوب طاقت ملیگی تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے یہ برفی مفید ہے۔ تمام وکیلوں۔ مختاروں۔ بیرسٹروں۔ کالجوں کے پروفیسروں سٹوڈنٹوں۔ اخباروں کے ایڈیٹروں منیجروں۔ سکولوں کے ماسٹروں طالب علموں مولویوں حکیموں۔ واعظوں۔ لیکچراروں۔ ایڈیٹروں۔ سٹیشن ماسٹروں۔ ہمیشہ سفر میں رہنے والوں اور تمام کلرکوں غرضیکہ دماغ سے کام لینے والوں کو اس برفی کا روزانہ استعمال کرنا ضروری ہے بچوں کو یہ برفی کھلانے سے ان کے جسم کے اور دماغ کی نشو ونما کی حالت خوب ترقی کرتی ہے۔ زچہ عورتوں کو بھی یہ برفی کھلا دے گر کھوپا نہ ڈالیں اور خوراک بجائے ۵ تولہ کے ۲½ تولہ دیویں مٹھائی کی مٹھائی اور دوائی کی دوائی ہے۔ جو اصحاب ایک بار اسکو استعمال کرینگے وہ بازاری مٹھائی کے پھر نزدیک نہ جاویں گے۔ بڑی لذیذ اور مقوی ہے۔

نوٹ گوند کو خوب تل لیا جاوے نہ تو خام ہی رہے اور نہ جل جاوے۔ خام رہنے سے کوئی بھی اچھی طرح سے نہ جاویگی اور زبان کو لگیگی اور کچی چاشنی رہنے سے برفی جم نہ سکے گی اس لئے خوب احتیاط رہے کہ چاشنی اس قسم کی ہو جاوے جس میں کہ ۳۲- ۴۲ تولہ مغز بادام۔ گوند و کھوپا پڑ کر برفی جم سکے۔ بہت پختہ چاشنی بھی نہ ہو جاوے ورنہ برفی کے بجائے پنجیری بن جاویگی جسکو پنجاب میں کسار کہتے ہیں۔ اسلئے خوب عمدہ قسم کی چاشنی بنا دیں ببھیری گوند خریدتے وقت احتیاط رہے یہ گوند آٹے کی سنیوں کی طرح سے لڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا نرخ فی سیر پختہ دو روپے کا بازار میں ہے۔ اگر کسی کو نہ مل سکے تو مجھے مطلع فرما دیں اور پیشگی قیمت ارسال کریں ۱۲ قیمت اور ۲ محصول ۲ رجسٹری کردائی اور پیکنگ کل ۔ کا منی آرڈر ایک سیر پختہ گوند کے لئے آنا چاہئے۔ اور آدھ سیر پختہ پر ۔ صرف ہوگا۔ میں ملازمت پیشہ ہوں وی پی کے لئے کوئی صاحب تحریر نہ کریں

+ + + + + + + + + + + + + + + + +

نسخہ دوم لڈو مقوی جسم و دماغ برائے استعمال ہر موسم خصوصاً موسم

لڈوؤں کے استعمال سے جسم میں طاقت و حرارت بصارت میں نور چہرہ پر رونق خون میں سرخی بدن میں فربہی و صبیرج میں گاڑھا پن پیدا ہوتا ہے۔ برابر دو ماہ تک ان کا استعمال کیا جاوے نسخہ یہ ہے۔ مغز کدو۔ مغز تربوز۔ مغز پیٹھا۔ مغز کھیا۔ مغز کھیرہ۔ مغز گری مغز کاہو۔ مغز خربوزہ۔ ہر ایک دس دس تولہ۔ اگر خواہش ہووے تو مغز بادام بھی دس تولہ۔ کیکر کا گوند آدھ سیر پختہ۔ کھانے کے کھیل پاؤ بھر پختہ۔ الائچی دانہ پسا ہوا ۵ تولہ۔ مصری ۲ سیر پختہ۔ گھی خالص گائے ایک سیر پختہ۔ سب مغزوں کو یکجا اور گوند و کھیل کھانہ کو الگ گھی میں تل لیں۔ اور کوٹ کر خوب باریک پیس لیں اس قدر کہ بونیں کہ کوٹنے سے خوب باریک ہو جاویں کچے نہ رہیں۔ پھول کھانے گھی میں ڈالنے سے خوب پھولتے ہیں ان کے لئے ذرا زیادہ گھی ڈالا جاوے اسکے بعد مصری کی چاشنی کریں جبکہ خوب پک جاوے تو اسمیں سب مغزیات و گوند و کھیل کھانہ کٹے ہوئے مع الائچی دانہ ڈال کر خوب رلا ملا کر دو دو تولہ کا لڈو باندھ لیں۔ خوراک ایک لڈو ہے جو ہضم کر سکے وہ ایک سے زیادہ بھی کھا سکتا ہے۔ یہ لڈو ہر مزاج کے موافق آتے ہیں اور بڑے لذیذ ہیں۔ چاشنی میں ڈالتے وقت اگر خواہش ہووے تو کچھ میوہ جات بھی ڈال سکتے ہیں۔ چاشنی خوب پک جاوے جس میں کہ یہ سب اشیاء کی کھپت ہو کر لڈو بن سکیں۔ فی لڈو رات کو سوتے وقت ہمراہ دودھ کھانے سے حاجت صبح کے وقت کھل کر ہوتی ہے۔ صبح و شام بوقت ۸ و ۵ بجے دو دو لڈو ہمراہ دودھ استعمال کریں اور پھر ۲ ماہ کے بعد طاقت کا امتحان کریں۔ جو صاحب برنی بھیری گوند اور یہ لڈو مقوی اکٹھے استعمال کرنا چاہیں۔ وہ صبح ۸ بجے کے وقت برنی ۵ تولہ ہمراہ دودھ گائے کے استعمال کریں۔ اور شام کو ۵ بجے دو لڈو کھا دیں۔ اوپر سے دودھ ملائی ملا ہوا نوش کریں۔ پھر دو ماہ کے بعد طاقت کا مزہ دیکھ لیں گے۔ میں نے ان ہر دو نسخوں کو برابر دو سال تک ہر سال میں چھ ماہ استعمال کیا ہے سب بڑے ہی لذیذ ہیں۔ جن اشخاص کے

پاس ان کے برابر استعمال کرنے کے لئے دولت ہو وہ بارہ ماہ استعمال کر سکتے ہیں۔
تمام برائے نام مقوی اشتہاری ادویہ کے مقابلہ میں ان پر لاگت بھی کم آتی ہے
اور لذیذ و مقوی بھی بہت ہی ہیں۔ دماغ سے کام لینے والا ہر ایک شخص اپنی طاقت
کے مطابق ان کا استعمال لگاتار کرے اور پھر طاقت کا مزہ اُٹھا دے۔ ان ہر
دو نسخوں کی شہرت ٹنکر جہلم پور۔ پلی بھیت۔ لائل پور۔ پنچ چھاونی۔ اندور تک تمام
کے آریہ بھائیوں نے مجھ کو خطوط لکھ کر طیار کر دا کر منگوائے اور سب نے مفید پائے
میں ان کے زیادہ تعریف کرنا مبالغہ خیال کرتا ہوں۔ اس خیال سے ان نسخوں کو
ظاہر کر دیا ہے کہ نہ معلوم کب دم نکل جاوے۔ ورنہ یہ نسخے میرے دل میں ہی رہ سکیں گے
معزز ایڈیٹر آپ بھی ان کا استعمال کریں اور اپنے پریوا متروں رشتہ داروں
مہربانوں کو بھی ان کے لگاتار استعمال کرنے کی ہدایت کریں۔ اور نتیجہ سے
مجھ کو مطلع کریں۔

راقم

امیر چند آریہ شہر لاہور۔ چونی منڈی۔ کوچہ سودان برمکان پنڈت ہیرالال جی

التماس

اب کی دفعہ ہم پروفیسر رچی رام صاحب ساہنی کی عکسی تصویر رسالہ میں شائع
کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن باوجود کوشش اب بھی ان کے متعلق کوئی
نوٹس دستیاب نہ ہو سکا۔ اُمید کہ کوئی صاحب براہ مہربانی ایک ہفتہ
کے اندر ان کی سوانح عمری کے متعلق ایک صفحہ فلسکیپ مضمون بھیجکر
ہمیں شکریہ کا موقع دینگے۔

منیجر



زبان

ایڈیٹر تارک قوم اکبرآبادی

ڈاکٹر مسٹر اوزیری ایڈیٹر

سائنس اور لٹریچر کا ماہواری رسالہ

فہرست مضامین

زبان پریس دہلی میں چھپا

زبان

یعنی ایس۔ پی۔ ایس۔ کے لاہور کا ماہواری ارگن
متعلق سائنس و متفرقات

ہیضہ

یہ ایک متعدی (یعنی چھوت سے لگنے والی) بیماری ہے۔ جو وقتاً فوقتاً نمودار ہوتی ہے اسکی عام علامات شدید دست وقے ہیں جنکو ہم آگے بالتفصیل بیان کرینگے۔

اسباب۔ اس مرض کے پیدا ہونے میں کئی اسباب شامل ہوتے ہیں جن میں سب سے مقدم ایک جاندار زہر جرم ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اجرام مانند بیج کے ہیں جو بغیر اسکو قبول کرنیوالی زمین اور موافق پرورش کنندہ سامان کے کارگر نہیں ہو سکتے۔ لہذا محض ہیضے کے اجرام انسان کو نقصان نہیں دیسکتے جب تک اسکے جسم میں ان کو قبول کرنے کی خاصیت اور انکی پرورش کرنے کے موافق سامان (یعنی آنتوں کے اندر گندگی وغیرہ) نہ ہو۔ اسلیئے اس مرض سے بچنے کے لیے ہمیں ان تینوں باتوں کو مد نظر رکھنا چاہیئے اوّل اجرام دوئم جسمانی کمزوری سوئم آنتوں کے اندر گندگی جو کہ ثقیل اور خراب غذا سے پیدا ہوتی ہے۔

اوّل اجرام۔ یہ کسی ذریعہ سے (زیادہ تر انسانی آمدورفت سے) ایک مریض سے دوسرے تک پہونچائے جاتے ہیں اور انسان کے اندر بذریعہ پانی۔ دودھ و غذا وغیرہ داخل ہوتے ہیں۔ لہذا محض چھونے سے یا سانس کے ذریعہ اڑکر لگنے کا خطرہ نہیں ہے اگر کافی احتیاط کیجائیں یہ زہر زیادہ تر معدہ و آنتوں میں محدود رہتا ہے اور ان پر

خراش پیدا کرتا ہے کہ قدرت اِن کو بذریعہ دست وقے جسم سے خارج کرتی ہے۔ گو کہ اجرام علاوہ آنتوں کے جسم کے اور کسی حصّہ میں نہیں پہونچتے۔ لیکن اِن سے پیدا شدہ زہر بذریعہ دوران خون، دل و دماغ کو مبتلا کر کے موت کا باعث ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں دست وقے کے ذریعہ سے اسقدر جسمانی رطوبت خارج ہو جاتی ہے۔ کہ خون گاڑھا ہو کر دَوران خُون میں قباحت پیدا کر دیتا ہے جو نبات خود موت کا باعث ہے۔ ہم علاج میں اِن باتوں کو مدنظر رکھیں گے ◆

دویم۔ جسم میں مرض کو قبول کرنے کی خاصیت محض عضلاتی (یعنی پٹھوں کی طاقت یا جسامت پر منحصر نہیں ہے لیکن عموماً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنکی عام صحت اچھی ہے اُن کے جسم میں کسی قسم کے اجرام بہ آسانی پرورش نہیں پا سکتے۔ مگر انسانی جسم عارضی طور پر بیماری کی دہشت۔ موسم کی گرمی۔ جسمانی محنت۔ ہر قسم کی بے اعتدالیوں سے ایسا کمزور ہو سکتا ہے۔ کہ باوجود اچھی صحت کے اجرام ہیضہ سے موثر ہو کر اِس بیماری کا شکار بنجاتا ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یہ اجرام بعض شخصوں کے براز میں پائے گئے ہیں جنکو کوئی بھی ہیضہ کی شکایت نہیں ہوئی۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجرام کے علاوہ بیماری کے لئے دیگر اسباب بھی ضروری ہیں۔

سویم پرورش کنندہ مادہ کی بابت جو کہ اِن اجرام کو آنتوں میں نشو و نما دیتے ہیں ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جو چیزیں آنتوں میں سڑ سکتی ہیں۔ مثلاً ثقیل چیزیں۔ مانند بھُنے کچالو۔ تلی ہوئی پکوڑیاں۔ بڑیاں۔ زیادتی دال و لحمی غذا۔ زیادہ پکے ہوئے (سڑنے کے درجہ تک) میوہ جات۔ انبہ۔ امرود وغیرہ وغیرہ سے حتی الامکان پرہیز کریں۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اجرام زندہ چیزوں میں سے ہیں۔ لہذا اِن کے زندہ رہنے کے لئے کسی قسم کی خوراک ضروری ہے۔ وہ خوراک اِنکو آنتوں کی گندگی سے بکثرت ملتی ہے۔ علاوہ ازیں زیادتی لحمی مادہ جو دال میں بھی موجود ہے اگر جسم میں تحلیل و جذب ہو کر کلیۃً طور پر

قارورہ کے ذریعہ سے خارج نہ ہو (جیسا کہ ہونا چاہیئے) تو براز میں خارج ہوتا ہے۔ آنتوں میں لحمی فضلہ اجرام کی پرورش کو بڑی مدد دیتا ہے۔ اسلئے زیادتی لحمی غذا سے بھی کچھ اجتناب چاہئے

علامات۔ اس مرض کی علامات مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہیں۔

اجرام ہیضہ کے جسم میں سرائت کرنے کے بعد تین دن کے اندر اور بعض دفعہ بارہ گھنٹہ کے اندر علامات۔ (یعنی دست وقے، ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ اکثر یہ بتدریج شروع ہوتے ہیں لیکن بعض دفعہ بہت شدت سے جاری ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی کسی حالت میں دست وقے کی نوبت بھی نہیں آتی ہے کہ مریض زہر اجرام کے جذب ہونے سے فوت ہو جاتا ہے اس کو بند ہیضہ کہتے ہیں۔ لیکن عام حالت میں مریض کو پہلے معمولی دست کی طرح دست آتے ہیں پھر رفتہ رفتہ محض پانی کی طرح مادہ خارج ہوتا ہے۔ جسکا رنگ سفید ہونے سے اسکو چاول کے مانڈ سے مشابہت دیگئی ہے۔ اور اسلئے بعض غلطی سے اس مرض کو چاول سے منسوب کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اسی رنگ کی قے بھی شروع ہو جاتی ہے۔ مریض کو از حد ضعف محسوس ہوتا ہے۔ پاؤں اور پیٹ میں ایک قسم کی چبھن اور اینٹھن معلوم ہونے لگتی ہے اور دست وقے کی زیادتی سے خون سے اسقدر رقیق حصہ خارج ہو جاتا ہے کہ دوران خون میں قباحت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسوقت سطح جسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے چہرے کا رنگ پھیکا پڑجاتا ہے۔ انگلیوں پر جھریاں پڑجاتی ہیں (جیسے پانی میں بھیگنے سے ہوتا ہے) آنکھیں اندر کو بیٹھ جاتی ہیں۔ ناک نیلی ہو جاتی ہے۔ جسم پر ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔ اور ٹھنڈے سانس چلنے لگتے ہیں۔ نبض بہت باریک ہو جاتی ہے حتیٰ کہ بعض دفعہ بالکل معلوم نہیں ہوتی۔ گویا کہ تمام علامات میت کی موجود ہوتی ہیں۔ مریض بالکل غافل پڑا رہتا ہے۔ بولنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ لیکن حواس قائم رہتے ہیں اور اکسانے سے جواب دے سکتا ہے بوجہ خارج ہو جانے رطوبت اسکو از حد پیاس لگتی ہے جس سے وہ بعض مرتبہ بہت بےچین ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر فعل قارورہ بند ہو جاتا ہے۔ اکثر مرنے والے مریض

اسی حالت میں فوت ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعضے گھنٹوں سبت کی حالت میں رہنے کے بعد شاید تھوڑی سی نیند کے بعد دوبارہ رو بہ صحت ہونے لگتے ہیں۔ سطح جسم گرمانے لگتی ہے اور جلد کی جھرّیاں کچھ کچھ مٹنے لگتی ہیں۔ اور وہ خوفناک رنگت جاتی رہتی ہے لیکن بعض مرتبہ مریض رو بہ صحت ہو کر بھی دوبارہ قے و دست کے دورے میں مبتلا ہو کر یا محض تکان سے فوت ہو سکتا ہے۔

علاج۔ سب سے پہلے ہم (جو کہ اس مضمون کا مدعا ہے) تدابیر دفعیہ کا بیان کرینگے۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہ ایک جاندار زہر (اجرام) سے پیدا ہوتا ہے۔ جو مریض کے قے و دست سے خارج ہو کر کسی طرح سے دوسروں کے اشیاء خوردنی میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسلئے ہمیں ان طریقوں پر غور کرنا چاہیئے کہ جس سے مرض اقدر میں پھیلتا ہے۔ اکثر اسکے دست و قے آلودہ کپڑے کوئیں یا تالابوں کے قریب دھونے سے اسکے اجرام پینے کے پانی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خالص صاف پانی میں شاید کسی قسم کے بھی اجرام کسی مدت تک نہیں جی سکتے۔ لیکن جس پانی میں پہلے ہی سے زندہ رہنے والا مادہ موجود ہے۔ اسمیں یہ بہ آسانی پرورش پاتے ہیں۔ لہٰذا یہ اجرام دودھ کے اندر بخوبی پل سکتے ہیں۔ چنانچہ وبا کے دنوں میں دودھ یا پانی اُبال کر پینا چاہیئے بلکہ برتن کے دھونے کے لئے جو پانی تصرف میں آتا ہے۔ وہ بھی اُبلا ہوا ہونا چاہیئے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ تربوز وغیرہ میوہ جات کھانے کے بعد یہ مرض نمودار ہوتا ہے۔ تازے پھلوں میں مضر اجرام نہیں ہوتے۔ لیکن اکثر پھل کاچھی کے یہاں گندے پانی سے دھوئے جاتے ہیں۔ اسلئے کوئی بھی کچا پھل لہٰذا پان بھی نہیں کھانا چاہیئے۔ کیونکہ اسکی سطح سے اجرام ہیضہ جسم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ مکھی بھی اجرام کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے میں مدد دیتی ہے۔ اسلئے مریض کے قے و دست کو کھلی جگہ پر پڑے رہنے دینا نہیں چاہیئے۔ ہوا کے ذریعہ سے اسکے اجرام عموماً مانند تپ دق کے انسانی

جسم میں نہیں پہونچ سکتے۔ کیونکہ یہ خشک ہوتے ہی مرجاتے ہیں اور نہ چھونے سے یا زخموں کے ذریعہ سے یہ جسم میں اثر کرسکتے ہیں جیسے کہ بعضے اور اجرام مرض کرسکتے ہیں جوتوں کے تلوں کے ذریعے سے بھی یہ ایک جا سے دوسری جا لایا جاسکتا ہے نہ اسلئے جن کو ہیضہ کے مریضوں کے پاس جانا ہو۔ وہ اپنے جوتوں اور اگر ہوسکے تو کُل کپڑوں کو کسی الگ مکان میں رکھیں۔ اور ہاتھ ادویہ سے دہوکر صاف کریں۔ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ہیضہ کے مریضوں کے براز میں آرام ہو کے کچھ دنوں بعد تک اجرام مرض پائے جاتے ہیں۔ اسلئے اُن کے براز کو ڈس انفیکٹ کرا کر پھکوا دینا چاہیئے۔ اس صلہ میں ایک گندی عادت کی طرف ناظرین کی توجہ دلاتے ہیں کہ بعض شخص آبدست کے بعد لوٹے میں مٹی ملکر کوئیں میں ڈالتے ہیں جسکے ذریعہ سے کنواں بہ آسانی گندا ہو سکتا ہے۔ ہمارے یہاں کی موجودہ کھلی نالیاں جنمیں پاخانہ کی موریاں بھی ملتی ہیں مرض کے پھیلانے کا ایک زبردست ذریعہ ہیں اور جن کا پانی بعض دفعہ رس کر کنوؤں میں شامل ہوسکتا ہے۔

اب مریض کے قے و دست کو کیونکر ڈس انفیکٹ کیا جائے؟ بہتر ہے کہ یہ کسی چینی کے بیڈ پین میں لیا جائے۔ اور اُن کے اوپر کوئی تیز کرم کش دوا[1] مثلاً معمولی کاربولک ایسڈ ایک حصہ چالیس حصہ میں پانی۔ لائی سول ایک حصہ چالیس حصہ پانی میں۔ یا پوٹاسی پرمیگنیٹ ایک حصہ سو حصہ پانی میں (تقریباً چوتھائی اونس ایک بوتل پانی میں) ڈال کر کچھ دیر کے بعد گڑھے میں دبا دیا جائے۔ چھوٹے موٹے سنے ہوئے کپڑے جلا دئے جائیں۔ اور بڑے کپڑوں کو صابن اور کاربولک ایسڈ کے پانی میں اُبال دیا جائے۔ ہاتھ معمولی صابن اور گرم پانی سے دہوکر کاربولک لوشن ایک حصہ چالیس حصہ پانی میں بنا کر تر کئے جائیں۔ ناخن کی کوروں کو برش سے صاف کرنا چاہیئے۔ فرد بشر کے علاج سے پیشتر مجموعی طور پر مرض کا روکنا ضروری ہے۔

[1] ان تینوں میں کاربولک ایسڈ سمیات کا اثر رکھتا ہے اور ہاتھ پر گرنے سے اسکو جلا سکتا ہے۔

چنانچہ وبا کے نمودار ہوتے ہی یہ معلوم کرنا چاہیئے۔ کہ کسی خاص کنوئے یا جوہڑ کے پانی پینے سے یا کسی گھوسی کے دودھ کے ذریعہ سے یہ مرض پھیلا ہے۔ ان کو فوراً بند کرنا چاہیئے۔ دوسرے صاف کنوؤں پر پنچایتی آدمی پانی کھینچنے کے لئے مقرر کئے جائیں تاکہ ہر کس وناکس اپنے یہاں کا ڈول درستی لا سکے۔ اِس قسم کی تدابیر سے مرض تین چار دن میں بالکل بند کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ روز بروز آدمیوں سے کنوئیں گندے ہو کر اور کنوؤں سے آدمی مبتلا ہو کر گاؤں کے گاؤں اُجڑ گئے ہیں۔ اکثر یہ مرض انتہائی گرمی کے دنوں میں جبکہ مینہ نہیں برستا ہے نمودار ہوتا ہے۔ شاید کنوؤں کا پانی خشک ہو جانے سے اسکی گندگی زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اسلیئے بہتر ہے کہ قرب وجوار میں ہیضہ کی خبر سنتے ہی تمام کنوؤں میں پوٹاسی پرمیگنیٹ ڈالدینا چاہیئے۔ جو کیمیائی طور پر گندگی کو دفع کرتا ہے۔ جدید تجربوں سے ثابت ہوا ہے۔ کہ یہی دوا اندرونی طور پر مرض کی حالت میں دینے سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے۔

اب فرولبشہ کے علاج کے متعلق ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ وہ کبھی ایسے شدید مرض کا خود علاج کرنے کا قصد نہ کریں اور نہ انکو عطائیوں پر چھوڑیں۔ علامات کے ظاہر ہوتے ہی فوراً کسی پاس شدہ ڈاکٹر کو دکہائیں اور اُسکی تجویز پر ہو بہو عمل کریں مندرجہ ذیل تدابیر علاج اسلیئے بتائے جاتے ہیں کہ جہاں ڈاکٹر نہ ہوں وہاں لوگ اِن تدبیروں سے فائدہ اٹہائیں۔ یا اسکی واقفیت سے ڈاکٹر کے علاج میں مخل نہ ہوں اب سمجھنا چاہیئے کہ مریض کی آنتوں کے اندر ایک سخت جاندار زہر دار اجرام موجود ہے۔ جسکو قدرت بذریعہ دست دستے خارج کر رہی ہے اور یہی زہر جذب ہو کر مریض کے دل و دماغ کو مبتلا کر کے موت کا باعث ہوتا ہے۔ یا مریض اپنے دوران خون میں سیال حصے کی کمی سے یا اُن کے بہم اثر سے فوت ہو جاتا ہے۔ اسلیئے ہم افیون کے مرکبات (مثلاً کلورو ڈین) سے دست کو شروع شروع میں ہرگز نہ روکیں

بلکہ بعض تیلیں (مثلاً کیسٹر آئل یا کیلومل) اور ادویہ دیگر اس مادہ کو بہ آسانی خارج کرنیکی کوشش کرینگے۔ انتڑی کے اندر کرم کش ادویہ (مثلاً تھائی مول۔ کیمفر وغیرہ) کا ڈالنا بھی مفید ہوگا۔ اور اسکے اندر ایسی اثر کرنے والی چیز (مثلاً بسمتھ سب نائٹرائٹ یا بسمتھ۔ ٹرائی بروم۔ فینول وغیرہ) جو اسکے زہر کو جذب ہونے سے روک سکے بڑی بڑی خوراکوں میں دینگے۔ آنتوں کے صاف کرنے کے لئے اور خون میں پانی پہونچانے کے لئے حقنہ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور بعض دفعہ جہاں موت صرف سیال کی کمی سے واقع ہوتی ہے۔ درید کے اندر یا جلد کے نیچے نمک کا پانی مقدار داخل کرنے سے فوراً فائدہ ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل مفید نسخہ جات بھی شاید کسی وقت کار آمد ہو سکیں +

(نمبر ۱) نسخہ دافع ریاح۔ کرم کش و مفرح برائے گرانی معدہ و دست و قے

تھائی مول یعنی پھول اجوائن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک ڈرام
مینتھال یعنی پھول پیپرمینٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک ڈرام
کیمفر یعنی کافور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دو ڈرام
کلوروفورم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تین ڈرام فقط

نوٹ۔ پہلے تین اجزا ملاتے ہی وہ ملکر رقیق ہو جائینگے اور کلوروفورم میں بالکل حل ہو جائینگے۔ بہتر ہے کہ اتنی مقدار دوا جو کہ حجم میں ایک اونس رقیق ہوتی ہے دو اونس کی شیشی میں بنائی جائے تاکہ قطرے ٹپکانے میں آسانی رہے۔ کاک عمدہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ سب ادویہ اڑنے والی ہیں۔

خوراک ۵ سے ۱۰ بوند قند سفید پر ڈالکر استعمال کریں۔ اور ہیضہ کے دنوں میں دن میں دو تین مرتبہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(نمبر ۲) نسخہ تیلین و کرم کش برائے دافعہ دست و قے یا پیچش۔

کیسٹر آئل یعنی ارنڈی کا تیل .... نصف اونس
تھائی مول کیپا دنڈا از نسخہ اول .... بیس منیم
گوندبیول پسا ہوا اور قند سفید .... کافی مقدار
پانی .... چار اونس تک

اسکی چار خوراکیں بنالیں اور پاؤ پاؤ گھنٹہ کے وقفہ سے ساری پلا دیں یہ خراش کرنیوالے مادہ کو آنتوں سے بہ آسانی خارج کرکے اِن کو صاف کردیتا ہے تاکہ دیگر ادویہ کارگر ہوسکیں۔

(نمبر ۳) نسخہ مسکن معدہ و آنت و کرم کش برائے دست ہر قسم پیچش و ہیضہ۔

بسمتھ سب نائیٹریٹ .... دو ڈرام
بسمتھ سیلی سلیٹ .... دو ڈرام
گوند و قند سفید .... کافی مقدار
پانی .... چار اونس تک

اسمیں آٹھ نشان لگالیں۔ ایک خوراک ہر دو گھنٹہ بعد جب تک کہ دست جاری رہیں۔

کرم کش اثر بڑھانے کے لئے نسخہ ہذا میں نسخہ اول تین سے پانچ بوند فی خوراک شامل کریں

بی۔ کے۔ متر ا۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔

نوٹ۔ یہ مضمون حسب فرمایش میسرز جے۔ کھنا اینڈ سنز دہلی زبان پریس میں چھپوا کر برائے رفاہ عام مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔

مینجر

جنار دَن

پنجاب کے ایک راجہ کے ایک اکلوتی لڑکی تھی جو اُسے بیٹوں سے زیادہ عزیز تھی۔ اِس کا نام سری کرشن جی کی پیاری　　　کے نام پر رادہا رکھا تھا زمانے کے دستور کے مطابق یہ ابھی بچہ ہی تھی کہ اسکی سگائی پاس ہی کے ایک راجکمار سے کردی گئی۔ افسوس یہ ہوا کہ اسکی ماں جو خوبصورتی اور نزاکت۔ فہم و فراست میں اپنا ثانی آپ ہی تھی اِس کو بچہ ہی چھوڑ کر سرگباش ہوگئی۔ اور اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا تمام بار راجہ ہی پر چھوڑ گئی۔ پھر راجہ اپنی اِس چاہتی بیوی کا اس قدر دلدادہ تھا کہ اس نے دوسری شادی کرنے کا خیال تک نکیا اور اپنے رنج و الم کو بھول اِس پیاری لڑکی کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہوگیا۔ دُور دُور سے ہر علم کے ماہر بلائے اور ہر زبان کے یکتا اُستادوں کو جمع کیا کہ اسکی تعلیم میں کوئی کمی باقی نرہے۔ لڑکی ہونہار تھی ان لایق فایق اُستادوں کی زیر تعلیم رہکر ہر علم اور زبان کے سیکھنے میں جلد ہی بہت مہارت حاصل کرلی۔ انگریزی۔ اُردو۔ سنسکرت۔ ہر سہ زبانوں پر پورا اقتدار پالیا۔ علم طبیعیات و کیمیا۔ ریاضی و علم نجوم فلسفہ و منطق میں کمال حاصل کیا اور مُلک مُلک کی تواریخی حالات کو بھی بنظر غور پڑھ ڈالا۔ راجہ نے اپنی پیاری دختر نیک اختر کی اِس نمایاں ترقی کو دیکھکر اسکے لئے ہر ملک و ملت کی خوبصورت سے خوبصورت اور لایق سے لایق لڑکیوں کو جمع کیا کہ اسکی سہیلیاں بنکر رہیں کہ اسکا ایک لمحہ بھی بُری صحبت میں نہ گزرے نہ وہ جاہل عورتوں کی باتیں سُنے نہ اُن کی عادتیں و طریقے استعمال کرے۔ اِن سہیلیوں اور اُستادوں کے یکجا جمع ہونے سے اِس لڑکی کا دربار ایسے شان و شوکت کا ہونے لگا۔ کہ دُور دُور تک اسکا ثانی نتھا

محال تھا۔ اس تمام تعلیم اور میل جول کا اثر لڑکی کے دماغ پر یہ ہوا کہ وہ ہر وقت اپنی عظمت اور فوقیت پر فخر کرنے لگی اور اپنے آپکو ہر علم و فن کا ماہر اور سلیقہ اور تہذیب کا منبع سمجھنے لگی۔ اسکے دل میں خیال تھا تو فقط یورپ کی سیر کا۔ انگریزی نظم و نثر و قصہ کہانی کی کتابوں نے یورپ کے مختلف ممالک کے خوبصورت نظاروں، مشہور اور قابل دید عمارتوں اور انکی صفائی اور نفاست کا ایسا سماں باندھ دیا تھا کہ رات دن اسکے دل میں یہی امنگ اٹھتی تھی کہ کسی طور پر یورپ کی سیر کیجاوے۔ وہاں کے اعلی دماغ باشندگان کی صحبت کا لطف اٹھایا جاوے۔ سوئزرلینڈ کی سرسبز و شاداب پہاڑیوں۔ وینس کے نہری بازاروں۔ اور اُن میں دوڑتی ہوئی گونڈلاؤں۔ پیرس کے آہنی ہتھیاروں اور لورپول اور مانچسٹر کے کارخانوں کے اپنی آنکھ سے دیکھنے کی ہوس ہر دم دل میں بھری رہتی تھی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور اپنے پیارے باپ کے سامنے جاکر اپنی دلی خواہش کو ظاہر کیا۔ اُسکا ظاہر کرنا تھا۔ کہ راجہ نے اُس کے یورپ جانے کے لئے تمام انتظام کر دیا۔ نیک ساعت پر وہ روانہ ہوئی۔ اور پورے دو سال تک یورپ کے مختلف مقامات کی سیر کرتی رہی۔ جب وہاں سے واپس آئی تو اسکی شادی کا ذکر اس سے کیا گیا۔ اُس راجکمار کی طرف سے بھی پیغام شادی آنے لگے۔ جس سے یہ بچپن میں ہی منسوب ہو چکی تھی۔ اسکو بھلا اپنی اعلے تعلیم اور سیر یورپ کے بعد یہ کسطرح گوارا ہو سکتا تھا۔ کہ ایک معمولی راجکمار سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاوے۔ چنانچہ اس نے شادی سے صاف انکار کیا۔ اسکے والد نے اُسکو سمجھایا بھی مگر وہ ایک نہ مانی۔ لاچار راجہ نے اُس راجکمار کو اُس کی تمام کیفیت لکھدی۔ اور یہ بھی بیان کر دیا کہ لڑکی خود شادی کرنے پر رضامند نہیں ہے۔ اور میں اُسکو مجبور کرنا نہیں چاہتا۔

جس وقت یہ پیغام اُس راجکمار کے پاس پہنچا۔ وہ تمام کو بغور پڑھ کر چپ

ہو رہا۔ اور راجہ کے پاس کوئی جواب نہ بھیجا۔ جو کچھ اُس کے دل پر گزر رہی وہ اُس کو ہی معلوم تھی۔

تھوڑے دن بعد راجہ کے دربار میں خبر پہونچی کہ ایک مشہور جوگی نے پاس کی پہاڑ کی ایک گپھا میں آکر دھونی رمائی ہے اِس یوگی کا نام جنار دن تھا۔ جس کے لغوی معنی معبود خلق کے ہیں۔ راجہ کو دن رات اِس بات کا خیال لگا رہتا تھا کہ منسوب راجکمار سے جو شادی کا وعدہ تھا وہ کسی طور پورا کیا جاوے اِس سدھ یوگی کے آنے کی خبر سنتے ہی راجہ اُس سے ملنے کو گیا اور اُس کے سامنے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ یوگی نے کچھ وچار کر کہا کہ اپنی لڑکی کی مرضی کے خلاف تجھکو کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔ تیری لڑکی کسی بڑے کام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اِس کے کام میں رکاوٹ ڈالنی اچھی نہیں یہ سنکر راجہ اپنے محل میں آیا۔ اور اپنی لڑکی کو یوگی مہاراج کا جواب لفظ بلفظ کہہ سنایا۔ بس پھر کیا تھا اُس لڑکی کو اور شہ ملی۔ منسوب راجکمار کے نام سے بھی اُس کو نفرت ہو گئی مگر ساتھ میں اُس یوگی کے درشنوں کا شوق اُس کے دل میں پیدا ہو گیا۔ اور ایکدن وہ اپنے والد کی اجازت سے اُس کے درشنوں کو گئی۔ جس وقت گپھا میں پہنچی اور یوگی مہاراج کو بھسم رمائے دھونی جلائے۔ بال بکھیرے اور نہایت غلیظ صورت بنائے دیکھا۔ اُس کے دل میں فوراً اُن کی طرف سے نفرت پیدا ہوئی۔ اور واپس جانے کا ارادہ کیا۔ مگر کچھ پہاڑ کے اوپر چڑھنے کی تکان اور کچھ اسقدر وقت ضایع ہونے کے دھیان نے اُسے اپنا ارادہ پورا کرنے سے باز رکھا اور وہ اپنی مرضی کے خلاف اُس گپھا میں داخل ہوئی۔ یوگی مہاراج سمادھی میں تھے۔ اور ایک شیر کی کھال پر آگ کے عین مقابل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ... سے معزز آدمی جو اُن کے درشن کے پیاسے تھے۔ اُن سے کچھ

صف بنائے چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ جونہی یہ راجکماری اندر آئی ایک آدمی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اور یہ ایک طرف کو چپ چاپ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد یوگی مہاراج نے اپنی آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف دیکھا جسطرف انکی نظر جاتی تھی اُسیطرف درشن ابھلاشی اپنے سر جھکا کر نمسکار کرتے تھے۔ راجکماری نے بھی نمسکار کی اور منو کے دھرم شاستر کی بابت کچھ سوال کیا۔ مگر یوگی مہاراج نے سوائے خاموش رہنے کے کچھ جواب نہ دیا۔ اور اپنے ہی دھیان میں مگن رہے۔ کسی اور آدمی کی اتنی بھی جرأت نہ ہوئی کہ مُنہ سے ایک لفظ بھی نکال سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی نے اشارہ کیا۔ اور سب اٹھکر باہر چلے آئے۔ راجکماری بھی باہر تو آگئی۔ مگر بڑی حیرت میں تھی کہ یہ دُبلا پتلا کنگال خاک آلودہ کون ہے جو میرے علمیت کے سوالوں کی پرواہ تک نہیں کرتا۔ بلکہ میری طرف نظر ڈالنے میں بھی عیب سمجھتا معلوم ہوتا ہے میرے والد صاحب سے میری اسقدر تعریف کرکے بھی میری طرف ذرا توجہ نہیں کرتا۔ میری عظمت کی بابت جانتا ہوا بھی مجھکو نہیں پتیاتا۔ ایسے خیالوں میں ڈوبی ہوئی وہ اپنے محل میں پہنچی اور اُسکے دلمیں بیساختہ ایک دفعہ پھر اس یوگی کے درشن کرنے کی اچھا ہوئی۔ چنانچہ دوسرے روز بھی گئی اور اُس روز اپنی علمیت کا زیادہ اظہار کرنے کے لئے ویدوں کے متعلق چند پرشن کئے مگر یوگی مہاراج سے سوائے خاموشی کے اور کوئی جواب نہ ملا۔ مگر اس خاموشی میں بھی عجب جادو تھا۔ جس قدر اس خاموشی سے اُس لڑکی کو اپنی بے عزتی معلوم ہوتی تھی اُتنی ہی اُسکے دلمیں یوگی مہاراج کا بھید معلوم کرنے کی خواہش بڑھتی جاتی تھی اُسے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ یہ کیا بات ہے کہ مجھ جیسی عالم فاضل راجکماری سے بھی اسطرح پیش آتے ہوئے اسکو ذرا ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ نہ اسکے چہرے پر کسی قسم کا ملال معلوم ہوتا ہے۔ آنند ہی کے ہی آثار دیکھتے ہیں۔ باوجودیکہ اسکا چہرہ ہر وقت خاک سے

آلودہ رہتا ہے۔ مگر ایک ایسی بشاشت ہر وقت ٹپکتی رہتی ہے کہ مجلکہ باوجود قسم قسم
کے آرام و آسائش کے میسر نہیں۔ یہ اپنی سمادھی اور دھیان میں کرتا کیا ہے۔ کیت
روز بروز اسکی صورت پر زیادہ ہی زیادہ تر و تازگی آتی جاتی ہے۔ یہ تمام خیالا
اس کے دلمیں ایسے جاگزیں ہوئے تھے کہ وہ دن بھر انہیں ہی ڈوبی رہتی تھی
اسکی خوبصورت فہیم و عالم سہیلیاں اسکو مختلف کھیل تماشوں کی طرف راغب کرتی
تھیں پر وہ سب سے ایک ہی سوال کرتی تھی کہ وہ کیا بھید ہے جسکے باعث یہ غریب
بھوکا ننگا کنگال سنیاسی اس قدر خوش رہتا ہے اور میرے عالمانہ اور دیرانہ حملہ
کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ سہیلیاں بہتیرا اسکو ٹالتی تھیں مگر اُسے اُس یوگی کی دھن
سمائی رہتی تھی۔ روز علی الصباح اشنان کر کر یوگی مہاراج کے درشنوں
کو جاتی تھی اور چپ چاپ بیٹھکر واپس چلی آتی تھی۔ سوال پوچھنے بھی رفتہ رفتہ
چھوڑ دئے تھے۔ کیونکہ جواب ہی نہیں ملتا تھا۔ اس طور پر قریب دو ہفتے
برابر وہ جاتی رہی اور یوگی مہاراج کی خاموشی سے روز بروز زیادہ متاثر ہوتی
رہی یہانتک کہ اُسکو خود بھی اُس خاموشی میں ایک لطف معلوم ہونے لگا۔ جب
یوگی مہاراج نے اسمیں بھگتی کے کچھ آثار دیکھے تو ایک روز جب وہ چپ چاپ بیٹھی
ہوئی تھی ایک سام وید کی رچا نہایت میٹھی اور سُریلی آواز سے گانی شروع کی
جسکو سُنکر وہ ششدر رہ گئی۔ وہ حیران تھی کہ یہ میٹھی اور دلکش آواز کہاں
سے آئی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو یوگی مہاراج کے ہی کمل مکھ سے اسکا اچارن
ہو رہا تھا۔ جب تو اُسکی حیرانی اور بڑھی۔ کیونکہ وہ اس خاک آلودہ سنیاسی
سے ہرگز اُمید نہ رکھتی تھی کہ وہ ایسے مدھر سور سے گا سکتا ہوگا۔ سکتے کے عالم
میں بے حس و حرکت اُس روح افزا رچا کو سُنتی رہی۔ گاین کے بعد
مہاراج نے ایک چھوٹا سا اُپدیش دیا جسکا اختصار ذیل میں۔

ویدکی رچپاؤں کے گاین کا حظ اُٹھاتا۔ کہانا کہانے اور پانی پینے سے بھی زیادہ ضروری معلوم ہونے لگا۔ اِسکو تمام دنیا کے کاروبار یوگی مہاراج کے بنا بالکل ہیچ معلوم ہونے لگے۔ جاگتے ہوئے اُسے ہردم دھیان تہا تو یوگی مہاراج کا۔ سوپنے میں اگر اُسکو نظر آتے تھے تو وہ سنیاسی جی مہاراج ہی دکھائی دیتے تھے۔ اب اِسکو معلوم ہونے لگا کہ کس قدر اِسکی اپنی زندگی کا انحصار اُس اپنے گرُو پر تہا۔ اِسکو یہ تیت ہونے لگا۔ کہ اِس گرو کے بنا اِسکا زندہ رہنا بھی مشکل ہو جاویگا۔

ایسے ہی خیالات میں اسکے کئی دن گزرے۔ ایک دن محل میں خبر پہنچی کہ منسوب راجکمار کی طرف سے ایک اور شادی کا پیام آیا ہے۔ اور کہ اس دفعہ پیام ایک افسر لیکر آیا ہے۔ راجہ نے اُس افسر کو عزت سے بٹھایا۔ اور اپنی لڑکی کے پاس اُسکی ایک سہیلی کی معرفت یہ سندیسہ کہلا بھیجا۔ لڑکی کا جواب وہی تہا۔ یعنی کہ وہ ایسے راجکمار سے شادی ہرگز نہیں کرنا چاہتی۔ جسکی نسبت کوئی اچھی بات سُننے میں نہیں آتی۔ یہ جواب سُنکر اُس افسر نے راجہ سے کچھ علیحدہ جاکر گفتگو کی اور اسکے بعد راجکماری سے ملنے کے لئے اندر گیا۔ راجکماری کو جاکر سلام کیا اور نہایت ادب سے عرض کیا کہ ہے راجکماری۔ ہمارا راجکمار تیری پیاری پیاری صورت۔ موہنی مورت پر ایسا دلدادہ ہے۔ تیرے پریم سے ایسا بھرا ہوا ہے۔ تیرے ہت کا ایسا چاہنے والا ہے کہ رات دن تیرے ہی خیال میں محو رہتا ہے۔ تیرے ہی دھیان میں مگن رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگرچہ میں اس لائق نہیں کہ تجھ جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ ماہ جبین کے تک کی بھی برابری کر سکوں۔ پر آخر کو راجکمار ہوں اگر تو مجکو اس

"منش کی اندریاں باہر کی دستوؤں کو گرہن کر سکتی ہیں۔ انکا اندر کی طرف جانا کٹھن ہے۔ یہی کارن ہے کہ منش سانسارک سُکھ۔ سمپتی اور ودیا آدی میں ایسا رت ہو جاتا ہے کہ پھر اُسے اپنی آتما کا ذرا دھیان نہیں رہتا۔ اپنے باہر کے ہیتو سے ایسا پرتیت ہوتا ہے کہ دوسروں کو تُچھ درشٹی سے دیکھنے لگتا ہے۔ سانسارک وشیوں اور کاموں میں ایسا لپت رہتا ہے کہ آتمک اُنتی کا دھیان تک نہیں آتا۔ دنیا کے وچتر روپ سے ایسا آکرشتا رہتا ہے کہ اِسکے من کو کبھی شانتی نہیں ملتی۔ ایکانت میں دھیان کرنے کا سُکھ اُسکو سوپن میں بھی پراپت نہیں ہوتا۔ یہ منش نیت اور وچار کر چار دن کی خوشی کے لئے نِتیہ کا سُکھ مت تیاگ۔ آتما پرم سُکھ کا دھام ہے۔ اُسکی طرف اپنی درشٹی پھیر"

اِن مختصر مگر پُرمعنی الفاظ کا اس لڑکی کے دل پر عجب اثر ہوا۔ اپدیش ختم ہوتے ہی وہ یوگی مہاراج کے پاؤں پر گر پڑی اور چیلی بننے کی درخواست کی جو فوراً منظور ہو گئی۔ رفتہ رفتہ یوگی مہاراج کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے کرتے اِسکا چِت سمادھی میں تھیر ہونے لگا اور وہ یوگی مہاراج کے اُپدیش کو زیادہ زیادہ سمجھنے لگی۔ ایک روز یوگی مہاراج نے اُس لڑکی سے کہا کہ اچھا اب ہم جاتے ہیں تم اسی طرح ابھیاس کئے جانا۔ پرنند سے ہمیشہ بچنا۔ اہنکار کو دور کرنا۔ اور دوسروں کو اپنے آپ سے کبھی تُچھ نہ سمجھنا۔ اتنا کہکر وہ لڑکی ابھی اِن الفاظ کو سوچ ہی رہی تھی کہ یوگی مہاراج نظر سے غائب ہو گئے۔ راجکماری نے اُٹھکر اُن کو ہر چند تلاش کیا مگر اُنکا کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر محل کو واپس آئی۔ مگر اسمیں عجب تبدیلی ہو گئی تھی۔ اسکو یوگی مہاراج کے پاس بیٹھنا۔ انکا اُپدیش سننا۔ اُنکی مہربانی سے

لائق نہیں سمجھتی کہ مجھ سے شادی کرے۔ تو کیا میں اس لائق بھی نہیں ہوں کہ تو مجھ سے آکر ایک دفعہ مل لیوے۔ میری اور تیرے والد کی ریاست کی حد پر ایک مندر بنا ہوا ہے۔ وہاں یہ میرا افسر تجھکو نہایت حفاظت سے پہونچا دیگا۔ وہاں اگر ایک دفعہ مل سکوں تو دل کی حسرت نکل جاوے۔ کیا عجب ہے کہ تیرے خیالات باطل میری جانب سے دور ہو جاویں۔ اگر نہ بھی ہونگے تو اسکے بعد پھر تجھ سے شادی کرنے کا نام بھی نہ لونگا"

اعلان

رسالہ زبان کو ہم ایس۔ پی۔ ایس۔ کے لاہور کا ارگن بنا رہے ہیں۔ جبکا اعلان ہم جون کے پرچہ میں دے چکے ہیں۔ مالکان رسالہ اسکو زیادہ تر طلباء کیلئے ایک علمی پرچہ بنانا چاہتے ہیں۔ بجائے زنانہ زبان کے اسمیں مضامین متعلق صحت و دیگر علوم نافعہ (سائنس) وجدید معلومات درج کئے جائیں گے۔ علاوہ کرینٹ پالیٹکس کے دیگر تمام مضامین سوشل۔ تاریخی۔ اخلاقی۔ تجارتی وغیرہ وغیرہ ہوا کریں گے۔ علاوہ ان کے کچھ مجرب نسخہ جات بھی لئے جاویں گے۔ امید کہ نامہ نگار ان باتوں پر کاربند ہونگے

منیجر

ایک مکالمہ

ہندوستان کے ایک قدیم شاہی شہر میں جو ہندوؤں کے زمانے میں راجدھانی اور شاہانِ اضیہ کے عہد میں مدتوں پایۂ تخت رہا۔ اور جسکو اب اس گئے بیتے وقت میں بھی کچھ کچھ شاہی دربار دنکا فخر حاصل ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء کے ماہ جولائی کی ۲۲ تاریخ کو ایک باغ میں چند احباب ایک ٹینس کلب میں بیٹھے ہوئے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ دوپہر کے کام کاج کی تکان دُور کر رہے تھے۔ اس سال گرمی نہایت سخت پڑی تھی اور بارش کا نام بھی نہ تھا۔ ایسے موسم میں بہت کم ممبران کلب ٹینس کھیلتے تھے۔ بلکہ زیادہ تر وقت تفریح اور زٹل قافیوں میں گزرتا تھا۔ ابھی تک اس مُلک کی تعلیم سوسائٹی ترقی و تہذیب کے اس پایہ کو نہیں پہنچی تھی۔ کہ اُمورِ رفاہِ عام اور معاملات ملکی میں اسقدر دلچسپی پیدا ہوئی تھی کہ انگلستان کے اکثر کلبوں کی طرح ایسے مفید مضامین کے بارہ میں گفتگو ہو۔ تاہم کبھی کبھی شہر کے واقعات کا ذکر آجاتا تھا۔ اور چونکہ تجارت کے سوا یہاں کے باشندوں کی توجہ تعلیم یا اصلاح قومی وغیرہ کی طرف بہت کم تھی۔ اور شہر میں ہر قسم کے علمی جلسے و سبھائیں وغیرہ کئی اسباب سے بند تھیں اسلئے اگر کبھی کسی بات کا چرچا ہوتا بھی تھا۔ تو بہت کم ممبر اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دن خلافِ معمول راقم بھی اس کلب میں پہنچا۔ اور زبان پر مہر خموشی لگا لی لیکن کان کھلے رکھے۔ اسوقت مندرجۂ ذیل گفتگو ۲-۳ ممبران کلب میں سُنی (یہاں بیان کر دینا مناسب ہے کہ اس کلب کے ممبروں میں ملت و ذات کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اور تمام درجہ اور حیثیت کے اشخاص طلباء سے لیکر بیرسٹر اور پروفیسر تک اس میں شامل رہتے تھے)۔

سین اوّل

لالہ شام سندر (لالہ ہری رام سے مخاطب ہو کر) آؤ جی ایک شطرنج کی بازی ہو جائے آج تو۔ اب تو بہت دن ہو گئے۔

لالہ ہری رام۔ آج تو مجھے ایک جگہ جانا ہے۔ اور شطرنج کی بازی کا کیا ٹھیک ہے کتنی دیر میں ختم ہو۔ (راوی۔ لالہ ہری رام ایک وکیل ہیں۔ جو ہر قسم کے امورِ رفاہِ عام میں خاص طور پر دلچسپی لیتے ہیں۔)

شام سندر۔ آپ کو تو روز ہی جلدی پڑی رہتی ہے۔ کبھی کہیں اور کبھی کہیں۔ کہیئے آج کہاں کا قصد ہے۔

ہری چند۔ (لالہ شام سندر سے مخاطب ہو کر) آج یہ پھیروں میں ہیں۔ آج یہ یہاں کیوں ٹھیرنے لگے۔

لالہ ہری رام۔ پھیروں میں کیا ہیں۔ کون سے لڈو پیڑے ملیں گے۔ جو پھیروں میں ہوں۔ وہاں تو پانی اور پان کی تواضع کے سوا خیر صلّا ہے۔

شام سندر۔ تو کیا آپ کو کسی محفلِ رقص و سرود میں جانا ہے یا کہیں اور تقریب میں؟

ہری چند۔ لو ہم سے سُن لو۔ انہیں آج ایک شادی میں جانا ہے۔ آج ان کا دل یہاں کیوں لگنے لگا۔

شام سندر۔ (سخت متعجب ہو کر) ہیں آجکل شادی کیسی؟ آج کل تو دیو سوئے ہوئے ہیں بھلا ان دنوں کیسی شادی ہوتی ہوگی۔ کسی نکاح میں جانا ہو تو خیر نہیں۔

ہری چند۔ بھائی صاحب آریہ سماج میں مہورت کو نہیں مانتے نہ کوئی خاص وقت مبارک یا موافق ہوتا ہے جب دل چاہا اور آسانی دیکھی بیاہ رچا لیتے ہیں۔

شام سندر (لالہ ہری رام سے) خیر یہ تو بتائیے کس کی شادی اور کہاں ہے۔

ہری رام ۔ بھائی صاحب آج ایک بدہوا بواہ ہے۔ اسمیں ضرور جانا ہے۔ میں کمیٹی میں ہوں
شام سندر ۔ (اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر) تو کیا آپ بھی لیسے کام میں شامل ہیں
نعوذ باللہ ۔ مجھے تو خبر ہی نہ تھی آپ بھی چھپے رستم ہیں ۔ ماشاء اللہ ہر کام میں اپنی ٹانگ اڑا لیتے ہیں
ہری رام ۔ کیوں خیر تو ہے ۔ کیا آپکو اس اصلاح سے نفرت ہے ؟
شام سندر ۔ تائید میں ہوں ۔ یا مخالف مگر میرے یا آپکے تائید میں یا خلاف ہونے سے کیا ہوتا ہے ۔ ابھی تک کثرت رائے تو اسکے خلاف ہی ہے ۔
ہری رام ۔ آپ تو اتنا پڑھ لکھکر بھی انھیں پلانی دقیانوسی غلطیوں میں پھنسے ہوئے ہیں ہر اصلاح یا نئے کام کے شروع میں اسکی مخالفت ہوا ہی کرتی ہے ۔ اور حامیوں اور سرپرستوں کا شمار محدود ہی ہوتا ہے ۔ بلکہ شروعات تو ایک ہی آدمی سے ہوا کرتی ہے ۔ ایک آدمی کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے بعد میں پیرؤوں اور حامیوں کی تعداد لاکھوں پر پہنچ جاتی ہے ۔ اور جو مخالف ہوتے ہیں وہی اس کام کے مداح ہوتے ہیں ۔
شام سندر ۔ آپ تو نرے لیکچر دینے ۔ میں آپ سے کچھ بحث تو نہیں کرتا ۔ اچھا یہ تو بتاؤ ۔ کچھ یہ کام چیل بھی پڑا ۔
لالہ ہری رام ۔ اب اس کام کے مروج ہو جانے میں کیا شک رہا ۔ آئے دن جگہ جگہ سے بدہوا بواہوں کی خبریں آتی ہیں ۔ اور سب فرقوں اور ذاتوں میں ۔
ہری چند ۔ (لالہ ہری رام سے مخاطب ہوکر) ہم تو آپ کی کوششوں کو اسوقت سپھل سمجھیں گے جب کچھ بواہ اس شہر میں بھی ہو جاینگے ۔ یہاں کسی ایسی اصلاح کا مروج ہو جانا کام رکھتا ہے ۔ یہ پوشاک یا کھانے پینے کی بات تو ہے ہی نہیں کہ جس نے چاہا ۔ اور جب چاہا ۔ نئے سے نیا فیشن اختیار کر لیا ۔
ہری رام ۔ کیا آپ کو خبر نہیں کہ یہاں کئی بدہوا بواہ ہو چکے ہیں ۔ حال میں ایک شادی ہو چکی ہے ۔ اور آج ایک اور ہے ۔ جسمیں مجھے جانا ہے ۔ ہاں یہ بات

بے شک ہے۔ کہ کسی اعلیٰ خاندان یا متمول گھرانے میں ابھی نہیں ہوئی ہے قلعہ کا اردگرد تو ہاتھ میں آگیا۔ ابھی قلعہ سر کرنا باقی ہے۔ جس دن کسی رئیس یا اعلےٰ درجہ کے شخص کے گھر میں کسی بیوہ کی شادی ہو جائیگی۔ اُس دن تو یہ تحریک بے روک ٹوک آگے چلے گی۔

شام سندر۔ اچھا لالہ ہری رام آپ یہ تو بتائیں۔ کہ اس کام کو ابھی خاطرخواہ فروغ کیوں نہیں ہوتا۔ اچھا کام تو مقبول عام ہو ہی جاتا ہے۔

ہری رام۔ گھڑی میں وقت دیکھ کر) مجھے جانے کو دیر ہوتی ہے۔ مگر آپکے سوال کا تو جواب دیتا ہی جاؤں۔ بھائی صاحب اسکی کئی وجوہات ہیں۔ لیکن مختصر یہ کہ لوگ مخالفت اور بدنامی سے ڈرتے ہیں۔ اور برادری سے نکالے جانے کا سخت خوف ہوتا ہے۔ ورنہ ایسا کون سادل ہے۔ جو اپنی عزیزوں کے دُکھ اور رنج سے شق نہ ہو۔ اور ایسا کون سنگ دل ہے جو ان مصیبت زدہ بیکس اور بے بس عورتوں کی تکلیف اور دقتوں اور آزمائشوں سے خراش نہ ہو۔ جوں جوں یہ ڈر دور ہوگا اس کام کو ترقی ہوگی۔ دوسرے تعلیم اور آزادی کے ساتھ ساتھ ایسے کاموں کو ترقی ہوگی۔

شام سندر۔ کیا اس بارے میں آپکے نزدیک کافی کوشش ہو رہی ہے؟

ہری رام۔ ایسی تحریک پر کیا ہندوستان میں تو تمام کاموں میں نہایت آہستہ رفتار ہے۔ اور سخت بے پروائی اور غفلت ہو رہی ہے۔ اور نہ صرف ناخواندہ لوگوں میں۔ بلکہ اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی اندھیر ہے۔ پولیٹیکل ترقی کی کوشش سے تو اسلیئے گریز ہے کہ وہ سخت خطرناک ہے۔ جان جوکھوں ہے۔ لیکن سوشل معاملات میں جو صرف بھائی برادری یا رشتہ داروں۔ یا ماں باپ کی عارض مخالفت۔ یا علیحدگی یا نکتہ چینی اور رنج کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان میں بھی بہت ہی کم اصحاب دلچسپی لیتے ہیں۔ اور عملی کارروائی کا کیا ذکر ہے۔ ایسی باتوں کی

بابت سوچ بچار۔ بات چیت ۔ صلاح مشورہ۔ ذکر اذکار بھی عنقا ہے۔ جو خاص اس تحریک کے حامی و مددگار ہیں۔ اوّل تو ان کی تعداد ابھی بہت کم ہے۔ دوسرے وہ بھی کافی سرگرم اور پرجوش اور مستعد نہیں۔ پرماتما بھلا کرے۔ منشی شنکر لال کا جنہوں نے کل صوبہ آگرہ و اودھ میں اس کام میں قابل تعریف مستقل اور باقاعدہ کوشش کی ہے۔ اور اپنے آپکو اس کام کی نذر کر دیا ہے۔ لیجئے اب وقت ہو گیا میں جاتا ہوں۔

شام سندر۔ آپنے تو آج ان باتوں میں مجھے بھی لگا لیا۔ کیا میں بھی اس بواہ میں آپ کے ہمراہ چل سکتا ہوں؟

ہر پرام۔ کیوں نہیں۔ اگرچہ پبلک تو نہیں ہے لیکن آپ میرے ہمراہ چل سکتے ہیں۔

(شام سندر۔ اور ہر پرام کلب سے چل پڑے اور ہرچند بھی ساتھ ہو گئے)

شام سندر۔ کیوں پبلک کیوں نہیں ہے؟ پبلک ہوں تو بہت اچھا اثر ہو۔

ہر پرام۔ پبلک ہوں تو کیونکر۔ ساری دہلی میں ایک پبلک ہال بھی ایسا نہیں جہاں آزادی کے ساتھ بغیر کسی ایک شخص کی اجازت پر دار و مدار ہوتے لکچر یا جلسے یا ایسے بواہ ہو سکیں جو اعلیٰ صاحب جلتے ہیں اور جنہوں نے بڑے بڑے تھیٹر و ہال بنوائے ہیں۔ یا دھرم شالہ وغیرہ تعمیر کرائے ہیں۔ وہ ابھی ان کاموں کے حامی نہیں۔ یا دل سے ہمدرد ہیں مگر ان میں اظہار ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ اسلئے رفاہ عام کے تمام کاموں میں یہاں اوّل بڑی دقت یہی پیش آتی ہے۔ کہ جگہ نہیں ملتی۔ اور ایسے مفید کام بھی ممبران سبھا کے مکانات پر کرنے پڑتے ہیں۔

شام سندر۔ آج شادی کہاں ہے۔ اور کس کے ہاں لے چلوگے؟

ہر پرام۔ ایک ڈاکٹر صاحب اس کام کے بڑے حامی اور ہمدرد ہیں انکے مکان پر بواہ ہے۔

ہرچند۔ کیوں لالہ ہر پرام سبھا کا اپنا مکان نہیں ہے؟

ہر پرام۔ ۳-۴ برس سے تو سبھا کا وجود ہی ہے سگے آدمی کے پیر شدی

بھائی صاحب کوئی کام بغیر روپیہ کے نہیں ہوتا۔ بمبئی میں تو بنا ہوا ہال خاص اس کام کیلئے ہے۔ یہاں بھی جب کوئی مکان دیدیگا یا بنوا دیگا۔ تب ہو جائیگا۔

ہرچند۔ ہر بار اس تو ہمیں کہتے تھے۔ کہ شہر کے ایک نامی گرامی وکیل صاحب نے اپنے بڑے مکان کا ایک حصہ ایسے کاموں کے لئے ہی وقف کر رکھا ہے۔ اور وہاں ایسے جلسے ہوا ہی کرتے تھے۔

ہر پرام۔ لیکن اب تو بہت عرصہ سے اسکے بھی دروازے بند ہیں۔ خبر نہیں کیوں ایک عرصہ سے وہاں بھی کسی قسم کا جلسہ وغیرہ نہیں ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب سے جدید پولیٹیکل شورش ہوئی سب قسم کے مفید کام رک گئے۔ بلکہ بند ہو گئے۔

شام سندر۔ کیوں سب قسم کے مفید کام کیوں رک گئے۔

ہر پرام۔ بھائی صاحب لوگ جھوٹی اور غلط رپورٹوں سے ڈرتے ہیں مکان والے جلسوں کے لئے مکان مستعار دیتے گھبراتے ہیں۔ یہ قضیہ تو اسی دن دور ہوگا جس دن دہلی میں کوئی پبلک ہال بنے گا۔ جہاں آزادی سے گو خاص قواعد کے مطابق جلسے وغیرہ ہو سکیں۔

ہرچند۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیگی۔ دہلی میں کوئی بھی رفاہ عام کا کام تو اچھی طرح چلتا نہیں پبلک ہال بھلا کہاں سے کھڑا ہو جائیگا۔ آپ بھی خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔

ہر پرام۔ دیکھو بھائی ایشور سے کچھ بعید نہیں جس دن اس کی مرضی ہوگی ایک آدمی کے کرنے سے سب کچھ ہو جائے گا۔ لاہور میں اکیلے سردار دیال سنگھ کی فیاضی اور دریا دلی اور پبلک سپرٹ سے کتنا پبلک کام ہوا۔ سکول کھلا۔ کالج کھلا۔ اخبار نکلا۔ ریڈنگ روم اور لائبریری قائم ہوئی۔ کیا دہلی کے نوجوان امیر زادوں میں سے کوئی سردار دیال سنگھ ثانی رہونا ناممکن ہے

(اس اثنا میں ہم سب دوست ڈاکٹر کے مکان پر جہاں شادی ہوتی تھی پہنچ گئے اور گفتگو ختم ہوئی)

راقم
ایک جاسوس

"سلطنت یمن"

حجاز کے جنوب میں جزیرہ نمائے عرب کا جنوبی اور شرقی حصہ یمن ہے جو عرب کے بہترین ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے اگرچہ یہاں لگاتار بارش یا متعدد دریاؤں کا ذخیرہ کافی تعداد میں موجود نہیں ہے پھر بھی یمن کو عرب کا سوئیٹ زرلینڈ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ عربستان میں کوئی ملک اس سے زیادہ گنجان اور زرخیز نہیں، یمن کا طول چار سو میل اور عرض ایک سو پچاس میل سے زیادہ ہے، یہاں کے قدیم باشندے یا تو تجارت پیشہ لوگ ہیں یا کاشتکار۔ تجار تو جنکی تجارت کا سلسلہ مصر ایران وغیرہ سے ہے مشہور بندرگاہ عدن۔ مخا وغیرہ سے مال لاتے اور مناسب نفع پر سرزمین یمن کے بڑے بڑے شہر اور قصبوں میں فروخت کرتے ہیں۔ لیکن یہاں کے کاشتکاروں کو اپنی کھیتی باڑی کے سوا اور کسی بات سے مطلب نہیں یہ لوگ بڑے محنتی ہیں اور جس طرح ممکن ہو سکتا ہے دولت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یمن میں سب قسم کے پھل میوے اور اجناس پیدا ہوتے ہیں۔ بالخصوص یہاں کا قہوہ کھجوریں گوند اور مصالحہ بہت مشہور ہیں۔ اگرچہ گیہوں بھی عمدہ اور سفید پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں کے باشندے عموماً باجرہ کھاتے ہیں جو بعض جگہ بغیر ہر سال بویا جاتا اور ملکی ضروریات سے اس قدر زیادہ پیدا ہوتا ہے کہ عدن اور جدہ وغیرہ بھیجنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یمن کے کاشتکار اور تجار جس کاشت اور تجارت سے نفع حاصل کر رہے ہیں۔ وہ قہوہ اور کوت کی پیداوار ہے یہاں کا قہوہ دکانی، تمام دنیا میں مشہور ہے اور خصوصاً فرانس میں اسکی بہت قدر کی جاتی ہے تخمینہ کیا گیا ہے کہ ہر سال ۶۰۰۰ ٹن (۸۰۰۰۰ من) قہوہ بندرگاہ ادرسیدہ سے امریکہ ہندوستان اور یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں جاتا ہے جسکی سالانہ قیمت تین لاکھ پونڈ (۴۵۰۰۰۰۰ لاکھ روپیہ) ہوتی ہے۔ کوت (جس سے عموماً ہم لوگ ناواقف ہیں) یمن کا ایک خاص پودا ہے۔ اگرچہ دوسرے ملکوں میں اسکی شہرت زیادہ نہیں لیکن یمنی باشندے اسکو ضروریات زندگی میں سمجھتے ہیں، یہ سبز پتیاں پان کے پتوں کی طرح کھائی جاتی ہیں

اور ہر یمنی عرب کے پاس اسکا کافی تعداد میں ہونا لازمی ہی کوکہ گر چہ نہایت قیمتی چیز ہی اور ترکی گورنمنٹ نے
اسپر بھاری محصول لگا رکھا ہی پھر بھی یمن سے ہر سال چند ہزار سے زیادہ کو دوسرے ممالک بھیجے جاتے ہیں۔
یمن کے بڑے اور مشہور شہر صنعاء، رودہ، تحا وغیرہ ہیں جن میں صنعاء، قدیم زمانہ سے حاکم
یمن کی جائے سکونت ہی۔ یہ شہر ساحل سمندر سے تقریباً دو سو میل دور اور سطح سمندر سے ۸۰۰۰
فٹ بلندی پر واقع ہی۔ آبادی کا اندازہ ... ۲ کے قریب کیا جاتا ہی یہاں کے باغات محل اور
دوسری مشہور عمارتیں اُس قدیم صنعت و حرفت کا نمونہ ہیں جس کی نظیر فی زمانہ صرف
مشکل ہی نہیں بلکہ کمیاب ہے۔

یمن کے باشندے عموماً سانولے رنگ کے ہوتے ہیں کچھ لوگ سیاہ فام بھی ہیں۔ لیکن وہ جنمیں حبشی نسل کا میل
زیادہ ہو گیا ہے) اور کچھ بالکل گورے رنگ کے قد اگرچہ درمیانہ ہوتا ہی لیکن جسم بہت مضبوط اور
سڈول، چہرہ بیضاوی، آنکھیں بڑی بڑی دہانہ خوبصورت ناک زیادہ تر سیدھی ہوتی ہی مردوں کی
بہ نسبت عورتیں زیادہ نازک اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی دلیر اور بہادر بھی یہ لوگ گو
لین دین کے معاملات میں جھوٹ بولنے اور فریب دینے کے عادی ہوں لیکن کسی مذہبی معاملہ
میں ہرگز جھوٹ نہیں بولتے بلکہ ایسے موقعوں پر جھوٹ سے موت کو اچھا سمجھتے ہیں۔

یمن کے آثار قدیمہ کی اب تک کچھ زیادہ تحقیقات نہیں ہوئی لیکن یورپ کے بہت سے سیاح وضع عربوں کے
لباس اور وضع میں مدتوں یہاں خاک چھان چکے اور چھان رہے ہیں، متفق الزبان ہیں کہ یہ ملک کسی زمانہ
تہذیب و شائستگی کا منبع ہوگا۔ یہاں کی مشہور عمارتیں، قدیم کتبے اور دوسرے مختلف ثبوت اِس بات کو
ظاہر کر رہے ہیں کہ یمن صنعت، تجارت، اور دولت میں کسی سلطنت سے کم نہ تھا۔ اب بھی اکثر
ذخیرہ قیمتی جواہرات اور دیگر اشیاء اُس کے ویرانوں میں پائی جاتی ہیں۔

یمن پر ۳۰ سال سے سلطنت ٹرکی قابض ہی۔ لیکن یہاں کے بعض قبائل دگروہ، کسی کو اپنا
حاکم یا بادشاہ نہیں سمجھتے۔ جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا ہی تو بغاوت کر بیٹھتے اور بڑی
بڑی سلطنتوں کے مقابلہ سے نہیں ڈرتے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں امام یحییٰ دین مخالف و
قبیلوں کے (امام) اور سلطنت ٹرکی کے درمیان جو لڑائیاں ہو رہی ہیں اُس سے یمن کی خود مختارانہ حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ سید حسین اختر دیر محکی

گئو رکھشا

گئو رکھشا اب ایک ملکی سوال ہے۔ گو کہ اس ملک میں ہر ایک ضروری امور مذہب کے لباس میں ڈالدئے گئے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ قوموں کو جو اس میں آباد ہیں۔ ہم سوال گئو رکھشا کا محض مذہبی پہلو میں نہیں کر سکتے۔ خوش قسمتی سے اہل اسلام اور دیگر مذاہب کے اشخاص بھی ہندوستان میں گئو رکھشا کی ضرورت کو سمجھتے جاتے ہیں۔ اور کئی اصحاب نے اسکے لئے اپنا جان و مال وقف کر دیا ہے حتیٰ کہ لیجیسلیٹو کونسلوں میں بھی اسکی بابت تجاویز غیر ہندو اصحاب کی طرف سے ہوئی ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک گئو رکھشا کی ضرورت کو محسوس کر رہا ہے۔

عنقریب گوالیر کے ایک پنڈت گنپتی لال صاحب بید وید نے گئو رکھشا کے متعلق ایک اپیل حضور ملک معظم جارج پنجم شاہنشاہ ہند کی خدمت میں پیش کرنے کی تجویز کی ہے۔ جسکے لئے وہ ہندوستان کی ہر قوم و ملت کے لوگوں کے دستخط جمع کر رہے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس اپیل کا کیا حشر ہو لیکن اگر سرکار ہاتھی و گھوڑے کی نسل کی حفاظت کر رہی ہے تو کیا تعجب کہ حضور ملک معظم جارج پنجم شاہنشاہ قیصر ہند دام اقبالہٗ اس تاجپوشی کی مبارک ساعت میں ہندوستان کی لکھوکہا رعایا کی بہبودی کو مد نظر رکھ کر اس مفید جانور کی نسل کی بھی حفاظت کرنے کے لئے کوئی فرمان جاری کریں مجھے قوی امید ہے کہ اس قسم کی کوشش جیسی کہ پنڈت صاحب موصوف کر رہے ہیں اگر باقاعدہ اور ڈھنگ سے جاری رکھی جائے تو ہم ضرور گورنمنٹ عالیہ کی توجہ سوال گئو رکھشا پر دلانے میں کامیاب ہونگے ؁

ہمیں نہایت شرم کے ساتھہ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود بجا فروش کی کوشش کے ہمارے ملک میں گئو رکشا پر عوام الناس نے بالکل توجہ نہیں کی ہے۔ افسوس اس ملک پر جسکی آبادی کا تین چوتھائی حصہ گئو رکھشا کو مذہبی فرض سمجھتا ہے اور جہاں کی تمام کاشت اور بہت سا حصہ تجارت اِس نسل کے قائم رہنے پر مبنی ہے جس ملک کی لطیف غذا صرف اِس جانور کا دودہ و گھی ہے۔ وہاں اسیراتنی بے غوری کیجائے کہ اسکی حالت غیر ممالک سے بھی بدتر ہو۔ میرے ایک دوست جو ابھی ولایت کی سیر سے واپس آئے ہیں ذکر کرتے تھے کہ وہاں کے کسی ڈیری فارم میں جانوروں کے رہنے کی جگہ یہاں کے لوگوں کے مکانات سے بہتر ہیں! ۔ کیا وجہ کہ وہ حقیقت میں گئو رکشا کرتے ہیں۔ اور ہمارا صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ خالص دودہ و گھی بڑے بڑے شہروں میں نایاب ہوتا جاتا ہے۔ حتی کہ لنڈن میں دودہ کی قیمت کلکتہ کی برابر ہے اور کیمیائی تجزیہ سے اگر دیکھا جائے تو وہ دودہ یہاں کے دودہ سے بدرجہا بہتر ہے

پیشتر اسکے کہ ہم اپنے ہموطنوں کو گئو رکھشا کے متعلق تحریک کریں ہمیں اس اصطلاح کے صحیح معنے بتانے ضروری ہیں۔ گئو رکشا کے معنی یہہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہم جانوروں کو بالکل مرنے نہ دیں۔ اگر کسی قانون کی مدد سے ہم قصائی کے ہاتھ سے انکو بچا بھی لیں تاہم انکو قضائے قدرت سے نہیں بچا سکیں گے۔ یہ ہمارے اختیار میں نہیں۔ لہذا تمام جانوروں کو بلا امتیاز حفاظت کرنے کی کوشش کسی حد تک رائیگان جائیگی ؂

پھر گئو رکھشا کے معنے کیا ہوئے۔ میرے خیال میں گئو رکھشا کا اصلی مدعا یہ ہے کہ ایک مفید نسل جسپر ہماری زندگی کا بہت سا دارومدار ہے قانوناً اس حد تک محفوظ کیا جائے کہ جس سے قوم اسکی کمی محسوس نہ کرسکے۔ الغرض

ترکیب سے ہمیں دودھ و گھی کا کوئی معقول بدل ملجانے اور لاد کھینچنے اور ہل جوتنے کے لئے کوئی اور قوت ملجائے تو ہم ہرگز گئو رکھشا کو لیکر ناظرین کی سمع خراشی نہ کریں۔ پس ظاہر ہوا کہ گئو رکھشا انسان کے لئے ہے نہ کہ انسان گئو رکھشا کے لئے جیسا کہ بعضوں نے کر رکھا ہے۔

میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ ہمارے ملک میں گئو رکھشا پر جس قدر شور وغوغا ہے۔ اسکا عشر عشیر بھی عملی کام نہیں ہے۔ جبتک اس کام میں ہر ایک فرد بشر جو اسمیں اعتقاد رکھتے ہیں شریک نہ ہوں گے۔ تو محض مباحثہ سے کوئی کار آمد نتیجہ پیدا نہ ہوگا۔ میں ہرگز یہ کہنا نہیں چاہتا ہوں کہ مباحثوں کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ عمل سے پہلے ہمیشہ خیال کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص خیال ہی خیال میں رہجائے جیسے کہ اس بدقسمت ملک میں ہر نیک کام کے ساتھ ہو رہا ہے۔ تو ہماری ترقی ہونی دشوار ہے۔

اب پوچھا جا سکتا ہے کہ ہر فرد بشر کیونکر گئو رکھشا کے لئے کوئی عملی کام کرسکتا ہے۔ ہر ایک کے لئے گائے کا پالنا ناممکن ہے۔ اور نہ ہندوستان کی ہر جماعت اسکو اپنا مذہبی فرض بنا سکتی ہے جیسے کہ اہل ہنود سمجھتے ہیں۔ تاہم ہر فریق کے سمجھدار اشخاص بہ حیثیت ایک تجارتی اور ملکی ضرورت کے اسکے مداح ہوتے جاتے ہیں۔ میں ان تمام اصحاب کی خواہ وہ ہندو ہوں یا نہ ہوں اس بات پر توجہ دلانی چاہتا ہوں کہ بلا امتیاز قوبی سب جانوروں کی رکشا نہ تو ہمارے اختیار میں ہے۔ اور نہ ہمارے لئے ضروری ہے۔ گئو رکھشا سے ہماری مراد گئو کی اچھی نسل پیدا کرنی ہے کہ جن میں سے زیادہ دودھ و گھی دینے والی گائے قوی ہیکل مضبوط اور

تیز رفتار بیل نکلیں۔ آئین اکبری کو پڑھکر معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں ایسے ایسے بیل شاہی گئو شالہ میں موجود تھے کہ تیز رفتاری میں گھوڑوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ وہ سب اب کہاں گئے۔ بے غوری سے معدوم ہو گئے لیکن پھر ویسی ہی نسلیں گائے اور بیل کی پیدا کرنا ہمارے اختیار میں ہے بلکہ علم جدید اور ڈارون کی عجیب و غریب معلومات کی مدد سے ہم بہت جلد نہایت عمدہ نسلیں جانوروں کی بلحاظ ان کے فضل جسمانی قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ان عمدہ نسلوں کی حفاظت کرنے میں ہمیں قانون قدرت (انتخابات) کی تقلید کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اگر ہم بلا امتیاز ہر جانور کی پرورش کریں جیسے کہ گئو شالاؤں میں کیجاتی ہے تو یہ کام نہ صرف ہمارے لئے تجارتی اصول پر ناممکن ہوگا بلکہ ہم کوئی عمدہ نسل ہرگز قائم نہ کر سکیں گے

ناظرین سوال یہ درپیش ہے کہ ایک طرف تو ہر ایک گئو رکھشا کے حامی کو اچھی گائے پالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور دوسری طرف دقت یہ ہے کہ ہمارے گنجان شہروں کو تو جانے دیجئے چھوٹے قصبہ جات میں بھی چرائی کی زمین کی قلت سے اور مکانوں کی تنگی سے گھر گھر میں گائے پالنا۔ جو کہ ہندوؤں کا دھرم ہے نہایت مشکل ہوتا جاتا ہے۔

اس دقت طلب امور کا فیصلہ میری عقل ناقص میں یہ آتا ہے کہ اس تجارتی زمانہ میں ہم صرف تجارتی اصولوں پر ہی گئو رکھشا میں کامیاب ہو سکتے ہیں یعنی بجائے فرداً فرداً کوشش کے ہمیں گئو رکھشا کے لئے کمپنیاں بنانی چاہئیں جسکو ہم نے گئو کل کہا ہے۔ جیسے انسانی بہبودی کے لئے گروکل کی ضرورت ہے۔ اسی طرح گئو رکھشا کے لئے گئو کلوں کی ضرورت ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ایک متوسط درجہ کا آدمی اپنے گھر میں

ایک گائے سے زیادہ نہیں پال سکتا۔ اور پھر باوجود بہت سی دقتوں کے جوکہ جانوروں کو گھر میں رکھنے سے ہوتی ہیں۔ نیز جانوروں کے لئے بھی مضر ہیں۔ مالک کو برس میں کئی مہینے دودھ نہیں ملتا ہے۔

ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جن اشخاص کے ایک سے زیادہ جانور ہوتے ہیں۔ انکو کسی وقت دودھ کی تنگی اور کسی وقت ضرورت سے زیادہ یافت ہونے سے پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ انہی قباحتوں سے تمام آدمی گائے پالنے کو محض دردسری سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر ایک بڑے شہر میں چار یا پانچ شخص ملکر ایک کمپنی بنائیں اور اسمیں ہر ایک حصہ دار۔ کم از کم گائے کی قیمت کا چوتھائی۔ یعنی دس روپیہ کا حصہ لے اور روزانہ ایک گائے کا کم و بیش چوتھائی حصہ یعنی دو سیر دودھ بقیمت چھ یا آٹھ پیسے سیر لینے کا وعدہ کرے تو نہ صرف یہ اسکے لئے بلا تکلیف گئو رکھشا ہو بلکہ ممکن ہے کہ ایک آمدنی کی شکل ہو جائے۔ اگر اسطرح سے جانور شہر کے باہر کھلے مکانوں میں رکھے جائیں اور انکے چرنے کے لئے جنگل ٹھیکے پر لے لئے جائیں اور قابل اطمینان شخصوں کی زیر نگرانی رہیں تو ہمیں یقین ہے کہ انکا دودھ گھوسیوں کے یا جانوروں کے گھروں کے دودھ سے بہتر ہوگا۔ اور قیمت میں تقریباً گھوسیوں کے دودھ کے برابر اور گھروں سے کسی قدر کم ہوگا۔

میں اس تدبیر کی تفصیل میں سر دست ناظرین کی سمع خراشی نہیں کرنی چاہتا ہوں۔ لیکن جب قصہ کو چھیڑا ہی ہے تو اسکے موٹے موٹے اصول بتا دینے لازمی معلوم ہوتے ہیں۔

اوّل۔ جانوروں کی صحت کے متعلق کافی واقفیت اور ہر موسم و حالات کے لحاظ سے انکی غذائی ضروریات سے ہر ایک شخص واقف نہیں ہو سکتا

لہذا گئوکل میں گائے پالنے میں ہم جانوروں کی معقول طبی ضروریات رفع کرسکتے ہیں۔
دویم۔ مجموعی حالت میں جانوروںکو پالنے میں چارہ وغیرہ موسم پر خرید کر رکھ لینے میں نہایت کفایت ہوسکتی ہے جوکہ روزمرّہ کی خریداری میں ہرگز نہیں ہوسکتی۔
سویم۔ شہر کے اندر ہمیں فی جانور مکان کا کرایہ بہت زیادہ دینا پڑتا ہے علیٰ ہذا القیاس کٹی وغیرہ کٹوائی میں جوکہ ہاتھ سے کاٹی جاتی ہے بمقابلہ مشین کے (جو زیادہ جانور رکھنے میں استعمال کیجا سکتی ہے) زیادہ خرچ ہوتا ہے۔
چہارم۔ دودھ و مکھن وغیرہ مشینوں کی مدد سے نکالتے ہیں ہم بہت زیادہ پاکیزگی کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ جوکہ صحت کے لئے نہایت ضروری ہے۔
پنجم۔ جانوروں کے بچے جو عموماً دقت سے بچنے کے لئے برہمنوں کو (قصائی کے ہاتھ بیچنے کے لئے !!!) دیدیئے جاتے ہیں۔ گئوکل میں بآسانی پرورش پاکر عمدہ نسل قائم کرنے میں کارآمد ہوسکتے ہیں۔
ششم۔ اکثر گھروں کے جانوروں سے بچے لینے میں سانڈ کی عمر و صحت کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ جوکہ گئوکل میں بآسانی ہوسکتا ہے۔
اس قسم کی اور بہت سی باتیں جو ملکر کام کرنے میں ہوسکتی ہیں۔ وہ فرداً فرداً کوشش میں بالکل ناممکن ہے۔ اُمید کہ دیگر اصحاب بھی اس مضمون پر اپنی رائے سے مطلع کرینگے۔
آخر میں ایک بات اور ناظرین کے گوش گزار کرنی چاہتا ہوں کہ اس قسم کے کام دلّی یا کسی اور جگہ کھولنے کے لئے جہاں اسکی ضرورت ہو خاکسار ہر طرح سے مدد دینے کے لیئے تیار ہے۔ خط و کتابت بمعرفت مینیجر رسالہ زبان دہلی ہونی چاہیئے

"ممگس"

سنسکرت کی ضرورت

موجودہ زمانہ بھی ایک نہایت خوش قسمتی کا زمانہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ اس میں پھر نئے سرے سے اس بات کی اُمنگ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئی ہے کہ سنسکرت جو مردہ زبان سمجھی جاتی ہے۔ اس کے از سرِ نو زندہ بنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا جائے۔ یہ جوش اور ولولہ صرف ہندوستانیوں ہی کے دلوں میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یورپ و امریکہ اور ممالک کے ودوان بھی سنسکرت کی چھان بین میں بہت وقت اور ہم سے کہیں زیادہ روپیہ صرف کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات قابل افسوس ہے کہ جتنی محنت اور جفاکشی کے سنگ وہ لوگ اِس علم کی تحصیل میں مستعد ہیں۔ ہم اسکا عشر عشیر بھی نہیں۔ لاکھوں ہی ودوان دیگر سنسکرت کی درسگاہیں کھلوادیں۔ سیکڑوں رسالے اِسی مذاق کے شائع ہونے لگے۔ سنسکرت کی بیسیوں خوبصورتیوں پر ایک ایک نئے نکتہ چینی شروع کردی۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے تھوڑے سے زمانہ میں انہوں نے اتنی زبردست ترقی حاصل کی۔ اب ہم اگر اپنی موجودہ حالت کا اِن سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوجائیگا کہ ہم اپنی ترقی میں کتنے نیچے گرے ہوئے ہیں اور اپنی کاہل وجودی میں بہ حیثیت ایک جماعت کے اِن سے کس قدر زیادہ سبقت رکھتے ہیں ⁂

سنسکرت لٹریچر ایک اتنا سمندر ہے۔ جس میں طرح بطرح کے موتی و جواہرات بکھرے پڑے ہیں۔ اور وہی شخص اِن سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے جو پرشرم کرکے اسکی تہ میں غوطہ لگاتا ہے۔ مغرب کا ایک بڑا سنسکرت

پنڈت لکھتا ہے
کہ مجھے سنسکرت کی دل پسند باتوں کے مقابل میں دنیا کی تمام خوش ذائقہ چیزیں محض کمتر اور بار معلوم ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں سنسکرت سے دلچسپی کم ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ خاصکر یونیورسٹی طلبا جو سنسکرت کو بہت مشکل خیال کرکے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ سکولوں اور کالجوں میں سنسکرت کی تعلیم اب تک کسی باقاعدہ طریقے سے نہیں دیجاتی۔ یہاں تک کہ سنسکرت کے انٹرنیس پاس طلبا، زیادہ تعداد میں درست سنسکرت لکھنے تک کی پوری طور سے شدہ بدہ بھی نہیں ہوتی اور شاید ہم سنسکرت پڑھے لڑکے کی فارسی والے سے مشکل سے تمیز کر سکتے ہوں۔ یونیورسٹی کی سنسکرت تعلیم کو درست کرنے کی آجکل سخت ضرورت ہے۔

عوام کے دلوں میں سے سنسکرت کی طرف سے توجہ ہٹ جانے کا باعث اسکی پرانی تاریخ ہے جو نہایت افسوس اور رحم کے قابل ہے۔ انگریزوں سے پیشتر ہندوستان کی فاتح قوم نے علم سنسکرت کے غارت کردینے میں ہر طرح کے ہتھیاروں سے کام لیا۔ محمد غوری نے سومناتھ جی کے مندر سے ہزاروں روپے ہی نہیں لوٹے بلکہ ساتھ ہی اسکے لاکھوں قلمی نسخہ اپنے ایک اشارہ سے خاک میں ملوا دئے۔ متھرا جی کے نوکہن کی پرانی مشہور لائبریری جو کھچا کھچ دستی پستکوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور جو پستک اپنی وضع کی آپ ہی نرالی ایک نمونہ تھی چند گھنٹے میں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کروا دی گئی۔ اس قسم کے واقعات ہندوستان کی چپہ چپہ زمین پر سرزد ہوئے ہیں۔ جنکا شمار ہماری طاقت سے باہر ہے۔

لیکن سنسکرت لٹریچر کی ہستی کسی غیر چیز کے بھروسے پر قائم نہیں ہے۔ اسکی

اگنی ایک اُپلے کی آگ کے مثال ہے جو وقت کے تغیر و تبدل سے کچھ عرصے کے لئے خاک سے ڈھک جاتی ہے لیکن بجھتی نہیں۔ سنسکرت لٹریچر کا سورج جو تھوڑی دیر کے لئے اودیات کے کالے بادلوں سے غروب ہوا معلوم ہوتا ہے۔ فوراً ہی طلوع ہو جاتا ہے۔ جبکہ دکھن کی کارگر ہوائیں اپنی مشہور ودیا کے جھکولوں سے اُن کے اُڑا دینے میں سرگرم ہوتی ہیں۔ آجکل سنسکرت کی بہت سی کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کی یہی مذکورہ بالا وجہ ہے۔ اس شرمناک حرکت سے پستکوں کو محفوظ رکھنے کے لئے پرانے پنڈتوں نے بہت سے طریقے اختیار کئے۔ اُنہوں نے کنٹھ کرنے کے سب سے پرانے دستور کو استعمال میں لایا۔ اور انہی کی برکت سے آج ہم کو بہت سی کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ باقی بچی کچی کتابوں کو انہوں نے یا تو زمین میں دفن کر دیا۔ اور یا جل پرواہ کر دیا۔ چنانچہ کشمیر میں اسکی شہادت کے لئے ابتک پانی میں انہی سنسکرت کتابوں کی دیوار موجود ہے۔ جو پنڈتوں نے غرق آب کردی تھیں۔ آجکل باقیماندہ کتابیں جرمن اور انگلستان کی لائبریریوں میں ہوا کھا رہی ہیں۔ چنانچہ ابھی سنا گیا ہے کہ ۲۵۰۰ دستی کتابیں ہندوستان کے ایک مشہور پنڈت نے اکسفورڈ بھجوا دیں جنکے سواگت کے لئے وہاں ایک علیحدہ عمارت تعمیر کروائی جا رہی ہے۔ یہ نمونے ہیں جو ہندوستان کی موجودہ گری ہوئی حالت کا صاف صاف پرچہ دے رہے ہیں۔ پس اس حالت میں کیا ہر ایک ہندوستانی کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اس لٹریچر کی ویدی پر اپنا آواہن کرے تاکہ آریہ ستان پھر اپنی پرانی عظمت کو حاصل کرے ✦

لٹریچر اور قوم کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہوا کرتا ہے۔ جس قوم میں سے آزادی کی بو غایب ہو گئی ہو۔ اور ہمیشہ افلاس و بیماریوں کے پنجہ میں پھنسی ہو وہ قوم کبھی عمدہ لٹریچر پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل ہندوستان میں

سنسکرت کی بہت کم اصلی کتابیں پیدا ہوتی ہیں اور زیادہ تر پرانی کتابوں پر تشریح وغیرہ لکھی جاتی ہے۔ جسطرح سے کہ لٹریچر کی بہتری قوم کی دوستی پر مبنی ہے۔ اسی طور پر قوم کی ترقی لٹریچر کی عمدگی پر قائم ہے۔ دونوں لازم ملزوم ہیں تاریخ اس بات کو بتلاتی ہے کہ کوئی قوم بغیر علم کے ترقی حاصل نہیں کر سکی۔ اس کی عمدہ مثال ہمارے سامنے انگریزی قوم موجود ہے۔ مسلمانوں کی پچھلی ترقیوں کا باعث انکا علمی شوق تھا۔ ہندوؤں سے بہت سے ودیائیں سیکھ کر عرب والے بہت مدت تک اپنے علم کی طاقت سے اکثر ملکوں پر حکمران رہے۔

ہندوؤں کی ترقی کا باعث بھی انکا زبردست لٹریچر رہا ہے۔ ہندوؤں میں ہمیشہ سے روحانیت کا جز او نچے درجہ پر رہا ہے۔ اونکی ترقی کو بند کرنے کی آسان کنجی یہ ہے کہ انکو روحانیت کی طرف سے پیچھے ہٹا دیا جائے۔ پس یہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکے گی۔ اور اس روحانیت کی سپرٹ کم کرنیکا اور ان ہندوؤں کے خلاف یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے لٹریچر کو جو ان باتوں سے ہی بھرا ہوا ہے فوراً غارت کر دیا جائے۔ ہندوؤں کے پرانے لٹریچر غارت کئے جانے سے ایسے نتیجے پیدا ہوئے ہیں۔ اسمیں ذرا بھی شبہ نہیں۔ پس ہندوؤں کی ترقی کرنے سنسکرت کی ترقی لابد امر ہے تاکہ ہم پرانے اڈیلز Ideals. کو اپنے سامنے آدرش رکھیں۔ اور پرانی تعلیم و تربیت کا مقابلہ موجودہ زمانے سے کرنے پر اپنے تئیں ہر طرح کی معلومات سے آگاہ کریں۔

ہندو قوم اکثر بری نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور اس پر ہر طرح کے مذہبی و قومی الزامات جڑے جاتے ہیں۔ اسکا یہ باعث نہیں ہے کہ انکے بزرگوں نے پرانے زمانہ میں کچھ ترقی حاصل نہیں کی۔ بلکہ اسکی یہ وجہ ہے کہ لوگ اسکی پرانی حاصل کردہ ترقیوں سے ناواقف ہیں۔ پس اسکی جہالت اسکی دامنگیر ہو رہی ہے

ترقی میں مانع ہے۔ اسلیئے ہندوؤنکو اپنی عزت قائم رکھنے کے لئے سنسکرت ودیا کا پرچار بہت تیز رفتاری سے کرنا چاہیئے۔ ایک ہندو تمام ملکوں میں اسوجہ سے عزت کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پرانے اور عظیم علم و ادب کا وارث سمجھا جاتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ اگر ہندو اب بھی بیدار نہ ہوئے تو اور قومیں ان سے سبقت لیجائینگی اور ان کی سنسکرت کی ملکیت ان سے چھن جائیگی۔ اور جو عزت انکو سنسکرت کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ اوس سے یہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

ہندوستان کے لئے سنسکرت کی ترقی ایک بڑی برکت ثابت ہوگی آپس میں ہمدردی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک شخص دوسرے کو دوست سمجھنے کی کوشش کرے۔ اکبر نے جب سنسکرت کتابوں کے سمجھنے کی کوشش کی تو آپس میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی اور دو قومیں جو مدت سے علیحدہ تھیں اکبر کی عہد حکومت میں قریب آتی گئیں۔ یہاں تک کہ چولی دامن کا ساتھ مشہور ہوگیا۔ لیکن اورنگ زیب نے تمام کی بیخ کنی کر ڈالی۔ اب زمانہ آیا ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے لٹریچر کو نہایت ہمدردی سے پڑھیں تاکہ آپس میں زیادہ محبت پیدا ہو۔

ہندو مسلمانوں کے درمیان دیوار بہ دیوار رہتے ہوئے بھی ایک آہنی دیوار واقع ہے۔ اور باوجود سالہا سال کے میل جول کے ابتک دونوں میں اتنا فرق ہے جتنا کہ قطب شمالی و قطب جنوبی میں۔ اس بیماری کے دور کرنے کے لئے جو آجکل زور پکڑے ہوئے معلوم ہوتی ہے ایک مجرب نسخہ جو مہرشیل کا بتلایا ہوا ہے۔ آزمودہ ہے۔ سو یہ ہے۔ کہ مسلمان بھائی ہندوؤں کے رسم و رواج و عادات کے سمجھنے کے لئے اور ہمدردی کو پیدا کرنے کے لئے ہندوؤں کے لٹریچر کو دوستی کی نظر سے پڑھیں۔ اور ہندوؤں کو بھی واجب ہے کہ اپنے بھائیوں کی عزت

کرنے کے لئے۔ ان سے محبت پیدا کرنے کے لئے اُنکے لٹریچر سمجھنے میں کوشاں ہوں۔ اس بنیاد پر جو عمارت تعمیر کیجائیگی۔ وہ یقین ہے کہ بہت سی مشکلات کے طوفان سے محفوظ رکھنے کے لئے نہایت سخت ثابت ہوگی + +

سنسکرت کے فوائد صرف ہندوستان کی چار دیواری تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ ان قیود کو پھاند کر سمندر کو عبور کر اسکی خوبیاں بڑے بڑے نکتہ دانوں کو اپنی طرف کھینچیں گے اور بغیر کسی جنگ کے سنسکرت کی فتحیابی سے ہندوستان کا سکہ تمام دنیا پر جم جائیگا۔ جو ہمارے لئے باعث فخر ہوگا +

جرمنی کے ایک مشہور شاعر گئے تے (Goethe) کا شکنتلا ناٹک کی تعریف کرنے سے اور شوپن ہیور (Sehanpanhar.) کا انپشدوں کے فلسفہ کی عظمت جتلانے سے تمام جرمن میں ہندوستان سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ جو دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ اور جسکی بدولت ہندوستان اور جرمن میں دوستی کا رشتہ پیدا ہوگیا ہے۔

چنانچہ جسوقت شہزادہ جرمن ہندوستان میں تشریف لائے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی نے انکو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی تھی۔ یہ باہمی تعلق و ہمدردی سنسکرت کے اور کارناموں سے ایک برکت ہی جب سے انگریزوں نے سنسکرت کی طرف توجہ مائل کی ہے تب سے وہ ہندوں کے خیالات و جذبات کو زیادہ سمجھنے لگے ہیں اس سے انکو انتظامی معلالات میں بہت آسانی ہوجاتی ہے۔ اسیطرح پر ہندوستانی لوگ انگریزی لٹریچر کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور شکسپیر (Shakespeare) کو پڑھتے ہوئے ہم اُسکو اپنا ہندوستانی ہی سمجھتے ہیں۔ پس جبکہ اور تمام ذرایعہ قومی اتحاد کے قائم رکھنے میں ناکامیاب ثابت ہوسکتے ہیں۔ تب لٹریچر

اپنی قوت سے تمام پر حاوی ثابت ہوتا ہے اور اسکی فتح ہوتی ہے۔ امریکہ اپنے خیالات میں دن بدن ہندوستان کی طرف کھچا چلا آتا ہے۔ ان تمام کا باعث سنسکرت لٹریچر کا پرچار ہے۔

پس ہندؤں کے لئے تو ہر طرح پر سنسکرت ودیا کا سیون کرنا اعلیٰ فرض ہے۔ کیا آپنے کبھی یہ نہیں سوچا کہ آج ہندوستان کے ایک سمت کے ہندو کو دوسری سمت کے ہندو سے ملانے والی کونسی چیز ہے۔ وہ کونسی چیز ہے جسکے نام سے ہر ایک ہندو واقف ہے اور جو چیز آج ہندو قوم کی بندش کو قائم کئے ہوئے ہے اور جسکی بنا پر ہمارے خیالات کی ساخت ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سنسکرت کی دو کتابیں راماین اور مہابھارت تمام ہندو قوم میں رائج ہیں جنکی کتھاؤں وغیرہ سے ہندؤں کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اور جنہوں نے باوجود لمبے فاصلوں کے قومی جوش اور حمیت کو ابتک قائم رکھا ہے۔ ہندوں میں خواہ کتنے ہی تفرقے پیدا کیوں نہ ہوگئے ہوں۔ لیکن سب اپنے خیالات کا منبع ویدوں کو مانتے ہیں اسلئے تمام تفرقونکو ترک کرنے کے لئے ہمیں ویدک لٹریچر کو از سرنو ترقی دینی چاہیے۔ جس کے آدھار پر اور تمام سنسکرت لٹریچر کی عمارت کھڑی ہے۔ پس ہندؤں کے لئے ویدک لٹریچر سے موجودہ سنسکرت تک کی ترقی ان کے دہرم کے پرچار کے لئے اور قومی اتحاد و بندش قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

سنسکرت کے نہ سمجھنے سے آجکل ہم اپنے رسم ورواجونکو بالکل بھول گئے ہیں اور بہت سے مسئلوں کو کچھ کا کچھ سمجھ کر بجائے فایدے کے قوم کو نقصان پہونچاتے ہیں۔ مثلاً چھوت ذات صفائی و برداشت وغیرہ کے مسئلے آجکل عام لوگونمیں بالکل برعکس سمجھے جاتے ہیں۔

ہندوؤں میں سوسائٹی اور مذہب کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہم کوئی ترمیم اپنے سوشل قوانین میں نہیں کرسکتے۔ جب تک کہ ہمکو دھرم کی رُو سے نہ سمجھا جائے۔ اور ہماری تشفی کے لئے شاستروں کے پرمان پیش نہ کئے جائیں۔ چونکہ موجودہ سوشل ریفورمرز اس اصول کی مدد کے بغیر سوسائٹی میں تبدیلیاں واقع کرنی چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُنکو ناکامیابی حاصل ہوتی ہے۔ پس اس دلیل کے مطابق بھی سنسکرت لٹریچر کی ترقی کھتاون کا جا بجا کیرتی آئندہ سوشل۔ اخلاقی و روحانی ترقی حاصل کرنے کے لئے نہایت لازمی ہے۔

کسی قوم کی ترقی کے لئے اِس قوم میں آرٹ کی ترقی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اصلی آرٹ کی چیزیں پیدا کرنے کے لئے وشواس اور شردھا کی ضرورت ہے ساتھ ہی اسکے ہمارا (Imagination.) بہت ہی وستار ہونا چاہیئے۔
اُن ضروریات کو پورا کرنے کے پرانے آئیڈیلز میں روح پھونکنے کے لئے۔ سنسکرت ہر طرح سے پوری پوری قابلیت رکھتی ہے۔ چونکہ ہندوؤں کی قومیت اُن کی روحانیت پر مبنی ہے اسلئے اسے قائم رکھنے کے لئے ہمیں جگت گرو رشیوں کی شرن جانا چاہیئے جو اپنے فلسفہ بھکتی و کرم کے سدھانتوں کے ذریعہ ہماری رہبری کے لئے اب تک مستعد ہیں۔ ہندوؤں کو بہت سی دقتیں اپنی اخلاقی کمزوری کی باعث برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ تاریخی صفحے اِسی کے بیان کرنے میں ہمارا کالا منہ کرتے ہیں۔ پس کیا یہ ہمارے لئے عبرت کا مقام نہیں ہے کہ ہم اپنی مریادا کو پالن کرنے کیلئے اور وقت کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے سنسکرت کی زبردست چٹان پر چڑھ جائیں۔ روحانیت و اخلاقی ترقی سے بُدھی کے درست ہونے کا نتیجہ تمام دنیوی ترقی اور خوشحالی ہے۔ اسلئے اِس ہندو قوم کے گلدستہ کو سرسبز رکھنے کے لئے ہمیں سنسکرت کی جل دھارا چڑھانی چاہیئے تاکہ آریہ سنتان ہمیشہ پھلتی پھولتی رہے۔ سنسکرت کا مطالعہ نہ صرف ہندوؤں کے پرانے سوسائٹی

و مذہب پر روشنی ڈالتا ہے۔ بلکہ اسکے مطالعہ سے ہم دنیا کی پرانی سے پرانی تہذیب پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ اور سنسکرت ہم کو انسان کی تدریج ترقی (Human Evolution.) کے سمجھنے میں کس قدر مدد دیتی ہے۔ کتنے فخر کی بات ہے کہ سنسکرت کی ترقی بغیر کسی قسم کی اور قوموں مدد کے اپنی اندرونی قوت سے ظہور میں آئی اور ہر زمانے کو عبور کر کے اسکی لگاتار موجودگی قابل داد اور قابل عزت ہے۔

اس بات کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں کہ سنسکرت کی بدولت دنیا کو کس قدر فائدہ پہنچا۔ کیونکہ اس کے فوائد علم و فن کی ہر ایک شاخ میں بے انتہا ہیں جنکا ذکر کرنا یہاں پر محال ہے۔ موجودہ زمانے میں سنسکرت کے مطالعہ سے یورپ میں دو نئے علوم یعنی Comparative Mythology Comparative Philology. کی بنیاد پڑی۔ سنسکرت کے ذریعہ یورپ کا لٹریچر دن بدن ترقی کرتا جاتا ہے میکڈونل صاحب لکھتے ہیں کہ سنسکرت کا قرضہ یورپ پر اتنا وسیع ہے کہ اسکا معاوضہ ناممکن ہے اور آیندہ آنیوالے سالو نمیں یقین ہے کہ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ جائیگا۔ یونان اور روما کے تمام لٹریچر سے سنسکرت کا موجودہ لٹریچر آٹھ گنا وسیع ہے یہ یورپ کے سنسکرت دانوں کی رائے ہے۔ منو بھگوان کی پیشین گوئی ہے کہ آریہ ورت کے نواسی تمام دنیا کے استاد اور معلم ہوں گے۔ یہ لوگ ہر گوشے میں پیشین دھرم کے جھنڈے گاڑینگے۔ جھوٹ کا قلع قمع کرنے کے لئے ہر طرف سچائی کا ڈنکا بجائیں گے۔ اور ان کے علم کی روشنی کے آگے تمام دنیا کی جہالت کی تاریکی کافور ہو جائے گی۔ پرانی تاریخ کا پڑھنے والا کون شخص اس بات سے واقف نہیں ہے کہ کیلڈیا کی تہذیب و گریس اور روم کے بہت سے فلاسفروں کی عظمت

ہمارے رشیوں کی بدولت تھی۔ کیا اس بات کے دہرانے کی ضرورت ہے کہ عرب والوں کے ذریعے جو علم کی روشنی یورپ میں پہنچی وہ اصلیت میں آریاورت سے حاصل کیگئی۔ مورخ بتلاتا ہے کہ رشی یاگیہ ولک نے دنیا کے تمام فلسفہ دانوں کو اپنی دلیل کے ذریعے شکست فاش دی۔ لیکن اگر منو مہاراج ذرا اس وقت یہاں آکر اپنی اولاد کی دیکھیں تو کفِ افسوس ملتے رہ جائیں۔ کہ یہ لوگ کس اندھیری غار میں پڑے ہیں۔ اسلیئے آریہ بچے اپنے پرکھاؤں کو منہ دکھلانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اور پھر کمر بستہ ہو کر سنسکرت میں نئی روح پھونک دیں۔ ہم کو امید ہے کہ کامیابی کا سہرا ہمارے سر بندھیگا۔ اس مشن کو پورا کرنے کے لئے گروکل و رشی کل وغیرہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ہندو یونیورسٹی بھی یہی سنکلپ لیکر جنم لیگی اسلیئے کیا آپ میں سے وہ لوگ جو سنسکرت کے خلاف ہمیشہ جھگڑتے رہتے ہیں۔ اپنی فارسی کے سنگ سنگ جسکے اوپر سنسکرت کا بہت بڑا اثر پڑچکا ہے۔ سنسکرت کا مطالعہ بھی کسی طور پر شروع کرینگے۔ اور کیا تمام ہندو جاتی سب قسم کے جنجالوں سے چھٹکارا کرکے اپنی سنسکرت ماتا کی گود میں پھر شرن لیگی۔ آیئے ہم اپنی ماتا سے اپنی ڈھٹائی کے قصور کی معافی مانگیں اور ہمیشہ اسکے چھتر سائے میں مگن اور پھلتے پھولتے رہیں۔

اوم شانتی۔ شانتی۔ شانتی۔ ایک ودھیارتھی۔

(ایڈیٹوریل نوٹ)

معزز نامہ نگار سے ہم کسی حد تک اتفاق ضرور کرتے ہیں۔ لیکن سنسکرت کے عروج کے زمانے میں بھی عوام الناس کے لئے پراکرت بھاشائیں رائج تھیں۔ ہمیں امید ہے کہ سنسکرت کی ترقی کے ساتھ کم از کم ایک جدید پراکرت مثلاً ہندی کو ترقی دیجائے ✦ ✦ فقط